جنوری سنہ ۱۹۸۱ء　　　　جلد نمبر ۱۲۷

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت پندرہ (۱۵) روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

([illegible])

جلد ۱۲۷ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ چودہ سو سال میں اس برصغیر کے مسلمان غداروں کا ذکر معارف کے گذشتہ شمارہ میں آیا تھا، اس میں اس ملک کے دور مغلیہ میں جو غدار پیدا ہوئے، ان کا احاطہ نہیں ہو سکا تھا،

بابر نے ہندوستان کی اپنی نوزائیدہ سلطنت اپنے چہیتے فرزند ہمایوں کو دی تھی، یہ خالصۃً اسلامی سلطنت نہ سہی مسلمانوں کی تو تھی، ان کی حمیت اور غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کو ہر قسم کی نفاق پروری انتشار پسندی اور غداری کے مضرت رساں پہلو سے محفوظ رکھتے، مگر بابر کی وفات کے بعد ہی اس کے بہنوئی میر محمد مہدی خواجہ، اس کا دمساز وزیر اعظم خلیفہ اور اس کے تین اور لڑکے کامران، عسکری، اور ہندال ہمایوں کے حریف بن کر حکمرانی اور جہانبانی کا خواب دیکھنے لگے، ہمایوں نے اپنے بھائیوں کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کو الگ الگ کچھ علاقے دیے، مگر وہ ان پر قانع نہیں رہے،

ہمایوں کو اپنی حکومت کی خاطر گجرات، سندھ، بنگال اور بہار کے حکمرانوں سے لڑنا پڑا، اس کے بھائیوں کو اس کا ساتھ دینا چاہئے تھا، لیکن کامران علی الرغم اپنے نام کا خطبہ پڑھاتا رہا، مرزا عسکری اپنی ایک رندانہ مجلس میں یہ مستانہ نعرہ لگایا "میں بادشاہ ہوں ظل اللہ ہوں" ہندال نے ہمایوں کی مخالفت میں اسکے ایک بڑے معتمد علیہ بہلول کو قتل کر دیا، ہمایوں نے قنوج میں شیر خاں سے شکست کھائی تو اس نے بھائیوں کو متحد کرنے کی کوشش کی، مگر ان میں سے ہر ایک سلطنت کا مالک بلا شرکت غیرے بننا چاہتا تھا، ہمایوں کی ہمت ساتھ دیتی رہی، شکست کھا کر ہندوستان چھوڑا تو پندرہ برس کے بعد کابل، قندھار، اور بدخشاں فتح کرتا ہوا، پھر یہاں واپس آیا، اس نے اپنے بھائیوں کو پھر

قریب تر کرنا چاہا، ہندال تو اس کے سامنے جھکا، مگر کامران اور عسکری اس کے مخالف رہے،

عسکری تو اس کو گرفتار کرکے اس کی بادشاہت کو ختم کرنے کی فکر میں رہا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ کامران کے قبضہ میں کمسن اکبر آگیا تو کابل کے محاصرہ میں جب وہ ہمایوں سے لڑا تو اس نے اکبر کو وہاں بٹھلا دیا جہاں توپ کے گولوں کا مینہ برس رہا تھا، مگر خوش قسمت شہزادہ محفوظ رہا، کامران تو آخر میں ہمایوں کے دشمن سلیم شاہ سوری سے جا ملا، اور جب وہ اپنی قسمت سے سب کھیل کھیل چکا تو فاتح ہمایوں کے پاس لایا گیا، اس نے اس کی غداری کی سزا میں اسکو اندھا کر دیا، جس کے بعد وہ مکہ معظمہ چلا گیا، اور وہیں وفات پائی،

شیر شاہ نے ہمایوں پر فتح پاکر ایک شاندار حکومت قائم کی، مگر افغانوں کی پھوٹ اور غداری کی وجہ سے یہ صرف چھبیس[۲۶] برس قائم رہ سکی، افغان امرا ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار رہتے، انکا عمل اس پر تھا کہ

ملک بمیراث نگیرد کسے تا نہ زند تیغ دو دستی کسے

اس تیغ دو دستی کے ذریعہ سے سپہگری کے اعلیٰ نمونے ضرور دیکھنے میں آئے، مگر اسی کے ذریعہ غداری بھی ہوتی رہی، اسلام شاہ کے بعد اس کا کمسن بیٹا فیروز شاہ تخت پر بٹھایا گیا، تو اس زمانہ کے مسلمانوں کو یہ بھی دیکھنا پڑا کہ اس کے حقیقی ماموں مبارز خاں نے اس کو اپنی بہن کے پہلو سے چھین کر تہ تیغ کیا، اور محمد شاہ المعروف بہ عدلی کے خطاب سے تخت پر بیٹھ گیا، مگر باہمی منافقت کی وجہ سے یہ سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی، ان میں تین علاقوں کے حکمراں خانہ جنگی میں مارے گئے،

یہ منظر بھی اس زمانہ کے مسلمانوں نے دیکھا کہ افغانی امراء کے اختلاف اور غداری کی وجہ سے ہیمو بقال سور خاندان کی حکومت پر چھا گیا، وہ افغانی امراء کو اپنے دسترخوان پر بلاتا، ان کو گالیاں دے کر کہتا کہ خوب کھاؤ تاکہ اپنے داماد مغلوں سے لڑ سکو، یہ بے غیرت امراء دم نہ مارتے اور اپنی زبانِ حال سے کہتے۔

ع مرانان دہ کہ کفش بر سر بزن

اکبر کو بھی اپنے غدار امراء سے پالا پڑا، وہ اپنی ہوشمندی اور معرکہ آرائی سے ان پر غالب رہا،

لیکن اسلام سے اس نے یہ غداری کی کہ ایک نیا مذہب قائم کرکے اسلام کی تضحیک اور اہانت شروع کردی، بقول کالکارنجن قانون گو "اگر وہ واقعی ہندومسلمان کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہاں تھا تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہئے تھا، لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ نہیں ہوسکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بن جاتا تو مسلمان اسکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، پھر وہ جو کچھ کہتا اس کو ماننے میں ان کو تامل نہ ہوتا، اس نے ہندوؤں کی حمایت میں جو قوانین بنائے اُن میں مسلمانوں کو اس کی نیت میں اخلاص نظر نہیں آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے"،

جہانگیر اپنی شہزادگی کے زمانہ میں باپ سے بغاوت کرکے تاج وتخت کا خواہاں ہوا، اس حیثیت سے وہ ایک غدار بیٹا تھا، اس کو خود اپنے شہزادوں میں خسرو اور خرم کی اسی قسم کی غداری کا سامنا کرنا پڑا، شاہجہان تو اپنے بھائی شہریار اور بھتیجے طہورث اور ہوشنگ کو قتل کرکے تخت پر بیٹھا، مگر اس کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے شہزادوں کو جانشینی کے لیے خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، اور خود بارہ برس تک نظر بند رہا، اُن اختلافات میں مراد، دارا شکوہ اور شجاع مارے گئے،

تخت وتاج کے لیے بھائیوں کا آپس میں لڑکر ایک دوسرے سے غداری کرنا ایک روایت بن گئی تھی، مغلوں کے آخری دور میں اعظم شاہ، کام بخش، عظیم الشان، جہاں شاہ، کریم، جہاندار شاہ اور فرخ سیر اسی خانہ جنگی ہی میں ہلاک ہوئے، فرمانرواؤں میں بے اعتمادی، بے وفائی، بدعہدی اور عہد شکنی جاری تھی تو انکے امراء اور وزراء میں کیسے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوسکتے تھے، وہ اپنی مفاد پرستی میں کبھی نسلی اور قبائلی کبھی ملکی اور غیر ملکی، اور کبھی شیعہ اور سنی کے تعصب کی آگ برابر بھڑکا کر ایک دوسرے سے غداری کرتے رہے، مگر خود اس کے شعلوں میں جلتے بھی رہے، امیر الامراء سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ جیسے شاہ گر اسی آویزش میں مارے گئے،

اسلام کے عہد زرین میں اخوت اور وحدت کی اسلامی تعلیم کی وجہ سے عدنانی قحطانی مضری، ربیعی قیسی اور کنانی وغیرہ ایک ہوکر رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ الحق میں سرشار ہو گئے، تو وہ ایران شام مصر اور افریقہ پر چھا گئے تھے، اس سے نہ صرف ان کی بلکہ اسلام کی شوکت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا، مگر جب یہ تعلیم بھلادی گئی تو خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے بہت سے غدار پیدا ہوتے چلے گئے،

مغلیہ دور کے آخری فرمانرواؤں اور ان کے درباریوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے حکومت تنگ روزگار بن کر رہ گئی تھی، نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا تو اس نے ایک مسلمان سلطنت کے اندر خون کی ندیاں بہاکر اور اسلامی قدروں کی پامالی کرکے اپنی غداری کا ثبوت دیا، المناک منظر یہ بھی تھا کہ کرنال کے میدان میں نادر شاہ اور محمد شاہ سے لڑائی ہوئی تو میدان جنگ میں محمد شاہ کے فوجی امرا میں خان دوران، سعادت خان اور نظام الملک میں حربی تال میل اس لیے نہیں ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ محفوظ رہے، اور دوسرا مارا جائے، تاکہ دربار میں اس کا رسوخ بڑھ جائے، یہ غداری کی کیسی نفرت انگیز صورت تھی، احمد شاہ ابدالی دوسرا غدار تھا، اس نے متواتر حملے اور لوٹ مارکرکے دہلی کی رہی سہی عزت کو خاک میں ملادیا، جس کے بعد انگریزوں کی سامراجیت کیلئے راستہ بالکل ہموار ہوگیا۔

انگریزوں نے اپنی روباہی اور حیلۂ افرنگی سے معلوم نہیں کتنے غدار پیدا کئے، انگریزوں کی حمایت میں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے میر جعفر اور میر صادق نے جو غداری کی، اس کی کسک اور چبھن کو ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں بیان کردیا ہے،

جعفر از بنگال و صادق از دکن	ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر بھی غداری کے بھینٹ چڑھے، اس پُرآشوب ہنگامہ کے غداروں میں الٰہی بخش، حکیم احسن اللہ خان اور مولوی رجب علی کے نام نمایاں ہیں، الٰہی بخش بہادر شاہ ظفر کے رشتہ دار تھے، حکیم احسن اللہ خان ان کے بڑے معتمد تھے، مولوی رجب علی دونوں کے ہمراز تھے، اول الذکر دونوں

انگریزوں کے جاسوس بن کر بہادر شاہ ظفر کو غلط مشورے دیتے اور وہ جو کچھ مجاہدین آزادی کے ساتھ مل کر کرنا چاہتے، اس کی خبریں رجب علی کے ذریعہ سے انگریزوں تک پہونچاتے، ان ہی کی غداری سے بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوئے، ظالم ہڈسن نے ان کے شہزادوں میں سے مرزا مغل، خضر سلطان اور ابو بکر کے سرکاٹ کر ان کے پاس بھیجے، پھر قتل عام شروع ہوا تو چاندنی چوک میں ستائیس ہزار مسلمان مارے گئے، اکبر آبادی مسجد شہید اور زینت المساجد کی دیواریں مسمار کر دی گئیں، جامع مسجد کو فوجی بارک بنا دیا گیا، اور وہاں سور ذبح ہونے لگے،

انگریزوں کی سامراجی حکومت کے زمانہ میں بہت سے موقع شناس مسلمانوں کو بڑے بڑے خطابات اس لئے دیے جاتے کہ وہ مسلمانوں سے غداری کر کے مصلحت اندیشی کے نام پر ان کی مذہبی حمیت اور ملی غیرت پر ضرب کاری لگاتے رہیں، اور جب یہ انگریز یہاں سے اپنی دکان بڑھانے لگے تو اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر گئے، یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان بننے کے حق میں ووٹ اس لیے دیے کہ ان کو خیال ہوا کہ ایک اسلامی مملکت بن گئی تو مسلمانوں کا مذہب کلچر زبان، ملی وجود اور سب کچھ وہاں محفوظ ہو جائیں گے، اس تحریک میں خدا جانے کتنے مسلمانوں کا خون بہا، ان کے گھر لٹے، ان کی عورتوں کی آبرو ریزی ہوئی، اس کی تفصیل مسلمانوں کی تاریخ کی ایک المناک داستان ہے،

پاکستان بنا تو اسلام کو فروغ دینے کے بجائے تھوڑے ہی عرصہ میں بنگالی قومیت کا نعرہ بلند ہوا، اس کے حدی خوان اور رجز خوان شیخ مجیب الرحمن بنے، پھر تو وہاں خون کی ایسی ہولی کھیلی گئی کہ اسلام کی تاریخ کی ساری خونریزیاں بھلا دی گئیں، شیخ مجیب الرحمن نے اسلامی اخوت اور وحدت سے گریز ہو کر اس کی قدروں کو جس طرح پامال کیا، اس لحاظ سے وہ ضرور غدار رہیں، وہ مغربی پاکستان سے کٹ کر بنگالی قومیت کے ابوالآبا اور بنگلہ دیش کے صدر یا وزیر اعظم بننا چاہتے تھے، تو غیر بنگالیوں سے نفرت

پیدا کرکے خون بہانے کے بجائے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے اور بھی پُرامن ذرایع تھے، انکی خون آشامیوں کی چاہے جتنی تاویل کی جائے مگر ایک غیر جانب دار مورخ کے قلم اور تحریر پر قدغن لگانا مشکل ہے، پھر خود بنگالیوں نے جس سفاکی اور بے دردی سے ان کو ان کے خاندان کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا اس سے ان کا سیاہ اعمال نامہ ظاہر ہے ع - الامان از جعفرانِ این زمان!

اب مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے نعرے بلند کیے جارہے ہیں، پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی تھی،

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں　　　جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اگر یہ صحیح تعلیم تھی تو کیا چار قومیتوں کے نعرے اس سے غداری نہیں۔

ان سطروں میں مسلمان غداروں کی جو لمبی فہرست پیش کی گئی ہے، اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صرف غدار ہی پیدا ہوتے رہے، ان کے نالۂ نیم شبی، آہ سحرگاہی، اور ایمان پروری سے ان کی ملی سرشت میں جو کوکبی، مہتابی، ملکہ براہیمی اور کلیمی رنگ پیدا ہوتا رہا، اسکی علیحدہ تاریخ ہے، شب و روز کی بے تابی میں انسان کی سیمابی کیفیت اور اس کی عقل کی روباہی سے اس میں خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی اور بالآخر غداری جیسی مذموم صفات پیدا ہوتی رہتی ہیں، اس کا ذکر فکر فزوا کے لیے ضروری ہے، اپنی تاریخ کے محاسن کے ساتھ ہم کو اس کے معائب پر نظر رکھ کر بصیرت حاصل کرتے رہنا چاہئے، اسی بصیرت سے ہمارے نخل کہن میں شادابی، حال میں تابناکی اور مستقبل میں درخشانی پیدا ہوگی،

غداروں اور منافقوں میں زیادہ فرق نہیں، کلام پاک میں منافقوں کی بڑی مذمت کی گئی ہے، ان منافقوں سے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح پیش آئے، اس کا اسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے، عبداللہ بن ابی اسلام کی تاریخ میں منافقوں کا سردار سمجھا جاتا ہے،

اس کی مفسدانہ کارروائیاں اسلام کے بدترین دشمنوں سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں کے مخفی رازدن کو ان کے دشمنوں تک پہونچایا کرتا تھا، وہ اپنے کو مسلمان کہتا، مگر غزوۂ احد میں شرکت کرکے علحدہ ہوگیا، جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا، اس نے واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام بھی لگایا، لیکن جب وہ مرا تو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مغفرت کے لیے نماز پڑھنے کے لیے آگے بڑھے، حضرت عمرؓ نے اس کی ساری باتیں یاد دلائیں تو آپ نے فرمایا، کہ اگر میری نماز سے اس کی بخشش ہوجائے تو میں اس کے لیے ستر دفعہ نماز پڑھوں،

مسلمان اپنے دشمنوں، بدخواہوں اور نقصان پہونچانے والوں کے ساتھ اسی اسوہ پر عمل کرتے رہتے تو وہ رحمۃ للعالمینؐ کے صحیح پیرو ہوتے، مگر وہ تو آپ کے پیام رحمت کو بھول گئے، اور بھولتے جارہے ہیں، اسی لئے ع

امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

مگر ان کے لیے یہ بھی بشارت ہے،

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا		آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دارالمصنفین سے ابھی ایک نئی کتاب صوفی امیر خسرو شائع ہوئی ہے، جس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ حضرت امیر خسرو نے شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ایک جاںنثار مرید ہونے کی حیثیت سے راہ سلوک پر گامزن ہونے کے بعد کیا درجہ حاصل کیا، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف میں عرب و ہند کے تعلقات، خیام، نقوش سلیمانی، خطبات مدراس اور رحمت عالم ان کی ذاتی ملکیت تھیں، لیکن دارالمصنفین نے ان کا حق طباعت باضابطہ طور پر خرید لیا ہے، ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی اپنے ذاتی مفاد کے لئے شائع نہ کرے، اگر اس نے شائع کیا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ کے

مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

روایت نمبر ۲ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ جب تلاوت قرآن پاک فرماتے اور کسی آیت وعید (عذاب کی آیت) پر پہنچتے تو سینے پر ہاتھ مارتے اور بیہوش ہوکر گرجاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہوجاتے اور اس طرح دن میں ہزار بار بیہوش ہوتے اور ہوش میں آتے تھے، (روزے ہزار بار بیہوش آمدے) اسی طرح جب آپ آیت مشاہدہ (دیدار الٰہی کی آیت) پر پہنچتے تو مسکراتے اور اٹھ کھڑے ہوتے، اور عالم مشاہدہ میں متحیر رہتے ایک رات دن عالم مشاہدہ میں ایسے متحیر رہتے کہ اپنی بھی خبر نہ رہتی،[1]

یہ مخصوص ترین کیفیت ہے، جو عام حالات سے ممیز ہے۔ اس کا تعلق مراتب سلوک سے ہے،

تو نظر باز نہ ورنہ تغافل نگہ ست　　　تو زبان فہم نہ ورنہ خموشی سخن ست

---

[1] اسرار الاولیاء ص ۱۳۱،

اس کا احساس تو کیا جا سکتا ہے، مگر اصل کیفیت کو نہ گرفت میں لایا جا سکتا ہے، اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے، کیفیات کی ترجمانی قوت بشری سے باہر ہے، اس میں بھی راز سربستہ ہے،

اہل زبان کی روش سے کم آگاہی ہزار بار پر بھی انگلی دھرے گی، مگر سمجھ لینا چاہیے کہ عرف عام میں ہزار سے مراد گنتی نہیں کثرت ہے، مرزا غالبؔ کہہ گئے ہیں، ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

محاورے میں کہتے ہیں ہزار بار سمجھایا باز نہ آئے، اب بھگتو خمیازہ اس کا، یہ بھی ہے کہ ایسی حالت میں گنتی گنی ہی نہیں جاتی، قرینے ہی سے کہہ دیا جاتا ہے، مراد ہوتی ہے کثرت، اس روایت میں یہی دو نکتے تھے، جو حل ہو گئے، ورنہ ہر دانش ور ہر اعتبار سے روایت کی معنویت اور اسلوب کی لطافت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

روایت ۵ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ کل قیامت کے دن جب عاشقوں کو مقام تجلی میں لایا جائے گا تو حکم ہوگا کہ آنکھیں کھولو، پھر عاشقوں میں سے ہر ایک کو آگے لایا جائے گا، اور ہر ایک پر بار تجلی ہوگی، وہ سات ہزار برس تک بیہوش رہیں گے، جب ہوش میں آئیں گے، تو فریاد کریں گے هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ان پر پھر تجلی ہوگی، ستر مرتبہ ایسا ہی ہوگا، پھر وہ اپنی جگہ آجائیں گے، حضرت بابا صاحبؒ نے یہ بیان فرمانے کے بعد آہ کی اور بیہوش ہو گئے اور بیہوشی ہی کے عالم میں یہ رباعی پڑھی

از بہر رخ تو مبتلا می باشم
اندر غم عشق در بلا می باشم
وز یاد جمال تو چناں مدہوشم
کز خود خبرے نیست کجا می باشم [1]

اس بیان کا اور اس روایت کا تعلق عالم بقا سے ہے، جو اس عالم فنا سے مختلف ہے، یہ مادی ہے اور وہ غیر مادی، وہاں کی کیفیات کو اس عالم کی مشابہت سے بیان کرنا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ تشبیہ و تمثیل سے منزہ ہوتا ہے، بیہوشی سلوک کی اصطلاح ہے،

---

[1] اسرار الاولیاء ص ۲۰

اس حالت میں سالک صفات ذات میں محو ہوتا ہے، اسی سے عالم باقی کی اس کیفیت کا احساس کیا جاسکتا ہے جیسے بیہوشی سے تعبیر کیا ہے، اس کی فہمید کا تعلق ہر فرد بشر سے ہے، ہر کس وناکس سے نہیں ہے، یہ ایسی ہی بات ہے کہ منطق وفلسفہ کی اصطلاحات کو علمائے منطق وفلسفہ ہی جانتے ہیں، جو ان علوم سے آگاہ نہیں، وہ نہیں جانتے۔

دوسری چیز ہے طول مدت، اس کا تصور واقعۂ معراج سے کیا جاسکتا ہے کہ یہاں بستر بھی گرم رہا، کنڈی بھی ہلتی رہی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی سیر بھی فرمالی، ان نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس روایت کو سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ ناآشنائے تصوف اس کی فہمید سے قاصر رہتے ہیں، وہ کچھ بھی کہیں ان کا کہنا معتبر نہیں ؎

تلقین درس اہل نظر یک اشارت است گردم اشارتے و مکرر نمی کنم

روایت ۲ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعاگو اور خواجہ قطب الدین بختیار اوشی ملک بالا کی طرف سفر میں تھے، سوتہ نامی دریا کا کنارہ تھا، ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو وہاں کوئی کشتی نہ تھی جو ہم پار جاتے، مقام بھی خوف کا تھا، حضرت خواجہ نے فرمایا، فرید آؤ پار چلیں، میں نے عرض کیا زہے سعادت، مگر دل میں یہ بات آئی کہ کشتی تو ہے نہیں، پار کیسے ہوں گے، دل میں یہ خطرہ گزرا ہی تھا کہ اپنے کو اور حضرت خواجہ صاحبؒ کو دریا پار کھڑے دیکھا، موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ ہم کیسے پار ہوگئے تھے آپ نے فرمایا کہ جب دیکھا کہ دریا کے کنارے کشتی نہیں ہے تو میں نے سورۂ اخلاص قل ھو اللہ احد پڑھ کر دریا پر دم کیا دریا شق ہوگیا، اور ہم پار چلے آئے۔ (اسرار الاولیار ص ۳)

پوری حکایت سادہ اور عام فہم ہے، البتہ دریا کا راستہ دینا خوارق عادت میں سے ہے لیکن صوفیۂ کرام کے حالات میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں، اور ان کتابوں میں ملتے ہیں جنھیں اولیا دشمن نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں، گویا کہ ایسے واقعات صوفیہ کے معمولات

میں سے ہیں، عجائبات میں سے نہیں ہیں،

امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دریا کی طرف سفر میں تھے، . . . . ہم نے دریا پار جانا چاہا کشتی تھی نہیں، ہمنے دعا کی تو حکم خدا دریا نے ہمیں راستہ دیدیا، آپ کا مبارک بیان یہ ہے:۔

دست بدعا بردیم بفرمانِ خدائے تعالیٰ	ہم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے خدا کے
دریا دوشق شد زمین خشک پیدا شد	حکم سے دریا شق ہوگیا، خشک زمین نکل
ما بگذشتیم [1]	آئی اور ہم دریا پار چلے گئے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ کی زبانی نقل کیا ہے:۔

خواجہ معین الدین حسن سنجری طیب اللہ	خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ
مضجعہٗ فرمود کہ وقتے من برابر خواجہ	فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ عثمان
عثمان ہرونی در سفر بودم در کنارۂ دجلہ	ہرونیؒ کے ہمراہ سفر میں تھا، جب ہم دریائے
رسیدیم کشتی نبود خواجہ عثمان قدس اللہ	دجلہ کے کنارے پہنچے تو وہاں کشتی نہ تھی،
سرہٗ العزیز فرمود کہ چشم پیش کن چشم پیش	خواجہ عثمان ہرونیؒ نے فرمایا، آنکھیں بند
کردم خواجہ را و خود را درگذرے دجلہ	کرلو، میں نے آنکھیں بند کرلیں، آنکھیں کھولیں
دیدم، از خواجہ عثمان قدس اللہ سرہٗ	تو دیکھا کہ ہم دونوں دریا کے پار ہیں،
العزیز پرسیدم کرشما این چہ کردید،	میں نے خواجہ عثمان ہرونیؒ سے دریافت
فرمود چند بار سورۂ فاتحہ خواندم،	کیا تو فرمایا میں نے چند بار سورۂ الحمد شریف
(سیر الاولیا ص ۴۴ ج)	پڑھی تھی،

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲ ج

مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ذکر میں فرمایا۔

از وے روایت کردہ اند، پیر من ہفتاد مرید تارک داشت، پوشش ایشان مئزر و عرق چیں در بر کلاہ بر سر اگر آب پیش آمدے و کشتی نہ بودے پائے می نہادند و می گزشتند (خیر المجالس ص ۱۵۱)

وہ یہ بیان کرتے تھے کہ میرے پیر کے ستر مرید تارکِ دنیا تھے، ان کا لباس تہمد تھا، اور بدن میں عرق چین یعنی پسینہ کو جذب کرنے والا لباس اور سر پر ٹوپی (سارا ہی لباس سادہ تھا مگر ایسے باکمال تھے) کہ دریا آجاتا اور کشتی نہ ہوتی تو (پانی ہی پر) پیر رکھتے اور چلے جاتے تھے۔

گویا کہ اسرار الاولیاء کا مذکورہ واقعہ بھی کچھ ایسا واقعہ نہیں ہے، جو دیگر کتبِ ملفوظات میں مندرجہ واقعات کے لگ بھگ نہ ہو۔

روایت ۶ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا، دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ ایک بزرگ پانی پر مصلّی بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں، جب نماز پڑھ چکے تو سجدہ میں سر رکھا اور سجدے ہی میں جناب باری میں التجا کرتے رہے کہ خداوندا! حضرت خضرؑ سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، آپ انھیں توبہ کی توفیق عنایت فرمائیے، اتنے میں حضرت خضرؑ بھی آگئے، اور دریافت کیا کہ اے بزرگوار! میں کون سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں، انھوں نے کہا کہ تم نے جنگل میں (فی سبیل اللہ) درخت بویا جب وہ بارآور ہو گیا تو تم اس کے سایہ میں بیٹھنے اور آرام کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ یہ درخت میں نے خدا کے لیے بویا ہے، حضرت خضرؑ نے توبہ کی۔

پھر ان درویش نے ترکِ دنیا اور حق دوستی سے متعلق حکایت بیان کرکے فرمایا کہ اس طرح وہ جس طرح میں رہتا ہوں، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ آپ کس طرح رہتے ہیں، اور کیا کرتے ہیں

ان بزرگ نے کہا کہ میں اس طرح رہتا ہوں کہ اگر مجھے ساری دنیا عنایت فرمائیں اور کہیں کہ تم اس کا حساب بھی نہ لیا جائے گا، اور یہ بھی کہیں اگر قبول نہ کروگے تو دوزخ میں ڈال دیئے جاؤگے تو میں دوزخ میں پڑنا قبول کرلوں گا، مگر دنیا کو لینا گوارا نہ کرونگا، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ کیوں، انھوں نے فرمایا اس لیے کہ وہ (دنیا) خدائے عزوجل کی مبغوضہ ہے، جس چیز کو اللہ پاک دشمن قرار دیں میں اسے قبول نہ کرونگا، اس کی بجائے دوزخ کو قبول کرلوں گا،

حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں ان کے نزدیک ہوا، اور سلام کیا، نہر حائل رہی، انھوں نے کہا آجاؤ، میں سوچنے لگا کہ پانی کو عبور کیسے کروں، میں اسی فکر میں تھا کہ خشکی نمودار ہوئی میں چلا اور ان کے پاس پہنچ گیا، تھوڑی دیر بعد انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا اے فرید! چالیس برس ہوئے کہ میں سونے کے لئے لیٹا تک نہیں، لیکن اے درویش میرے مقام مجھے جو کھانے کو ملتا ہے، تو جب تک کوئی آنے والا آ نہیں جاتا اور میں اپنے ساتھ اسے کھلا نہیں لیتا مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوتا، اتنے میں دو پیالے سالن کے اور چار روٹیاں ہلکی ہلکی سی عالم غیب سے آئیں، ایک پیالہ میرے آگے رکھا اور دوسرا اپنے آگے، دونوں نے کھانا کھایا، جب پہر رات ہوگئی تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر وہ بزرگ نماز نفل پڑھنے لگے، میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے انھوں نے دو رکعات نماز میں چار بار قرآن پاک ختم کیا، ہر رکعت میں دو قرآن پاک ختم کرتے تھے، اس کے بعد سلام پھیرا اور سر سجدے میں رکھا، اور زار و قطار رونے لگے، اور عرض کیا کہ خداوندا میں نے آپ کے شایانِ شان عبادت نہیں کی جو میں یہ سمجھوں کہ میں نے کچھ کیا ہے، اس کے بعد صبح کی نماز پڑھی، اور مجھے رخصت کیا، میں نے اپنے کو دریا کے کنارے کھڑا پایا، اور وہ بزرگ نظروں سے غائب ہوگئے، نہیں معلوم کہاں گئے،

اس کے بعد حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ اے درویش درویشی یہ تھی جو وہ رکھتے تھے کہ

دنیا کی چیزوں میں سے ان کے پاس ٹوٹی ہوئی پانی کی ٹھلیا کے سوا اور کچھ نہ تھا، رات ہوتی تو اس کا پانی بھی پھینک دیتے تھے، اور رات دن تجرید و محاسبہ میں مشغول رہتے تھے، (اسرار الاولیاء ص ۴۴-۴۵)

یہ حکایت بہت دلچسپ اور نہایت سبق آموز ہے، اس میں مافوق العادۃ عنصر بھی ہے، اس روایت کو خواجہ حسن علائے سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے، بیان میں وہی فرق ہے جو فطرتاً دو صاحبوں کے بیان میں ہوا کرتا ہے[1] لیکن موازنہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا ضبط الفاظ خواجہ حسن علائے سجزیؒ کے ضبط الفاظ سے افضل و اعلیٰ ہے، محل غور ہے کہ ایک ہی خیال کو دونوں صاحبوں نے کس کس طرح بیان فرمایا ہے، مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے لکھا ہے،

مصلی برآب انداختہ نمازمی گزاردچوں	پانی پر مصلی ڈالے نماز پڑھ رہے ہیں،
ازنماز فارغ شد، سر بسجدہ نہاد و مناجات	جب نماز سے فارغ ہوئے، سر سجدے میں
می گفت،	رکھا اور التجا کرتے رہے،

خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ نے لکھا ہے،

مصلی بر روئے آب انداختہ بود و نماز	پانی پر مصلی ڈال رکھا تھا، اور نماز
می کرد و می گفت خداوندا الخ	پڑھتے رہے اور کہتے رہے کہ خداوندا

(فوائد الفواد ص ۸۲)

جسے علم و فن سے ذرا بھی آگاہی ہے وہ ان جملوں کے اوصاف سے واقف ہے کہ چوں از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و مناجات می گفت اقتضائے حال کے مطابق ہے، یا یہ کہ نماز می کرد و می گفت، (نماز پڑھتے رہے اور کہتے رہے) نماز میں کچھ کہتے رہنا کہاں تک مناسب ہے اولیاء اللہ تو جہ تن ذات الٰہی میں محو ہو جاتے ہیں، اور اگر چہ دعا یہی ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد

---

[1] تفصیل کے لیے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۷۵ تا ۱۸۲، ملاحظہ فرمائیے،

دعا کی مگر ظاہر ہے، اسرار الاولیاء کا اسلوب زیادہ اقتضائے حال کے مطابق ہے بہر نوع اسرار الاولیاء کو اسلوب بیان اور ماخذ کے اعتبار سے ترجیح حاصل ہے،

روایت ۱۸: حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ زمانۂ ماضی میں ایک بزرگ تھے جو تیس سال عالم تحیر[1] میں رہے ایک سال گزرتا تو وہ عالم صحو[2] میں آتے، ان کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا، البتہ ایک چھوارا تھا، جو ان کی خانقاہ کے طاق میں رکھا رہتا تھا، جب بھوک کا غلبہ ہوتا تو وہ اس چھوارے کو طاق میں سے اٹھاتے اور چوس لیتے پھر وہیں رکھ دیتے کہتے ہیں کہ پچاس برس تک یہی کرتے رہے ابھی وہ کچھ باقی ہی تھا کہ ان بزرگ کا انتقال ہوگیا، اور وہ رحمت حق سے جا ملے (اسرار الاولیاء ص ۵۴)

اس حکایت میں سلوک کی دو اصطلاحیں آگئی ہیں، (۱) تحیر (۲) صحو، سالک کے مرتبۂ احدیت میں محو ہونے اور مشاہدۂ حق میں مستغرق رہنے کو حیرت و تحیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور صحو کہتے ہیں ہوش میں آنے یا رہنے کو مراد اس سے یہ ہے کہ انہماک و توحید حقیقی تک رسائی حاصل ہونے کے باوجود سالک حفظ مراتب سے غافل نہ ہو،

یہ حکایت بلاشبہ عجائبات روزگار سے ہے، تاہم ہر عہد میں عجوبۂ روزگار شخصیتیں عالم وجود میں آتی رہی ہیں، اور کتب ملفوظات میں ایسے بزرگوں کا ذکر خوب ملتا ہے، خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل فرماتے ہیں۔

بقالے بود علیہ الرحمۃ در مدت بست و پنج	ایک بقال تھا اس پر خدا کی رحمت ہوا
سال صائم بود، ہیچ کس را بر حال او	پچیس برس روزہ دار رہا کسی کو خبر نہ
اطلاع نہ بود کہ او صائم می باشد اگر در	ہوئی کہ وہ روزے سے ہے، حتیٰ کہ

[1] عالم تحیر یا عالم حیرت سالک کا مرتبہ احدیت میں محو ہونا، اس مقام کی کیفیات احاطۂ تحریر و تقریر میں نہیں سما سکتیں، اسی کو عالم سکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [2] بیہوشی سے ہوش میں آنا، یا سالک کا انتہائے توحید حقیقی میں پہنچ کر فرق مراتب سے غافل نہ ہونا، مگر یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں۔

خانہ بودے چناں غمدیدہ کہ در دکان چیزے خوردہ است و اگر در دکان بودے چناں نمودے کہ در خانہ چیزے خوردہ است (فوائد الفواد ص ۲۴)

اس کے گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوئی، اگر وہ گھر میں ہوتا تو یہ ظاہر کرتا کہ اس نے دکان پر کھانا کھا لیا ہے، اور دکان پر ہوتا تو یہ ظاہر کرتا کہ گویا اس نے گھر پر کھا لیا ہے،

اسرار الاولیاء میں شیخ بزرگ کی حکایت ہے، اور یہ ایک بقال کی کیفیت ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے رشید پنڈت کا ذکر فرمایا ہے کہ اسے کاروباری مشغولیت میں کھانا یاد ہی نہ آتا تھا، اور یہ کلیہ بھی بیان فرمایا ہے،

در عالم عشق ہم چنیں است چوں دل عاشق بہ معشوق متعلق می شود، او را طعام و خواب یاد نمی آید، جائے کہ در عالم ظاہر ایں معاملہ است در عالم باطن ہر طریق اولیٰ، آں کہ مشغول مشاہدات عالم غیبی باشد طعام کہ؟ آب کہ؟ خواب کہ؟ (خیر المجالس ص ۹۳)

عشق کے عالم میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب محب کا دل محبوب سے متعلق ہو جاتا ہے تو اسے کھانا اور سونا یاد نہیں آتا جب عالم ظاہر میں یہ کچھ ہے، تو عالم باطن میں بطریق اولیٰ ہے، جو بھی عالم غیب کے مشاہدے میں محو و مستغرق ہوتا ہے، اس کے لیے کھانا پینا اور سونا کیسا

حضرت مخدومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

عبادت ظاہری سبب می شود برائے غذا و ہمیں عبادت ظاہری جائے غذا می شود برائے اشتہا . . . .
. . . . بعد ازاں فرمودند ذکر ہم سبب

عبادت ظاہری غذا کا سبب ہوتی ہے (عبادت ظاہری سے بھوک لگتی ہے) اور یہی ظاہری عبادت غذا بن جاتی ہے، اور اگر کسی کو ذوق و شوق نہیں ہے تو وہی

• خیر المجالس ص ۱۹۳ . . . .

اشتہا است دہم بجائے غذا ہا مراقبہ در ہمہ حال بجائے غذا است زیرا کہ در مراقبہ حضور و مشاہدہ است، و جوارح در حرکت نمی آید۔ ملائم این فرمودند کہ خواجہ عقال مغربی چہار سال در کعبہ مراقب بود و درین چہار سال طعام و آب نخورد

(خیر المجالس ص ۱۵۳ ۔ ۱۵۴)

. . . . . . پھر فرمایا کہ ذکر بھوک بھی لگاتا ہے اور غذا بھی بن جاتا ہے، مگر مراقبہ ہر حال میں غذا کا قائم مقام ہے، کیونکہ مراقبہ میں حضور و مشاہدہ ہے اور اعضا حرکت میں نہیں آتے، اسی سے متعلق یہ فرمایا کہ خواجہ عقال مغربیؒ چار سال کعبۃ اللہ میں مراقب رہے، اس چار سالہ مدت میں انھوں نے نہ کھایا نہ پیا

خواجہ عقال مغربیؒ کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہ العزیز ہفت سال طعام نخورد، چون وقت نماز شدے، بہ خود آمدے، برخاستے نماز گزاردے، باز در مراقبہ شدے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہ العزیز نے سات برس کھانا نہیں کھایا جب نماز کا وقت ہوتا، ہوشیار ہو جاتے، اٹھتے نماز پڑھتے پھر مراقبے میں مشغول ہو جاتے،

(خیر المجالس ص ۶۲)

کتب ملفوظات مشائخ چشت رحمہم اللہ میں ایسے واقعات اور بھی ملتے ہیں، حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے فرمایا:۔

شیخ شرف الدین (بو علی قلندر) پانی پتی نے تیس سال تک کھانا نہیں کھایا

(جوامع الکلم ملفوظ ۱۔ رمضان المبارک [illegible])

یہ بھی فرمایا ہے:۔

سید مصریؒ ایک خط لاتے، انھوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے اٹھائیس برس سے پانی نہیں پیا ہے۔ (جوامع الکلم ملفوظ ۱۰ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے اشتہا پیدا نہ ہونے اور مدتوں تک کچھ نہ کھانے پینے کی حکمت بھی بیان فرمادی ہے، جنھیں علم تصوف سے ذرا بھی آگاہی ہے، وہ جانتے ہیں کہ راہ سلوک میں ایسے مقام بھی آتے ہیں، جن کی فہم سے سطحی اذہان معذور رہتے ہیں، اسرار الاولیار کی مذکورہ حکایت آئین تصوف کے مطابق اور نہایت درجہ موثر ہے،

روایت نمبر ۹ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ بزرگان دین میں سے ایک بزرگ تھے، انھیں عبداللہ خفیفؒ کہتے تھے، چالیس سال تک وہ رات کو نہیں سوئے بلکہ پلک تک نہیں، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روئے کہ ان کے مبارک رخساروں پر گوشت نام کو بھی نہ رہا تھا، یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنا لیے تھے، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے ایسے حیران و سراسیمہ تھے کہ انھیں چڑیوں کی آمد و رفت کی خبر تک نہ ہوتی تھی، جب وہ بزرگ قیامت کی باتیں اور قبر کی کیفیت سنتے تو مثل بید کانپنے لگتے، زمین پر گر پڑتے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے، جب ہوش میں آتے تو اٹھتے اور یہ آیت پڑھتے۔ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ زار وقطار روتے اور فرماتے میں کچھ نہیں جانتا کہ کس فریق میں ہوں گا۔ ساری عمر انھوں نے اسی طرح گزاری اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ (اسرار الاولیا ص ۵۸)

یہ روایت بھی محیر العقول اور عجائبات روزگار میں سے ہے، لیکن ایسی روایتیں دیگر کتب ملفوظات میں بھی ہیں، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ صوفیہ کرام کے احوال سے ایسی روایات کو خصوصی علاقہ ہے، یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ یہ جملہ کہ یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے جا لیے تھے، الخ بعض نسخوں میں نہیں ہے، اس کے ماسوا "چنانچہ می گویند"

اس پر دلالت کرتا ہے کہ مذکورہ روایت ہے، جو بطور افواہ عوام کی زبان پر ہے، اس کا کوئی معتبر راوی نہیں ہے، بات کا بتنگڑ بنا دینا عوام کی عادت ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد روایت میں کوئی خلفشار نہیں رہتا۔

اب رہی یہ بات کہ چالیس سال تک وہ رات کو نہ سوئے، تو کاملین صوفیۂ کرام کے احوال میں ایسے واقعات ملتے ہی ہیں، چنانچہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

شجاع کرمانی چہل سال شب نہ خفت۔ (فوائد الفواد ص ۴۰)	شجاع کرمانیؒ چالیس سال تک رات کو نہ سوئے،

اسی روایت کو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے دہرایا ہے فرماتے ہیں ۔

شاہ شجاع کرمانیؒ فرمود ند چہل سال نخفت، (خیر المجالس ص ۲۳۹)	شاہ شجاع کرمانیؒ نے فرمایا کہ وہ چالیس سال سوئے نہیں،

فوائد الفواد اور خیر المجالس کے بیانات سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ روایت بھی صوفیۂ کرام سے خصوصی رابطہ رکھتی ہے، اور خشیتِ ایزدی کی ترجمان ہے، اور اس کا اسلوبِ بیان یہ بتاتا ہے، کہ اس کا تعلق حضرت باباصاحبؒ ہی سے ہے،

روایت ۱ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ اے درویش شیر خاں ملتان کا حاکم تھا، وہ دعاگو سے صاف نہیں تھا، خلش رکھتا تھا، میں نے بارہا نہایت نرمی اور ہمدردی سے کہا اور سمجھایا کہ درویشوں سے بغض وکینہ مناسب نہیں ہے، بلکہ ملک کی تباہی وبربادی کا سبب ہے، مگر وہ نہ مانا اور من مانی ہی کرتا رہا، انجام کار تاتاریوں نے اُچ پر یورش کی اور لوٹ مار بھی کی قضاء عنداللہ صرف وہی مارا گیا، پھر آپ نے یہ شعر پڑھا۔ (اسرار الاولیاء ص ۶۹)

درویش یہ نھبرہ بودے اگر مقام گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال

یہ واقعہ بروئے تاریخ سنہ ۶۶۲ھ کا ہے، اسی واقعہ کو حضرت محبوب الٰہی نے بھی بیان فرمایا ہے خواجہ امیر حسن علائے سنجری نے لکھا ہے،

شیر خان والئ اُچ و ملتان بود، در حق	شیر خان اُچ اور ملتان کا حاکم تھا حضرت
شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ	باباصاحبؒ کے متعلق کچھ اچھا اعتقاد
سرہ العزیز چنداں اعتقادے نداشت	نہ رکھتا تھا، یہاں تک کہ حضرت بابا
تا بارہا شیخ الاسلام در معنئ او ایں	صاحبؒ نے اس کے متعلق بارہا یہ شعر پڑھا ؎
دو مصرع بگفتے ؎	
افسوس کہ از حال منت نیست خبر	افسوس کہ تجھے میرے حال کی کچھ بھی خبر نہیں
آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری	البتہ جب تجھے پتہ چلے گا تو افسوس کرے گا
بعد ازاں فرمود کہ چوں شیخ الاسلام	اس کے بعد فرمایا کہ حضرت باباصاحبؒ
قدس اللہ سرہ العزیز از دنیا برفت ہماں	کا انتقال ہو گیا، تو اسی سال کافر اس
سال کافراں دراں دیار رسیدند۔	شہر میں آپہنچے۔

(فوائد الفواد ص ۲۲۰ - ۲۲۱)

مفہوم کے اعتبار سے دونوں بیان یکساں ہیں، الفاظ کا رد و بدل فطری شے ہے، جو دو مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا ہے، البتہ اشعار مختلف ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے، البتہ فوائد الفواد میں بعد ازا

(حاشیہ ص ۲۰) سلہ اسرار الاولیاء کی اصل فارسی عبارت یہ ہے:-

اے درویش شیر خان والی ملتان بود، چنداں عقیدہ بردعاگوئے نداشت، ہر بار بطریق بہتری گفتم، کہ با درویشاں کینہ کردن نیکو نیست کہ خلل ملک توست او التفات نہ کردے چنانچہ وقتے در حوالی اُچ مغل رسید ہیچ کشتہ نہ شد مگر ہموں آں گاہ بر لفظ مبارک ایں دو مصرع راند بیت ؎

(اسرار الاولیاء ص ۹۵)

بعد جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق اس واقعہ سے نہیں ہے، کیونکہ شیرخاں کا واقعہ ۲۶۲ھ کا ہے، اور اس بیان میں حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد کے واقعہ کا ذکر ہے، اس کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے۔

"بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیار اجودھن رسیدند خواجہ نظام الدین از جہت مردی و غایت دلاوری بحرب کفار پیوست بعد اقتال بسیار شہادت یافت (سیر الاولیاء ص ۱۹۵)

یہ خواجہ نظام الدین حضرت باباصاحبؒ کے چوتھے صاحبزادے تھے، غالباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی ذکر فرمایا تھا کہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد یہ حادثہ بھی پیش آیا تھا، جو حضرت باباصاحبؒ کے فرمودہ اس شعر سے بھی متعلق ہے، جو اسرار الاولیاء میں اس ذکر کے بعد ہے، خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ کے اسلوب میں ایجاز ہے، انھوں نے بعد ازاں سے اس واقعہ کو علٰحدہ تو کر دیا ہے لیکن پھر بھی مبہم ہی رہا، اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہی جس میں شیرخان مارا گیا تھا، مگر ایسا ہی نہیں کیونکہ یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد کا ہی اور شیرخان کے مارے جانے کا واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی حیات ۶۶۲ھ کا ہی یہ واقعہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے راحت القلوب میں بھی قلم بند فرمایا ہے، آپ کا مبارک بیان یہ ہے،

شیرخان والی اچ وملتان بود، درحق دعاگوے چنداں عقیدہ نہ داشت کہ بر زبان آید بارہا در حق او ایں بیت گفتہ، ؎

افسوس کہ از حال منت نیست خبر　　آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

بعد از چند روز جہاں سال کفار در رسیدند۔ تمام نہیب کردند و بردند۔ (راحت القلوب ص ۱۶-۱۷)

تینوں بیان سامنے ہیں، مگر یہ وضاحت صرف اسرار الاولیاء میں ہے کہ مغلوں کی یورش اچ کے گرد و نواح میں تھی، دوسرے یہ وضاحت بھی اسرار الاولیاء ہی میں ہے کہ حملہ آور مغل (تاتاری)، تھے، کفار دکافران میں یہ وضاحت کہاں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء کے بیان کو

ترجیح ہے، خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ کا بیان ایجاز کی بنا پر قدرے گنجلک ہو گیا ہے، اس لیے اس کا مقام تیسرا ہے، اولیت اسرار الاولیاء کے بیان کو حاصل ہے، اور یہ وصف تقابل میں بھی اسرار الاولیاء کے مستند ہونے کی بین دلیل ہے، ع صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کے لیے،

روایت نمبر ۱ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا ایک دفعہ سلطان ناصرالدین (محمود) علیہ الرحمۃ والغفران ملتان جا رہا تھا تو جب اجودھن (پاکپتن) پہنچا تو مجھ سے ملنے آیا، جو آداب ملاقات ہیں اس نے انجام دیئے، اور چلا گیا، (فوجی جو اس کے ساتھ تھے وہ بکثرت آتے رہے) جب میں ہجوم خلق سے عاجز ہو گیا تو میں نے تنہائی اختیار کرنی چاہی لیکن پھر یہ سوچا کہ ہمارے بزرگوں نے ایسا نہیں کیا ہے وہ سب ہی سے مصافحہ کیا ہے، میں ایک چھت پر جا کے بیٹھ گیا، ہاتھ نیچے لٹکا دیئے، آنے والے آتے اور مصافحہ کرتے، آنے والے بے حد وشمار آتے مصافحہ کرتے اور کپڑے کا ٹکڑا عقیدت مندی سے پھاڑ کے لے جاتے، اس دن ڈلس کرتے یکے بعد دیگرے پہننے پڑے سب ہی پارہ پارہ ہو گئے، مجھے ان کی اس عقیدت مندی پر حیرت ہوئی کہ یہ کیسے خوش عقیدہ ہیں، جمعہ کا دن تھا میں نماز کو گیا، واپس آیا تو پھر مخلوق کا ہجوم ہو گیا، میں مصافحہ کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا اتنے میں ایک فراش نے میرا پیر پکڑ کر گھسیٹا مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی فراس نے برجستہ کہا کہ شیخ فرید خدا کا شکر ادا کرو کہ اپنے ہی جیسے انسان پائے بوسی کے آرزومند ہیں مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اس نے خوب کہا، (واقعہ میں مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے) پھر فرمایا اے درویش جو اللہ کو پیارا ہے، وہ سب ہی کو پیارا ہے، (اسرار الاولیاء ص ۸۲ - ۸۳)

اس روایت میں کئی اہم نکات ہیں،

(۱) یہ اس عہد کا یعنی ۶۵۵ھ کا اہم تاریخی واقعہ ہے، جس کے پس منظر میں وہ سب کچھ ہے جس کا تعلق اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے ہے، اس باب میں اسرار الاولیاء پہلا مجموعہ

ملفوظات ہے، جو اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کی نشان دہی کرتا ہے، اور اس باب میں دیگر کتب ملفوظات پر اسے فوقیت ہے،

(۲) اس روایت سے حضرت بابا صاحبؒ کی مقبولیت کے عمومی رجحان کی اور ان سے عقیدت مندی کی پوری کیفیت سے آگاہی ہو جاتی ہے، اور معاشرے کا واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے،

(۳) فراش کی بصیرت اور جسارت اور برمحل توجہ دلانا ایسا واقعہ ہے جو آپ اپنی نظیر ہے جس سے قرون اولیٰ کے کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو صحت مند معاشرہ کی علامت ہے.

یہ روایت فوائد الفواد (ص ۱۲۵) میں بھی ہے، اور سیر الاولیاء (ص ۹۰، پ) میں بھی ہے، بلکہ فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ایک اور روایت بھی ہے، جس میں الغ خان (غیاث الدین بلبن) کے حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے، بہرحال یہ واضح ہے، کہ اسرار الاولیاء، فوائد الفواد کا ماخذ بھی ہے، اور سیر الاولیاء کا بھی، اسلوب کی سادگی و صفائی اور دلآویزی منہ سے پڑی بول رہی ہے کہ یہ کلام حضرت بابا صاحبؒ ہی کا ہے،

روایت نمبر ۱۲ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک شخص بیعت ہونے کی نیت سے دہلی سے اجودھن چلا تاکہ مجھ سے بیعت ہو، راستے میں ایک عورت سے ملاقات ہوئی، اس نے اس عورت سے دست درازی کرنی چاہی یا بات چیت کرنی چاہی اچانک ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ تو کسی سے بیعت ہونے کی نیت سے جا رہا ہے، اور یہ کچھ کرنا چاہتا ہے، القصہ جب وہ شخص میرے پاس آیا تو سب سے پہلے میں نے اس سے یہی کہا کہ دیکھا اس دن اللہ پاک نے تجھے اس بلا سے کیسے محفوظ رکھا، (اسرار الاولیاء ص ۸۶)

حضرت بابا صاحبؒ نے اس سے پہلے ایسے ہی ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے، وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کی نیت سے چلا تھا

راستے میں ایک مطربہ اس پر مائل ہوئی، اتفاق سے یہ دونوں ایک گاڑی میں ہمسفر ہوئے کوئی دوسرا نہ تھا، تو اسے اس کی طرف کچھ رغبت ہوئی، کچھ دست درازی کی یا بات چیت کی، اس حالت میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص آیا، اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ کس بزرگ کی خدمت میں جا رہا ہے، اور کس نیت سے جا رہا ہے اور یہ کیا ہے جو کر رہا ہے، غرض کہ جب وہ حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا تو سب سے پہلے آپ نے یہی فرمایا اللہ پاک نے اُس دن تیری بہت ہی حفاظت فرمائی۔ (اسرار الاولیاء ص ۸۲)

الغرض جو روایت حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے متعلق ہے، وہ فوائد الفواد (ص ۲۲۰ مطبوعہ مطبع نولکشور) میں بھی ہے، لیکن بعض تفصیلات جو اس شخص سے متعلق ہیں اور جو حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں بیعت و ارادت کی نیت سے چلا تھا، وہ بھی حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے سے متعلق ملتی ہیں، اس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ فوائد الفواد کسی ناقص نسخے سے منقول ہے، اور کسی کاتب و ناقل نے دونوں روایتوں کی معلومات کو خلط ملط کر کے ایک ہی سے وابستہ کر دیا ہے، اور یہ قرین قیاس ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء ہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے، جو مستند و معتبر ہے، اس کے علاوہ حضرت بابا صاحبؒ نے جو اس شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے وہ بسبیل تذکرہ زبان پر آگیا ہے، مقصود اظہار کرامت نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات سے آگاہی کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ساریہؓ کے واقعہ پر قیاس کرنا چاہئے جس کا تعلق بصیرت باطنی سے ہے جو بادنی توجہ حاصل ہو جاتی ہے، اس کے لیے خیر المجالس ص ۱۳۷ – ۱۳۸ کی وہ روایت ذہن نشین رکھنی چاہئے جو روغن فروش کی بیوی سے متعلق ہے،

روایت نمبر ۱۳ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور شیخ جلال الدین تبریزی قدس اللہ سرہ العزیز دونوں بدایوں گئے۔۔۔ ایک دن ہم دونوں

گھر کی دہلیز میں بیٹھے جب تھے کہ دہی بیچنے والا دہی کا مٹکا سر پر رکھے سامنے آ گیا، دہی بیچنے والا مواسی گنوار تھا، جو بزرگوں کے پاس ہی بیٹھا سے کم دکھیتر بکھنے ہی، وہاں ذاکر بہت رہتے تھے، وہ دہی بیچنے والا بھی ان ہی میں سے تھا، الغرض جب دہی بیچنے والے کی نظر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مبارک چہرے پر پڑی، دیکھتے ہی وہ متاثر ہوا، اور جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس کی طرف دیکھا تو کہنے لگا کہ دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے ایسے بزرگ بھی ہیں، فوراً ہی مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام علی[2] رکھا، جب مسلمان ہو گیا تو اپنے گھر گیا، اور فوراً ہی واپس آ گیا اور ایک لاکھ جیتل[3] لا کر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کئے، شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انہیں قبول فرمایا، اور فرمایا انہیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس طرح میں کہوں، اس طرح خرچ کرتے رہو، چنانچہ کسی کو دس تو دلاتے اور کسی کو کم و بیش مگر پانچ سے کم کسی کو نہ دلاتے تھے، تمام رقم خرچ ہو گئی صرف ایک درہم رہ گیا، علی کہتے ہیں مجھے تردد تھا کہ پانچ سے کم تو کسی کو دلاتے نہیں اور میرے پاس اب ایک ہی درہم ہے، اگر کسی کو پانچ دینے کو کہا تو میں کیا دوں گا، اتنے میں ایک مانگنے والا آیا، تو آپ نے فرمایا کہ ایک درہم اسے دے دو، علی کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر حیران رہ گیا،

...... (اسرار الاولیاء ص ۹۰)

یہ واقعہ بھی فوائد الفواد میں آتا ہے،[4] | البتہ اسلوب و جزئیات میں قدرے فرق ہے، اس کا ایک سبب تو وہی ہے جس کا مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مباحث کے زیر عنوان تفصیل سے کر چکا ہوں اس لئے

سلہ حصاری۔ اس پناہ گاہ کو کہتے ہیں، اور ایسی بستی کو بھی کہتے ہیں، جس کے گرد قلعہ گرد فصیل یا خندق ہوتی ہو،

سلہ یہ بزرگ علی مولیٰ کے نام سے مشہور رہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کی دستار بندی کی تقریب میں شریک تھے،

سلہ جیتل بہت کم قیمت کا سکہ ہوتا تھا، مگر یہاں جیتل سے مراد وہ رقم ہے، جس میں درہم اور چاندی کے سکے شامل تھے،

سلہ فوائد الفواد ص ۱۳۶ شہ نامہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۶۹ سے فوائد الفواد ص ۱۶۶-۱۶۷-۱۶۵، ۲۰۲-۲۱۱-۹۹
نیز خیر المجالس ص ۱۳۱-۱۳۹

وہ یہ کہ جب ایک ہی شخص کسی واقعہ کو یا کسی حکایت کو ایک سے زیادہ مجالس میں بیان کرتا ہے تو اسلوب وجزئیات میں فرق ہو جاتا ہے، اور جب دو مختلف شخص ایک ہی واقعہ کو بیان کریں تو اسلوب وجزئیات میں فرق ہونا فطری شے ہے،

اسرار الاولیاء کی روایت میں حضرت بابا صاحبؒ بھی شریک ہیں، مگر فوائد الفواد (ص ۱۳۷) کی روایت میں حضرت بابا صاحبؒ کا نام نہیں ہے، اسی طرح فوائد السالکین (ص ۱۳) کی حکایت طواف کعبہ میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ دونوں بزرگ ہیں، مگر فوائد الفواد (ص) کی اسی روایت میں صرف قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا نام ہے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کا نام نہیں ہے، اور ان بزرگ کا بھی نام نہیں ہے جن کی دونوں بزرگوں نے اتباع کی تھی، اور جن کا نام فوائد السالکین میں شیخ عثمان لکھا ہے (او رانیز شیخ عثمان گفتندے)

اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ چونکہ یادداشت قلم بند نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف قوت حافظہ سے کام لیتے تھے، اور یہ بہت لائق ستائش امر ہے لیکن یہ بھی ہے کہ قوت حافظہ خواہ کتنی قوی کیوں نہ ہو، تاہم تحریری یادداشت کی نسبت حافظہ میں سہو کا زیادہ امکان ہے، اور انھیں اس کا اعتراف بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے:-

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر سہ چہار بیت	حضرت محبوب الٰہیؒ نے تین چار
بخواند بندہ را ایں دو بیت یاد آمد	شعر پڑھے تھے مجھے یہ دو ہی یاد
(فوائد الفواد ص ۱۵۰)	آئے ہیں،

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی قوت حافظہ سے متعلق استعجاب کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا:-

---

۱؎ مشتے بہشتی نامی ترجمہ ملفوظات میں برہان الدین لکھا ہے، جو غلط ہے،

[illegible] ست خرافات ہے یہ بات کہ وہ سب ہی بکواس اور ہنگامہ عجیب

غریب ہے،

تعجب نہیں کہ آپ پر بے ہوشی ہو کر سہو لاحق ہوتا ہے، اور آپ نے تنبیہاً یہ ذکر چھیڑا ہو اور اتفاقاً

استفہام فرمایا ہو، قرینہ اسی پر دلالت کرتا ہے، بلاشبہ حضرت محبوب الٰہیؒ مکاشف عالم بھی تھے،

الغرض فوائد الفواد کی مذکورہ روایت میں حضرت باباصاحبؒ کا نام نامی نہ ہونا ہرگز اسکی

دلیل نہیں ہے کہ آپ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ہمراہ شریک سفر نہیں تھے، یا آپ کبھی بدایوں تشریف

لے ہی نہیں گئے تھے، اس لیے کہ مذکورہ وجوہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ کسی کتاب میں کسی واقعہ کا نہ ہونا

اس کی دلیل نہیں کہ واقعہ کا وجود ہی نہیں ہے، میر شکار کا واقعہ اور روغن فروش کی بیوی کا واقعہ

نہ فوائد الفواد میں ہے، اور نہ سیر الاولیاء میں، صرف خیر المجالس میں ہے، سلطان ناصر الدین محمود

کے سفر ملتان کا اور حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ تاریخ طبقات ناصری میں

نہیں ہے، جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے، اور سلطان ناصر الدین محمود ہی سے منسوب ہے، مگر اسرار الاولیاء

فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ہے، تو کیا صرف اس لیے اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبقات

ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے، اصول یہ ہے کہ جب راوی مستند ہوتے ہیں تو

خواہ کوئی واقعہ کسی کتاب میں ہو اور کسی میں نہ ہو، اسے مستند ہی مانا جاتا ہے، حضرت باباصاحبؒ کے

سوانح کے متعلق حضرت باباصاحبؒ سے زیادہ اور کون مستند ہو سکتا ہے، یہ کہنا یا سمجھنا کہ اگر ہوتا تو

فلاں کتاب میں ضرور ہوتا، یہ لزوم مالا یلزم ہے، ممکن تو ہے، مگر ہر کسی کتاب میں ہونا لازم نہیں،

یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض امور کا ذکر ان مستند کتابوں میں ہوتا ہے، جو دستبرد زمانہ سے ناپید

ہو چکی ہوتی ہیں، مگر ان ہی سے بعد کی کتابوں میں بھی منقول ہو چکا ہوتا ہے، تو اگر کتاب معتبر ہے،

تو اس کی روایت کو بھی معتبر مانا جاتا ہے، تاہم تو اتر یہ بات سے ثابت ہے کہ اسرار الاولیاء نا معتبر کتاب

کتب ملفوظات کا ماخذ اور بدرجۂ اولیٰ افضل و معتبر ہے، اور اس میں حضرت بابا صاحبؒ کے سفر بدایوں کا ذکر بھی معتبر ہے، قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے۔

شیخ نجیب الدین متوکلؒ را برادرے بود در بداؤں، ہر سال بدیدن او آں جا رفتے،

(سیر الاولیاء ص ۱۶۹)

شیخ نجیب الدین متوکلؒ حضرت بابا صاحبؒ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، جو ہر سال اپنے بھائی کی خدمت میں بدایوں تشریف لے جاتے تھے، تو کیا حضرت بابا صاحبؒ کا بدایوں تشریف لے جانا ناممکنات سے ہے، جو انکار کیا جائے، واقعاتِ متعلقہ سے اسرار الاولیاء کے بیان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے، اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر اسرار الاولیاء میں بیان کردہ مذکورہ سفر بدایوں کو تسلیم کرنا ہوتا ہے، اور انکار کی کوئی معقول وجہ متبادر نہیں ہوتی، اور یہ ماننا ہوگا کہ اگرچہ اسرار الاولیاء عقیدت مندوں کی بے اعتنائی کی بنا پر صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر منظر عام پر نہیں آسکی ہے، اور اس میں کتابت و طباعت کی بکثرت غلطیاں ہیں تاہم وہ بذاتِ خود معتبر و مستند ہے، اور اس کا استناد حضرت بابا صاحبؒ سے صحیح اور درست ہے۔ (باقی)

امام الحرمین عبدالملک جوینی

از جناب مولوی شاہ نصر احمد صاحب پھلواروی

(۲)

امام الحرمین کے عقائد امام الحرمین کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ وہ عقیدۃً اشعری اور مسلکاً شافعی ہیں لیکن حافظ ذہبی کے خیال میں ان کے بعض اقوال اہل حق کے نقطۂ نظر سے مختلف ہیں اس لئے ان اقوال کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے،

امام نے اپنے وسعت مطالعہ اور علم کلام میں انہماک و اشتغال اور ذوق تحقیق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ

> میں نے کروروں صفحات کا مطالعہ کیا، پھر مسلمانوں اور ان کے ظاہری علوم کو چھوڑ کر تلاش و تحقیق کے بحر مواج میں غوطہ زن ہو اور میری طلب و جستجو نے مجھکو ان مسائل میں بھی غور و فکر سے باز نہیں رکھا جن کی کرید سے شریعت نے منع کیا ہے، میں پہلے تقلید و اتباع کا طوق اتار کر پوری آزادی سے غور و فکر میں مصروف رہا، لیکن اب میں اس بحر بیکراں سے نکل کر حق کے ساحل پر آگیا ہوں تم لوگ بھی اسلاف کے دین پر قائم رہو، اگر میرا انجام اہل حق کے طریق پر اور کلمۂ اخلاص لا الہ الا اللہ پر نہ ہوا تو سمجھو کہ میرے لیے ہلاکت ہے۔[1]

---

[1] طبقات الشافعیہ ۳/۲۶۰

ان کے اس بیان میں ان کے فکری اور داردا نقلابات کے ساتھ ہی فکری داجتہادی خطا ولغزش کا اعتراف اور قبول حق کا اعلان بھی مذکور ہے، لیکن حافظ ذہبی اور بعض حنابلہ نے اسکی وجہ ان پر یہ اعتراض کیا ہے، کہ وہ خالص فلسفی ومنطقی تھے، عقل کو نقل پر ترجیح دیتے تھے اور کلام کے ساتھ شغف نے ان کو سلف کی روش سے دور کر دیا تھا، تاہم اخیر عمر میں وہ اس سے باز آگئے تھے۔

در اصل وہ ابتدا میں اپنے عہد کے طریق تعلیم کے اثر سے تقلیداً شافعی اور اشعری تھے لیکن مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ تقلیدی جمود ٹوٹتا گیا، اور انھوں نے بلا استثنار تمام مذاہب کا مطالعہ کیا اور اہل مذاہب سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ انکو قریب سے سمجھنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اپنی تحقیق کی روشنی میں امام اشعری کے خیالات سے کلی اتفاق نہ کر سکے، اور اشعری مذہب کو جس حد تک قبول کیا وہ اپنے نظریات سے اتفاق کی بنا پر کیا اس لئے ایک عرصہ تک جذبۂ تحقیق کی یہ وارفتگی اور آزادی فکر ان کی عظیم شخصیت کے لیے کوئی بدنما داغ نہیں، بلکہ ایسا طرۂ امتیاز ہے، جو امام جیسے نابغۂ روزگار کے لیے مخصوص ہوتا ہے تحقیق وتلاش کی یہ کیفیت بغداد و حجاز کے زمانۂ قیام میں تھی، حجاز میں اشعری مذہب کے بارے میں ابھی امام کو پوری طرح شرح صدر نہیں ہوا تھا کہ ایک شب خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، ارشاد ہوا۔

علیک باعتقاد ابن الصابونی ؎ ابن الصابونی کے مسلک کو اختیار کرو،

شیخ الاسلام ابو عثمان صابونی (م ۴۴۹ھ) عالم متبحر، زاہد مرتاض تھے، اور سنت وسلف کی سختی سے پابند تھے، انھوں نے بیس سال تک جامع نیشاپور میں وعظ کہا ان کے وعظ میں احادیث

؎ ابن عساکر تاریخ الکبیر ۴/ ۳۲

کی صف کے لوگ مثلاً ابو الطیب سہل الصعلوکی، ابو اسحاق اسفرائینی، ابو بکر ابن فورک وغیرہ آتے تھے، خراسان میں انکو شیخ الاسلام کہا جاتا تھا، فقہ میں امام شافعیؒ اور کلام میں امام اشعری کے مسلک پر تھے۔
اس خواب کے بعد انھوں نے اسی مسلک کو اختیار کیا، اور پھر تو اعتدال سے بھی بڑھ گئے، چنانچہ اپنی کلامی کتابوں میں اشاعرہ کی پوری تائید کی ہے، اور فقہ میں ایک کتاب "مغیث الخلق فی اختیار الاحق" تصنیف کی جس میں شافعی مذہب کو دیگر مذاہب پر ترجیح دی،

حافظ ذہبی نے ان کے علم وفضل پر اس روایت سے نقد کیا ہے کہ امام سے کسی نے الرحمٰن علی العرش استویٰ کے معنی دریافت کیا اور وہ جواب نہ دے سکے، اس کی تفصیل یہ ہے، کہ کلام اللہ کی وہ آیتیں جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے صفات جسمانی کے الفاظ یعنی چہرہ، ہاتھ اور پیر وغیرہ کا ذکر ہے، ان کے بارے میں اشاعرہ کے خیالات مختلف ہیں، متقدمین اور خود امام اشعری کا مسلک یہ ہے کہ تنزیہ و تقدیس کے مفہوم کے ساتھ ان الفاظ کو ظاہری معنی میں رکھا جائے اس کے معنی ظاہری ہیں لیکن کیفیت لا معلوم ہے اس لئے اس میں غور وفکر نہیں کرنا چاہیئے اور متاخرین نے تاویل کی ہے، چونکہ ان الفاظ وصفات سے جسمانیت لازم آتی ہے، جو مخلوقات کا خاصہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری و برتر ہے،

ان ہی آیتوں میں الرحمٰن علی العرش استویٰ بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ عرش پر متمکن ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جگہ متعین ہے، اور یہ مخلوق وحادث کی صفت ہے، اسی بنا پر امام غزالی اور معتزلہ نے استویٰ کا ترجمہ استیلاء (قہر و غلبہ) کیا ہے، ایک موقع پر امام الحرمین سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا، امام نے فرمایا "کان اللہ ولا عرش" ایک زمانہ گذرا ہے جب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور عرش نہ تھا یعنی اللہ تعالےٰ کی ذات قدیم اور ازلی وابدی ہے، اور اس کے ماسوا تمام چیزیں حادث ہیں، اس لیے

اس ذات قدیم کے ساتھ حادث کی نسبت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے، اس طرح امام نے اشارۃً استیلاء کے معنی بیان کئے۔

ابوجعفر ہمدانی نے اس جواب پر یہ اعتراض کیا کہ دعا کے وقت عارف کی زبان کی حرکت سے قبل اس کے دل کی توجہ اور ارادہ آسمان کی طرف کیوں ہوتا ہے، اس قلبی توجہ کا کیا جواب ہے؟ راوی کا بیان ہے کہ جب امام سے یہ سوالات کئے گئے، تو وہ لاجواب ہوگئے[1]

علامہ سبکی کہتے ہیں کہ یہ روایت درایۃً و روایۃً محلِ نظر ہے، کیونکہ اس کی روایت ایسے لوگوں نے کی ہے جو علم کلام سے ناآشنائے محض ہیں، اور اس علم سے نابلد ہونے کی بنا پر ایسے کلامی مسائل ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں، ان سے روایت میں غلطی ناگزیر ہے، اور پھر علم کلام اور اشاعرہ سے مخالفت کی بنا پر ان سے صداقت و دیانت کی امید نہیں کی جا سکتی اور ابوجعفر ہمدانی کو بھی اِن علوم سے کوئی نسبت نہیں اور نہ وہ محققین علماء کی صف میں ہیں، انکا اعتراض بھی بے وزن اور مہمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت جہت فوق کا خیال ایک عارف کے لیے ہرگز جائز نہیں، یہ تو جاہلوں کی صفت ہے، کہ ذکر خدا کے وقت جہات کا تصور کرتے رہیں اگر یہ جائز ہوتا تو نماز کی حالت میں آسمان کی طرف نظر کرنا اس کی ادائیگی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا، حالانکہ یہ مصلی کے لیے شرعاً ناجائز ہے،

امام الحرمین کے اس قول کی بنا پر کہ :-

لاتشتغلوا بالکلام فلو عرفت	تم لوگ کلام سے اشتغال نہ رکھو اگر میں
ان الکلام یبلغ بی ما بلغ ما	جانتا کہ یہ مجھکو وہاں پہنچا دیگا جہاں پہنچایا ہے
اشتغلت .	تو میں نے اس سے اشتغال نہ رکھا ہوتا۔

---

[1] طبقات ۳/۲۶۲

حنابلہ نے کہا کہ انھوں نے علم کلام کی عقلی گمراہیوں اور خرابیوں کی وجہ سے دوسروں کو اس سے منع کیا، اور ایک عمر گذر جانے کے بعد خود بھی باز رہے، واقعہ یہ ہے کہ امام کی پوری زندگی علم کلام سے وابستہ رہی اس علم کو ان کی ذات سے بڑا فروغ ہوا، ان کی کلامی تصنیفات بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اخیر عمر میں وہ تصوف کی طرف مائل ہوگئے تھے، اور عقلی دلائل و براہین کے بجائے اب وہ کیفیات ومشاہدات کی منزل میں تھے، ان کا باطنی منبعِ علم جاری ہوگیا تھا" اس لیے انھوں نے لوگوں کو بھی اس کی تلقین کی، علامہ سبکی اِن اقوال کو موضوع قرار دیتے ہیں' ان کا خیال یہ ہے کہ امام کو متہم کرنے کے لیے حنابلہ نے یہ اقوال انکی طرف منسوب کیے ہیں' ان اقوال کی روایت کرنے والے ایک غیر معروف شخص ابوالحسن القیروانی ہیں، ان کے علاوہ امام کے کسی شاگرد نے اس کی روایت نہیں کی ہے[1]

مرض الموت میں امام نے یہ فرماکر

اشہدوا علی انی رجعت عن	تم لوگ گواہ رہو کہ میں نے سلف کے
کل مقالۃ یخالف فیہا السلف	خلاف اپنے تمام اقوال سے رجوع کیا
وانی اموت علی مایموت علیہ	اور نیشاپور کی بوڑھیوں کے دین پر
عجائز نیسابور[2]	جان، جان آفریں کے سپرد کر رہا ہوں'

متاخرین اشاعرہ کے مسلک سے سلف کی طرف اپنے رجوع کا اعلان کیا، امام نے اپنی کتاب العقیدۃ النظامیۃ میں بھی سلف کی ہی تائید کی ہے[3]

علامہ ذہبی نے امام الحرمین کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ فقہ واصول میں تبحر کے باوجود علم حدیث سے ناواقف تھے، ذہبی کے اس نقد کی بنیاد اس پر ہے کہ امام نے اصول فقہ میں اپنی مشہور کتاب

---

[1] طبقات ۳/۲۶۰ [2] طبقات ۳/۲۶۳ [3] شذرات الذہب (بحوالہ رسالہ نظامیہ) ۳/۳۶۰

"البرہان" میں نے حضرت معاذؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت معاذؓ کو والیِ یمن بنا کر روانہ کرتے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور امتحان دریافت فرمایا کہ جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے آئے گا تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ انھوں نے عرض کیا کتاب اللہ کے مطابق، پھر فرمایا کتاب اللہ میں صراحت نہ ہو تو کیا کروگے؟ جواب دیا سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرونگا، پھر پوچھا اگر سنت رسول میں بھی جواب نہ ہو تو؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ اسوقت اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا، اس جواب پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا، اور حضرت معاذؓ کے سینہ پر دست مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہؐ کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو رسول کو پسند ہے، اس حدیث کے راوی حارث بن عمرو ہیں، انھوں نے حمص کے ان لوگوں سے روایت کی ہے جو حضرت معاذؓ کے صحبت یافتہ تھے، لیکن خود حارث بن عمرو محدثین کے ہاں غیر معروف ہیں، اسی طرح جن لوگوں سے انھوں نے روایت کی وہ بھی مجہول ہیں، اس حدیث کے بارے میں امام نے فرمایا ھو مدون فی الصحاح متفق علی صحتہ' امام کا پہلا جملہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اس کی ابوداؤد اور ترمذی نے تخریج کی ہے، اور یہ دونوں کتابیں صحاح میں داخل ہیں لیکن دوسرا جملہ محلِ نظر ہے، چونکہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث متصل نہیں ہے لیکن جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ اس کی تائید میں دوسری موقوف حدیثیں بھی ہیں جو حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے اجلۂ صحابہ سے روایت کی گئی ہیں، بیہقی نے سنن میں حضرت معاذؓ کی حدیث کے بعد ان موقوف احادیث کی بھی تخریج کی ہے، دارمی نے بھی حضرت معاذؓ کی حدیث اسی سند کے ساتھ لکھی ہے، اور تمام فقہاء مجتہدین اس حدیث پر اعتماد کرتے ہیں، اور اس کو قیاس کے ثبوت میں بیان کرتے ہیں امام نے بھی اس پر اعتماد کیا اور صحیح کہا،

امام کے علم حدیث کی تحصیل اور احادیث کی سماعت و روایت کو تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، انھوں نے متعدد شیوخ حدیث سے حدیث کا درس لیا اُن کے علاوہ اپنے والد اور ابوبکر خبازی اور حافظ ابونعیم اصفہانی سے روایت کی ہے اور بغداد کے محدثین میں ابومحمد جوہری کے درس میں شریک ہوئے اس لئے امام کے بارے میں کہنا کہ وہ اس علم سے ناواقف تھے، انکار حقیقت ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ اس علم میں مشاہیر شیوخ کی طرح انکو شہرت نہ ہوئی، امام کے شاگرد عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ امام فن جرح و تعدیل سے اچھی طرح واقف تھے امام کے بارے میں ان کے تلمیذ عبدالغافر کا قول زیادہ قابل اعتماد ہوگا نہ کہ دو صدی بعد کے حافظ ذہبی کا بیان، حافظ ذہبی حنبلی تھے، اور حنابلہ و شوافع کے اختلافات تعصب و تشدد کی حد تک، تاریخ کے نمایاں ابواب ہیں، تاج الدین سبکی شافعی و اشعری ہیں لیکن ذہبی کے خاص شاگرد ہیں، وہ اپنے استاذ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ذہبی سخت متعصب ہیں، وہ ہمارے استاذ ہیں، ہم پر ان کے حقوق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا حق ان کے حق سے بڑھ کر ہے، اس لئے میں پوری صفائی کے ساتھ کہونگا کہ کسی حنفی اور شافعی کے ذکر میں ذہبی کے خیالات ہرگز قابل قبول نہیں، بلکہ ان کی کتابوں سے احناف و شوافع کے حالات نہیں لینے چاہئیں۔[1]

سلوک و تصوف: اگر وہ ظاہری علوم میں بلند مقام رکھتے تھے، تو احسان و عرفان کی اعلیٰ بارگاہ پر گامزن تھے، ان کے خاندان کی دینداری اور تقوی و طہارت کا یہ عالم تھا کہ امام کی والدہ جو ام ولد تھیں، ان کے لیے شیخ جوینی کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ پاک و طیب رزق کے علاوہ کوئی چیز انکا جزو بدن بنے، اپنے مختصر کسب حلال سے خود اور امام کی والدہ کے لیے رزق مہیا کرتے تھے، امام کی ولادت کے بعد فرزند کے ساتھ اور زیادہ توجہ رکھی اس سلسلے میں

---

[1] طبقات، ۴/۱۹۱

زمانۂ شیر خوارگی کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے،

شیخ جوینی نے امام کی ولادت سے قبل خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دیکھا اور ان کی طرف قدمبوسی کے لیے جھکے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو منع کیا تو شیخ ان کی پشت کی جانب پھر گئے اور ایڑی کا بوسہ دیا۔[1] شیخ جوینی نے اس کی تعبیر امام کی ولادت سے کی کہ قدمبوسی کی برکت ایسے لایق فرزند کی شکل میں حاصل ہوئی، اُس وقت کے مشاہیر صوفیہ سے امام کا بہت قریبی لگاؤ تھا، امام صاحب کے والد نے شیخ ابو طالب مکیؒ، اور ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ اور سلطان ابوسعید ابوالخیر سے فیض پایا[2] امام کو بھی سلطان ابوسعید ابوالخیر کی مجالس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تحصیل علم کے زمانہ میں ایک روز والد بزرگوار نے سلطان کی مجلس میں جانے کے لیے حکم دیا، اور یہ بھی کہا کہ ان سے جو باتیں ہوں وہ سے مجھ کو خبر کرنا، سلطان ابوسعید نے ان سے دریافت فرمایا کیا پڑھتے ہو؟ امام نے جواب دیا "خلافیات" یہ اصطلاح میں فقہ کا وہ حصہ ہے جو ائمہ مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل پر مشتمل ہے، یہی وہ مسائل ہیں جو مناظرے کا موضوع قرار دیئے جاتے تھے، اور دو جماعتوں میں نزاع و تصادم کا باعث بنتے تھے، ابوسعید ابوالخیرؒ نے فرمایا "خلاف بنایذ، خلاف بنایذ خلاف بنایذ اتفاق باید" امام نے والد سے بیان کیا انھوں نے کہا خلافیات چھوڑ دو اور فقہ پڑھو۔[3]

شریعت و طریقت کے بارے میں شیخ ابوالقاسم قشیریؒ کے استفسار پر سلطان ابوسعید نے اپنے اس شعر میں اس کے معنی بیان کیے،

از دوست پیام آمد کاراستہ کن اینک شریعت

---

[1] طبقات ۳/۲۵۹ [2] الانتباہ فی ذکر سلاسل اولیاء اللہ، [3] مقدمہ طبقات الصوفیہ

[4] مقامات شیخ ابوسعید،

ہر دل پیش آر و فضول از رہ بردار انیک طریقت

اس کے بارے میں امام الحرمین نے فرمایا کہ انہی دو لفظوں کے لیے ہم لوگ ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں، اور تصنیف و تالیف کی محنت کرتے ہیں، لیکن سلطان ابوسعید نے اسکو ایک شعر میں ادا کر دیا[۱] ان صلحاء امت کی مجالس و صحبت نے امام کو طریقت کے سلسلۃ الذہب میں شامل کر لیا، اور امام کے ذریعہ چار سلاسل رائج ہوئے شاذلیہ، مدنیہ غزبیہ، عیدروسیہ، قشیریہ۔ عیدروسیہ کی اجازت امام کو اپنے والد شیخ جوینی سے ہے، اور قشیریہ کی اجازت والد کے واسطہ سے بھی اور براہ راست حضرت شیخ ابوالقاسم قشیری سے بھی ہے، امام غزالی دونوں سلسلوں کے مجاز امام الحرمین کے ہیں، اور اپنے شیخ ابوعلی فارمدی کے بھی تصوف میں امام کی کوئی تصنیف نہیں ہے، لیکن وہ دعا کہتے تھے، جو تصوف کے اسرار و رموز اور صوفیہ کے واردات وکیفیات کے بیان کی وجہ سے بہت موثر ہوتے تھے، اگر وہ ترتیب دیئے جاتے تو تصوف کی امہات کتب میں اضافہ ہوتا۔

سلسلۂ مدنیہ کی کئی شاخیں ہیں، ان میں سے بلاد مغرب میں مشہور ترین مدنیہ غزبیہ ہے، اور حضرموت میں عیدروسیہ، ہندوستان میں عیدروسیہ اور اس کی تمام شقیقات آئی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ " ایں فقیر را ارتباط باہر یکے واقع شدہ"[۲]

ذوق شعری | امام عرب کے مشہور ترین قبیلہ طے کی ایک شاخ سے تھے، اس لئے عربی ان کی خاندانی زبان تھی، اس گھرانے کی زبان بہت پاکیزہ اور فصیح ترین سمجھی جاتی تھی، اس خصوصیت کے ساتھ ساتھ امام نے اپنے ذوق سلیم، ذہانت اور محنت سے علوم ادب میں وہ کمال پیدا کیا کہ اپنے وقت کے چوٹی کے ادیب اور ماہر زبان تسلیم کئے گئے،[۳]

---

[۱] مقامات شیخ ابوسعید [۲] الانتباہ فی ذکر سلاسل اولیاء اللہ [۳] طبقات الشافعیہ ج ۲

خطابت: انکی نثر و ملاٰدیز اطناب اور سلاست و روانی میں بے مثال ہوتی تھی، جب تکلم ریز ہوتے تو فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرتے، ابوالحسن باخرزی جیسا شاعر جس کے کلام میں جدتِ فکر پائی جاتی ہے[1] ان کا کفش بردار تھا، اصمعی ادبائے عرب میں محتاج تعارف نہیں، وہ دوسری صدی کا نقاد اور لغت ونحو کا استاد تھا، لسانیات میں اس کے خدمات گوناگوں ہیں، امام شافعیؒ اس کے اسلوب بیان کے مداح تھے،[2] خلیفہ مامون زبان کے مشکل مسائل مراسلہ کے ذریعہ اس سے حل کراتا تھا،[3] امام الحرمین کے معاصرین کا خیال ہے کہ وہ اپنے وقت کے اصمعی تھے، باخرزی ان کی خطابت کے بارے میں گویا ہے،

"خطابت کے وقت اپنی زور بیانی سے فصحاے وقت کو بند کر دیتے اور اپنی نادر معلومات اور قیمتی حقایق سے بہت سے قادر الکلام لوگوں کو خاموشی پر مجبور کر دیتے،[4]

عربیت میں اس علوے شان کا تقاضا تھا کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہوتے لیکن انھوں نے علم عروض کی قید وبند سے خود کو آزاد رکھا اور اس طرف بہت کم توجہ کی، بلکہ اس بارے میں اس قدر محتاط تھے کہ باخرزی نے ان کے کلام کی نقل کے لئے ایک سادہ بیاض رکھی لیکن بار بار کی حاضری کے باوجود اسے اشعار کے نقل وگرفت کا موقع نہ مل سکا اور بیاض بیاض ہی رہی،

تاہم ان کا خزانۂ ادب اشعار سے یکسر خالی نہیں ہے، ان کے اشعار ملتے ہیں اور اہل نظر کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کا کلام فنی پختگی، معنوی گہرائی اور زبان وبیان کے اعتبار سے بلند ہوتا تھا، چند اشعار جو نظام الملک کی تعریف میں امام کی زبان گوہر بیان سے نکل پڑے ہیں پیش کیے جاتے ہیں،

فمازال ركب المعتفين ينحنه	لذروتك العليا ولازلت مقصدا
برابر حاجت مندوں کی سواریاں آپکے دولتکدہ پر آتی رہیں	اور آپ ہمیشہ ان کی منزل مقصود بنے رہیں،

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳/۲۶ [2] ابن خلکان ۱/۵۱۰ [3] ایضاً [4] دمیۃ القصر ۱۹۶

تدین لک الشم الانوف تخضعا ولو ان زهر الافق ابدت تمردا

بڑے بڑے مغرور آپ کے نیازمند ہیں اور اگر زمین کے کسی کونے کا کوئی پھول سرکشی دکھائے،

لجاءتک اقطار السماء تجرها الیک لتعفو او لتوردها الردا

تو آسمان کے کونے اسے کھینچ کر آپ کے حضور پیش کر دیں کہ خواہ آپ اُسے معاف کریں یا موت کے گھاٹ اتار دیں

وما انا الا دوحة قد غرستها وسقیتها حتی تمادی بها المدی

اور میں تو آپ ہی کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ایک پودا ہوں جسکو آپ نے سیراب کیا اور وہ برگ و بار لے آیا

فلما اقشعر العود منها وصوحت اتتک باغصان لها تطلب الندی

اب جب کہ اس کا تنہ خشک ہو گیا اور ڈالیاں زرد پڑ گئی ہیں تو وہ اپنی شاخوں کو اپکی شبنم سے سیرابی کیلئے لیکر آیا ہے[۱]

تاج الدین سبکی نے عبد الملک جوینی کے دست خاص کی تحریر سے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ اخیر کے دو شعر مضمون کے اعتبار سے ہرگز ان کو زیب نہیں دیتے لیکن نظام کے عدل و انصاف نظم و نسق اور علمی اشاعت کے علاوہ ان کے ساتھ اخلاص و محبت، عقیدت و نیاز کے جو اوصاف بیان کیے گئے ان کی روشنی میں یہ تحدیث نعمت اور تحریف علی الخیر ہے، نہ کہ مدح سرائی جو امام کی شان سے فروتر ہے ــــ امام الحرمین کے یہ دو شعر طالبین علم کے لیے مشعل راہ ہیں،

اخی لن تنال العلم الا بستة سانبئک عن تفصیلها ببیان

میرے بھائی! علم چھ چیزوں کے بغیر تم کبھی حاصل نہیں کر سکتے، میں ان سب کو تفصیل سے بیان کرتا ہوں

ذکاء وحرص وافتقار وغربة وتلقین استاذ وطول زمان[۲]

ذہانت، شوق، عسرت اور غریب الوطنی استاذ کا درس و تعلیم اور طویل زمانہ

بعض وقت انھوں نے ارتجالاً بھی شعر کہے ہیں، اپنے ایک ہونہار شاگرد ابو نصر عبد الرحیم کو

---

[۱] طبقات جدید اڈیشن، ۵/۲۰۹ [۲] طبقات ۳/۲۶۲، ۲۶۵

دیگر فرماتے ہیں،

تمیس کغصن البان ... وتبدو وکشمس وترنو کریم

تم شاخ تازہ کی طرح ناز سے چلتے ہو اور طلوع آفتاب کے مانند ظاہر ہوتے ہو اور ہرن کی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہو[1]

معانی النجابۃ مجموعۃ لعبد الرحیم بن عبد الکریم[2]

نجابت و شرافت کے تمام اوصاف کے جامع عبد الرحیم بن عبد الکریم ہیں،

ابن العماد نے غلطی سے امام رازی کے مندرجۂ ذیل دو شعر بھی ان کی طرف منسوب کردیے ہیں[2]

نہایۃ اقدام العقول عقال وغایۃ آراء الرجال ضلال

عقل کی انتہا پیر میں باندھی جانے والی رسی ہے، فکر انسانی کی انتہا حیرت زدگی اور گمراہی ہے،

وارواحنا فی وحشۃ من جسومنا وغایۃ دنیانا اذی ووبال

ہماری روحیں جسموں میں کشمکش کی حالت میں ہیں ہماری دنیا کا انجام اذیت اور مصیبت ہے،

ابن قیم نے "اجتماع الجیوش الاسلامیۃ" میں امام رازی کی کتاب "اقسام اللذات" کے ذکر میں اور لذت عقلی کی تشریح میں امام رازی کے یہ دونوں شعر نقل کیے ہیں،[3]

علمی تبحر امام الحرمین کے عہد میں اور اس کے بعد بھی کلام، اصول اور فقہ میں ان پر فضیلت رکھنے والا کوئی شخص نہیں گذرا ہے، ان کی تحقیقات سب سے بڑھ کر ہیں، قاضی ابو سعید طبری نے کہا کہ ان کو امام الحرمین کا لقب دیا گیا لیکن حق تو یہ ہے کہ وہ علمی فضیلت اور تقدم کی وجہ سے خراسان و عراق کے بھی امام ہیں، وہ قوت حافظہ و استحضار میں بے نظیر تھے، ضخیم ترین کتابیں حفظ کر لیتے تھے، اور مطالعہ و کتب بینی ان کی فطرت و عادت ثانیہ بن گئی تھی زیادہ تر علمی مطالب کے غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ میرے خواب و خور و عادت اور وقت کے

---

[1] طبقات ۳/۲۰۴، ۲۰۵ [2] شذرات الذہب ۳/۳۶۱ [3] اجتماع الجیوش الاسلامیۃ ص ۱۲۰

مطابق نہیں ہوتے، دن اور رات میں جس وقت نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے سو رہتا ہوں اور بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاتا ہوں تو کھا لیتا ہوں، اگلے متکلمین کی کتابوں سے ان کو اس درجہ شغف تھا کہ قاضی ابوبکر باقلانی کے ۱۲ ہزار صفحات اتنی بار اور اس انہماک سے مطالعہ کیے کہ پورے حفظ ہو گئے[1] لیکن اس تبحر اور وسعت کے باوصف کبھی اپنے علم پر قانع نہیں ہوئے، بلکہ رہوارِ عمر کے ساتھ شوقِ علم تیز تر ہوتا رہا، ۴۶۹ھ میں ابوالحسن علی المجاشعی آئے ان کی تصنیف اکسیر الذہب فی صناعۃ الادب کا ان سے درس لیا، مجاشعی نے کہا کہ میں نے علم کا ایسا عاشق نہیں پایا، اس محنت و ریاضت اور بحرِ علم کی غواصی و شناوری کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، حافظ ذہبی نے ان کے حافظہ و استحضار کے بارے میں کہا ہے،

كان من اذكياء العالم	ان کا دنیا کے ذہینوں میں شمار ہے
واحد اوعية العلم[2]	اور وہ علم کا ایک ظرف تھے۔

ان کے شاگرد ابوالحسن عبدالغافر کا بیان ہے کہ ہم لوگ ان کی زبان سے عجیب و غریب علمی نکات اور ایسی ایسی عبارتیں سنتے تھے، جو ادبِ عالی کا نمونہ ہوتی تھیں اور بارہا مناظرے کے وقت ہم نے فریقِ مخالف کو لاجواب ہوتے دیکھا، ان کی مجالسِ وعظ و درس میں علماء کو مباحثے اور غور و خوض میں مشغول پایا، اور ہم لوگوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ بہت ہی مختصر ہے، ابوالحسن باخرزی نے کہا، وہ فقہ میں اپنے وقت کے شافعی اور ادب میں اصمعی اور وعظ میں حسن بصری تھے، وہ اماموں کے پیشوا تھے، اپنی علمی شان کی وجہ سے ہر ایک پر فوقیت رکھتے تھے اور رزمگاہِ علم کے شیروں کو زیر کر لیتے تھے، جب فقہ کی مسند پر ہوتے تو امام مزنی سے بھی بڑھ جاتے، کلامی مباحث فروع کرتے تو امام اشعری سے کم نہیں ہوتے اور جب خطبہ دیتے تو اس شان

---

[1] طبقات ۳/۲۵۹ [2] العبر فی خبر من غبر ۳/۲۹۱

خطابت سے کہ فصحائے وقت کی زبان گنگ ہو جاتی، کسی شاعر نے ان کے بارے میں کہا ہے،

لم ترعینی تحت ادیم الفلک   مثل امام الحرمین الثبت عبد الملک[1]

میری نگاہ نے زیر فلک امام الحرمین عبدالملک جیسا معتمد فاضل نہیں دیکھا،

امام، ارباب فضل وکمال کی نگاہوں میں

عام لوگ اگر ان کو اپنا معتقد اور پیشوا سمجھتے تھے، اور تلامذہ پروانہ دار ان پر نثار ہوتے تھے، تو ہم رتبہ اور بزرگان ان کی مدح و توصیف کرتے تھے، بادشاہ و وزیر اور ارکانِ دولت ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے تھے، شیخ ابو اسحٰق شیرازی ان کے بارے میں لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان امام سے فائدہ حاصل کرو، یہ اس زمانہ کی بہار ہیں، اور ان کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں،

یا مفید اھل المشرق والمغرب لقد استفاد منک الاولون والآخرون۔

اور ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں انت الیوم امام الائمۃ (آپ تو آج امام الائمہ ہیں) شیخ الاسلام ابو عثمان الصابونی جو اپنی بزرگی اور عمر کے لحاظ سے ان کے اساتذہ کی صف کے ہیں، وہ ان کی علمی تقریروں اور مواعظ کو سن کر فرماتے ہیں،

صرف اللہ المکارہ عن ھذا الامام فھو الیوم قرۃ عین الاسلام۔   اللہ اس امام سے مکارہ کو پھیر دے، یہ چشم اسلام کی ٹھنڈک ہیں،

اور حافظ ابو محمد جرجانی نے کہا کہ وہ امام وقت ہیں، نادرۂ روزگار ہیں، قوت حافظہ اور قدرت کلام میں عدیم المثال ہیں اور حضرت شیخ ابو القاسم قشیری بھی ان کے مداح ہیں،[2]

---

[1] دمیۃ القصر..... [2] طبقات ۳/۲۵۳

غانم موشیلی شاعر نے کہا۔

دعوا لبس المعالی فھو ثوب علی مقدار قد ابی المعالی[۱]

شرف و مجد کا لباس چھوڑ دو، یہ تو ابو المعالی ہی کے قد کو زیب دیتا ہے،

اخلاق وعادات | ان کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر انانیت، خود پسندی اور حب جاہ جیسے اوصاف تھے، مناظروں کی کثرت خود اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے اخلاق وعادات کے ذیل میں جو صفات بیان کئے ہیں ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی، ممکن ہے اوائل عمر میں یہ مزاج رہا ہو لیکن بعد کو انکسار اور تواضع ان کے اندر بہت نمایاں ہوگئی تھی، وہ اعلیٰ سیرت وکردار کا نمونہ تھے، ہر ایک سے انشراح اور خندہ جبینی سے ملاقات کرتے بزرگ وخورد جو شخص ان سے ہم کلام ہوتا وہ پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتے کسی کی گفتگو سے علمی فائدہ ہوتا تو اس کو قبول کرتے اور یہ کہتے کہ یہ بات مجھ کو فلاں سے معلوم ہوئی اعلانِ حق اور غلط کام کی اصلاح میں بادشاہ تک کی پروا نہیں کرتے، چنانچہ سلطان کی طرف سے ایک غلط اعلان کی تردید میں انھوں نے کسی مصلحت کو روا نہ دی، اور پھر ملک شاہ کے عین غیظ وجلال کے وقت کہا کہ مذہبی امور میں تم کو مجھ سے مشورہ کرنا چاہئے، وہ اہل علم کا احترام کرتے اور ان کے کمالات کو فراخ دلی سے بیان کرتے تھے، جب شیخ شیرازی نیشاپور آئے تو امام نے احتراماً ان کی سواری کی رکاب پکڑ لی، امام بیہقی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا ان کے ہر پیرو پر احسان ہے لیکن بیہقی کا امام شافعی پر احسان ہے کیونکہ بیہقی نے ان کے مذہب کی اشاعت کیلئے تصانیف کا انبار لگا دیا ہے، اسی طرح بیہق میں شیخ جوینی کے ایک تلمیذ مفتی احمد بن علی تھے، جو

---

[۱] طبقات الشافعیہ ۳/۲۵۳

ابن فطیمہ کے لقب سے مشہور اور بیہق کے امام تھے، وہاں سے امام الحرمین کے پاس کوئی استفتاء آتا تو اس کو واپس کر دیتے کہ ابن فطیمہ کی موجودگی میں کسی دوسرے سے استفتاء کی ضرورت نہیں،[1] لیکن علم و تحقیق کے باب میں کسی پر صحیح نقد سے باز نہیں رہتے، وہ قلب خاشع رکھتے تھے، تفکر و احتساب نفس کرتے اور رونے لگتے، خصوصاً وعظ کہتے وقت مغلوب الحال ہو جاتے۔[2]

وفات: ان کو یرقان کا مرض ہو گیا تھا، کچھ دنوں کے بعد صحت ہو گئی، اس بیماری میں درس و افتا اور وعظ و تصنیف کے کام موقوف ہو گئے تھے، صحت کے بعد مدرسۂ نظامیہ آئے اور درس دیا، وعظ کہا، ان کی صحت سے عام طور پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا، لیکن کس کو معلوم تھا کہ یہ چراغ سحری کا آخری سنبھالا ہے، کچھ ہی دنوں کے بعد مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، اور بخار کا دورہ آنے لگا، اس بخار نے ان کو بے حد کمزور کر دیا، علاج سے فائدہ نظر نہیں آیا تو تبدیل آب و ہوا کے لیے بُشتنقان[3] گئے، لیکن وہاں کے قیام میں مرض بڑھتا ہی گیا، اور ۴۷۸ھ میں ۲۵ ربیع الثانی چہار شنبہ کی شب کو بعد عشا اپنی حیات کی ۵۹ بہاریں دیکھ کر وفات پا گئے، اسی رات کو جنازہ نیشاپور لایا گیا، اس خبر کے عام ہوتے ہی سارا شہر ٹوٹ پڑا اور کہرام مچ گیا، ہر طرف آہ و بکا کی آواز تھی، ہجوم و اژدحام کا یہ حال تھا کہ غسل کے وقت مکان کے اندر لیجانا دشوار ہو رہا تھا، بہت کوششوں سے ان کے صاحبزادے ابوالقاسم نے نماز پڑھائی، اور اس مجسمۂ فضل و کمال کو لحد کی آغوش میں رکھ دیا گیا، اس روز نیشاپور کے در و دیوار گریہ کناں تھے، سارا شہر، بازار اور ایک ایک دوکان بند ہو گئی، کئی روز تک عام فضا سوگوار رہی، جامع منیعی کا وہ منبر جس پر وہ وعظ کہتے تھے توڑ دیا گیا اور ان کے تقریباً چار سو تلامذہ اس غم میں قلم دوات توڑ کر پورے ایک سال تک علمی خدمات چھوڑ بیٹھے،

[1] تاریخ بیہق ص ۲۵۰ [2] طبقات ۳/ص ۲۵۰ [3] یہ جگہ نیشاپور سے ایک فرسخ پر ہے اور آب و ہوا کے لحاظ سے معتدل ہے، مراصد الاطلاع ۱/۱۵۵

شعراء نے دلدوز مرثیے کہے،[1]

قلوب العالمین علی المعالی وایام الوری شبه اللیالی

اہل دنیا کے قلوب امام ابو المعالی سے وابستہ تھے، اب مخلوق کے دن شب کے مانند ہیں

أیثمر غصن اهل الفضل یوما وقد مات الامام ابو المعالی[2]

کیا کسی اہل علم کی شاخ ثمربار ہوگی جب کہ امام ابو المعالی رحلت فرما چکے ہیں

حافظ ذہبی نے ان کے شاگردوں کے اس طریقۂ اظہارِ غم کے بارے میں کہا ہے، کہ یہ دور جاہلیت کا طریقہ اور عجمی رسم ہے، اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے کہ کسی کے غم میں ایک سال تک لوگ تمام کاموں سے دست کش ہو جائیں اور معطل ہو کر بیٹھ رہیں ـــــ لیکن جس قدر عظیم نقصان ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اثرات بھی وسیع اور دیرپا ہوتے ہیں، ع

جو ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے

ایسی مثالیں اور بھی ملتی ہیں، اس سے ایک سال قبل بغداد میں جب شیخ ابو اسحٰق شیرازی کا انتقال ہوا تو نظام الملک کے لڑکے نے جو بغداد میں تھا، نظامیہ کو ایک روز کیلئے بند کر دیا اور تعزیتی جلسہ کیا، لیکن بیہقی سے نظام الملک نے بیٹے کو خط لکھا کہ تم کو ایک سال تک مدرسہ بند کر دینا چاہیے تھا،[3]

امام کی اولاد۔ امام کے صرف ایک لڑکے ابو القاسم مظفر تھے، یہ رے میں پیدا ہوئے، اور کمسنی میں والد کے ساتھ نیشاپور آئے اور یہاں تعلیم حاصل کی، ادب، علوم قرآن اور حدیث سے خاص مناسبت تھی، صحیح بخاری کی سماعت کشمیہنی کے شاگرد حفصی سے کی اور والد سے "شامل" پڑھی، اور دوسرے علماء سے بھی تحصیل علم کیا، شافعی مسلک کے ممتاز علما میں انکا شمار رہا،

---

[1] طبقات الشافعیہ ۵ ص ۲۰۵، [2] ایضاً ۳ ص ۲۵۰ [3] مرآۃ الجنان ۳/۱۱۹

اور لقب فخرالاسلام ہے،[1] ابن فندق نے بیہق کے اہم تاریخی واقعات کے ذیل میں ایک مذہبی شورش کا ذکر کیا ہے کہ نیشاپور میں ۴۹۰ھ میں کرامیہ اور دوسرے فرقوں میں تصادم ہوا، اُن میں احناف اور شوافع بھی تھے، احناف کے قائد قاضی ابوسعید محمد ابن الصاعد تھے، اور شوافع کے مرخیل فخرالاسلام ابوالقاسم مظفر تھے، ان لوگوں کی مدد کے لیے بیہق سے ایک جماعت آئی تھی۔[2]

ابوالقاسم کی وفات کے بارے میں کئی بیانات ہیں، ابن السمعانی نے لکھا ہے کہ ان کو باطنیوں نے شہید کیا، اور تاج الدین سبکی کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے وہ خراسان کے عمید محمد بن محمد کے ظلم وتعدی کا نشانہ بنے اور بقول عبدالغافر فارسی انکو زہر دیا گیا،[3] بہرصورت شعبان ۴۹۳ھ میں انکا انتقال ہوا، اس واقعہ کے بعد طوس کے ابوالقاسم محمد اشعری جو غالی شافعی تھے نسا جارہے تھے، راستے میں ان کو امام کے صاحبزادے کے انتقال کی خبر ملی، اُن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ شدت غم سے انکا پتہ ٹوٹ گیا اور اسی رات میں وہ بھی جاں بحق ہوئے۔[4]

ابوالقاسم مظفر کے علاوہ ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ملتا لیکن عبدالملک بن محمد بن ہبۃ اللہ البسطامی (م ۵۴۴ھ) کو سبکی نے سبط امام الحرمین الجوینی لکھا ہے،[5] اور امام جوینی کے حالات میں لکھا ہے۔

ان آثار جدہ واجتہادہ	ان کے دینی خدمات نے ان کو زندہ
فی دین اللہ یدوم الی یوم	جاوید کردیا، اگرچہ ان کی نسل بیٹے
الساعۃ وان انقطع نسلہ	کی طرف سے منقطع ہوگئی۔
من جہۃ الذکور[6]	

---

[1] طبقات الشافعیہ جدید اڈیشن ۵/۳۳۰ [2] تاریخ بیہق ۲۰۸ فارسی ابوالحسن علی بن زید بیہقی معروف بابن فندق [3] طبقات جدید اڈیشن ۵/۳۳۰ [4] طبقات جدید ۴/۱۳ [5] طبقات ۴/۲۶۲ [6] طبقات ۳/۲۵۸

اس سے معلوم ہوا کہ ابو القاسم کے ذریعہ تو نہیں لیکن ان کی لڑکی سے ان کا خاندان باقی رہا، مولانا عبد الرزاق کانپوری مرحوم نے اپنی کتاب "نظام الملک طوسی" میں ان کے ذکر کے بعد علاء الدین عطا الملک الجوینی مصنف تاریخ جہانگشائی کو امام کا نبیرہ کہا ہے، موصوف نے غالباً مجمع الفصحاء اور مجالس المومنین کے مندرجات کے مطابق لکھا ہے، دراصل یہ محض جوینی نسبت سے اشتباہ ہوا، فاضل شمس الدین ذہبی نے تاریخ الاسلام میں علاء الدین کا نسب فضل بن ربیع تک پہونچایا ہے، جو بنو عباس کا مشہور حاجب تھا[۱]۔

ممتاز تلامذہ | اس آفتاب فضل و کمال سے اکتساب فیض کے بعد جو مہ و انجم سمائے علم پر ضوفگن ہوئے وہ حجۃ الاسلام امام محمد غزالی، ابو الحسن علی الطبری معروف بہ کیا ہراسی، ابو المظفر الخوافی، ابو القاسم انصاری اور ابو نصر عبد الرحیم قشیری ہیں، یہ انکے ایسے تلامذہ ہیں جن پر خود استاذ کو ناز تھا، انھوں نے ان شاگردوں کو یہ خطابات دیئے، امام غزالی کو بحر مغدق (بحر زخار) اور کیا ہراسی کو اسد مخرق (شیر درندہ) اور خوافی کو نار محرق (آتش سوزاں) وہ اکثر انہی خطابات سے ان شاگردوں کو یاد کرتے تھے،

ابو الحسن علی الکیا ہراسی م ۵۰۴ھ | ان کے تلامذہ میں ابو الحسن کیا ہراسی، امام غزالی کے برابر تھے، بلکہ زمانۂ تحصیل میں بعض فطری اور وہبی اوصاف کی بنا پر امام غزالی پر بھی فوقیت رکھتے تھے، کیا، فارسی لفظ ہے، اس کے معنی بزرگ کے ہیں[۲]، اور ہریسہ ایک خاص قسم کا کھانا ہوتا ہے، اسکو بنانے اور بیچنے والے کو ہراس کہتے ہیں، ممکن ہے ابو الحسن یہ کام کرتے رہے ہوں، اسلیے ہراسی کی نسبت سے مشہور ہوئے، یہ طبرستان سے نیشاپور آئے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد بیہقی کے مدرسہ میں مدرس ہو گئے، اس کے بعد نظامیہ بغداد کی تدریسی خدمات پر مامور ہوئے، برکیارق انکا نیازمند تھا، اپنی دولت ان کے قدموں پر نثار کرتا تھا، کیا ہراسی ایک عرصہ تک قاضی بھی

---

[۱] مقدمہ تاریخ جہانگشائی [۲] طبقات ابن ہدایۃ اللہ ص ۷۸

بھی رہے فقہ، اصول، مناظرہ ان کے خاص علوم ہیں، اور فقہی مسائل کے مصادر احادیث کے حافظ تھے، ان کو احادیث کا اتنا اچھا استحضار تھا کہ مناظرہ میں الزامی اور عقلی جواب کے بجائے براہ راست احادیث بیان کرتے تھے، انکا یہ قول مشہور ہے،

اذا جالت فرسان الاحادیث۔	جب شہسوار ان حدیث رزمگاہ
فی میادین الکفاح طارت	علم میں آجائیں تو عقلی علوم کے ناموران
رؤس المقاییس فی مھاب	ہوا کے رخ پر بھاگتے نظر آئیں۔
الریاح۔	

تاج الدین سبکی نے ان کو احد فحول العلماء رؤس الائمۃ کہا ہے، اسی طرح تمام مورخین ان کے فضل و کمال کے معترف ہیں، فیاض ازل نے علمی کمالات کے ساتھ ان کو ظاہری حسن وجمال بھی عطا کیا تھا، وہ پاکیزہ شمائل، بلند آواز اور شیریں زبان تھے، امام الحرمین کے درس کے معید ثانی تھے، ان کی تصانیف میں "شفاء المسترشدین" جو علم خلافیات کی عمدہ کتاب ہے، اور نقد مفردات الامام احمد ہیں، ان کے علاوہ ایک کتاب احکام القرآن بھی ہے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ نظامیہ بغداد کی مسند پر گذرا اور اسی منصب پہ ان کا انتقال ہوا، بغداد میں شیخ ابو اسحق شیرازی کی قبر متصل ان کی ابدی خواب گاہ ہے، ابو الحسن دامغانی اور ابو طالب زینبی دونوں کو کیا سے معاصرانہ چشمک تھی، تدفین کے وقت یہ دونوں موجود تھے، ابو الحسن دامغانی اور ابو طالب نے فی البدیہۃ ایسے اشعار کہے جن میں کیا کے فضل و کمال کا اعتراف ہے،

ابو نصر عبد الرحیم (م ۵۱۴ھ) | حضرت شیخ ابو القاسم قشیری کے فرزند چہارم، کمالات صوری ومعنوی میں ان کے نقش ثانی تھے، اور اپنے استاذ امام الحرمین کے محبوب نظر، ابو نصر قشیری

اشعریت کے ویسے ہی حامی تھے، جس طرح شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی حنبلیت کے، یہی وجہ ہے کہ بغداد کی ایک مذہبی شورش مین ان کا نام جلی حروف میں ثبت ہے ۴۶۹ھ میں حج کے بعد بغداد آئے، اور نظامیہ کے منبر پر اشعری مذہب کی اس انداز سے تبلیغ کی کہ حنابلہ جو اس کے سخت مخالف تھے، برداشت نہ کر سکے اور دفعۃً نظامیہ کی پرسکون علمی فضا کشت وخون کی شورش سے بدل گئی، اس کے بعد نظام الملک نے ان کو اصفہان بلالیا[۱]

علم حساب میں انفرادیت کی بنا پر فرائض میں پوری مہارت رکھتے تھے علماء اُن سے یہ علم سیکھتے تھے، ابونصر کے کمال کی بڑی دلیل یہ ہے کہ امام الحرمین نے اپنی کتاب "نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب" کے باب الوصیت مین ان کے اقوال نقل کیے ہیں، ابونصر کی مجلس وعظ مین شیخ شیرازی جیسے لوگ بھی شریک ہوتے تھے، اور فاسق وفاجر اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، اور کفار مشرف بہ اسلام ہوتے تھے، حجاز و بغداد کے سفر سے واپسی کے بعد شہرت و مرجعیت کے زمانہ مین بھی اپنے استاذ امام الحرمین کے دامنِ فیض سے لپٹے رہے، ابونصر کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، پچاس ہزار اشعار ان کو حفظ تھے، علامہ تاج الدین سبکی نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں، ابونصر کی یادگار ایک تفسیر بھی ہے[۲]

ابو المظفر الخوافی (م ۵۰۰ھ) نیشاپور کے زیر سایہ خواف ابو المظفر کا وطن ہے اسی نسبت سے خوافی کہلاتے ہیں، ابو المظفر، ابو ابراہیم ضریر سے فقہ پڑھ کر امام الحرمین کے درس میں آئے اور اپنی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی بنا پر اُن سے قریب ہو گئے، اور ان کی درسگاہ کے ہونہار فرزندوں میں شمار کیے گیے، استاذ کی خاص مجلسوں میں بھی موجود رہتے، ان

---

۱ الکامل ابن اثیر ۱۰/۳۶ ۲ تبیین ۱۵ طبقات ۴/۲۴۹

ان صحبتون مین مناظرہ مین کمال پیدا کیا اور اپنے وقت کے بڑے مناظر تسلیم کئے گئے، اسی جوہر خاص کی بنا پر ان کو وہ آتش سوزان کہتے تھے، ان کے معاصرین کا بیان ہے کہ امام غزالی جس درجہ اپنی تصنیفات میں کامیاب ہوئے، خوافی اسی طرح مناظرے میں، حافظ ذہبی نے لکھا ہے،

رفیق الغزالی وکان مجبانی	امام غزالی کے ہم درس تھے اور مناظرے
المناظرۃ رشیق العبارۃ	مین نرالی شان رکھتے تھے، عمدہ عبارت
بارع عند امام الحرمین	لکھتے تھے، امام الحرمین کے ہان علمی کمال[۲]

ان کی حیات ہی مین مسند درس پر بیٹھے، علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی صاحب الملل والنحل نے فقہ کی تکمیل خوافی سے کی، خوافی طوس میں ایک عرصہ تک قاضی رہے، لیکن ان کے تقوی و تدین نے اس کی اجازت نہیں دی، اور وہ منصب قضا سے مستعفی ہوگئے، ذکاوت، فطانت، اور زبان کی فصاحت جو امام کے تلامذہ کے امتیازی اوصاف ہیں، خوافی میں بھی تھے، علامہ سمعانی نے ان کے دو صاحبزادوں ابو القاسم عبداللہ اور ابو المعالی مسعود سے حدیث کی سماعت کی، نظامیۂ نیشاپور کے شیوخ میں ابو المعالی مسعود کا ذکر آیا ہے،

ابو القاسم انصاری (م ۵۱۲ھ) ظاہری علوم میں امتیاز کے ساتھ باطنی فضائل کے بھی حامل تھے، امام الحرمین جیسے عبقری استاذ اور مشاہیر شیوخ سے اکتساب علم کیا، ان کے درس مین آنے سے قبل علمی اسفار سے فارغ ہو چکے تھے، ابو الحسین بن مکی اور عبدالغافر فارسی سے حدیث کا درس لیا، فقہ، اصول اور تفسیر نظامیۂ نیشاپور میں تمام کی، اور شیخ ابو القاسم قشیری کی صحبت میں رہے، ورع و تقوی، اور دیانت و امانت کی وجہ سے

اپنی مادر علمی کے عظیم کتبخانہ کے افسر منتخب ہوئے، عبدالکریم شہرستانی نے علم کلام ابوالقاسم انصاری سے پڑھا امام رازی کا سلسلۂ تلمذ ابوالقاسم انصاری تک پہونچتا ہے، امام رازی نے اپنے والد کے واسطہ سے کلام وعقائد کے اہم مسائل اُن سے بیان کئے ہیں، وہ اپنی تفسیر میں سورہ انعام میں ابوالقاسم کا یہ قول نقل کرتے ہیں، جو اختلافِ عقائد کے متعلق بنیادی نکتہ ہے، ابوالقاسم انصاری نے کہا۔

"اہل سنت والجماعت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت کی طرف گیا، اور معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم اور مبرا عن العیوب ہونے پر ہے اس لئے غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت وتقدس کے معترف ہیں، البتہ اس قدر ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی صائب الرائے ٹھہرا"[1]

---

[1] تفسیر کبیر سورہ انعام

تبع تابعینؒ

(حصہ دوم)

تبع تابعین حصہ اوّل کی اشاعت کے بعد اب اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے، اس میں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی وغیرہ کے علاوہ ۴۸، صاحب تصانیف تبع تابعین رضی اللہ عنہم کے حالات اور علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

صفحات: ۵۸۶ - قیمت: ۲۰ روپے،

مرتبہ: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی،

طب کا منظوم سرمایہ

از۔ جناب حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب صدر شعبہ علم الادویہ، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

زمانہ قدیم سے نظم کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا جاتا رہا ہے، اسے نہ صرف ایک موثر اور دلنشین ذریعہ سمجھا گیا ہے، بلکہ کلام موزوں کی وجہ سے نثر کے مقابلہ میں اسے زبانی یاد رکھنا بھی آسان ہوتا ہے، اسی لئے دنیا کے تقریباً ہر ملک اور ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم کا وجود ملتا ہے،

یونان میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے تحریر کی ابتدا نہیں ہوئی تھی، اہم ترین واقعات اور جملہ علوم کی تفصیلات زبانی یاد رکھی جاتی تھیں، اور سینہ بسینہ منتقل کی جاتی تھیں، اس لئے نظم کا سہارا ضروری تھا، جو وقائع کو محفوظ رکھنے کی بہترین شکل ہے، یونان کی ابتدائی تاریخ اسی کے سہارے لکھی گئی، سلسلہ میں ہیومر کی نظموں (ایلیڈ اور اوڈیسی) کو اولیت حاصل ہے، جن کا تعلق نویں صدی قبل مسیح سے ہے،

ہومر کی نظمیں یونانی تاریخ کے ابتدائی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان نظموں کے مضامین کی وجہ سے ہومر کو طب کی تاریخ میں خاص مرتبہ حاصل ہے، اسی کی وجہ سے یونانی طب کے متعلق پہلی واقفیت حاصل ہوتی ہے، اس کی نظموں سے پیشہ ور طبیبوں کی طب اور سرجری کا ثبوت ملتا ہے، ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں بھی دواؤں کے بارے میں معلومات رکھتی تھیں (ایلیڈ ۱۱، ۲۰۰، ۲۰۲) ان تین زخموں اور ان کے مابعد اثرات اور نیز علاج کا بہت صحیح بیان ہے، درد دور کرنے والی اور زخم بھرنے والی دوائیں، دافع جنون جڑی بوٹیاں (اوڈیسی ۴، ۲۲۰) برادہ فولاد کا طبی استعمال اور گندھک

جلا کر مکان کی صفائی کا ذکر بھی ہے، (اوڈیسی ۲۲ ، ۴۸۱) علم تشریح کی معلومات کی وسعت تقریباً ۱۵۰ مخصوص الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے،

ہومر کی طرح دوسرے یونانی شعرا مثلاً کورنتھ کا باشندہ یومیلوس (آٹھویں صدی قبل مسیح) اسکرا (نزد کوہ ہیلی کون) کا باشندہ ہیسائڈ (آٹھویں صدی قبل مسیح) اور ساموس کا باشندہ اسیوس (غالباً ساتویں صدی قبل مسیح) بھی قابلِ توجہ ہے، ان کی شاعری سے بھی ابتدائی مورخین نے مواد حاصل کیا ہے)

مسلمان اطبا نے بھی جن کا شعر و ادب سے خاص تعلق رہا ہے، نظم کے ذریعہ طبی معلومات پیش کی کی ہیں، خالص فنی موضوعات کو نظم کرنا اگرچہ دشوار بات تھی لیکن عربی عہد کی ابتدا ہی سے مسائل طبیہ کو نظم کرنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی،

شیخ الرئیس ابن سینا جہاں قانون اور دوسری اہم کتابوں کا مصنف ہے وہاں نظم میں بھی اس کی متعدد طبی کتابیں ہیں،

۱۔ الاجوزۃ فی التشریح ۱۰۹۸ اشعار پر مشتمل ہے، کتب خانہ ویٹیکن اور برٹش میوزیم میں اسکے نسخے محفوظ ہیں،

۲۔ الارجوزۃ فی المجربات فی الطب ۱۔ ایاصوفیہ، راغب پاشا، نور عثمانیہ، جامع استنبول، ویانا اور برٹش میوزیم میں موجود ہے،

۳۔ الارجوزۃ فی الطب ۱۔ اس کے متعدد نسخے اسکوریال، پیرس، برلن، بوڈلین لندن بیروت، قاہرہ، کیمبرج، برٹش میوزیم، استنبول، پٹنہ اور رامپور میں موجود ہیں، راقم الحروف کے ذخیرہ میں اس کا ایک نفیس مخطوطہ ۔ اسوال ۱۲۱۵ھ کا مکتوبہ ہے، اس ارجوزہ کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں ابن رشد کی شرح مشہور ہے،

یہ ارجوزہ لکھنؤ سے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ابن رشد کی شرح کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس سے قبل کلکتہ سے ۱۸۲۹ء میں یہ طبع ہو چکا تھا، حکیم عبدالعزیز بٹالوی نے جواہر النفیس کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مع شرح طبع کرایا ہے۔

۴۔ الارجوزۃ فی الطب:۔ درج بالا ارجوزہ کے علاوہ دوسرا منظومہ ہے جس میں ۱۵۱ اشعار ہیں، یہ کتب خانہ ایا صوفیہ میں محفوظ ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ برلن میں بھی ہے، اس ارجوزہ کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اسمع بنیّ وصیتی واعمل بھا فالطب مجموع بنص کلامی

۵۔ الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ:۔ کتب خانہ برلن میں ہے،

۶۔ الارجوزۃ فی الباہ:۔ رضا لائبریری رامپور، برٹش میوزیم اور کتب خانہ وہبی استنبول میں اس کے نسخے ہیں۔

۷۔ الارجوزۃ فی تدبیر الحول فی الفصول الاربعۃ:۔ اس کے متعدد نسخے استنبول کے کتب خانوں اور کتب خانہ برلن اور ویٹیکن میں موجود ہیں،

اس کی ایک شرح "القول الانیس ودر النفیس علی منظومۃ الشیخ الرئیس" کے نام سے مدین بن عبدالرحمٰن الطبیب نے کی ہے، جو کتب خانہ راغب پاشا استنبول میں ہے،

۸۔ الارجوزۃ فی الوصایا الطبیۃ:۔ استعمال دوا کے مناسب اوقات کے تعین میں ہے۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

دل یوم تنزل الشمس الحمل تشرب ماء فاترا عسلی عجل

کتب خانہ برلن، نور عثمانیہ، سلطان احمد ثالث استنبول میں اس کے نسخے ہیں،

۹۔ الارجوزۃ اللطیفۃ فی وصایا ابقراط:۔ کتب خانہ برلن، ویٹیکن، برٹش میوزیم اور موصل میں

موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور طبیب سعید بن عبد ربہ کا طبی قصیدہ طب کے منظوم عربی ذخیرہ میں خاصہ کی چیز ہے، ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء میں اس کا ذکر کیا ہے،

سدید الدین محمود بن عمر العطار ابن رقیقہ (۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) فخر الدین ماردینی کا شاگرد اور ابن ابی اصیبعہ کا ہم عصر ہے، لطف المسائل وتحف السائل (تالیف ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء) کے نام سے حنین بن اسحٰق کی کتاب المسائل اور ابن سینا کی کلیات قانون کو اس نے بحر رجز میں نظم کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب فن شاعری اور طب دونوں کا شاہکار ہے، گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس میں اس کا مکمل نسخہ محفوظ ہے۔

ابن رقیقہ کی دوسری منظوم کتاب الفریدۃ الشاہیۃ والقصیدۃ الباہیۃ ہے جسے اس نے الملک الاشرف موسیٰ بن الملک العادل کے نام معنون کیا ہے، اس کے علاوہ فصد کے بیان میں بھی اس کا ایک قصیدہ ہے۔

علم الادویہ کی شہرۂ آفاق کتاب تذکرۂ اولی الالباب کے مصنف داؤد انطاکی (وفات ۱۰۰۵ھ) نے جہاں متعدد و بلند پایہ کتابیں تصنیف کی ہیں وہاں کلیات قانون کی منظوم شرح لکھنے کی بھی اسے عزت حاصل ہے،

عربی کی طرح فارسی میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا، ہندوستان کی ابتدائی منظوم کتابوں میں طب شہابی ہے، جو نہ صرف نظم بلکہ نثر کے لحاظ سے بھی یہاں لکھی جانے والی شروع کی چند کتابوں میں ہے اس کا سنہ تصنیف ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء ہے،

حکیم شہاب الدین بن عبد الکریم کی اس کتاب کا نام شفاء المرضیٰ ہے، لیکن مصنف کے نام کی رعایت سے طب شہابی کے نام سے مشہور ہوئی، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے، ۱۲۷۲ھ کی اشاعت

پیش نظر ہے، جو مطبع مسیحائی کانپور سے طبع ہوئی ہے،

مغلیہ عہد کی بے شمار طبی کتابوں میں منظوم کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے، ایک ابتدائی کتاب زبدۃ الکامل عہد بابری کے حکیم شرف الدین علی یزدی کی مرتب کردہ ہے، سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں اس کا مخطوطہ ہے، اس لائبریری میں سید نور اللہ حسین کی طب فیضی بھی قابلِ قدر چیز ہے،

عہد بابری کی ایک اور کتاب جامع الفوائد ہے، یہ طب یوسفی کے نام سے مشہور ہے، یوسف ابن محمد بن یوسف طبیب ہروی کی یہ کتاب ۹۴۲ھ میں تحریر کی گئی ہے، اس کا شمار عام مطبوعہ کتابوں میں ہے، شرح رباعیات طب یوسفی کے نام سے اس کی شرح بھی شائع ہو چکی ہے،

طب یوسفی کے انتخاب کا ایک خطی نسخہ جو ۴۳۳ ابیات پر مشتمل ہے، راقم کے ذخیرہ میں ہے یہ انتخاب ۱۱۹۱ھ میں کیا گیا ہے،

عہد اکبری کے نامور طبیب حکیم دوائی نے ۱۰۰۴ھ میں ادویہ کے افعال و خواص پر ایک منظوم کتاب لکھی ہے، اکبر کی تجویز پر اس کا نام فوائد الانسان رکھا گیا، راقم الحروف کے پاس اس کے دو مخطوطے محفوظ ہیں، ایک مخطوطہ کی کتابت ۱۱۵۱ھ تا آخر ۱۱۵۸ھ میں مکمل ہوئی ہے، اس پر علی مظفر خان فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی" کی مہر ہے، یہ نسخہ حاذق الملک حکیم معالج خان کی ملکیت میں رہ چکا ہے اور اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں،

ایک اہم کمیاب کتاب طب صدیقی ہے، جو بعہد جہانگیر ۱۰۲۴ھ میں لکھی گئی ہے، مؤلف نے اس میں ادویہ کے ہندی نام استعمال کئے ہیں چنانچہ کہا ہے ؎

نوشتم دوا ہائی بہندی زبان کہ حاجت بفرہنگ نبود در آں

ابوبکر صدیق ناگوری کی کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں محفوظ ہے، ۱۰ رجب ۱۰۸۳ فصلی کو اس کی کتابت کی گئی ہے، اس کا ایک نسخہ راقم کے ذخیرہ کی بھی زینت ہے،

عالمگیر کے عہد میں شیخ احمد قنوجی نے تحفۃ الاطباء کے نام سے نظم میں قانونچہ کی شرح کی ہے، یہ ضخیم شرح ۲۷ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں اس کا مخطوطہ ہے، ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۱۹ھ میں بچھمی نراین نے اس کی کتابت کی ہے، مخطوطہ پر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ اودھ کی مہریں لگی ہوئی ہیں، کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اس کا ایک زیادہ قدیم نسخہ موجود ہے، جس کی کتابت ۲ محرم ۱۱۹۱ھ کو ہوئی ہے۔

ایک ضخیم منظوم طبی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حبیب گنج ذخیرہ میں ہے، شاعر کا نام صادق بن کاظم ہے، مخطوطہ کی کتابت چرنجی لعل نے دوشنبہ ۲۶ محرم ۱۲۷۰ھ مطابق ۳ دسمبر ۱۸۵۰ء کو مکمل کی۔

بھوپال کا پرتگالی خانوادۂ طب وہاں کے مشہور فرانسیسی خاندان سے گہرے قریبی رشتہ کی وجہ سے خود بھی فرانسیسی خاندان کے نام سے مشہور ہوا، اس خانوادہ میں حکیم فرانسیس ڈسلوا نظرت، حکیم بتیس ڈسلوا، حکیم الیاس ڈسلوا عبرت، ارسطوئے زماں حکیم جوان ڈسلوا، حکیم میتھو ڈسلوا عرف حکیم میتیس (صاحب مجربات فرنگی)، حکیم دون ایشنس ڈسلوا، حکیم دون جزئی ڈسلوا، حکیم شوپر ڈسلوا مشہور طبیب گزرے ہیں، اس خاندان کے مورث اعلیٰ حکیم دون پیڈرو ڈسلوا ترچناپلی سے وارد ہند ہوئے، شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی کے کامیاب معالجہ کے صلہ میں خردمند خاں کے خطاب سے نوازے گئے اور پالکی جھالردار اور منصب عطا ہوا، اس خاندان میں متعدد اطبا صاحب دیوان اور صاحب تصنیف ہوئے ہیں، اس کے ایک ممتاز فرد حکیم لوئیس ڈسلوا نے شفاء المرض کے نام سے ۱۶۰ ابواب پر مشتمل علاج امراض پر ایک منظوم کتاب تحریر کی ہے، خوش قسمتی سے خود مصنف کے قلم کا نسخہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے، حکیم لوئیس کا انتقال ۲۰ محرم ۱۳۱۵ھ کو بھوپال میں ہوا۔

فارسی کی منظوم کتابوں میں ایک دلچسپ کتاب مثنوی بدیع "باغ رزاق" (۱۳۱۱ھ) ہے جو منشی راجہ گردھاری پرشاد باقی نے نواب میر محبوب علی خان کے زمانہ میں حیدرآباد میں لکھی اس میں میوہ، پھل، پھول، ساگ، سبزی، دال، گوشت اور مختلف غذاؤں کے افعال و خواص نظم کئے ہیں، یہ کتاب ۱۳۱۴ھ میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوئی ہے،

ترکی میں بھی اس ذوق کو نشو و نما ملی، الارجوزۃ فی الطب از خطیب قسطنطینی، حفظ الابدان از خضر بن عمر العطوفی، ذخر العطشان از ابن العطوفی اور کنز الاشتہا اس کی بہترین مثالیں ہیں،

اس قدیم روایت کو اردو میں بڑی خوبصورتی سے برتا گیا ہے اطبائے ہند نے فارسی کی طرح خالص طبی مضامین کو نہ صرف اردو اشعار میں ڈھالا ہے، بلکہ اس میں خوب خوب جدتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں، فرس نامہ رنگین تالیف ۱۲۱۰ھ غالباً اردو کی پہلی منظوم کتاب ہے، جو بہر حال، ایک درجہ میں طب کے مخصوص شعبہ سے تعلق رکھتی ہے، یہ کتاب عرصہ ہوا طبع ہو چکی ہے،

طب شہابی کے منظوم اردو ترجمہ کے علاوہ جو صحیفہ دلفزا المعروف بہ ترجمہ طب شہابی کے نام سے ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں باہتمام قاضی عبد الکریم مطبع فتح الکریم بمبئی سے طبع ہوا ہے، دوسرے متعدد اطبا کی کاوشین بھی خراجِ تحسین کی مستحق ہیں،

اس سلسلہ کی قابل قدر کتابوں میں "طبی خالق باری" ہے، جو خسرو کی خالق باری یا قادر نامہ غالب اور قادر نامہ فروغی کے طرز پر طب کے مبتدیوں کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ہندی، فارسی اور عربی میں ادویہ کے مترادف نام پیش کرنے کے علاوہ امراض کے ناموں کی توضیح اور اصطلاحات ادویہ کی تشریح کی گئی ہے، یہ کتاب حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی اور حکیم سید محمد کرم حسین ناطق تجاروی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، حکیم سید کرم حسین ناطق نے اس کو مارچ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا آیورویدک، یونانی طبی کانفرنس کے بارہویں سالانہ اجلاس کے موقع پر مسیح الملک حکیم اجمل خان کی

نذر کرتے ہوئے شائع کرایا تھا، اس سے پہلے بھی اس رسالہ کی ایک اشاعت سامنے آچکی تھی، بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

گوکھرو ہندی تازی ہے خسک — فارسی خار خسک ہے بے شبہ وشک
کہتے ہیں آلو بخارا جس کو سب — بولتے اجاص ہیں اس کو عرب
بچہ کواے جان جہاں تم وچ کہو — جو سلیخہ ہے اسی کو تج کہو
آڑو ہندی فارسی شفتالو ہے — خوخ تازی جان لے اے نیک پے
عشر تازی ہندی ہے آکھ اور مدار — فارسی میں جان خرک اے ہوشیار
آنبہ ہلدی ہندی تازی دارہلد — دارچوبہ فارسی ہے جان جلد
سیوتی نسرین ہے اے باخبر — کیوڑہ کو جان کاذی اور کدر

حکیم فقیر احمد فقیر حیدرآبادی کی تالیف مقصود الادویہ میں ادویہ کے مزاج اور خواص کو سلیقہ کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، سات ابواب پر منقسم یہ کتاب زبان وبیان پر شاعر کی ماہرانہ دسترس ظاہر کرتی ہے، لیکن بطور انکسار اس نے کہا ہے، ؎

شاعری سے نہیں یہاں سروکار — محض مخصوص طب میں ہیں اشعار

اس سلسلۂ زریں کی ایک انمول کڑی "اصول صحت" ہے، یہ حکیم سید محمد عتیق القادر اور حکیم سید محمد فضل الرحمٰن کی مساعی کا عکس جمیل ہے، انھوں نے اپنے والد گرامی فخر الاماثل حکیم حاجی قاضی سید محمد کرم حسین ناطق کی ہدایت اور رہنمائی میں ۱۹۳۳ء میں اس کی تکمیل کی تھی، اور ۱۹۳۳ء ہی میں مطبع علمی اہلی سے یہ طبع ہوئی تھی، نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

برگ نورستہ مغیلاں کے تمام — شب کو پانی میں بھگوائے نیک نام
صبح کو اس آب میں شیرہ نکال — روز یونہی تو پلا اے ذی کمال

دور ہوگا یہ مرض سوزاک کا | آزمایا ہم نے اس کو بار ہا
مغز ماسہ کلتھی پیش ہمراہ عسل | صبح کو ہر روز پی لے بے بدل
مغز کلتھی روز ایک ماشہ بڑھا | آئے جب دس تک تو پھر اسکو گھٹا
اک اک ماشہ کو کم کر روز تو | ایک تک پہنچے تو چھوڑ لے نیک خو
خاص گر وہ یا مثانہ کا ہو سنگ | اس دوا سے دفع ہوگا بے درنگ

ادویہ اور معالجات کی طرح علم تشریح میں بھی حکیم سید کرم حسین ناطق کی حسب ہدایت انکے شاگرد سید محمد فرحت علی فرحت تجاروی نے موعظۃ الحکمت کے نام سے کام شروع کیا تھا، اس کتاب کی سات فصلیں علم تشریح میں تھیں اور کچھ فصلوں میں نسخہ جات نظم کئے گئے تھے، یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی اور یہ سلسلہ ناتمام رہا، اس کتاب کی پہلی قسط ماہنامہ مسیحائے زماں تجارہ ریاست الور میں جون ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی ہے، درج بالا دونوں کتابوں کے علاوہ اگر یہ تیسری کتاب بھی طبع ہو جاتی تو طب کے منظوم ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہوتا۔

تشریح فواد کے نام سے حکیم صابر گوالیاری کا بھی ایک منظوم رسالہ ہے، جو ۱۹۵۰ء میں طبع ہوا ہے،

پنجابی زبان کی کتاب "دارالشفا" کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے، جس میں کلیات معالجات اور مرکبات کو پنجابی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، سینکڑوں اشعار پر مشتمل ۱۲۶۰ھ کی یہ تالیف مطبع محمدی لاہور سے فارسی رسم الخط میں طبع ہوئی ہے،

معارف، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی مطبوعہ اور قلمی طبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، ان میں اکثر طبی کی اہم منظوم کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، لیکن جو ہیں، ان کا مندرجہ بالا مضمون میں ذکر نہیں ہے اقارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں ان کا مختصر حال درج کیا جاتا ہے،

۱. رسالۂ منظوم یہ قلمی رسالہ شیخ بو علی سینا کی ایک منظوم تصنیف ہے جو غالباً اس کی مشہور کتاب قانون کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے، شروع میں طب کے مفہوم اور اعمال وخواص کے متعلق ایک مختصر نثری تحریر بھی ہے، اس کے بعد منظوم حصہ فی الامور الطبیعیۃ کے زیر عنوان شروع ہوتا ہے، یہ پورا رسالہ ۴۲ ورق اور دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ ۲۵ ورقوں پر مشتمل ہے، اس میں طب کی علمی قسم کا ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں عملی قسم کا بیان ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا کہیں ذکر نہیں مل سکا، البتہ سرورق پر ایک مہر ثبت ہے جس میں ۱۲۲۳ھ درج ہے اور سید نعمت درج ہے، رسالہ خوشخط ہے، مگر کہیں کہیں کرم خوردہ ہے، اہل فن کو اس کے مطالعہ میں کوئی دشواری نہ ہوگی، زبان عربی ہے،

۲. کتاب المعلوم الاعم ۱۰۰ ورقوں کی یہ قلمی کتاب ناقص الاول والآخر ہے، اس لئے کتاب مصنف اور کاتب کسی کے نام کا علم نہ ہو سکا اور نہ سنہ کتابت کا پتہ چل سکا، اس میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف امراض اور ان کے علاج کا منظوم بیان ہے، جو اہل فن کے لئے بہت کار آمد ہوگا، اسکی زبان فارسی ہے،

۳. کتاب البیزرہ۔ یہ عربی کتاب دمشق کی المجمع العلمی العربی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کی ہے، اس پر شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کا مقدمہ اور تعلیقات بھی ہیں، کتاب اصلاً نثر میں ہے لیکن تقریباً نصف آخر منظوم ہے، محمد کرد علی نے اس کو جس قلمی نسخہ سے ایڈٹ کیا ہے، اس کے شروع کے صفحات موجود نہ تھے، آخری حصہ کو انھوں نے الحاقی بتایا ہے، جس میں مصنف کا نام بازیار عزیز باللہ نزار فاطمی (م ۳۸۶ھ) درج تھا لیکن فاضل محقق کے خیال میں اصل مصنف کا نام ابو عبداللہ حسن بن حسین بازیار ہے، جو فاطمی خلیفہ نزار کا وزیر تھا،

أدبیات

نعتِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

از پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، مسند نشین وخادمِ حضرت خواجہ غریب نواز اجمیر

زینتِ فردوسِ ایماں روئے زیبائے رسول — دولتِ جاویدِ عرفاں، حسنِ رعنائے رسول
دل کا ہر گوشہ، مدینہ زارِ عرفاں ہو گیا — مرحبا! اعجازِ یا شئ تولائے رسول
دیدۂ بینا، دلِ بیدار، کیفِ سرمدی — سارے گوہر تجھ پہ قرباں اے تمنائے رسول
قدسیانِ جنت بداماں، بہرِ تمکیں ساتھ ہیں — شاہدانِ ناز! دیکھی شانِ شیدائے رسول
انتخابِ حق وصدق وعدل واحسان وکرم — آئینہ دارِ صفات اللہ، سراپائے رسول
جو بھی فرمایا تو پہلے خود عمل پیرا ہوئے — ہادیانِ حق میں یہ تھی شانِ یکتائے رسول
حق کی تعلیم وعمل سے ہر نفس آباد تھا — دشمنانِ حق کو بھی ایسے نظر آئے رسول
بیکسیٔ شرمِ عصیاں، ملتجیٔ رحم ہے — المدد! اے کوثر وتسنیم لب ہائے رسول!
شیوۂ رحمت کے قرباں مژدۂ لا تقنطوا — دل نوازِ شرمِ عصیاں ہے ایمائے رسول
حسنِ نایابِ ازل کی آرزوئے دید میں — جانبِ محشر نکل آیا ہے شیدائے رسول
ناز وانداز پرستارانِ الفت کیا کہوں — لب پہ لا، دم میں الا، سر میں سودائے رسول
کعبۂ اربابِ ناز وقبلۂ اہلِ نیاز — جنتِ چشمِ محبت، بابِ اعلائے رسول

دردمندانِ محبت میں حسن کی خستگی
درخورِ لطف وکرم ہے اے تولائے رسول

نعت

از جناب وارث ریاضی چمپارن

زندگی شوق کا حاصل مری یادِ رسولؐ
لوحِ دل سے مٹ نہیں سکتی کبھی یادِ رسولؐ

مظہرِ شانِ خدائے دو جہاں اُن کا وجود
کاشفِ اسرارِ علم و آگہی یادِ رسولؐ

باعثِ امن و امانِ زندگی اُن کا پیام
رونقِ بزمِ خلوص و راستی یادِ رسولؐ

جب ہجومِ گردشِ دوراں سے گھبراتا ہے دل
دور کر دیتی ہے ساری بے کلی یادِ رسولؐ

عشق کو پاکیزگی دی قلب کو سوز و گداز
دے گئی ہے فکر کو سنجیدگی یادِ رسولؐ

اُن کے ذکرِ خیر سے شاداب ہے دل کا چمن
یوں بڑھا دیتی ہے لطفِ زندگی یادِ رسولؐ

مدحتِ خیر البشرؐ میری متاعِ زندگی
اور میرا مدعائے شاعری یادِ رسولؐ

رحمتِ عالمؐ کے فیضِ بے نہایت کے طفیل
بن گئی ہے میری وجہِ بے خودی یادِ رسولؐ

اے ہجومِ شوق لے چل جانبِ طیبہ مجھے
اے سرشکِ یاس تھم جا آ گئی یادِ رسولؐ

دولتِ ایمان، غمِ عشقی، اطاعت کا شعور
اور میرے رب نے وارثؔ مجھ کو دی یادِ رسولؐ،

نعت

از جناب حافظ آجالپوری

قلبِ ذرہ ہو یا پیکرِ کائنات
باعثِ جزو کل سرورِ کائنات ﷺ

اسمِ پاکِ محمد ﷺ ... ازل تا ابد
اک یہی لفظ ہے جوہرِ کائنات

جشنِ کون و مکاں انکے ہی دم سے ہے
ورنہ کچھ بھی نہ تھا بر سرِ کائنات

عرش و فرش انکی چوکھٹ کے دریوزہ گر
اُن کی جاگیر کُل کشورِ کائنات

جسم کے خال و خد گنبدِ معرفت
آنکھ کی بتلیاں منظرِ کائنات

مقصدِ کن تو چشمِ رسالت میں تھا
لوگ الٹتے رہے دفترِ کائنات

اُن کے غم کے خریدار بن جائیے
بیچ کر کُل غمِ محشرِ کائنات

قدر کیجے محمد ﷺ کے اصحاب کی
یہ ہیں مہر و مہ و اخترِ کائنات

کتنے پتھر تھے حافظ جو دل بن گئے
دیکھ کر اسوۂ سرورِ کائنات ﷺ

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

نقد و نظر رشید نمبر۔ مرتبہ، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۴ قیمت سالانہ پندرہ روپیے، فی شمارہ دس روپیے، پتہ بزم اقبال، گلفشاں، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ،

ششماہی نقد و نظر نو عمر رسالہ ہے، لیکن اس نے اپنے سنجیدہ ادبی و تنقیدی مضامین کی وجہ سے معیاری اردو رسالوں کی صف میں جگہ بنالی ہے، معارف میں اس کا پہلے تعارف کرایا جا چکا ہے، یہ نمبر اردو کے مشہور انشا پرداز اور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے، اس کے آغاز و اختتام میں خود رشید صاحب کے دو مضامین درج ہیں، ایک میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے متعلق ان کے دلچسپ تاثرات بیان ہوئے ہیں، اور دوسرا پروفیسر خواجہ منظور حسین سابق صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کے متعلق تحریر کیا گیا ہے، دونوں مضامین رشید صاحب کی مخصوص طرز نگارش، اچھوتے انداز بیان اور ادبی لطافت و رعنائی سے معمور ہیں، باقی سات مضامین میں رشید صاحب کے ادبی کمالات کے بعض پہلوؤں کا ذکر ہے، زیڈ، اے عثمانی نے رشید صاحب کی مزاح نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، سید وقار حسین نے رشید صاحب کے مخصوص اور علامتی کرداروں کی روشنی میں ان کے کمالات نمایاں کئے ہیں، انور صدیقی نے ان کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا ہے، اور سید امین اشرف نے ان کے اسلوب تحریر کے بانکپن کا ذکر کیا ہے، اس نمبر میں جناب علی جواد زیدی کا مضمون رشید صاحب کا تہذیبی شعور

اور جناب اسلوب احمد انصاری صاحب کا مقالہ رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہیں، زیدی صاحب نے علی گڑھ تہذیب اور ہندی اسلامی تہذیب کی اچھے انداز میں وضاحت کر کے رشید صاحب کے خط و خال بیان کئے ہیں، جناب اسلوب احمد انصاری نے رشید صاحب کے مختلف خاکوں اور مرقعوں پر بحث کرکے دکھایا ہے کہ ان کے تمام مرقعے اعلیٰ اور دلکش ہیں، البتہ رشید صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو وہ مبالغہ پر مبنی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام قارئین اس سے اتفاق کریں، آخر میں رشید صاحب پر لکھی جانے والی کتب و مضامین کے علاوہ خود ان کے مضامین و تصنیفات کے اشاریے بھی شامل ہیں، یہ نمبر اپنے متوازن مضامین کی بنا پر لائق مطالعہ اور رشید صاحب کے مختلف کمالات کا آئینہ دار ہے،

جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم :- مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبداللطیف اعظمی

کتابت و طباعت اچھی، سائز ۲۰ × ۲۶، قیمت خاص نمبر ۵ روپیہ، پتہ ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی

رسالہ جامعہ (دہلی) مولانا محمد علی مرحوم پر اپنا ایک خاص نمبر اہتمام سے شائع کر چکا ہے، یہ دوسرا حصہ ہے، اس میں بھی مولانا کی دلآویز شخصیت کے رنگارنگ جلووں اور گوناگوں پہلوؤں کی مصوری کی گئی ہے، اس میں مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں لیکن ان کی حیثیت قند مکرر کی ہے، علاوہ ازیں یہ مضامین اب کمیاب اور عام قارئین کی دسترس سے باہر تھے، جناب عبداللطیف اعظمی کا یہ کارنامہ ہے کہ ان کو بڑی کوشش و محنت سے اکٹھا کر کے دستبرد سے محفوظ کر دیا، مولانا محمد علی کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کا مضمون پسند کئے جانے کے لائق ہے کیونکہ یہ بہت دلچسپ اور بے تکلف انداز میں لکھا گیا ہے، اور اس سے مولانا کے بچپن، طالب علمی اور خانگی زندگی کے متعدد واقعات و حالات معلوم ہوتے ہیں، اس نمبر کی ایک اور مفید اور اہم چیز بیگم محمد علی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے گول میز کانفرنس کے زمانہ میں لندن سے اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ خاتون کو لکھے تھے، ان سے گول میز کانفرنس کی سرگرمیوں

اور مولانا کی علالت و وفات کے متعلق بہت سی ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، ڈاکٹر احمد سجاد کے مضمون میں مولانا محمد علی کی شخصیت کے عناصر اربعہ کا ذکر ہے، ایک مضمون میں ہندوستانی سیاست میں مولانا کا حصہ دکھایا گیا ہے، قاضی عبدالغفار اور خواجہ حسن نظامی کے مضامین میں ان کی صحافت پر گفتگو کی گئی ہے، مفتی رضا انصاری نے مولانا محمد علی کے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے ان کے تعلق، عقیدت اور اختلاف وغیرہ کی سرگزشت لکھی ہے، یہ سب مضامین مفید ہیں، فاضل مرتب کے شذرات کی اختتامی سطروں میں مولانا محمد علی کی سیرت، کمالات اور مضا طیسی شخصیت کا اصل جوہر پیش کر دیا گیا ہے،

مجلۃ الجامعۃ السلفیہ مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر	مرتبہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، سائز۔ متوسط کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ، صفحات ٢٣٠ قیمت سالانہ ٢٠ روپے خاص نمبر تین روپے

پتہ ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء جامعہ سلفیہ، بنارس،

جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم بنارس) کا شمار ملک کی بڑی درسگاہوں میں ہوتا ہے، گذشتہ سال فروری میں اس کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ دعوتی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی، جس میں ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور قدیم و جدید تعلیم گاہوں کے نمایندوں کے علاوہ بعض عرب ملکوں کے ممتاز علمی و تعلیمی اشخاص شریک ہوئے تھے، امام حرم محمد بن عبداللہ بن سبیل کی شرکت نے اجلاس کو زیادہ پرکشش بنا دیا تھا، اب جامعہ سلفیہ کے ماہنامہ عربی رسالہ نے اس خاص نمبر میں کانفرنس کی روداد شایع کی ہے، شروع میں اجلاس کے سلسلہ میں ہندوستان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، کویت، شارقہ اور اردن کے بعض اکابر کے پیغامات، نامور شرکاء کے نام اور ان کی تقریروں کے خلاصے درج ہیں، اور آخر میں جامعہ سلفیہ کے نقشے، علمی نمایش کے قائم جامعہ کے آیندہ منصوبوں اور اجلاس میں منظور کی گئی تجویزوں کا ذکر ہے، اجلاس کی مناسبت سے

تقریروں میں علم و تعلیم اور دعوت و تبلیغ کی اہمیت اور فائدے بیان کئے گئے ہیں، امام حرم کی متعدد تقریروں کے علاوہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی اور ڈاکٹر محمد عبداللہ عجلان (محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض) کی تقریریں مفید اور موثر ہیں، ہندوستانی مقررین میں کملاپتی ترپاٹھی، ہیم وتی نندن بہوگنا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد یوسف امیر جماعت اسلامی ہند اور ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ قابل ذکر ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی نے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ملک کے موجودہ ابتر حالات میں مسلمانوں کے داعیانہ فرائض بیان کئے ہیں، آخری حصے کے خاکوں اور نقشوں سے بنارس کی مختصر تاریخ و اہم واقعات اور ہندوستان میں تحریکِ اہل حدیث کی علمی، تبلیغی اور دینی سرگرمیوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، بعض خاکوں میں ہندوستان میں علم حدیث کے اہم مرکزوں اور ممتاز محدثین کا ذکر ہے اور بعض میں اہل حدیث کے گذشتہ اہم دینی اجتماعات، انکی موجودہ مرکزی و صوبائی شاخوں اور ہندوستان کے تمام صوبوں کا رقبہ، زبان، کل آبادی اور اُن میں مسلمانوں کی تعداد وغیرہ درج ہے، اس اعتبار سے یہ خاص نمبر ایک علمی و تاریخی دستاویز ہے، اس کو پڑھکر وہ لوگ بھی کانفرنس کی سرگرمیوں کا لطف حاصل کر سکتے ہیں، جو اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے،

مجلہ سیفیہ یادگار اقبال:۔ نگران جناب عبدالقوی دسنوی صاحب، مرتبہ حفظان احمد ہاشمی و محمد نعمان انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۳ مصور قیمت درج نہیں پتہ سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال،

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کی جانب سے متعدد کتابوں کے علاوہ ایک سالانہ مجلہ بھی شایع ہوتا ہے، ۱۹۷۸ء کا مجلہ علامہ اقبال مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ڈاکٹر صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس میں محوی صدیقی کی نظم

بڑی موثر ہے، دوسرا حصہ نثری مضامین کا مجموعہ ہے، اس کی ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے جاوید اقبال کے دو خطوط درج ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کے بھوپال کے سفر کے بارے میں پروفیسر عبد القوی دسنوی صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے استفسار کے جواب میں تحریر کئے گئے ہیں، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لائق استاذ ڈاکٹر عبد الحق نے اقبال صدی تقریبات میں اقبال سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں کا اچھے انداز سے جائزہ لیا ہے، علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں (ڈاکٹر سید حامد حسین) اقبال کی شاعری میں وطنیت کا تصور (پروفیسر سید حامد جعفری) اقبال کا تعارف عالم عرب میں (اقبال مسعود ندوی) اقبالیات اور بھوپال (محمد نعمان خان) اچھے مضامین ہیں، دوسرے مضامین میں اقبال کے تغزل اور دوسرے اصناف کلام کی خصوصیات بیان کر کے ان کے افکار و خیالات کی وضاحت کی گئی ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر وطنیت، مارکسزم اور عورت کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا ذکر ہے، زیادہ تر مضامین سیفیہ کالج کے اساتذہ و طلبہ کے قلم سے ہیں، طلبہ کے مضامین ان کی اچھی استعداد و صلاحیت کے غماز ہیں، تیسرے حصہ میں کلام اقبال کا انتخاب ہے جو طلبہ و طالبات ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، انتخاب کے تین حصے ہیں، ایک میں گل و لالہ، دوسرے میں پرندوں اور تیسرے میں خودی سے متعلق اشعار نقل کئے گئے ہیں، شروع میں صدر شعبہ نے اپنے اداریہ میں مختلف حیثیتوں سے بھوپال سے اقبال کے تعلقات کا ذکر کیا ہے، آخر میں سیفیہ کالج کے مختلف شعبوں کی کارگزاری تحریر کی گئی ہے، یہ مجلہ نفاست و سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اس کے لیے جناب عبد القوی دسنوی اور ان کے معاونین تحسین کے مستحق ہیں۔

الفرقان عدیل عباسی نمبر؛ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۔ قیمت سالانہ ۵ روپیہ، پتہ دفتر الفرقان نیا گاؤں نظیر آباد لکھنؤ

یہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کا اگست و ستمبر ۸۰ء کا مشترک شمارہ ہے جو مشہور قومی و ملی کارکن اور دینی تعلیمی تحریک کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی یادگار میں شائع ہوا ہے، اس نمبر کی خاص اور اہم چیز مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے قلم سے قاضی صاحب مرحوم کی کتاب "تحریک خلافت" کی تلخیص ہے، یہ کتاب بعض حیثیتوں سے مختلف فیہ ہو گئی ہے، اس تلخیص میں بھی اس کے بعض قابل اعتراض امور کا ذکر ہے، مگر یہ ناکافی ہے، اس کے علاوہ قاضی صاحب کی سیرت و شخصیت پر فاضل مرتب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا شکیل عباسی ندوی کے موثر مضامین بھی ہیں، ایک مختصر مضمون ان سطروں کے راقم کا بھی معارف سے نقل کیا گیا ہے،

رگ سنگ شخصیات نمبر ۱۔

مرتبہ جناب فیروز بوبیہ صاحب کتابت و طباعت بہتر، سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۴ روپیئے پتہ ۴۲/۴۴ کھنیا بازار کانپور،

یہ رسالہ چند برسوں سے نکل رہا ہے، اس خاص نمبر میں مختلف طبقوں کے چند ممتاز اشخاص کے فضل و کمال کا تذکرہ ہے پہلے مذہبی اشخاص پھر شعرا کا تذکرہ ہے، اور آخر میں ادیبوں کے متعلق مضامین ہیں، ایک مضمون مشہور طبیب اسحاق بن حنین اور دوسرا لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر اور قوم و ملت کے بے لوث خادم عبدالجلیل فریدی مرحوم پر بھی ہے، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب پرانے چراغ سے ماخوذ ہے بعض اور مضامین بھی ماخوذ ہیں، مذہبی شخصیتوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا فخرالدین سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور مصر کے عبدالقادر عودہ شہید پر مضامین ہیں لیکن اسی حصہ میں عبدالرزاق قریشی مرحوم از ڈاکٹر خورشید نعمانی بھی درج ہے، مضمون اچھا ہے، لیکن اس کو ادیبوں کے ضمن میں نقل کرنا چاہیئے تھا، شعرا میں حسرت، سیماب، نوح ناروی، جگر، امجد حیدرآبادی، اثر لکھنوی،

احسان دانش اور شاد عارفی پر مضامین ہیں، اسی حصہ میں مولانا شبلی کی اردو میں مذہبی تاریخی شاعری پر بھی ایک مضمون ہے، ایک اور مضمون میں راجستھان کی موجودہ ادبی و شعری حالت کا جائزہ لیا گیا ہے، ادبائے عظام کے زیرِ عنوان مسعود حسن ادیب، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر زور، پروفیسر ہارون خاں شروانی، شوکت تھانوی، ڈاکٹر مسیح الزماں اور عامر عثمانی کا تذکرہ ہے لیکن اس فہرست میں بعض ناموں کا ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے، مضامین اوسط درجہ کے ہیں لیکن دلچسپ ہیں،

صفیر:- مرتبہ جناب راہی فدائی صاحب کتابت و طباعت اچھی سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت درج نہیں پتہ ادارہ صفیر، انجمن ترقی اردو، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور،

یہ جنوبی ہند کی ایک قدیم دینی درسگاہ مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کا سالنامہ ہے، جو اس درسگاہ کے طلبہ کی انجمن ترقی اردو کی جانب سے سلیقہ مندی سے شائع کیا گیا ہے، ہمارے پیشِ نظر سنہ ۶۰ء اور سنہ ۶۱ء کے سالنامے ہیں جن میں وہاں کے طلبہ و اساتذہ اور قدیم فارغین کے علاوہ بعض دوسرے اہلِ قلم کے مضامین و منظومات ہیں، دونوں شمارے مفید اصلاحی و دینی مضامین پر مشتمل ہیں، ایک شمارہ میں بانی مدرسہ مولانا شاہ عبدالوہاب قادری اور دوسرے میں ان کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین محمد کا تذکرہ ہے، دونوں مضامین میں ان بزرگوں کے موثر حالات و واقعات درج ہیں، دونوں شماروں میں مدرسہ کی سالانہ تعلیمی رپورٹ بھی درج ہے اور ان میں وہاں کے موجودہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، طلبہ کے مضامین بھی اچھے ہیں،

گلشن:- مرتبین مولانا عبدالاحد ازہری و مولانا محمد حنیف ملی، سائز ۲۰×۳۰/۸، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، صفحات ۲۲۲ پتہ معہد ملت، رسول پورہ، مالیگاؤں،

معہد ملت مہاراشٹر کے صنعتی شہر مالیگاؤں کی مشہور دینی درسگاہ ہے، اس سے مالیگاؤں ہی نہیں پورا مہاراشٹر فیضیاب ہو رہا ہے، یہ اس کا سالنامہ ہے، اس میں درسگاہ کے بانی و سرپرست اور مہاراشٹر کے قدیم ملی و قومی کارکن مولانا عبدالحمید نعمانی پر متعدد مضامین درج ہیں، جن سے ان کے حالات و خدمات اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، مدرسہ کی گذشتہ کارگذاری، تعارف اور اہم خصوصیات کے متعلق بھی مضامین درج ہیں بعض منظومات میں بھی معہد ملت کی خصوصیات کا ذکر ہے، ملک و بیرون ملک کے متعدد مشاہیر اہل علم کے تأثرات علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت نقل کئے گئے ہیں، مختلف علمی، دینی اور ادبی موضوعات پر اوسط درجہ کے مضامین اور ترجمے بھی بڑی تعداد میں درج ہیں، آخر میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی ایک مفید اور پُر مغز تقریر بھی شامل ہے، یہ مدرسہ کے ختم بخاری کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی، اس میں بخاری شریف کی آخری حدیث کی موثر اور دلنشین تشریح کی گئی ہے، اس نمبر کا یہ امتیاز بھی ہے کہ اکثر مضامین معہد ملت کے اساتذہ، فضلاء اور طلبہ کے قلم سے ہیں، لیکن ابھی یہ ان کی پہلی کوشش ہے اس لئے بعض مضامین میں اطناب، تکرار، لفاظی اور خطیبانہ رنگ نمایاں ہے، تاہم اس گلشن کی چمن بندی رنگ برنگ پھولوں سے کی گئی ہے اور یہ مرتبین کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے،

فاران جگر نمبر:- مرتبہ جناب اسمٰعیل احمد مینائی، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۰، چندہ سالانہ ۵ روپیہ، قیمت خاص نمبر دس روپیہ، پتہ دفتر ماہنامہ فاران ۲/۱۴ بہادر آباد کراچی۔ پاکستان۔

ماہنامہ فاران کراچی ماہر القادری مرحوم کی یادگار ہے اب یہ اسمٰعیل مینائی کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس خاص نمبر میں جگر مرادآبادی کے متعلق مضامین و منظومات کے علاوہ انکی بعض تحریریں اور نظمیں بھی شائع کی گئی ہیں، تسنیم مینائی کے طویل مضمون میں جگر صاحب کے تعلق سے کئی مشاعروں کا ذکر ہے اور اس سے جگر صاحب کے متعدد دلچسپ واقعات و حالات معلوم ہوتے ہیں، ایک اور قابل ذکر مضمون نواب شمس الحسن بن نواب سید علی حسن کا ہے انھوں نے بھی جگر صاحب کے بعض دلچسپ واقعات سنائے ہیں، ایک مضمون جگر کے ماہر ڈاکٹر محمد اسلام کا بھی ہے، غرض جگر صاحب پر یہ مختصر اور طویل مضامین کا اچھا مجموعہ ہے،

شیرازہ فوق نمبر: مرتبہ جناب محمد احمد اندرابی، کتابی سائز، کتابت وطباعت، کاغذ بہتر، صفحات ۱۹۰، قیمت سالانہ دس روپے فی شمارہ ۲ روپیہ، پتہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، لال منڈی، سری نگر، کشمیر۔

محمد الدین فوق مرحوم اردو کے مشہور ادیب، صحافی اور کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے سرگرم مجاہد تھے انھوں نے کشمیر، اس کی اقوام اور اشخاص کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی تھیں اور ان کے ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی گوناگوں تعلقات تھے، کلچرل اکیڈمی نے فوق کی یاد میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا، اکیڈمی کے رسالہ شیرازہ نے اس خاص نمبر میں سیمینار کے اکثر مضامین کو شایع کیا ہے، اس میں فوق کے حالات، شاعری، تاریخ نگاری اور دوسرے خدمات ادب نیز کشمیر کی آزادی میں ان کی جدوجہد کا تذکرہ ہے، یداللہ سلیم ڈار کا فوق سے تصوراتی انٹرویو ایک دلچسپ مضمون ہے، اس میں انھوں نے اپنے سوالات کا جواب فوق کے شعروں سے دیا ہے، منظوم حصہ میں خود فوق کی نظمیں اور ان کی وفات پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں، شروع میں فوق کی تصویریں اور شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ کشمیر کا پیغام اور آخر میں فوق کی تصنیفات کی فہرست ہے،

تعمیر حیات خصوصی شمارہ : مرتبین، جناب نور عظیم، شمس الحق، محمود الازہار ندوی صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۴، قیمت ۵ روپے، پتہ، مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

سنہ ۱۹۷۹ء دار العلوم ندوۃ العلماء کے لیے عام الحزن تھا، اس میں اس کے تین لایق اور اہم فرزندوں مولانا عبد السلام قدوائی معتمد تعلیم، مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی اور مولوی محمد اسحاق جلیس اڈیٹر تعمیر حیات نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا ان سب کا دار المصنفین سے تعلق بھی کم نہ تھا، خصوصاً مولانا عبد السلام قدوائی مولانا سید سلیمان ندوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور آخر عمر میں دار المصنفین سے وابستہ ہو کر اس کے

رفقا کی علمی رہنمائی کر رہے تھے، گذشتہ برس ندوہ کے آرگن پندرہ روزہ تعمیر حیات نے تینوں کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کر کے ان کے نام نیک کو ضایع ہونے سے بچا لیا، اس کا پہلا حصہ مولانا عبد السلام مرحوم پر مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین کے مضامین بڑے اثر انگیز ہیں، ڈاکٹر مشیر الحق اور مولانا ابو العرفان ندوی کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں، دوسرے اور تیسرے حصہ میں بالترتیب مولانا محمد الحسنی اور مولوی محمد اسحاق جلیس کا ذکر خیر ہے، ان دونوں حصوں میں بھی مولانا علی میاں کے درد بھرے مضامین ہیں، ان کے علاوہ مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی اور مولانا محمد رابع کے مضامین بھی اچھے ہیں، نمبر کے مرتب مولوی نور عظیم ندوی کے تاثرات بھی پڑھنے کے لایق ہیں، اس نمبر کے اکثر مضامین فرزندان ندوہ کے قلم سے ہیں لیکن دوسرے اہل قلم کے مضامین سے بھی یہ خالی نہیں ہے، اس سے تینوں حضرات کے حالات و کمالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے،

دعوت ایسوڈو دی نمبر۔ مرتبہ، جناب محمد مسلم صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اخباری، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت تین روپے پچاس پیسے، پتہ دفتر دعوت ۱۲۵ سوئیوالان نئی دہلی،

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی کے انتقال کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی جماعت کے مختلف اخباروں اور رسالوں نے خاص نمبر شایع کئے تھے، یہ خاص نمبر جماعت اسلامی ہند کے ترجمان دعوت نے مولانا کی وفات کے بعد شایع کیا تھا جو جماعت کے پاکستانی و ہندوستانی اہل قلم کے علاوہ دوسرے حلقوں کے بعض ارباب قلم کی تحریروں اور نظموں پر مشتمل ہے، ایک مضمون خود مولانا کے قلم سے بھی ہے، اس کی حیثیت خود نوشت حالات کی ہے، اس کے علاوہ ان کے متوسلین وغیرہ کے انٹرویو بھی شامل ہیں، ان سے ان کی سیرت، شخصیت اور عظمت کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں، بعض اخباروں کے تراشے اور ملک بیرون ملک کے تعزیتی پیغام بھی دیے گئے ہیں، مولانا اشخاص کے معاملہ میں بیجا غلو اور عقیدت مندی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن خود اس نمبر میں اس کی جھلک آگئی ہے "مدض"

مطبوعاتِ جدیدہ

پرانے چراغ حصہ دوم معہ تکملہ سینے کے داغ | مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۳۱ مجلد مع گرد پوش

قیمت ، درج نہیں، پتہ - مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنو،

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور و مقبول کتاب "پرانے چراغ" کا دوسرا حصہ ہے، اس میں مولانا نے مختلف عنوانات کے تحت بہت دلکش انداز میں کئی مرحوم معاصرین کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، ہر عنوان کے تحت چار شخصیتوں کی زندگی کے خط و خال نمایاں کیے ہیں، اس طرح چھ عنوانوں کے تحت یہ چوبیس اصحابِ علم و کمال کے سوانحی خاکے ہیں، اہل کمال و مشاہیر کی بزم میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان رونق افروز ہیں، پھر اُن لوگوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جن کی بزرگانہ شفقتوں سے لائق مصنف ممتع ہوتے رہے ہیں، اور یہ الحاج مفتی امین الحسینی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، اور مولانا محمد سلیم کیرانوی ہیں، ادیبوں اور انشا پردازوں کی انجمن مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر، ماہر القادری سے سجائی گئی ہے، علمائے کرام کی صف میں، مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ بہجت البیطار شامی، مولانا عبدالعزیز میمن اور مولانا محمد اویس نگرامی نظر افروز ہیں، ایک حصہ ان کے معاصر دوستوں کی نذر ہے، جن میں صوفی عبدالرب، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مولانا عبدالسلام قدوائی، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں،

آخر میں تین خاندانی عزیزوں مولانا سید ابوالخیر برق، امۃ اللہ تسنیم، مولانا محمد الحسنی اور ایک ندوی شاگرد و عزیز مولوی اسحاق جلیس کا ذکر خیر ہے، اسی حصہ کا نام "سینے کے داغ" ہے، ان سب اشخاص سے مولانا کی برسوں شناسائی اور قربت رہی ہے اور انھوں نے ہر ایک کی زندگی کا مشاہدہ گہرائی سے کیا ہے، اسلئے ان کے اخاذ ذہن اور دراک طبیعت نے ایسا سراپا بیان کیا ہے کہ ان حضرات کی چلتی جاگتی اور ایسی تصویریں سامنے آگئی ہیں جن سے ناظرین خود بھی ان کے کمالات کا مشاہدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے، مولانا کی باریک بین نظر جس طرح فضائل و محاسن پر پڑی ہے اسیطرح سیرت و شخصیت کی خامیاں اور بشری کمزوریاں بھی ان سے اوجھل نہیں رہی ہیں لیکن انکی شیریں بیانی سے زہر ہلاہل بھی قند بن گیا ہے، کوئی مضمون ادب و انشا کی دلفریبی و بانکپن، تحریر کی بے ساختگی و برجستگی، زبان کی روانی و سلاست، انداز بیان کی تازگی و شگفتگی اور فکر و خیال کی رعنائی و دلآویزی سے خالی نہیں، یہ پورا مجموعہ مصنف کے حسن مذاق، لطافت طبع، پختہ اور رچے ہوئے ادبی ذوق کا صحیفہ بن گیا ہے، مگر اسکی طباعت غالباً عجلت میں ہوئی ہے، اسلئے کہیں کہیں تاریخوں اور سنین کی غلطیاں ہیں، مثلاً مولانا مسعود علی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں، "جشن (دارالمصنفین کی طلائی جبلی) کے بعد وہ آٹھ، نو مہینے اور زندہ رہے..... آخر یکم شعبان ۱۳۸۵ھ (۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء) کو بزم شبلی کی یہ شمع بھی آخری طور پر بجھ کر رہ گئی" (ص ۱۱۳ و ۱۱۴) جبکہ مولانا کی وفات ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۶۶ء کو ہوئی تھی اور جشن کے بعد وہ تقریباً ڈھائی برس تک زندہ رہے، ص ۲۳۱ پر دمشق یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تاریخ ۲۳ جون اور ص ۲۳۲ پر اسی تقریر کی تاریخ ۲۳ جولائی تحریر کی ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر تاریخ غلط ہے، بعض جگہ تو تاریخیں درج ہونے ہی سے رہ گئی ہیں (ص ۱۴۰) مولانا عبدالباری ندوی کے بارہ میں رقمطراز ہیں "ان کا مضمون معجزات پر جو سیرۃ النبیؐ کے پانچویں حصہ میں شامل ہے" (ص ۱۲۳) حالانکہ یہ مضمون سیرت کے تیسرے حصہ میں ہے، مولانا نے جن حضرات کے تذکرے لکھے ہیں ان میں سے بعض کے اپنے نام کے خطوط بھی نقل فرمائے ہیں، مگر عام قارئین کیلئے توضیح کے بغیر انکے بعض مندرجات کا سمجھنا مشکل ہے، اسلئے ان پر فٹ نوٹ ضروری تھا، ص ۲۳۰ پر یہ مصرعہ "میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی" نقل کیا ہے اور اسکو اقبال کا بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں، مولانا شبلیؒ نے مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام کے ایک خطبہ مورخہ ۵ جون ۱۸۹۹ء میں اسے اسطرح لکھا ہے، ؎ "میرے ویرانہ میں ہو جائیگی دم بھر چاندنی"، کتابت و طباعت کی غلطیوں سے قیام گاہ (ص ۱۰۲) تعمیر (ص ۱۰۰) سند (ص ۱۱۶) گلی (ص ۱۲۱) فائل (ص ۱۵۱) مکان (ص ۲۰۲) تذکرا در

مضمون (ص۱۱۲) اور دواعی (ص۱۱۴) حذف ہوگئے ہیں اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام فضل الرحمٰن لکھ گیا ہے، ص۱۲۱-۱۲۲ میں اپنی عمر ۹۰ سال بتائی ہے (ص۱۱) لیکن سنہ ۱۹۳۵ء میں دس سال بتائی ہے (ص۲۳) اس سے آئندہ ان کی عمر کا سنہ تعین کرتے ہیں مشکل پیدا ہوگی،

مولانا علی میاں اپنی کتابوں کو بہت عمدہ اور صحیح چھپوانے کا اہتمام کرتے ہیں لیکن اپنی گوناگوں مشغولیتوں کی وجہ سے یہ کام اپنے شاگردوں اور عزیزوں کے سپرد کر دیتے ہیں، یہ غلطیاں ان ہی کی وجہ سے ہوئی ہیں، انکی نشاندہی کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان کو درست کر دیا جائے،

ابن کثیر کمورخ (عربی) ۱۔ مرتبہ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی، بڑا سائز، طباعت ٹائپ، صفحات ۳۰۲، قیمت چالیس روپے، پتہ پبلیکیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی آٹھویں صدی ہجری کے نامور محدث، مفسر اور مورخ تھے، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، اس مقالہ کے دو جز ہیں، پہلا حافظ ابن کثیر کے حالات و کمالات کا مجموعہ ہے، اور دوسرا ان کی شہرۂ آفاق تاریخی تصنیف البدایہ والنہایہ کے جائزہ و تبصرہ پر مشتمل ہے، دونوں اجزا کی ضخامت کی وجہ سے ان کو علحدہ علحدہ دو مستقل کتابوں کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، پہلے جز کا معارف میں ذکر آچکا ہے، یہ دوسرا جز ہے، اس میں مورخ کی حیثیت سے ابن کثیر پر گفتگو کی گئی ہے، اس غرض سے ان کی کتاب البدایہ والنہایہ کا جائزہ دقت نظر سے لیا گیا ہے، یہ چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب زیادہ اہم اور طویل ہے، اس میں مصنف نے ابن کثیر کی کتاب کے ماخذ و مصادر پر بڑی محنت سے بحث کی ہے، البدایہ والنہایہ کے اصلاً دو حصے ہیں، پہلا حصہ ابتدائے آفرینش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے کے واقعات و حالات کا مجموعہ اور اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے، اسی لئے اس کا نام البدایہ رکھا ہے اور دوسرے میں ہجرت نبویؐ سے اپنے زمانہ تک کے سنہ وار واقعات بیان کئے ہیں اور ہر طبقہ کے مشاہیر کے تراجم لکھے ہیں اس لئے اس کا نام النہایہ رکھا ہے، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن نے مصادر کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں کر دی ہیں، پہلی قسم تخلیق عالم اور انبیاء کے

قصص پر مشتمل ہے، دوسری میں سیرت نبویؐ کا ذکر ہے اور تیسری میں خلافت راشدہ سے مصنف کے زمانہ تک کو شامل کیا ہے، پھر انھوں نے البدایہ والنہایہ کے مضامین کا تجزیہ کرکے ہر قسم کے ماخذ پر علٰحدہ علٰحدہ گفتگو کی ہے، پہلی قسم کے اہم ماخذ کتب تفسیر، صحف سماوی و احادیث کے مجموعے بتائے ہیں اور ان پر تین فصلوں میں گفتگو کی ہے، پہلی فصل میں ان تفسیروں کا ذکر ہے جن سے البدایہ والنہایہ کی ترتیب و تالیف میں مدد لی گئی ہے، دوسری فصل میں قرآن مجید سے پہلے کی اُن آسمانی کتابوں کا تذکرہ ہے جو ابن کثیر کا ماخذ تھیں، اسی طرح تیسری فصل میں صحاح، سنن، مسانید، معاجم، اطراف اور بعض شروح کو ابن کثیر کے ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، دوسری یعنی سیرت نبویؐ کے ماخذ دو فصلوں میں بیان کئے گئے ہیں، پہلی میں سیر و مغازی کی کتابوں کا ذکر ہے اور دوسری میں امام بیہقی اور امام ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے علاوہ متعدد اور کتابوں کا ذکر ہے، تیسری قسم کے اصلی اور خاص ماخذ تاریخی کتابیں ہیں، اس قسم کے تین حصے کر دئے ہیں، پہلے حصہ میں خلافت راشدہ اور اموی حکومت کے ماخذ دو فصلوں میں بیان کئے ہیں، دوسرے حصہ میں دولت عباسیہ کے ماخذ ایک فصل میں لکھے ہیں، تیسرا حصہ دولت ممالیک بحریہ کے ماخذ کے ذکر میں ہے، اسکی پہلی فصل میں اُن معاصر تاریخوں کا تذکرہ ہے جن سے ابن کثیر نے اپنی تاریخ کے اس حصہ میں مدد لی ہے اور دوسری فصل میں غیر کتابی ماخذ یعنی ابن کثیر کے ذاتی مشاہدات، براہ راست معلومات، سماعی واقعات، شاہی فرامین، دستاویزات اور خطوط وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے ابن کثیر کے جن ماخذ کی نشاندہی کی ہے، اُن میں سے جو ان کو دستیاب ہو سکے ہیں انکا البدایہ والنہایہ کے حوالوں سے مقابلہ بھی کیا ہے، اور ان پر ابن کثیر کے نقد و اعتراض کا ذکر بھی کیا ہے، اور احادیث و روایات کی صحت و ضعف کے متعلق ان کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، اسی طرح ان ماخذ کے بارہ میں یہ بھی بتلایا ہے کہ ابن کثیر نے ان سے براہ راست اخذ و استفادہ کیا تھا یا بالواسطہ، اس ضمن میں انھوں نے کہیں کہیں ابن کثیر کی تاریخ کے بعض اہم خصوصیات بھی تحریر کئے ہیں، دوسرے باب میں اس منہج کا ذکر ہے جسکو ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں مدنظر رکھا ہے، تیسرے باب میں انکے اسلوب تحریر اور انداز بیان کی خصوصیات دکھائی ہیں، چوتھے باب میں البدایہ والنہایہ کی قدر و قیمت، انکی جامعیت، استناد اور حسن قبول وغیرہ کا ذکر ہے، گو مصنف نے کہیں کہیں ابن کثیر پر نقد بھی کیا ہے مگر یہ سرسری ہے، ابن کثیر کا زمانہ اسلامی تاریخ میں بہت اہم ہے، تاتاریوں نے دنیائے اسلام کو تہ و بالا کر دیا تھا، ابن کثیر اُن واقعات کے عینی مشاہد تھے، اسلئے انکی تاریخ کا آخری حصہ اس دور کا اہم ماخذ ہے، مصنف کو اس حیثیت سے بھی انکی تاریخ کا جائزہ لینا چاہئے تھا، بعض

مباحث کا تکرار اور اعادہ بھی ہے، آخر میں کئی فہرستیں اور اسماء و اعلام کے اشاریے بھی دیئے ہیں،

شراب اور اس کا اسلامی موقف، مرتبہ جناب حافظ بشیر الحق قریشی ادھونی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹، قیمت تین روپیہ پچاس پیسے، پتہ (۱) گوہر بک ڈپو، ٹرپلیکین ہائی روڈ مدراس (۲) ہندوستان بک ڈپو، جامع مسجد ادھونی (آندھرا)

شراب ام الخبائث ہے، زیر نظر کتاب میں قرآن و حدیث کے نصوص سے اس کی حرمت واضح کی گئی ہے اور عیسائی مذہب کے رو سے بھی اسے قبیح بتایا گیا ہے، مصنف نے اسلام میں شراب کی حرمت کے احکام تدریجاً نازل کئے جانے کی غرض و حکمت بھی بیان کی ہے اور اس کے طبی، اقتصادی اور معاشرتی نقصانات بھی تحریر کئے ہیں، اس سلسلہ میں مغربی مفکرین کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو اسے بطور دوا جائز کہتے اور چستی کا سامان سمجھتے ہیں، آخر میں اسلامی قانون میں شراب نوشی کی سزا کو بالکل مناسب اور موزوں ثابت کیا گیا ہے، یہ سنجیدہ اور مفید کتاب مطالعہ کے لائق ہے،

کاغذ کا شہر، مرتبہ ڈاکٹر ساغر اعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۶، مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت پندرہ روپیہ، پتہ کیا ئنڈ کلینک، فیض آباد روڈ، بارہ بنکی۔ یو۔پی

ڈاکٹر ساغر اعظمی مشاعروں میں چمک دمک دکھانے کے بعد کاغذ کا شہر لیکر پہلی بار کتابی دنیا میں داخل ہوئے ہیں، ان کا شہر دنی کے لوگوں سے معمور ہے، یہاں طمع کاری، اداکاری، فریب اور تصنع کا چلن ہے، کتمان حق، جرم کی پردہ پوشی، بے انصافی، سفاکی، بربریت اور اہل سیاست کی بازیگری عام ہے، مروت، شرافت، ہمدردی، خلوص اور حسن سیرت ناپید ہے، صبا کے دامن میں انگارے دھک رہے ہیں اور ٹھنڈی فضاؤں اور گھنیری چھاؤں میں بھی جسم، روح اور احساس جل رہا ہے، اس ماحول نے ساغر کی شاعری میں تلخی پیدا کر دی ہے لیکن ذغم دوراں کا مداوا غم جاناں کو سمجھے ہیں اسلئے حسن و عشق کے نغمے بھی دلکش پیرایہ میں بیان کرتے ہیں مگر انکے مجموعہ میں سطحیت، ناہمواری اور حد سے بڑھی ہوئی شوخی و بیباکی کے علاوہ بعض اور خامیوں سے بھی کور کسر ہے، اگر وہ محنت، مطالعہ اور اپنی تربیت سے غافل نہ رہے تو عوامی مقبولیت کی طرح خواص کا مرکز توجہ بھی بن جائیں گے۔

"ض"

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند ۵ا کتابوں پر مشتمل ہے اسی کے تحت عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے حصۂ اول میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی ماخذوں کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے، اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں (خصوصاً) مغل فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے، اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور مردم نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت ۔۔۔ ۷ روپیے (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن)

تبع تابعین حصۂ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں امام ابوحنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور ان کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے اور حصہ دوم میں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مسعودی اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے ۴۴ صاحب تصنیف اور صاحب عزت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،

مرتبہ محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین

قیمت:۔۔ ۲۰

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو اور فارسی کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

(مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی)

قیمت:۔ ۰۰-۱۲

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں احادیث نبوی کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، یہ احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں، محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں اور نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا، اُن کے مجموعے مرتب کیے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین و تبع تابعین کے مقدس سلسلہ کے مکمل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاریؒ پر ایک مضمون اور صاحب موطا امام مالکؒ کی سوانح عمری وہ لکھ بھی چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے بعد ان کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیر ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالکؒ اور ائمہ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام عبد الرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن [illegible] طحاوی وغیرہ کے حالات سوانح اور فن حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات سوانح اور اُن کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بقیہ اور اس کے بعد کے تمام قابل ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی،

قیمت حصہ اول [illegible] قیمت حصہ دوم [illegible] "منیجر"

رجسٹرڈ نمبرال ۵۲۰ فروری ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

دار المصنفین کی نئی کتاب

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی سے لیکر ۱۹۶۹ء تک غالب کی مدح و قدح میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں،

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۸ء تک اُن کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے،

قیمت:۔ ۱۸ روپئے،

حصہ دوم

اس میں مرزا غالب کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے

قیمت:۔ ۱۲ روپیے،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۲۷ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

معارف کی سالانہ قیمت میں اضافہ

کاغذ، کتابت، طباعت ہر چیز کی شدید گرانی کی وجہ سے معارف کا سالانہ زرِ اعانت جنوری سنہ ۱۹۸۱ء سے پندرہ روپیے کے بجائے بیس روپیہ کر دیا گیا ہے، خریداران معارف آئندہ خریداری کے لئے بیس روپیے ارسال فرمائیں۔

شذرات

معارف کے تین گذشتہ شذرات مین مسلمان غداروں کا ذکر آیا ہے جن کو پڑھ کر ہمارے بعض ناظرین بددل اور ملول ہوئے ہونگے کہ کیا مسلمانوں میں غدار ہی غدار پیدا ہوتے رہے۔

دوسری قوموں مین اس قسم کے جو غدار پیدا ہوئے، ان کی بہیمانہ حرکتوں کی تفصیل پڑھ کر ہمارے ناظرین اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جو کچھ ہوا اس کی دردناکی اور قوموں کے مقابلہ میں کم ہے، یونان کا نامور فرمانروا یعنی سکندر اعظم کا باپ فلپ ایک قاتل کے خنجر سے اجل کا شکار ہوا، سکندر اپنی فتوحات کی معرکہ آرائیوں کی ایک ولولہ انگیز داستان چھوڑ گیا ہے لیکن جب وہ مرا تو اس کے خود غرض اور مفاد پرست سپہ سالاروں نے اپنے زیر اثر ممالک پر خود مختار حکومتیں قائم کرلیں جس کے بعد شدید خانہ جنگی میں اتنا خون بہا کہ سکندر کی سلطنت کھنڈروں میں تبدیل ہوگئی، اور ان ہی کے ملبوں پر مصر، شام اور مقدونیہ کی حکومتیں قائم ہوئیں۔

رومن امپائر پر یورپ کو فخر ہے، مگر وہاں کی غداریوں کی تاریخ اور بھی زیادہ ہولناک ہے، سیزر بہت بڑا فاتح گذرا ہے، اس کی سپہگری اور معرکہ آرائی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے، مگر روم کے سینیٹ نے اسکو دشمن ملک قرار دے کر اسکو اقتدار سے برطرف کرنے کی کوشش کی، اس کا حریف پومپی بن گیا، سیزر سے لڑا لیکن شکست کھا گیا، روم کے کمسن حکمران ٹولومی دوازدہم کے وزیروں نے اسکو ہلاک کر دیا، ٹولومی کی بہن کلوپیٹرا جلا وطن کر دی گئی تھی لیکن وہ اپنے بھائی کے خلاف فوج جمع کرکے اس سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی، سیزر نے اس کا ساتھ دیا، کلوپیٹرا کی چھوٹی بہن اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ان دونوں سے لڑی، مگر انکے ہاتھوں گرفتار ہوئی، کمسن ٹولومی ہلاک کر دیا گیا، اسی کی لاش پر سیزر کی مدد سے کلوپیٹرا ملکہ بنائی گئی اسکے

خلاف بغاوت ہوئی تو سیزر نے قتل عام کرایا۔

سیزر نے افریقہ، پرودنس، اندلس، ایشیائے کوچک، کارتھج اور کورنتھ کو فتح کرکے رومن امپائر کو وسیع کرکے بڑی شہرت حاصل کی لیکن اس کے سینیٹ کے کچھ ارکین نے اس سے غداری کرکے اسکو قتل کر دیا، جس کا سربراہ بروٹس تھا، مگر بروٹس کو اس کی غداری کی سزا اس طرح ملی کہ سیزر کا جانشیں انٹونی ہوا، انٹونی کا حریف سیزر کے بھائی کا پوتا اوک ٹی وی ایس بن گیا تو اسکے حامی سسرو نے انٹونی سے لڑکر اس کو شکست دی لیکن غدار اوک ٹی وی ایس نے اپنے محسن سسرو کو انٹونی کے حوالے کر دیا، جس نے اسکو بے رحمی سے ہلاک کر دیا۔

انٹونی نے کلوپٹرا کو اپنی محبوبہ بنایا، وہ اوک ٹی وی ایس کو بے دخل کرنا چاہتا تھا لیکن اوک ٹی وی ایس نے اپنی بہن سے اس کی شادی کرکے اپنی جان بچائی، انٹونی نے بعد میں اس کی بہن کو طلاق دیدی اور کلوپٹرا سے شادی کرلی، جس کے بعد وہ رومن امپائر کا شہنشاہ اور کلوپٹرا ملکہ بنی، مگر دونوں کے خلاف بغاوت ہوئی، باغیوں کی سرکشی بڑھی تو انٹونی اور کلوپٹرا دونوں نے خودکشی کرلی،

اوک ٹی وی ایس نے آگسٹس کے نام سے حکومت کی، اس کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس کی ایک لڑکی جولیا تھی جس کی شادی اگری پاسے ہوئی لیکن وہ جلد ہی وفات پاگیا، اس کے دو لڑکے تھے لیکن آگسٹس ان دونوں کو نظر انداز کرکے اپنی بیوی لیویا کے پہلے شوہر کے لڑکوں ٹائبریس اور ڈروس کی طرف مائل ہوگیا، ٹائبریس سے اس کی چہیتی بیوی کو طلاق دے کر اپنی بیوہ لڑکی جولیا سے شادی کرنے پر اصرار کیا، مگر اس نے انکار کیا، تو وہ جلاوطن کر دیا گیا، خود جولیا بدچلن ہوگئی تو باپ نے شرمندہ ہوکر اس کو بھی دربدر کر دیا۔

رومن امپائر کا ایک مشہور حکمران کلاڈی ایس ہوا ہے اس کی بیوی مسالینا اس پر حاوی تھی، اسی کے ساتھ اپنے ایک عاشق سے ساز باز کرکے اس کو حکومت میں نمایاں جگہ دیدی، کلاڈی ایس نے

[illegible] کا جانشین [illegible] ہوا [illegible] عصمت [illegible] اپنے
شوہر سے ایک [illegible] کی جانشین [illegible] سے [illegible]
تو وہ کلاڈیس کی مقتول بیوی [illegible] عیسائی کے لڑکے کی [illegible] ہو گئی جس کے بعد اس نے کلاڈیس
کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

کلاڈیس کا جانشین نیرو ہوا جس کا ظلم ضرب المثل بنا ہوا ہے، اس نے کسی کو زہر دے کر مارا، اپنے حریفوں کو بے دریغ قتل کرایا، اپنی بیوی اوکٹاویہ کو طلاق دے کر موت کے گھاٹ اتارا، پھر اپنے ایک دوست کی بیوی سے شادی کی لیکن تین سال کے بعد اسکو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا [illegible] میں روم میں زبردست آگ لگی جس کا بڑا حصہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا، روم آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا تو وہ بیٹھا بانسری بجا رہا تھا، روم کے لوگوں کو شبہ تھا کہ یہ آگ اسی نے لگوائی، وہ عیسائیوں کو آگ میں ڈال کر ہلاک کراتا، اسکے زمانہ میں برطانیہ اسی کے ماتحت تھا، اسکے ایک گورنر پولی نس اور اسکے کمسن رومن حکام نے ملکہ بوڈیکا کو کوڑے سے پٹوایا، اسکی لڑکی کی عصمت ریزی کی، بوڈیکا نے زہر کھا کر جان دیدی، نیرو کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر لوگوں نے اسکو مار ڈالنے کی سازش کی تو اس نے قتل عام کا حکم دیا، ان پر قابو پا کر وہ اپنے کو تمام دنیا کا شہنشاہ تصور کرنے لگا، لیکن لوگوں کی مخالفت اس سے بڑھی تو اس نے خود اپنے کو ہلاک کر لیا۔

اس کے بعد گلبا شہنشاہ ہوا، تو وہ مار ڈالا گیا، اس کا جانشین اوتھو خدائی کا دعوی کر بیٹھا، اور جب ڈومیشین تخت پر بیٹھا تو اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اسکو اپنا دیوتا تسلیم کریں، لیکن وہ قتل کیا گیا

کاراکلا حکمران ہوا، تو اس نے اپنے بھائی گیٹا، اور اس کے حامیوں کو مروا ڈالا، لیکن پھر خود بھی ہلاک کیا گیا، اس طرح مورخین لکھتے ہیں کہ رومن امپائر کے باون حکمراں یکے بعد دیگرے قتل ہوتے رہے، عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ رومن امپائر میں غدری کی بربریت عیسائیت سے پہلے ہوتی رہی، مگر رومن امپائر کے عیسائی حکمرانوں میں کچھ [illegible] ہے۔

عیسائی حکمرانوں میں ہرکلیس نے تو اپنی سگی بھتیجی مارٹی نا سے شادی کر کے اپنا منہ کالا کیا، وہی اسکی موت کے بعد تخت کی مالک بنی، لیکن عوام اس کے خلاف ہوگئے تو وہ تخت چھوڑ کر گوشہ نشیں ہوگئی، اس کا سوتیلا لڑکا کونس ٹن ٹائین تخت پر بیٹھا تو مارٹی نا نے اس کو زہر دے کر ہلاک کر دیا، مارٹی نا کا جرم ثابت ہوا تو اس کو عبرت ناک سزا اس کی زبان کاٹ کر دی گئی، اس کے حامیوں کی ناکیں کاٹ ڈالی گئیں،

کونس ٹینس تخت پر بیٹھا تو اس سے ایسی ناراضگی بڑھی کہ اسکو اسکے ایک گھریلو ملازم کے ذریعے موا ڈالا گیا، اس کے بعد کونس ٹین ٹائین دوم کی حکومت شروع ہوئی تو اس نے ایک پادری کی موجودگی میں اپنے دو بھائیوں کی ناکیں کٹوا دیں، لیکن اس کا بھی برا حشر ہوا، اس سے لوگ خفا ہوئے تو اسکی ناک اور زبان دونوں کاٹ کر اس کو جلا وطن کر دیا گیا، پھر اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا،

اس خاندان کے بعد دوسرا خاندان آئی سورین کا چلا، اس کے ایک حکمران کونس ٹن ٹائین پنجم کے ظلم وستم کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگر اس کے سامنے انسانوں کی ناکیں کاٹ کر ایک طشت میں پیش کی جاتیں تو وہ خوش ہوتا، وہ غیر عیسائیوں کی ایذا رسانی اور غارتگری کے لیے مشہور تھا،

اس کے بعد لیو چہارم تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے پانچ سوتیلے بھائیوں میں سے ایک کی تو آنکھیں نکلوا لیں، اور چار کی زبانیں کٹوا دیں، اس کی بیوی آئرین سے اس کا اختلاف ہوا تو دونوں میں باضابطہ میدان جنگ میں معرکہ آرائی ہوئی، آخر میں لیو گرفتار ہوا، تو اس کی بیوی نے اس کو بے رحمی سے مروا ڈالا، جس کے بعد آئی سورین خاندان ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، آگے چل کر بعض حکمرانوں کی تاریخ اسی طرح ہولناک رہی اور پھر اس امپائر کے لوگوں میں مذہبی اختلافات بھی بڑھتے گئے، اے۔ جی گرانٹ نے اپنی تاریخ یورپ میں لکھا ہے کہ ان اختلافات سے مسیحی اپنے باہمی

جھگڑوں اور نزاعوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن اس طرح ہوگئے کہ اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ عیسائیت کو چھوڑ کر بت پرستی ہی کو پھر زندہ کیا جائے، وہی بہتر ہے،

ساتویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے سیاسی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی جو اخلاقی حالت ایک دوسرے کی غداری کی وجہ سے ہوگئی تھی، اس کی مرقع آرائی لیکی نے اپنی کتاب ہسٹری اف دی یوروپین مورلس جلد دوم میں لکھا ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایک عجیب بدنظمی اور طوائف الملوکی جاری تھی، ظلم وجبر، مکروفریب، آوارگی واوباشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے، ملکہ فریڈیگونڈ، اور ملکہ برونہاٹ کا نمبر اپنی خون آشامیوں اور ہوسناکیوں کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا، یہ دونوں تو ملکہ تھیں، جو چاہتیں کرتیں، ان کے علاوہ ہر طبقہ فسق وفجور اور سیہ کاری میں مبتلا تھا، بعض پادری شراب پی کر اس قدر بدمست اور مخمور ہوجاتے، کہ ان کا کھڑا ہونا مشکل ہوجاتا، ایک پادری نے ایک بار اپنے کسی ماتحت کی جائداد پر دست برد کرنے کی کوشش کی، جب اس کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اسے زندہ دفن کرادیا، بڑے سے بڑے ظالم وسیہ کار تاجداروں کے مصاحبین وحوارئین اسی قسم کے پادری ہوتے تھے، ملکہ فریڈی گونڈ کے رازدار ایسے پادری تھے، جن کے ذریعہ سے وہ ہر طرح کی سفاکیوں کا ارتکاب کرتی تھی، مشہور پاپائے اعظم سینٹ گری گوری کا زیادہ تر وقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامد میں گذرتا، شاہ گونڈی بالڈ نے اپنے بیٹوں کو قتل کر ڈالا تو پادری سینٹ اوینس نے اس قتل کو صحیح ثابت کرکے حکومت کی جڑ مضبوط کردی۔

لیکی مزید رقمطراز ہے کہ ان ہی پادریوں کو عہدے دئے جاتے جو حرص وہوا اور عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی مذہبی مجالس میں سے نوفیصی ہوتی ان کا اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کردینا معمولی سی بات ہوگئی تھی۔ ہر جگہ ظلم شقاوت،

تھی، اور سفاکی کے مناظر دیکھنے میں آتے، مخالفوں کے ہاتھ پاؤں یا ناک کان کاٹ ڈالنا ایک عام بات
ی، ہر بادشاہ کے لیے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا فرض تھا، ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے اپنی بہو اور اپنی
یوں کو اپنے سامنے زندہ جلوا دیا، ایک ملکہ نے اپنی بیٹی کو دریا میں غرق کر دیا، اس ڈر سے کہ کہیں
ں کے سوتیلے باپ کی طبیعت نہ اس پر آجائے، ایک اسقف زنا کرتے وقت مارا گیا، ایک شہزادہ
یہ تفریح تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو آگ میں جلوایا کرتا تھا، اس نے اپنے دو غلاموں کو اس جرم میں
ہ دفن کر دیا کہ انھوں نے اسکی اجازت کے بغیر شادیاں کر لی تھیں، ملکہ بر دنہاٹ جب اپنے حریف کلوٹر
ہاتھوں گرفتار ہوگئی تو اسکو طرح طرح اذیتیں دے کر ایک شریر گھوڑے کی دم میں باندھ کر اسے تیز دوڑا
یا جس سے اسکی لاش کے پرخچے اڑ گئے،

آٹھویں صدی میں شارلیمین یورپ کا مشہور فرمانروا گذرا ہے، اس کے کارناموں کی دھوم
مگر اسکی خانگی زندگی بہت ہی داغدار رہی، اس نے نو بیویاں رکھ چھوڑی تھیں، اس کے خلاف بغاوت
ئی تو اس نے چار ہزار افراد کو بڑی بے رحمی سے تہ تیغ کر دیا، وہ مسیحیت کی اشاعت میں بڑی سختی اور
رم رواداری سے کام لیا کرتا تھا، اس نے اپنی سلطنت کو بڑی وسعت دی تھی، مگر اس کے پوتوں میں
یسی خونریز رقابت پیدا ہوئی کہ اس سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے، جرمنی کا مشہور حکمران فریڈرک دوم
پنے معاصر پوپ کی مدد سے تخت پر بیٹھا، مگر پھر دونوں ایک دوسرے کے ایسے دشمن ہوگئے کہ پوپ نے
تعدد فرامین میں شہنشاہ کو کافر اور ملحد قرار دے کر اعلان کیا کہ وہ حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ
ور حضرت مسیحؑ کو کذاب اعظم کہا کرتا ہے، فریڈرک اس کی تردید یہ کہہ کر کرتا کہ وہ کلیسا سے برسرپیکار نہیں
بلکہ اہل کلیسا کی عیاشی، بداعمالی، گندگی، خبث نفس، حرص اور لوٹ مار کا دشمن ہے،

سولہویں صدی میں روس کا حکمران آئیوان اپنی وحشیانہ سفاکی اور بے رحمی کی وجہ سے آئیوان دی ٹیریبل
یعنی ہیبت کے نام سے مشہور تھا، اسکو شہروں کو تباہ کرنے، مرد عورت اور بچوں کو اذیت دینے میں خاص لطف آتا تھا،

جھگڑوں اور نزاعوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن اس طرح ہوگئے کہ اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ مسیحیت کو چھوڑ کر بت پرستی ہی کو پھر زندہ کیا جائے، وہی بہتر ہے،

ساتویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے سیاسی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی جو اخلاقی حالت ایک دوسرے کی غداری کی وجہ سے ہوگئی تھی، اس کی مرقع آرائی لیکی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی یوروپین مورلس جلد دوم میں لکھا ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایک عجیب بدنظمی اور طوائف الملوکی جاری تھی، ظلم و جبر، مکر و فریب، آوارگی و اوباشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے، ملکہ فریڈیگونڈ، اور ملکہ برونہاٹ کا نمبر اپنی خون آشامیوں اور ہوسناکیوں کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا، یہ دونوں تو ملکہ تھیں، جو چاہتیں کرتیں، ان کے علاوہ ہر طبقہ فسق و فجور اور سیہ کاری میں مبتلا تھا، بعض پادری شراب پی کر اس قدر بدمست اور مخمور ہو جاتے، کہ ان کا کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا، ایک پادری نے ایک بار اپنے کسی ماتحت کی جائداد پر دست برد کرنے کی کوشش کی، جب اس کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اسے زندہ دفن کرا دیا، بڑے سے بڑے ظالم و سیہ کار تاجداروں کے مصاحبین و حواریین اسی قسم کے پادری ہوتے تھے، ملکہ فریڈی گونڈ کے رازدار ایسے پادری تھے، جن کے ذریعہ سے وہ ہر طرح کی سفاکیوں کا ارتکاب کرتی تھی، مشہور پاپائے اعظم سینٹ گریگوری کا زیادہ تر وقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامد میں گذرتا، شاہ گونڈی بالڈ نے اپنے بیٹوں کو قتل کر ڈالا تو پادری سینٹ اوینس نے اس قتل کو صحیح ثابت کرکے حکومت کی جڑ مضبوط کر دی۔

لیکی مزید رقمطراز ہے کہ ان ہی پادریوں کو عہدے دئے جاتے جو حرص و ہوا اور عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی مذہبی مجالس میں مے نوشی ہوتی، ان کا اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دینا معمولی سی بات ہوگئی تھی۔ ہر جگہ ظلم و شقاوت،

بدچلنی، اور سفاکی کے مناظر دیکھنے میں آتے، مخالفوں کے ہاتھ پاؤں یا ناک کان کاٹ ڈالنا ایک عام بات تھی، ہر بادشاہ کے لیے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا لازمی تھا، ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے اپنی بہو اور اپنی پوتیوں کو اپنے سامنے زندہ جلوا دیا، ایک ملکہ نے اپنی بیٹی کو دریا میں غرق کر دیا، اس ڈر سے کہ کہیں اس کے سوتیلے باپ کی طبیعت نہ اس پر آجائے، ایک اسقف زنا کرتے وقت مارا گیا، ایک شہزادی کی یہ تفریح تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو آگ میں جلوایا کرتا تھا، اس نے اپنے دو غلاموں کو اس جرم میں زندہ دفن کر دیا کہ انھوں نے اسکی اجازت کے بغیر شادیاں کر لی تھیں، ملکہ برونہاٹ جب اپنے حریف کلوٹیر کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی تو اسکو طرح طرح اذیتیں دے کر ایک شریر گھوڑے کی دم میں باندھ کر اسے تیز دوڑایا گیا جس سے اسکی لاش کے پرخچے اڑ گئے،

آٹھویں صدی میں شارلیمین یورپ کا مشہور فرمانروا گذرا ہے، اس کے کارناموں کی دھوم ہے مگر اسکی خانگی زندگی بہت ہی داغدار رہی، اس نے نو بیویاں رکھ چھوڑی تھیں، اس کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس نے چار ہزار افراد کو بڑی بے رحمی سے تہ تیغ کر دیا، وہ مسیحیت کی اشاعت میں بڑی سختی اور عدم رواداری سے کام لیا کرتا تھا، اس نے اپنی سلطنت کو بڑی وسعت دی تھی، مگر اس کے پوتوں میں ایسی خونریز رقابت پیدا ہوئی کہ اس سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، جرمنی کا مشہور حکمران فریڈرک دوم اپنے معاصر پوپ کی مدد سے تخت پر بیٹھا، مگر پھر دونوں ایک دوسرے کے ایسے دشمن ہو گئے کہ پوپ نے متعدد فرامین میں شہنشاہ کو کافر اور ملحد قرار دے کر اعلان کیا کہ وہ حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور حضرت مسیح کو کذاب اعظم کہا کرتا ہے، فریڈرک اس کی تردید یہ کہہ کر کرتا کہ وہ کلیسا سے برسرپیکار نہیں بلکہ اہل کلیسا کی عیاشی، بداعمالی، گندگی، خبث نفس، حرص اور لوٹ مار کا دشمن ہے،

سولہویں صدی میں روس کا حکمراں آئیوان اپنی وحشیانہ سفاکی اور بے رحمی کی وجہ سے آئیوان دی ٹیریبل یعنی مہیب کے نام سے مشہور تھا، اسکو شہروں کو تباہ کرنے، مرد، عورت اور بچوں کو اذیت دینے میں خاص لطف آتا تھا،

اسی ملک کا فرڈی نینڈ اپنے کانسٹنس کی وجہ سے بیٹے پر ظلم کیا۔ اگر اس نے اپنے ایک سپاہی کو ناقابل بیان طرح کی اذیت دے کر قتل کرایا، اپنے بیٹے کو بے دردی سے تہ تیغ کر کے اور اسی طرح کے اور دہشتناک واقعات کا مرتکب ہو کر اس نے آئیوان مہیب کی یاد تازہ کر دی۔

اسی سولہویں صدی میں فرانس کے حکمراں چارلس نہم اور اسکی ملکہ کیتھرائن نے مل کر سینٹ بارتھولومیو کے موقع پر دس ہزار پروٹسٹنٹ کو قتل کرا دیا، کیتھولک فرقے نے خوشی کے شادیانے بجائے، فرانس کے بادشاہ لوئی پانزدہم کے زمانہ میں ژان سینی تحریک مذہبی اور سیاسی حکام کے خلاف چلی تو انکو کچلنے کے لئے ہر طرح کے مظالم ڈھائے گئے، والٹیر نے آزردہ ہو کر مذہبی عقیدوں کی مخالفت اپنی پرزور تحریروں سے کی، روسو نے معاہدہ عمرانی لکھ کر یہ ترویج کی کہ حکومت کو قائم کرنے اور الٹ دینے کا حق صرف عوام کو حاصل ہے، ان تحریکوں سے اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانس میں بڑا انقلاب آیا، لوئی شانزدہم اور اسکی ملکہ میری انتوانت کو دار پر چڑھا دیا گیا جیکوبن برسر اقتدار ہوئے تو اپنے مخالفین کو چن چن کر گلوٹین کے ذریعہ قتل کرایا۔

اگر اور تفصیلات بیان کی جائیں تو اس قسم کے واقعات کی ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، مگر اس سرسری خاکے سے بھی ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ غداری کی کون ایسی قسم ہے جو وہاں دیکھنے میں نہیں آئی، سنیٹ اور پارلیمنٹ کے ارکین اپنے جلیل القدر فاتحوں اور حکمرانوں، راعی اپنی رعایا، رعایا اپنے راعی، باپ اپنے بیٹے، بیٹے اپنے باپ، بیوی اپنے شوہر، شوہر اپنی بیوی، ماں اپنی بیٹی، بیٹی اپنی ماں، بھائی اپنی بہن، بہن اپنے بھائی، پادری اپنے مذہبی بادشاہ اپنے پوپ، اور پوپ اپنے بادشاہ، اور خود عام لوگ اخلاق اور انسانیت سے غداری کرتے رہے اور انھوں نے جن بہیمانہ اور وحشیانہ حرکتوں کا ثبوت دیا، اس کے مقابلہ میں مسلمان غداروں کی ہولناکیاں ماند پڑ جاتی ہیں مگر اس سے انکی غداریوں پر پانی نہیں پھیرا جا سکتا ہے، غداری بہرحال غداری ہے، مسلمان خیر امت قرار دے گئے ہیں، ان کے کردار کا نمونہ ہر شعبہ زندگی میں اعلیٰ ہونا چاہئے، وہ تو قیصر و کسریٰ کی روایات کو ختم کر کے اخلاق اور انسانیت کو سنوارنے کے لیے دنیا میں مامور کئے گئے تھے۔

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ
کے
مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ

از۔ جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۴)

روایت ۱۳ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا امام ابو یوسف (قاضی) کی روایت کے مطابق طاقیہ (کلاہ) دو طرح کا ہوتا ہے، (۱) لاطیہ (۲) ناشرہ۔ لاطیہ سر سے ملا ہوا ہوتا ہے، اور ناشرہ کسی قدر سر سے ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلاہ لاطیہ اکثر استعمال کیا ہے، اور کلاہ ناشرہ کم استعمال کیا ہے، کلاہ ناشرہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، بعض مشائخ نے بھی کلاہ ناشرہ استعمال کیا ہے۔ (اسرار الاولیاء ص ۶۴)

حضرت بابا صاحبؒ کے اس مبارک بیان سے کلاہ کی نوعیت واضح ہو گئی کہ کلاہ و تاج جو صوفیہ میں مروج ہے، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ہے اور سنت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اختراعیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسے دیومالا کی کہانی سے تعبیر کرنا نہایت درجہ گستاخی اور کم علمی کی علامت ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ نے تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو فرمائی ہے جو اسرار الاولیاء کے صفحہ ۵ کی زینت ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کا شمار مشائخ کے لباس میں ہوتا ہے، یہ بھی تاثیر و

وکیفیات الاحوال، ہمارے ہاں سے صوفیہ کرام کے یہاں قادم [illegible] جس کی استناد حضرت باباصاحبؒ کے بیان سے ہو درست ہے، جو کہ فوائد الفواد میں [illegible] میں بھی ہے،

روایت ۱۴ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا: ہمارے خواجگان کے نزدیک خرقہ کا تعلق حضرت رب العزت سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں خرقہ عطا ہوا جسے خرقۂ معراج کہتے ہیں، اور یہ فرمان ہوا ہے کہ اپنے اصحاب میں سے اُسے عنایت فرمایئے، جو یہ کہے کہ میں پردہ پوشی پر عمل کروں گا، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے تشریف لائے تو اصحابِ کرامؓ سے دریافت کیا کہ اگر میں تمہیں یہ خرقہ دوں تو تم کیا کروگے، صحابہؓ نے جو مناسب سمجھا جواب دیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا کہ میں پردہ پوشی سے کام لوں گا، مسلمانوں کے بلکہ جملہ بندگانِ خدا کے عیوب چھپاؤں گا، چونکہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جواب حضرت حق تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق تھا، ییسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرقۂ معراج سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمادیا۔ (اسرار الاولیا ص ۳۹)

حضرت باباصاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، میرے پاس حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی یادگار، ایک گلیم ہے، مجھے فرمانِ حق یہ ہے کہ میں یہ گلیم علی ابن ابی طالب کو دیدوں تاکہ وہ میرے امتیوں کو پہنچادیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ حاضر خدمت تھے چنانچہ وہ گلیم آپ نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمادی اس سے یہ واضح ہوا کہ گلیم پوشی کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے ہے۔ (اسرار الاولیا ص ۲۵ [illegible])

خرقہ کہتے ہیں پیوند لگے کرتے کو اور گلیم کہتے ہیں کملی کو جو زمانۂ قدیم سے انبیا علیہم السلام اور صوفیۂ کرام کا لباس ہے، اور اس لباس صوفیہ کو خرقۂ معراج اور گلیم بھی [illegible]

لیکن خرقۂ خصوصیت کو اور گلیم پوشی کو مادی لباس سمجھنا صحیح نہیں، بلکہ وہ لطیفہ غیبی ہے، مادی نہیں ہے، خواجہ نظام فرید چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے،

"خرقۂ معراج ایک باطنی چیز ہے، اور راز مخفی ہے، کپڑے اور اشیاء محسوسہ میں سے نہیں ہے........... خرقۂ معراجیہ ایک مخفی راز ہے، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے ہر اس شخص کو ملا جو اس نعمت عظمیٰ کے لائق تھا، .... خرقۂ معراجیہ ایک قسم کی خصوصیت تھی جو ان بائیس[۲۲] حضرات کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی، اس خصوصیت کو حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے"۔ (مقابیس المجالس ص ۳۵۶)

خرقۂ اور گلیم کا اسرائیلیات سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے، اور نہ اسرائیلیات سے ان کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے، ایسا گمان کرنا کم علمی اور نافہمی کی علامت ہے، خرقۂ معراجیہ کا اور ملائکہ کی گلیم پوشی کا ذکر ان کتابوں میں بھی ہے جنھیں مخالفین ملفوظات نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل تسلیم کرتے ہیں، ان میں یہ روایت حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول ہے۔

بعد ازاں از کرامت ابوبکر صدیق	اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
رضی اللہ عنہ حکایت فرمود کہ آں روز	کی بزرگی کے متعلق حکایت بیان فرمائی کہ
او چہل ہزار دینار بیاورد، دگلیمے پوشید	جس دن وہ چالیس ہزار دینار لائے تھے،
ومیخے بر آں زدہ، بخدمت رسول علیہ السلام	اس دن وہ کمبلی پہنے ہوئے اور کانٹے لگائے
بیامد، ہماں زماں جبرئیل علیہ السلام	ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
بحضرت رسالت آمد، گلیمے پوشیدہ ومیخے	خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اسی وقت
بر آں زدہ، رسول علیہ السلام پرسید کہ	جبرئیل بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[illegible]	[illegible]
امروز بہ جہت آنکہ در فرمان شدہ است	اور اس وجہ سے ان کے کانٹے لگے ... حضور اکرم
تا بہ موافقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا
گلیمے پوشیدہ اند و در میخ پہان زدہ ،	کہ یہ کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا
(فوائد الفواد ص ۲۳۳ ، سیر الاولیاء ص ۳۴۳)	کہ یا رسول اللہ ﷺ تمام فرشتوں کو حضرت
	ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موافقت میں
	کمبل پہننے کا حکم ہوا ہے سب کمبل پہنے ہوئے
	اور اس میں کانٹے لگائے ہیں ،

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری ؒ المتوفی ۴۶۵ھ نے بھی اس روایت کی طرف ایما فرمایا اور لکھا ہے ۔

صدیق اکبر اندر حال تجرید ش جامہ صوف پوشید (کشف المحجوب ص ۴۳)

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ روایت بھی بیان فرمائی ہے ، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں ،

سلطان المشائخ می فرمود پیغمبر	حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم در شب معراج از حضرت	علیہ وسلم نے شب معراج میں جو خرقہ اللہ پاک
عزت خرقہ یافت و آن را خرقہ فقر گویند	سے پایا اسے خرقہ فقر کہتے ہیں پھر صحابہ
بعدہ صحابہ را طلب کرد و گفت من از	کرام کو بلایا اور فرمایا کہ میں نے اللہ پاک
حضرت عزت خرقہ یافتہ ام و در فرمان	سے خرقہ لیا ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں یہ
است کہ آن را بیکے دہم بعدہ پیغمبر	کسی ایک کو دوں پھر حضور اکرم صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم روے سوئے ابوبکر کرد	علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف

رضی اللہ عنہ فرمود، اگر من این خرقہ
تو بدہم تو چہ کنی؟ ابوبکر گفت من صدق
ورزم و طاعت کنم و عطا کنم۔ بعدہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ را فرمود، اگر من این خرقہ
تو بدہم تو چہ کنی؟ عمر گفت عدل کنم و انصاف
نگاہ دارم، بعدہ از حضرت عثمان رضی اللہ
عنہ پرسید، اگر من این خرقہ تو بدہم تو چہ
کنی؟ عثمان گفت من اتفاق کنم و سخاوت
ورزم۔ بعدہ علی علیہ السلام رضی اللہ عنہ
را پرسید اگر من این خرقہ را تو بدہم
تو چہ کنی؟ علی گفت من پردہ پوشی کنم
و عیب بندگان خدای عزوجل بپوشم
آن خرقہ بر علی داد کرم اللہ وجہہ فرمود
فرمان خدای عزوجل بود، ہر کہ این جواب
گوید، این خرقہ او را بدہی۔ (فوائد الفوائد
ص ۱۹۶، سیر الاولیاء ص ۳۴۱، ۳۴۲، چ ۲)

منع کیا اور دریافت فرمایا کہ اگر میں یہ
خرقہ تمھیں دوں تو تم کیا کروگے حضرت
ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا کہ میں سچائی
اختیار کروں گا، عبادت کروں گا اور
بخشش کرونگا پھر حضرت عمر فاروقؓ سے دریافت
فرمایا، اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا
کروگے، انھوں نے جواب دیا کہ میں انصاف
کرونگا اور انصاف کی نگرانی کرونگا، پھر
حضرت عثمان غنیؓ سے دریافت فرمایا کہ اگر یہ
خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے انھوں
نے عرض کیا کہ میں اتفاق اور باہمی میل
جول سے کام لوں گا اور سخاوت کرونگا
پھر حضرت علیؓ سے دریافت فرمایا کہ اگر یہ
خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے حضرت
علیؓ نے عرض کیا کہ میں عیب پوشی کرونگا
اور خدا کے بندوں کے عیبوں کو چھپاؤنگا،
آپ نے وہ خرقہ حضرت علیؓ کو دیدیا اور فرمایا کہ
مجھے اللہ پاک کا یہی حکم تھا کہ جو یہ جواب
دے یہ خرقہ اسے دیدینا۔

حضرت [illegible] سید علی ہجویری نے لکھا ہے:

شعار متصوفہ لبس مرقعہ است و لبس	[illegible]
مرقعات سنت است، از آں جاکہ رسول	[illegible]
گفت علیہ السلام علیکم بلبس الصوف	[illegible]
تجدون حلاوة الایمان فی	[illegible]
قلوبکم و نیز یکے گوید از صحابہ کان النبی صلی اللہ	تو تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت
[illegible]	[illegible]
...... حسن بصری گوید	یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
رحمۃ اللہ علیہ ہفتاد بدری را دیدم ہمہ	اون پہنتے تھے اور خچر پر سوار ہوتے تھے،
را جامہ پشمین بود (کشف المحجوب ص ۴۳-۴۴)	...... حضرت حسن بصری
	فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر کو
	دیکھا ہے، سب ہی صوف پوش تھے،

خرقۂ ابراہیمی کی روایت شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (المتوفی ۶۳۲ھ) نے اپنی موقر تصنیف عوارف المعارف (ص ۱۲۰) میں بھی نقل فرمائی ہے۔ ادب صوفیہ میں عوارف المعارف کا پایۂ اعتبار متفق علیہ اور مسلّم ہے، اس کے پانچ باب حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ سے پڑھے تھے[1]۔

بہر نوع ان موقر بیانات سے یہ واضح ہے کہ خرقہ و گلیم کا تعلق عین اسلامیات سے ہے، اور ان کا استعمال سنت ہے، خرقۂ ابراہیمی اور خرقہ معراجیہ لطیفۂ غیبی سے ہیں، اور خرقۂ فقر کو

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۶ چ

ان سے گہری نسبت [illegible] کی برکت سے خرقہ، غیر معمولی اوصاف
کا مالک ہے، حضرت [illegible] کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اور فرزندان
حضرت [illegible] حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی علیہ السلام
از آں جانب کی مدد۔ (سیر الاولیاء ص ۳۰۰)

احادیث کی تدوین: مسلمانوں کا یہ زندہ جاوید کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قول و عمل کی کامل نگہداشت کی، اور محنت و خلوص سے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدون کیا، احادیث میں دنیا کی کسی قوم کو مسلمانوں سے [illegible] انھوں نے جمع و تدوین ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ احادیث کو پرکھنے کے لیے اصول و ضوابط بھی بنائے، اور پرکھ پرکھ کے احادیث کے مجموعات مرتب کیے، اصول حدیث مستقل فن اور علم کا ایک گراں قدر شعبہ ہے، اس کے ساتھ ہی علم اسماء الرجال وجود میں آیا جو علوم و فنون میں منفرد حیثیت کا مالک ہے، جس کی بدولت آج تک مسلمانوں کو سربلندی حاصل ہے۔

صوفیائے کرام میں بھی جید عالم گزرے ہیں، وہ اصول حدیث کے قائل اور اسے معتبر مانتے تھے بلکہ اصول حدیث کا درس بھی دیتے تھے[1] اور حدیث کی مشہور و معتبر کتابوں کو اسی نگاہ عظمت سے دیکھتے ہیں، جس سے علمائے محدثین دیکھتے تھے، حضرت محبوب الٰہی کا مشہور مقولہ ہے:

آنچہ در صحیحین است آن صحیح است (فوائد الفواد ص ۱۰۳)

اور اگرچہ احادیث مبارکہ کا بے پناہ ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کوئی اس کا قائل نہیں کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے، اس تصور کو کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے احصا سے تعبیر

---

[1] اسرار الاولیاء، ص ۱۰۸، اصول حدیث کی معتبر کتاب تمہید المستدی تصنیف شیخ ابو شکور سالمی حضرت محبوب الٰہی نے حضرت بابا صاحب ہی سے پڑھی تھی۔

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری نے لکھا ہے:

شعار متصوفہ لبس مرقعہ است و لبس	گدڑی پہننا صوفیوں کا معمول ہے
مرقعات سنت است، از آں جا کہ رسول	اور گدڑی پہننا سنت ہے اس لیے کہ
گفت علیہ السلام علیکم بلبس الصوف	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
تجدون حلاوة الایمان فی	ہے کہ اون پہننا اپنے لیے لازم جانو گے
قلوبکم و نیز یکے گوید از صحابہؓ کان النبی صلی اللہ	تو تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت
علیہ وسلم یلبس الصوف و یرکب الحمار	پاؤ گے، (صحابہ میں سے) ایک (صحابی)
. . . . حسن بصریؓ گوید	یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
رحمۃ اللہ علیہ ہفتادؓ بدری را دیدم ہمہ	اون پہنتے تھے اور خچر پر سوار ہوتے تھے،
را جامہ پشمین بود (کشف المحجوب ص ۴۳-۴۴)	. . . . حضرت حسن بصریؒ
	فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر کو
	دیکھا ہے، سب ہی صوف پوش تھے،

خرقۂ ابراہیمی کی روایت شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (المتوفی ۶۳۲ھ) نے اپنی موقر تصنیف عوارف المعارف (ص ۱۲۰) میں بھی نقل فرمائی ہے، ادب صوفیہ میں عوارف المعارف کا پایۂ اعتبار متفق علیہ اور مسلم ہے اس کے پانچ باب حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ سے پڑھے تھے۔[1]

بہر نوع ان موقر بیانات سے یہ واضح ہے کہ خرقہ و گلیم کا تعلق دین اسلامیات سے ہے، اور ان کا استعمال سنت ہے۔ خرقۂ ابراہیمی اور خرقۂ معروف کرخیؒ ہی سے ہیں، اور خرقۂ فقر کو

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۲ پ

الصحگی نسبت ہے، اور صوفیہ کرام کے استعمال کی برکت سے خرقہ غیر معمولی اوصاف کا مالک ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ از فرزندان حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام کرم اللہ وجہہ است ویک قسم خرقہ، حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی علیہ السلام از آں جانب می رود۔ (سیر الاولیا ص ۳۴۹ ج)

احادیث کی تدوین، مسلمانوں کا یہ زندہ وجاوید کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قول وعمل کی کامل نگہداشت کی، اور محنت وخلوص سے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدون کیا اس باب میں دنیا کی کسی قوم کو مسلمانوں سے ہمسری کا حق حاصل نہیں ہے، انھوں نے جمع وتدوین ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ احادیث کو پرکھنے کے لیے اصول وضوابط بھی بنائے، اور پرکھ پرکھ کے احادیث کے مجموعات مرتب کیے، اصول حدیث مستقل فن اور علم کا ایک گراں قدر شعبہ ہے، اس کے ساتھ ہی علم اسماء الرجال وجود میں آیا جو علوم وفنون میں منفرد حیثیت کا مالک ہے، جس کی بدولت آج تک مسلمانوں کو سربلندی حاصل ہے،

صوفیہ کرام میں بھی جید عالم گزرے ہیں، وہ اصول حدیث کے قائل اور اسے معتبر مانتے تھے بلکہ اصول حدیث کا درس بھی دیتے تھے[1] اور حدیث کی مشہور ومعتبر کتابوں کو اسی نگاہ عظمت سے دیکھتے ہیں، جس سے علمائے محدثین دیکھتے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا مشہور مقولہ ہے،

آنچہ در صحیحین است آں صحیح است (فوائد الفواد ص ۱۰۳)

اور اگرچہ احادیث مبارکہ کا بے پناہ ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کوئی اس کا قائل نہیں کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے، اس تصور کو کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے احصا سے تعبیر

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۱، ج اصول حدیث کی معتبر کتاب تمہید المبتدی تصنیف شیخ ابو شکور سالمی حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت ... سے پڑھی تھی،

[illegible]

مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں ان میں سے چھ ہزار کے انتخاب سے صحیح بخاری کو تدوین کیا ہے،

چورانوے ہزار صحیح حدیثوں کا ذخیرہ جو محفوظ نہیں ان میں کچھ بھی ہو سکتی ہیں، جو صوفیہ کرام کے ملفوظات کی زینت ہیں،

صوفیہ کرام متقیوں سے زیادہ متقی اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے، صاحب ذوق سلیم بھی تھے، اور کلام نبی صلعم سے لذت آشنا بھی تھے، اگر وہ کیفیت اندوز نہ ہوتے تو بے تکلف ان کی زبان پر آجاتا تھا۔

لیس فیہ ذوق کلامہ علیہ السلام (اصول الاسماء قلمی ص ۴۲)

لہذا حضرات صوفیہ کرام نے جن احادیث نبوی کو اپنایا ہے ان کے متعلق بھی کلام نہیں کیا جا سکتا اور اب حدیث کے باب میں صوفیہ کرام کا خصوصی نقطہ نظر ہے جس کے متعلق حضرت محبوب الٰہی کا یہ ارشاد ہے،

حدیثے کہ مردم بشنوند تو ان گفت کہ این حدیث رسول صلعم نیست، اما این تو ان گفت، در کتبے کہ این احادیث جمع کردہ اند و اعتبار یافتہ اند نیامدہ است (فوائد الفواد، ص ۳۰۴)

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ حدیث خرقہ کا کتنی معتبر مقام ہے، خرقہ انبیاء علیہم السلام کے شعار کی یادگار ہے، اس کا اسرائیلیات سے رشتہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس کے [illegible] اس روایت خرقہ سے بھی یہ واضح ہے کہ اسرار اولیا حضرت بابا صاحب کے [illegible]

محمد ہے، اور بعد کی کتب ملفوظات کا ماخذ ہے، اور کوئی ایسی معقول دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر اسرار الاولیاء کو نامعتبر مانا جاسکے۔

فصول کا اختتامیہ | اسرار الاولیاء میں ۲۲ فصلیں ہیں، ہر فصل کے آخر میں اختتام کی کیفیت لکھی ہے، اور ان کی تفصیل یہ ہے، (۱) چار فصلوں کے اختتام پر یہ ذکر ہے کہ اذان کی آواز آئی تو مجالس ختم ہوئیں، ان چار میں سے دو اذانیں ظہر کی تھیں (۸ - ۱۲) دو اذانوں کے متعلق یہ صراحت نہیں کہ وہ کس وقت کی تھیں (۱ - ۹) گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی ظہر ہی کی ہوں گی۔

(۲) تین کے اختتام پر آپ عالم تحیر میں کھڑے ہوگئے تھے، (۲۰۲۱۰۲ - ۲۲) (۳) ایک کے اختتام کے بعد آپ تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے تھے (۱۸) (۴) ایک کے اختتام کے بعد آپ دولت خانہ میں چلے گئے، (۵) (۵) ایک کے اختتام کے بعد آپ مشغول ہوگئے تھے، (۱۹) (۶) تین کے اختتام پر آپ بعجلت اٹھ کھڑے ہوئے، (۱۰ - ۱۴ - ۲۰) (۷) چھ کے بعد آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے۔ (۲ - ۴ - ۶ - ۱۴ - ۱۵ - ۱۷) (۸) ایک کے بعد آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ (۱۱) (۹) ایک کے اختتام پر آپ اٹھے اور عجلت سے اندر چلے گئے۔ (۱۳)

بدواں برخاست و بدواں دروں رفت سے مراد یہ ہے کہ بعجلت آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور بعجلت اندر تشریف لے گئے، اندر تشریف لے جانے سے مراد غالباً حجرے میں تشریف لے جانا ہے، ایک جگہ یہ تشریح بھی ہے کہ اندر جاکر آپ تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے، تیرہ کے اختتام پر یہ ہے کہ بدواں دروں رفت، بعجلت اندر چلے گئے، غالباً مجالس میں وقت زیادہ صرف ہوا تھا، معمولات کو پورا کرنا ہی تھا، اس لیے آپ بعجلت اندر تشریف لے گئے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا ہے،

بیشتر اوقات در مسجد اجودھن مشغول بودے۔ (خیر المجالس ص ۹۸)	آپ اکثر اجودھن (پاکپتن) کی مسجد میں مشغول رہتے تھے،

گویا کہ مسجد ہی میں اذان ہوتی، اور مسجد ہی میں نماز باجماعت پڑھتے، خانقاہ میں اذان و نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1] اس لیے یہ کہنا لا حاصل ہے کہ بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں کبھی نماز باجماعت نہیں ہوتی تھی، تو ظاہر ہے کہ مسجد کے قریب ہونے اور مسجد میں اکثر مشغول رہنے کی بنا پر اس کی ضرورت ہی نہ تھی

مجلس کا اختتام عموماً ایسے اوقات میں ہوتا تھا، جو اذان و نماز کے اوقات نہ ہوتے تھے، بائیس میں سے صرف چار کا اختتام اذان کی آواز پر ہوا ہے، غالباً یہ چاروں مجلسیں موسم سرما کی تھیں، جو اذان ظہر کے وقت تک منعقد رہیں، بدولت خانہ دروں رفت سے مراد غالباً گھر میں تشریف لے جانا ہے، اذان کے بعد ہی جو آپ دولت خانے میں تشریف لے گئے تو یقیناً کسی ضرورت سے گئے ہوں گے، اور جماعت میں آ شریک ہوئے ہوں گے، چونکہ صرف اختتام کی کیفیت بتانی مقصود تھی بعد کی تفصیلات میں جانا مقصود نہیں تھا، اس لیے اس کا ذکر بھی نہیں کیا، اور نہ کرنا چاہئے تھا،

کتابت کی غلطیاں پیش نظر نسخہ "اسرار الاولیاء" میں بکثرت غلطیاں ہیں مطبع نولکشور کانپور کی مطبوعہ کتابیں بکثرت مطالعہ میں آئی ہیں، مگر اس قدر اغلاط سے بھری کوئی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اسماء کا تو ذکر ہی کیا، املا کی معمولی معمولی بکثرت غلطیاں ہیں، ایسا لگتا ہے کہ جو نسخہ کاتب کے پیش نظر تھا، وہ بھی اغلاط سے پر تھا، کاتب بھی فارسی زبان سے قطعاً ناواقف تھا، اس کے علاوہ نہ کسی نے کاپی کی تصحیح کی اور نہ پروف کو دیکھا، اور متواتر غلط نسخے شائع ہوتے رہے اور وہ نسخہ بھی جو ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں بار ششم شائع ہوا تھا کثرت اغلاط سے مملو ہے، اغلاط کی

---

[1] حضرت محبوب الٰہیؒ پنجگانہ نماز اپنے جماعت خانہ میں ادا فرماتے تھے، اس عہد میں غیاث پور میں کسی مسجد کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، البتہ نماز جمعہ آپ جامع مسجد کیلوکری میں پڑھتے تھے،

امثلہ یہ ہیں۔

غلط	صفحہ	صحیح
(۱) ودگانہ بگزارد۔ وودزنو	ص ۷	دوگانہ بگزار۔ ودوزانو
(۲) برتور تجلی کنم	ص ۷	برتو تجلی کنم
(۳) رفت ایماں	ص ۱۱	رخت ایماں
(۴) کارزارگفتگوے گزشت	ص ۱۴	کار ازگفتگوے بگزشت
(۵) درذکر رزق رجزان	ص ۱۵	درذکر رزق وجزآں
(۶) دور ودراز	ص ۱۷	دو روزہ
(۷) اورا انکار برکرم حق	ص ۱۸	اورا نگاہ برکرم حق
(۸) سنگ را بشگفتم	ص ۱۹	سنگ را بشکستم
(۹) شمس نوعت	ص ۲۱	شش نوع است
(۱۰) صبح بہ بر	ص ۲۳	صبح بہ امید
(۱۱) اوقات	ص ۶۱	ملاقات
(۱۲) آزادی	ص ۶۲	آرزوے
(۱۳) بلانہ	ص ۲۷	براند
(۱۴) بدواں دروں رفت	ص ۷۱	برداں دروں رفت
(۱۵) درمیاں رفتہ است	ص ۸۴	دربیابان رفتہ است

اساکی اہم غلطیاں

(۱) چوں برادرم مولانا بہاؤالدین زکریا	ص ۴۱	چوں برادرم مولانا بہاء الدین زکریا

قدس الله سره العزیز کار خود را در عشق و محبت به تکمیل رسانید و بخدمت شیخ بهاء الدین سهروردی قدس الله سره العزیز پیوست

قدس الله سره العزیز کار خود را در عشق و محبت به تکمیل رسانید و بخدمت شیخ شهاب الدین سهروردی قدس الله سره العزیز پیوست،

(۲) این سخن به سمع شیخ بهاء الدین نور الله مرقده رسید فرمود

(ص ۱۴) این سخن به سمع شیخ شهاب الدین نور الله مرقده رسید

(۳) اے درویش برادر شیخ جلال الدین تبریزی رحمة الله علیه بعد از نقل پیر خود بخدمت شیخ بهاء الدین رحمة الله علیه پیوست، اما چندان خدمت کرد که هیچ خدمتگارے آن چنان خدمت نه کند۔

(ص ۲۷) اے درویش.... شیخ جلال الدین رحمة الله علیه بعد از نقل پیر خود بخدمت شیخ شهاب الدین سهروردی پیوست، اما چندان خدمت کرد که هیچ خدمتگارے آن چنان خدمت نه کند (اسرار الاولیا کے جس نسخے سے مولوی عبد الاحد مرحوم نے ترجمہ کیا ہے اس میں برادر نہیں ہے برادر ہے، مناسب یہ تھا کہ کچھ بھی نہ ہو)

(۴) اے درویش دعاگوے را برادرے بود، شیخ نجم الدین نام او بود،

ص ۶۱ اے درویش دعاگوے را برادرے بود، شیخ نجیب الدین نام او بود

(۵) اے درویش وقتے شیخ جلال الدین تبریزی و دعاگوے یک جا بودیم مولانا علاء الدین صوفی می گذشت، نظر شیخ بر او افتاده او را بخواند جامہ خود برو داد و پنج بار سورۂ اخلاص بخواند و بروے دمید حق تعالی بر مولانا علاء الدین چندان

(ص ۳۰) اے درویش وقتے شیخ جلال الدین تبریزی و دعاگو یک جا بودیم مولانا علاء الدین اصولی می گذشت (یہ مولانا علاء الدین اصولی بدایوں میں تھے اور حضرت محبوب الٰہی کے استاد تھے، اور یہاں ہی کا واقعہ ہے، اصولی کی بجائے صوفی لکھ دیا گیا ہے) چندان برکت و نعمت داد و پیر او نصیب طلب

فوائد الفواد	اسرار الاولیاء
بہ برکت و نعمت داد و بعید او گرد انید از برکت شیخ جلال الدین تبریزی بود ،	[illegible]
(۶) مولانا بدرالدین اسحاق و چند نفر درویش دیگر بخدمت حاضر بودند ،	ص ۱۱ مولانا بدرالدین و چند نفر الخ (جس قلمی نسخے سے مولوی عبدالاحد مرحوم نے اسرار الاولیاء کا ترجمہ کیا ہے اس میں یہ نام نہیں ہے) البتہ اس نام کے ایک اور بھی بزرگ تھے، جو شیخ سیف الدین باخرزی رح سے اور شیخ نجم الدین کبریٰ رح سے فیض یافتہ تھے ، ہندوستان آئے تھے ، حضرت محبوب الٰہی رح سے بھی فیض پایا تھا سنہ وفات ۷۱۰ ھ ہے ، غالباً بدرالدین اسحاق سے مراد یہی بزرگ تھے جو سمرقند کے باشندے تھے ، ان کا مزار موضع سنکولہ میں ہے ،
(۷) خدمت خواجہ قطب الدین با او ملاقی شد	(ص ۸۸) خدمت سید[1] قطب الدین با او ملاقی شد

تحریف جنگ غولان بیابانی قلمی کتابوں میں تحریف کی امثلہ تو عموماً ملتی ہی ہیں ، اسرار الاولیاء بھی اس سقم سے مبرا نہیں ہے ، لیکن اہم ترین تحریف کا ایک واقعہ وہ ہے جو اسرار الاولیاء فصل ہفتم ص ۳۶ میں ہے اور جو سورہ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) کے اوصاف و فضائل اور خواص سے متعلق ہے ، اسے واقعہ جنگ خیبر سے متعلق کر دیا ہے ، وہ دراصل جنگ خیبر سے متعلق نہیں ہے ،

---

[1] نوٹ - سادات کرام کو خواجہ سے بھی یاد کیا جاتا ہے ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ سید قطب الدین کو خواجہ قطب الدین لکھ دیا ہے اور چونکہ بختیار اوشی یا بختیار کاکی نہیں ہے ، اس لئے یہ تسامح بھی واقع نہیں ہوتا ،

بلکہ جنگِ غولانِ بیابانی سے متعلق ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے۔

ایک دفعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جنگ غولِ بیابانی پر مامور فرمایا تھا، امیر المومنین (حضرت علیؓ) عرصے تک لڑائی میں مشغول رہے مگر فتحیابی نہ ہوئی، ایک دن آپنے ایک نعرہ بلند کیا کہ زمین و آسمان کے طبق گونج اٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشِ مبارک تک یہ آواز پہنچی، اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور سورہ اخلاص[1] لائے، اور کہا کہ یہ سورت ان کے پاس بھیج دیجئے کہ وہ اسکی کثرت سے تلاوت کریں، چنانچہ آپ نے فوراً بھیج دی، حضرت علیؓ نے ایک شبانہ روز اس کی مزاولت کی تھی کہ وہ مہم سر ہوگئی، اور قلعہ فتح ہوگیا۔ (راحت المحبین صفحہ ۲۷ ترجمہ مجتبائی)

راحت المحبین حضرت امیر خسروؒ کی مؤقر تالیف ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے، اسے حضرت امیر خسروؒ نے کتاب افضل الفوائد کے بعد مرتب فرمایا تھا، یہ کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کی فہرستِ ماخذات میں بھی شامل ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ مولانا برہان الدین غریب (المتوفی ۷۳۲ھ) کی نگرانی میں مرتب ہوئی تھی جس کا پایہ اعتبار مسلم ہے، مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے حضرت امیر خسروؒ کے مرتب کردہ کتبِ ملفوظات کے متعلق فرمایا ہے،

امیر خسرو ہم ملفوظا جمع کردہ لیکن آن قدر مقبول نیست (ملفوظات شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ص ۲۰)

---

[1] حضرت جبرئیلؑ کے سورۂ اخلاص کو لے کر آنے سے مراد سورۃ کا نزول نہیں ہے، کیونکہ سورۂ اخلاص مکی ہے اور یہ بعد کا واقعہ ہے،

ضرورت ہے کہ اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مذکورہ روایت کی تصحیح کی جائے، مجموعی اوصاف سے اسرار الاولیا حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور اور قدیم سے اہلِ کمال اس کی اہمیت کے معترف ہیں، اور اس میں وہی کچھ ہے جو دیگر کتبِ ملفوظات میں ہے، اور سب ہی کچھ شریعت و طریقت کے مطابق ہے،

وقت کا تقاضا وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ مخلص عقیدت مند مجتمع ہوں، اور اس پر غور کریں کہ یہ طرفہ تماشا کیا ہے، کیونکہ اسرار الاولیاء کو غیر مستند اور جعلی قرار دیا جا رہا ہے۔ مدافعت کی تدبیر یہ ہے کہ اسرار الاولیاء کو صحت و مقابلہ سے مزین کر کے منظرِ عام پر لایا جائے یہی نہیں بلکہ اس کا صحیح ترجمہ بھی شائع کیا جائے، اور ہر زبان میں کیا جائے، اسے رواج دیا جائے، روحیں اس کی متلاشی ہیں، اس سے معاشرے میں سدھار آئے گا، اور اخلاقی قدریں جلوہ گر ہوں گی، یہ کام مخلص عقیدتمندہی انجام دے سکتے ہیں، وہ نہیں جو حصولِ مقاصد کی طمع میں عقیدت مندی کا بہروپ بھرے بیٹھے ہیں، ان پر تو یہ مصرع صادق آتا ہے، ع

دوست وہ کرتے ہیں دشمن سے جو ہو سکتا نہیں

بلاشبہ اگر مخلص عقیدت مند کمر ہمت باندھیں تو اس مشکل کو آسان کر سکتے ہیں اور ہدایت کی روشنی سے دنیا میں اجالا کر سکتے ہیں، یہ بہت بڑی نیکی ہے، اللہ پاک ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے لیے مقدر ہے، راقم حروف سے جو کچھ بن پڑا کیا ہے، کر رہا ہے اور کرتا رہیگا انشاء اللہ، اس کے لیے یہی توشۂ آخرت ہے، اللہ پاک قبول فرمائیں۔

اسرار الاولیاء کے قدیم نسخے اسرار الاولیاء کو مرتب کرنے کے لیے اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخوں سے آگاہی، اور ان سے مقابلہ اسرار الاولیاء کی صحت کے لئے اشد ضروری ہے، اس ضرورت کے اقتضا سے میں نے ہندوستان کی مشہور مشہور لائبریریوں سے جو معلومات

عوام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، سالہا سال سے یہ چاہتا تھا کہ صحت کے ساتھ اسرار الاولیاء کا کوئی نسخہ مرتب ہو کر شائع ہو جائے اور منظر عام پر آ جائے جو سالہا سال سے ... ہیں اگر توفیق الٰہی سازگار رہی، اور حیات مستعار نے ساتھ دیا تو میں خود اس خدمت کو انجام مگر میں چراغ سحری ہوں، چاہتا ہوں کہ کوئی جواں سال و جواں ہمت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنے اخلاص اور اپنی کوشش سے دنیا میں اجالا کر دے، اگر خدائے پاک نے کسی اولوالعزم کو توفیق دی، اور اس نے اس کام کو سنبھالا تو یہ میرے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوگا، اور جو تعاون میں دے سکتا ہوں، اس میں مجھے ذرا بھی تامل نہ ہوگا انشاء اللہ، اسرار الاولیاء کے جو قدیم قلمی نسخے میرے علم میں آئے ہیں وہ یہ ہیں،

۱۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تین نسخے ہیں، ایک نسخہ سنہ [illegible] ہجری کا مکتوبہ ہے، دوسرا ۱۰۸۲ھ کا مکتوبہ ہے، اور تیسرے پر سنہ کتابت مرقوم نہیں ہے۔

۲۔ اندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد میں دو نسخے ہیں، مگر ان میں سے کسی میں سنہ کتابت مندرج نہیں ہے۔

۳۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ابتدائی بارہویں صدی ہجری کا ایک نسخہ ہے۔

۴۔ رضا لائبریری، رامپور میں ایک نسخہ ہے، سنہ کتابت تحریر نہیں ہے،

۵۔ عربی فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک (راجستھان)، میں ایک نسخہ ہے، سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

نوٹ:۔ میرے پاس ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کی کیٹلاگ شکستہ اور کرم خوردہ ہے، اس لیے وہاں کے نسخے کا پتہ نہیں چل سکا، خط لکھنے پر جواب بھی نہیں آیا، اگر کوئی صاحب وہاں کا یا کہیں کا کوئی قلمی نسخہ کی نشاندہی کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے، اخلاق حسین دہلوی، لال محل بستی حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۳۔

الکلمۃ الملہمۃ لوھاء الفلسفۃ المشئمہ

تہافت الفلاسفہ کی تشکیلِ جدید

از

جناب شبیر احمد خان غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

الکلمۃ الملہمۃ ارسطاطالیسی اور سینائی فلسفہ کے رد میں عہد حاضر کا ایک عظیم شاہکار ہے اور اس سلسلہ اگر اسے تہافت الفلاسفہ" غزالی کی تشکیلِ جدید کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، ہر چند کہ مصنف رحمہ اللہ کا ہرگز کبھی ایسا خیال نہ تھا۔

سطور ذیل میں علم کلام کی تاریخ میں اس کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے و باللہ التوفیق

۱۔ کلام کی حقیقت اور آغاز و ارتقا کلام اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہ کا نام ہے، چنانچہ شرح المواقف" میں یوں طور اس کی تعریف کی گئی ہے۔

"الکلام علم باموریقتدر معہ اثبات العقائد الدینیۃ بایراد الحجج ودفع الشبہ":

کلامی تفکیر کے قدیم ترین نمایندے معتزلہ تھے۔ معتزلی نظام فکر کا مجدد اور اصطلاحی اعتزال کا بانی واصل بن عطاء الغزال تھا مگر اس کا سارا وقت اسلامی فرقوں ہی سے مناظرے میں گزرا، لیکن جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں منتقل ہوا، تو چونکہ اس کے بہت سے مسائل اسلام کی اصولی تعلیمات کے ساتھ متصادم تھے، لہٰذا دشمنِ اسلام زنادقہ نے اس سے اپنی بیراہ روی کی

آچکا تھا، [illegible] کی [illegible] کی حمایت کے لئے [illegible] بھی [illegible] پاکر مخالفین اسلام کے دینی کتابیں لکھ رہے ہیں، اس لئے متکلمین نے فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، تاکہ ان کا رد کر سکیں، اس طرح علم کلام فلسفہ کا جواب بن کر شکل بن گیا اور اسلام کی عقلی تفہیم کے ساتھ فلسفہ کا رد بھی اس کے دائرہ عمل میں داخل ہو گیا۔

واصل بن عطاء الغزال کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل اور اس کا شاگرد ابو الہذیل العلاف تھا، موخر الذکر کا شاگرد ابو یعقوب الشحام اور اس کا شاگرد ابو علی الجبائی تھا جو امام ابو الحسن الاشعری کا استاد ہے، ابو علی جبائی کے ساتھ امام اشعری کا مناظرہ مشہور ہے جس کے نتیجہ میں وہ اعتزال سے تائب ہو کر فرقۂ اہل السنت والجماعت میں آملے، اعتزال کی تائید میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اُس سے تو وہ دستبردار ہو گئے تھے، مگر انھیں فلسفہ کے رد کا جو ورثہ اپنے معتزلی شیوخ سے ملا تھا، وہ اُسے اپنے ہمراہ لے آئے تھے اور اب سُنی متکلمین نے بھی فلسفہ کے رد میں خدماتِ شایستہ انجام دینا شروع کیں۔

امام اشعری کے ایک شاگرد اُستاذ ابو القاسم اسکاف تھے ان کے شاگرد امام الحرمین تھے، اور اُن کے شاگرد حجۃ الاسلام امام غزالی۔ امام غزالی ہی نے اس نئے انداز نگارش کی بنیاد ڈالی اور مستقل طور سے فلسفہ کے مواقف کا رد کیا، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے۔

"اول من کتب فی طریقۃ الکلام علی ہذا المنحی الغزالیؒ وتبعہ الامام ابن الخطیب وجماعۃ وقفوا اثرھم۔"

مزید تفصیل غیر ضروری ہے، تاریخی تسلسل کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ امام غزالی کے سلسلۂ تلمذ میں ہی قاضی ناصر الدین بیضاوی منسلک تھے، انھوں نے علم کلام میں "طوالع الانوار" لکھی۔ بیضاویؒ کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی عضد الدین ایجی ہیں جو [illegible] مستقل علم کلام

کے مصنف ہیں، "مواقف" کی شرح میر سید شریف نے کی جو سنی علم کلام کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، قاضی عضد کے شاگرد علامہ سعد الدین تفتازانی تھے، جنہوں نے کلام میں مقاصد و شرح مقاصد، تہذیب الکلام اور شرح عقائد نسفی لکھیں۔

یہ سب اس فن کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہیں، مگر جو بات تہافت الفلاسفہ کی وہ دوسروں کی کہاں۔

۲۔ تہافت الفلاسفہ اور الحکمۃ الملہمہ کا تصنیفی پس منظر: گوناگوں اسباب کی بنا پر چوتھی پانچویں صدی ہجری میں اسلامی فکر کے اندر فلسفہ نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی، اور یونانی بالخصوص ارسطاطالیسی اور ابن سینائی فلسفہ کے ساتھ آزاد خیال مسلمانوں کا شغف خطرناک حد تک پہونچ چکا تھا، اس خطرے کا سد باب وقت کی اہم ضرورت تھا، اور یہ فریضہ امام غزالی نے انجام دیا اور یہ واقعہ ہے کہ امام رازی سے کہیں پہلے فلسفہ کے پرخچے اُڑا کر رکھ دئے تھے،

کچھ ایسی ہی صورت حال پچھلی صدی میں ہمارے یہاں تھی، نصاب پر معقولات ہی معقولات چھا کر رہ گئی تھی، قرآن کریم کے سلسلے میں صرف کوئی ڈیڑھ بلکہ سوا کتاب پڑھائی جاتی تھی، یعنی جلالین شریف اور بیضاوی شریف (تا مقام درس)، مگر منطق میں "صغریٰ" سے "میر زاہد امور عامہ" تک کوئی پچیس کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، پھر فلسفہ میں ہدایۃ الحکمۃ متن اور ہدیہ سعیدیہ سے صدرا و شمس بازغہ بلکہ شرح اشارات تک ضروری تھیں اور معقول پسند طلبہ کے جذبۂ ہل من مزید کی تشفی کے لیے شرح مطالع، شرح حکمۃ العین، حواشی قدیمہ ......، حواشی جدیدہ اور جی کتابت بھی پڑھائی جاتی تھیں، غرض طبائع پر معقولات کا غلبہ تھا اور علوم عقلیہ کی وقعت مسلم تھی کسی عالم کو اس وقت تک عالم تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جب تک معقولات میں دستگاہ عالی نہ رکھتا ہو۔

امام غزالی کے دور میں شیخ بو علی سینا کی عظمت و رفعت کی پہچان بن گئی تھی، بعد کے شعرا متقدمین کی طرح اس کی تصانیف کو علم و دانش کا ذخیرہ کہا کرتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ایک قصیدے میں شاعر بحتری کے اشعار آبدار پر ابن سینا کی ہفوات کو ترجیح دیتا تھا۔

مرد با حکمت همی باید که دامن گیردش ‏ تا شفائے بو علی خواند نہ تا از بحتری

اور پچھلی صدی میں ہندوستان کے فلسفی علی الاطلاق ملا محمود جونپوری کا شمس بازغہ حکمت و دانشوری کی مثل اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ذوقؔ اپنے ایک قصیدے میں میر حسن کی "مثنوی بدر منیر" اور "شمس بازغہ" کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہوا ہے مدرسہ یہ جلوہ گاہ عیش و نشاط ‏ کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں "بدر منیر"

لیکن جب امام غزالی نے فلسفہ کا رد کرنا چاہا، تو ان کے سامنے اس کی تردید کے سلسلے میں کافی مواد تھا، چنانچہ کاتبی قزوینی نے "شرح محصل رازی" میں لکھا ہے کہ "تہافت الفلاسفہ" میں فلسفہ کے رد و ابطال کے سلسلے میں امام غزالی نے یحییٰ نحوی کی بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے،

مگر اس صدی کے آغاز میں جب مولانا احمد رضا نے فلسفہ کا رد کرنا چاہا تو پچھلے فلاسفہ و متکلمین سے استفادے کا تو ذکر ہی کیا، اپنے معاصرین کی تصانیف کا بھی مطالعہ نہیں کیا، قسّام ازل نے افتاء و درس کی جو خدمتیں انھیں تفویض فرما دی تھیں ان کی ذمہ داریاں ہی انھیں کسی اور جانب متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی، لہٰذا جب انھوں نے فلسفہ کا رد کرنا چاہا تو محض توفیق ایزدی اور اپنے ذہن ثاقب ہی کا سہارا لیا، چنانچہ فلسفہ میں اپنی رسمی تعلیم کے بارے میں خود فرماتے ہیں

"فقیر کا درس بحمدہٖ تعالیٰ تیرہ برس دس مہینے چار دن کی عمر میں ختم ہوا، اس کے بعد چند سال تک طلبہ کو پڑھایا۔ فلسفۂ جدیدہ سے تو کوئی تعلق ہی نہ تھا...... فلسفۂ قدیمہ کی دو چار کتابیں مطابق درس نظامی اپنے استاد سے پڑھیں ... بعد چند روز ترک

... طلبہ کو پڑھائیں، مگر بحمد اللہ تعالیٰ روز اول سے طبیعت اس کی ضلالتوں سے دور اور اس کی غلطیوں سے نفور تھی، سرکار ابد قرار بارگاہ عالم پناہ رسالت علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات سے دو خدمتیں اس خانہ زاد ہیچکارہ کے سپرد ہوئیں، افتاء اور رد فرق، انھوں نے مشغلۂ تدریس بھی چھڑا دیا، اور آج ۴۵ برس سے زائد ہوئے کہ بحمد اللہ تعالیٰ فلسفہ کی طرف رخ نہ کیا، نہ اس کی کسی کتاب کو کھول کر دیکھا اب اخیر عمر میں سرکار نے اپنے کرم بے پایاں کا صدقہ بندۂ عاجز سے یہ خدمت لی کہ دونوں فلسفوں کا رد کرے اور ان کی قباحتوں، شناعتوں، حماقتوں، ضلالتوں پر اپنے دینی بھائیوں یعنی طلبۂ علم کو اطلاع دے۔"

فلسفہ سے اپنی بے توجہی و بیزاری کا تذکرہ دوسری جگہ بایں طور کرتے ہیں:

"یہ چند اوراق تو اس کے قلم کے ہیں، جس نے ابتداء ہی سے فلسفہ کو سخت مکروہ جانا اور صرف دو چار کتابیں درس میں پڑھ کر دو ایک بار پڑھا کر جو چھوڑا تو ۴۵ سال سے زائد ہوئے، کہ اس کا نام نہ لیا۔"

مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اشہب قلم کی عنان اس طرف اٹھ گئی اور بغیر کسی اہتمام کے دو کتاب مستطاب ان کے قلم سے ظہور میں آئی جسے بجا طور پر امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ کی تشکیل جدید کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اس حسن اتفاق کی تفصیل سے پہلے ایک بنیادی مسئلہ کے بارے میں ہمیں اپنے ذہن کو صاف کرنا ہے۔

۳۔ ایک اہم بنیادی سوال | سوال یہ ہے کہ اگر کائنات کے ابدی حقائق کا وہم غلط کار کے تراشے اصنام خیالی کے ساتھ ٹکراؤ ہو جائے تو ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے؟

اس سوال کے جواب میں یقیناً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ انسان کی فطرت سلیمہ سے پوچھے بغیر کسی تردد کے اول الذکر کے واجب الترجیح ہونے کا فیصلہ کرے گی۔

کائنات کا علم [illegible] بہت بعد ہے [illegible] حقیقت کو صرف [illegible]
کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی [illegible]

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"

اور جب انبیاء سابقین نے اپنے ناشکرے گروہ فرد منکروں سے پوچھا

"افی اللہ شک فاطر السموات والارض"

تو اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے۔

رہی سائنس اور اس کے نظریات تو اس کی حقیقت ایک دل خوش کن شاعرانہ حسن تعلیل سے زیادہ نہیں رہی، جسے فریب خوردہ انسان اپنے ادعائے ہمہ دانی کی تشفی کے لئے گنگناتا رہا ہے پھر عہد قدیم کا انسان ان نت نئے ڈھکوسلوں کی اختراع و اختلاق میں اتنی فراخ دلی سے کام نہیں لیتا تھا، جتنا اس نام نہاد عہد تنویر کا مدعی دانش کرتا ہے، جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

اس باب میں پیشوایان دین و ملت کا تبصرہ نقل کرنے کے بجائے زیادہ مستحسن ہوگا کہ خود ارباب سائنس اپنی کاوش پیہم کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، اسے ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے،

ایک سائنس دان نارتھ روپ کہتا ہے۔

"آج فنی علوم کا ماحصل کیا ہے؟ چند مساواتیں جن کی توجیہ سے خود اُن کے دریافت کنندگان قاصر ہیں اور کچھ نظریے جنھیں وہ بغیر تعلمت کے نہیں سمجھا سکتے اور پھر بھی انھیں ان کے بہت سے رفقا تسلیم نہیں کرتے یا یوں کہئے کہ آج علمائے سائنس خود اپنے اکتشافات کو نہیں سمجھ پا رہے ہیں کیونکہ وہ مبادی و اساسیات جو تمام اکتشافات کے افہام و تفہیم کے لیے ضروری ہیں خود پادر ہوا ہیں۔

——— وہ قدیم ڈھانچہ اور پس منظر جو اہل سائنس کے تخیل و تصویر کائنات کا محکم قلعہ تھا

خود سائنس کے لیے خطرہ ہے کہ خود اپنے ہی اکتشافات و ایجادات کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گی اور خود اس کی کامیابی اس کی موت کا باعث بن جائے گی[لہ]

اسی طرح ایک دوسرا ماہر سائنس میکس پلانک لکھتا ہے،

"آج ہم اپنی نوعیت کے ایک عجیب دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ صحیح معنوں میں ایک نازک دور ہے، ہم اپنی تہذیب و ثقافت کے ہر شعبہ میں مادی ہو یا روحانی ایک نازک موڑ پر پہونچ چکے ہیں، اور یہ جذبہ نہ صرف ملکی معاملات کے احوال واقعی ہی میں کارفرما ہے، بلکہ شخصی و اجتماعی زندگی کی اقدار اولیہ کے متعلق عام رجحانات میں بھی برابر ظاہر ہو رہا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ علامات ایک عظیم الشان نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہیں لیکن کچھ اور لوگ بھی ہیں، جنھیں ان ارتیابی رجحانات میں اس زوال کی خبر نظر آرہی ہے جو ہماری تہذیب کے نصیب میں مقدر ہو چکا ہے"[عہ]

بالفاظ دیگر وہ چٹان ہی سائنس دانوں کے پیروں تلے سے نکل رہی ہے جس پر وہ ان دل خوش کن مفروضات کی فلک بوس عمارت کو مستحکم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے کیونکہ آج سائنس کے بنیادی نظریات ہی خود پادر ہوا بن چکے ہیں، کوئی بات ہی متعین نہیں ہو، بقول چیسٹر رووِل۔

"ہم خود کو ایسے گرداب میں پھنسا پاتے ہیں، جہاں کچھ بھی متعین نہیں ہے یہاں تک کہ جو امواج ہمیں بہائے لئے جارہی ہیں، ان کا رخ تک غیر متعین ہے"[سہ]

لہ UX Northrop, Science And First Princ-iples, P.2)

عہ (Max Plank: Where is Science Going, P.64

سہ (Chester Rowell in San Francisco Chronic-le, August 1930)

اس طرح ان کی صحت حال کے بعد ظاہر ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر کلیات تک [illegible] باطل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اُدھر اہلِ سائنس تو اس طرح اعتراف نارسائی کر رہے ہیں مگر ادھر ہمارے یہاں متجددین کا ایک طبقہ ہے جو ان فرسودہ نظریات کو کالوحی المنزل من السماء سمجھنے پر مصر ہے اور پھر انھیں معیارِ حق و باطل ٹھہرا کر روایاتی اقدار حیات اور دینی تصورات کی انہی قیاسی نظریات و مفروضات کی روشنی میں توجیہ پر مصر ہے۔

کچھ ایسے ہی تجدد پسند لوگوں نے حضرت مولانا مولوی ظفر الدین بہاریؒ کو مجبور کیا کہ وہ مولانا سے ایک پیشین گوئی کے باب میں استفسار کریں۔

۴۔ <u>الکلمۃ الملہمہ کی وجہ تصنیف</u> ہوا یہ کہ امریکہ کے کسی مہندس نے دعویٰ کیا تھا کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجتماع سیارات کے سبب آفتاب میں اتنا بڑا داغ پڑ جائے گا کہ اس کے باعث زلزلے آئیں گے، طوفان شدید آئے گا، ممالک برباد ہو جائیں گے اور خدا معلوم کیا کیا مصائب ارضی و سماوی رونما ہوں گے۔

جب تجدد پسند لوگوں نے ... مولانا بہاریؒ کو جو اُس وقت مدرسہ عالیہ سہسرام کے مدرس اعلیٰ تھے مجبور کیا تو انھوں نے ۱۰ صفر ۱۳۳۸ھ کو اس پیشین گوئی پر مشتمل ایک عریضہ مولانا کی خدمت اقدس میں روانہ کیا، انھوں نے پہلے تو اس کا مختصر جواب چند ورق میں جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہ محض اباطیل بے اصل ہیں، نہ وہ اجتماع سیارات اُس تاریخ کو ہوگا، جس کا مدعی ہے، نہ جاذبیت (کشش ثقل یا Gravition) کوئی حقیقت رکھتی ہے [اور چونکہ مدعیان فرنگ کا اعتماد کوپرنیکی نظام ہیئت پر ہے، جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ زمین کے گرد آفتاب حرکت نہیں کرتا، بلکہ زمین آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے، پھر اسکی تائید مزید نیوٹن اور ان کے پیروؤں نے کشش ثقل کے مفروضے کی تھی، لہٰذا اس کو بھی]

متن میں بعض دلائل ردِ زمین کے لکھے :

جب یہ توضیحی تقریر زیادہ طویل ہوئی تو موخر الذکر دلائل کو جدا کر کے مستقلاً ایک کافی و کامل کتاب بعنوان "فوزِ مبین در ردِ حرکتِ زمین" لکھی جس میں ایک سو پانچ دلائل سے حرکتِ زمین باطل کی اور "جاذبیت" "نافریت" وغیرہ ہاتھ مزعومات فلسفۂ جدیدہ پردہ روشن رد کئے، جن کے مطالعہ سے ہر ذی انصاف پر بحمدہٖ تعالےٰ آفتاب سے زیادہ روشن ہو جائے کہ فلسفۂ جدیدہ کو اصلاً عقل سے مس نہیں۔

"فوزِ مبین" کئی فصلوں پر منقسم تھی، اُن میں سے تیسری فصل میں ایک "تذییل" لکھی، اس "تذییل" میں اُن دس دلائل کا ذکر تھا جو فلسفۂ قدیمہ نے حرکتِ زمین کے رد پر وارد کئے تھے، مثلاً

۱۔ دلیل پنجم یہ تھی کہ فلک میں "میل مستدیر" ہے تو زمین میں نہ ہوگا کہ طبیعت متضاد ہے،

۲۔ دلیل ہفتم یہ کہ زمین میں مبدء میل مستقیم ہے، تو مبدء میل مستدیر محال،

۳۔ دلیل ہشتم، یہ تھی کہ زمین کا دورہ طبعاً وارادتاً ہونا ظاہر اور "قسر" کو دوام نہیں،

۴۔ دلیل نہم یہ کہ حرکتِ زمین ماننے والوں کے نزدیک یہ حرکت نامتناہی ہے، تو قوت جسمانی سے اس کا صدور محال،

۵۔ دلیل دہم، یہ کہ طبعیات میں ثابت ہے کہ حرکت وضعیہ نہ ہوگی مگر "ارادیہ" اور زمین "ذات ارادہ" نہیں۔

فاضل مصنف نے ان دلائل عشرہ کا ابطال کیا کہ یہ دلائل باطل و زائل ہیں ان کے ردنے اصول فلسفۂ قدیمہ کے رد ہاق و ابطال کا دروازہ کھولا"۔ انھوں نے ان کے ابطال تیس مقام لکھے" جن سے بعونہٖ تعالےٰ تمام فلسفۂ قدیمہ کی نسبت روشن ہو گیا کہ فلسفۂ جدیدہ کی طرح بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا"!

"ان مقامات جلیل کے سبب یہ تذییل غیر معمولی طور پر طویل ہوگئی جس کے نتیجہ میں اصل کتاب "فوزمبین" کی چوتھی فصل بہت دور جا پڑی، لہذا ان کے صاحبزادے مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں صاحب کی رائے ہوئی کہ ان مقامات کو رد فلسفۂ قدیمہ میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ الاخرین یکجا ہو تو وہ کتاب رد فلسفۂ جدیدہ تحقیق دوسری رد فلسفۂ قدیمہ میں اور ساتھ ساتھ مقاصد فوزمبین میں اجنبی (بظاہر غیر متعلق ابحاث) سے فصل (سوم) طویل نہو۔"

یہ رائے مولانا کو بھی پسند آئی اور اس طرح کتاب کامل النصاب بعون الملک الوہاب المسمّیٰ بنام تاریخی "الکلمۃ الملہمۃ فی الحکمۃ لوہاء الفلسفۃ المشئمۃ" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

ازاں بعد مولانا سفارش فرماتے ہیں۔

"مسلمان طلبہ (و اہل علم) پر دونوں کتابوں کا بغور بالاستیعاب مطالعہ اہم ضروریات سے ہے کہ دونوں فلسفۂ مزخرفہ کی شناعتوں، جہالتوں، سفاہتوں ضلالتوں پر مطلع رہیں اور بعونہ تعالےٰ عقائد حقہ اسلامیہ سے ان کے قدم متزلزل نہوں۔"

امام غزالی نے یونانی ارسطاطالیسی فلسفہ کی تنقیص کے لیے فارابی و ابن سینا کے مزخرفات کے پرخچے اڑا دیے اور مولانا نے فلسفہ کے ہفوات و باطلین کی تردید و ابطال کے لیے مشہور فلسفی ملا محمود جونپوری کے چیتھڑے بکھیر دیئے۔ وہ ذات گرامی جو اس قسم کی کاوشوں کو

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

کا مصداق سمجھتی تھی، اس تغافل کو پسند نہ فرماتی، پھر بھی ان کے عقیدت مندوں کے انشراح

صدر کے لیے امام غزالی کی "تہافت الفلاسفہ" اور عہد حاضر کے اس عظیم کلامی شاہکار [الکلمۃ الملہمہ فی الحکمۃ المحکمۃ لوہاء الفلسفۃ المشئمۃ"] کا سرسری موازنہ پیش کیا جا رہا ہے وباللہ التوفیق۔

۵ - تہافت الفلاسفہ اور الکلمۃ الملہمہ کے محتویات | "تہافت الفلاسفہ" میں بیس مسئلے ہیں، تفصیلِ ذیل

پہلا مسئلہ، فلاسفہ کا مذہب ہے کہ عالم ازلی (ہمیشہ سے) ہے، اس کا ابطال،

دوسرا مسئلہ، ان کا یہ بھی مذہب کہ عالم ابدی ہے (ہمیشہ رہے گا) اس کا ابطال،

تیسرا مسئلہ، فلاسفہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالےٰ عالم کا بنانے والا ہے اور عالم اس کی کاریگری ہے، فریب محض ہے، اس کی وضاحت۔

چوتھا مسئلہ، فلاسفہ صانعِ عالم (باری تعالیٰ) کا وجود ثابت کرنے سے عاجز ہیں، اس کی توضیح۔

پانچواں مسئلہ۔ فلاسفہ "دو خداؤں کے محال ہونے پر دلیل قائم کرنے سے عاجز ہیں،

چھٹا مسئلہ۔ فلاسفہ باری تعالےٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں، اس کا ابطال،

ساتواں مسئلہ۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اول (باری تعالےٰ) کی ذات جنس اور فصل میں منقسم نہیں ہو سکتی، اس کا ابطال۔

آٹھواں مسئلہ۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اول (باری تعالےٰ) موجود، بسیط اور بلا ماہیت ہے، اس کا ابطال۔

نواں مسئلہ۔ فلاسفہ اس بیان سے عاجز ہیں کہ اول (باری تعالےٰ) جسم نہیں ہے۔

دسواں مسئلہ۔ "قول بالدھر" (دہریت) کی توضیح اور اس بات کی وضاحت کہ اس قول کے قائلین کے لیے صانع عالم کی نفی لازم ہے،

گیارہواں مسئلہ۔ فلاسفہ یہ ثابت کرنے سے عاجز ہیں کہ اول (باری تعالیٰ) اپنے غیر کو جانتا

بارہواں مسئلہ۔ فلاسفہ یہ بات بھی ثابت کرنے سے عاجز ہیں کہ اول (باری تعالیٰ) اپنی ذات کو جانتا ہے۔

تیرہواں مسئلہ۔ فلاسفہ کے اس قول کا ابطال کہ اول (باری تعالیٰ) جزئیات (متغیرہ وحادثہ) کا عالم نہیں ہے۔

چودہواں مسئلہ۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ آسمان ذی حیات حیوان ہے، اور اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اس کا ابطال۔

پندرہواں مسئلہ۔ فلاسفہ نے جن اغراض کا ذکر کیا ہے کہ وہ آسمان کی محرک ہیں، اُن کا ابطال۔

سولہواں مسئلہ۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ آسمان کے نفوس کو اس عالم کی تمام جزئیات حادثہ کا علم ہے، اس کا ابطال،

سترہواں مسئلہ۔ فلاسفہ جو "خرق عادات" کو محال بتاتے ہیں، اس کا ابطال۔

اٹھارہواں مسئلہ۔ فلاسفہ اس بات پر کہ نفس انسانی، جوہر قائم بنفسہ ہے جو نہ جسم ہے اور نہ عرض، عقلی دلیل قائم کرنے سے عاجز ہیں، اس کی توضیح۔

انیسواں مسئلہ۔ فلاسفہ نفوس بشریہ پر فنا کو محال بتاتے ہیں، اس کا ابطال،

بیسواں مسئلہ۔ فلاسفہ کو بعث بعد الموت اور حشر اجساد سے انکار ہے نیز اس بات سے بھی کہ جنت اور دوزخ میں وہ جسمانی لذتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہوں گے، اس کا ابطال،

ان میں بارہ [۱۲] مسئلوں (۱، ۲، ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰) کے اندر فلاسفہ کے مواقف اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں، لہٰذا امام صاحب نے انھیں باطل کیا ہے، باقی آٹھ مسئلوں میں ان (فلاسفہ) کا دعویٰ بظاہر وہی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کی تعلیم ہے، مگر یا تو یہ کھوکھلے دعاوی

اور فریب کے مترادف ہیں، یا اگر نیک نیتی کے ساتھ کئے گئے ہیں تو غالباً کچھ ذہنی تحفظات کے ساتھ کئے گئے ہیں، اس لئے انھوں (فلاسفہ) نے ان کے اثبات کے لیے جو دلیل دی ہو، وہ سقیم ہے، اور منطقی معیار پر پوری نہیں اترتی، اس لیے امام صاحب نے ان دلائل کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے، مثلاً ایمان باللہ اسلامی تعلیم کا اصل الاصول ہے، چوتھے مسئلہ میں امام صاحب بتاتے ہیں کہ فلاسفہ صانعِ عالم کے وجود کو مانتے ہیں، مگر اس کے وجود پر جو دلیل دیتے ہیں، وہ سقیم ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا انداز فکر متناقض بالذات ہے کیونکہ ایک جانب وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں [جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ موثر سے مستغنی ہے] اور دوسری جانب اس کے لیے ایک "صانع" کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ تخبط کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، امام غزالی فرماتے ہیں :۔

" واما الفلاسفۃ فقدروا ان العالم قدیم ثم اثبتوا لہ مع ذلک صانعاً وھذا المذھب بوضعہ متناقض "

اسی طرح کا تخبط باقی مسائل ثمانیہ میں ہے، جس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

اس کے بعد "الکلمۃ الملہمۃ" کے محتویات پر نظر ڈالئے، مصنف نے دیباچہ میں تیس مقام بتائے تھے، فرماتے ہیں،

"دس دلائل ..... فلسفۂ قدیمہ نے رد حرکت زمین پر دئے ..... ان کے رد نے اُصول فلسفۂ قدیمہ کے ازہاق وابطال کا دروازہ کھولا "

ہم نے تیس مقام ان کے رد میں لکھے۔

مگر مطبوعہ کتاب میں ان کی تعداد اکتیس ہے، جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے،

(مقام اول) اللہ عزوجل فاعل مختار ہے، اس کا فعل نہ کسی مرجح کا دست نگر، نہ کسی

اسفنداد کا [illegible] (مقام دوم) اللہ واحد القہار ایک اکیلا خالقِ جملۂ عالم ہے، خالقیت
میں عقول وغیرہا کوئی اس کا شریک، نہ تخلیق میں واسطہ (مقام سوم) فلک محدد جہات نہیں
(مقام چہارم) قسر کے لئے مقسور میں کوئی میل طبعی ہونا کچھ ضرور نہیں (مقام پنجم) خلا محال نہیں
(مقام ششم) حیز، شکل، مقدار اور جتنی چیزیں جسم کے لیے فی نفسہ ضروری ہیں کہ جسم کا
اُن سے خلو نامتصور، اُن میں بھی کسی شے کا جسم کے لیے طبعی ہونا کچھ ضروری نہیں (مقام ہفتم)
فلک الافلاک میں میل مستقیم ہے (مقام ہشتم) فلک میں مبدء میل مستدیر نہیں۔
(مقام نہم) جسم میں کوئی نہ کوئی مبدء میل ہونا کچھ ضروری نہیں (مقام دہم) حرکت
وضعیہ کا طبیعیہ ہونا محال نہیں (مقام یازدہم) حرکت وضعیہ فلک بھی طبیعیہ ہو سکتی ہے
(مقام دوازدہم) طبیعت کا دائماً اپنے کمال سے محروم رہنا محال نہیں (مقام سیزدہم)
حرکت فلک قسریہ ہو سکتی ہے، (مقام چہاردہم) فلک کی حرکت ارادیہ ہونا ثابت نہیں
(مقام پانزدہم) بلکہ افلاک کی حرکت قسریہ ہونا ثابت (مقام شانزدہم) فلک پر
خرق والتیام جائز ہے (مقام ہفدہم) (فلک) بسیط نہیں (مقام ہیجدہم) فلک کا
قابل حرکت مستدیرہ ہونا ثابت نہیں (مقام نوزدہم) فلک کی حرکت ثابت نہیں۔
(مقام بستم) اصول فلسفہ پر فلک کی حرکت مستدیرہ بلکہ مطلقاً جنبش یکسر باطل و محال۔
(مقام بست ویکم) دو حرکت مستقیمہ کے بیچ میں سکون لازم نہیں (مقام بست ودوم)
اُمور غیر متناہیہ کا عدم سے وجود میں آجانا مطلقاً محال ہے، مجتمع ہوں، خواہ متعاقب
مرتب ہوں، یا غیر مرتب (مقام بست وسوم) قدم نوعی محال ہے (مقام بست وچہارم)
قوت جسمانیہ کا غیر متناہی پر قادر ہونا محال نہیں (مقام بست وپنجم) آن سیال کوئی چیز نہیں۔
(مقام بست وششم) زمانہ کا وجود خارجی اصلاً ثابت نہیں (مقام بست وہفتم) زمانہ کے لئے

خارج میں کوئی منشأ انتزاع بھی نہیں (مقام بست وہشتم) زمانہ موجود ہو خواہ موہوم، کسی حرکت کی مقدار نہیں ہو سکتا (مقام بست ونہم) زمانہ کا مقدار حرکت فلکیہ ہونا تو کسی طرح ثابت نہیں، بلکہ نہ ہونا ثابت ہے (مقام سیم) زمانہ حادث ہے۔

یہ ہیں وہ تیس مقام جنہیں "فوزمبین" کی فصل سوم میں بطور تذییل لکھا تھا، مگر جب مستقل کتاب (الکلمۃ الملہمہ) مرتب ہونے لگی تو ایک اور مقام کا اضافہ کیا تاکہ یہ رد کامل وکافی ہو جائے، چنانچہ مقام سیم کے آخر میں فرماتے ہیں۔

یہ ہیں وہ تیس مقام کہ اس تذییل میں تھے، بعونہ تعالیٰ دو کا با فاضہ اور اضافہ ہوا کہ فلسفہ کی کوئی اہم مردود بات ردسے رہ نہ جائے۔ وباللہ التوفیق ۔

(مقام سی ویکم) "جزء لایتجزیٰ" باطل نہیں۔

واضح رہے کہ سائنس جدید کے اہم نظریات جو اسلام سے متصادم ہیں چار ہیں۔

۱۔ کوپرنیکس کا "شمسی۔ مرکزی نظریہ" جس کی رو سے زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے،

۲۔ ڈارون کا "نظریۂ ارتقاء"

۳۔ مارکس کی جدلیاتی مادیت" یا تاریخ کی مادی توجیہ

۴۔ فرائڈ کا نظریہ۔

اول الذکر جدید علم الہیئت اور "نجمی طبیعیات" (Astrophysics) کی اساس ہے اسکے بہت سے دعاوی بالواسطہ اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوتے ہیں، اسلیے فاضل مصنف نے "حرکت زمین" اور اُس سے متعلقہ مسائل کی تنقیح وتنقید پر خصوصیت سے توجہ کی پھر حرکت زمین کی ہو یا دوسرے اجرام سماوی کی، بحث وتمحیص کے گوناگوں مباحث پر مشتمل ہے، جو ان فلسفیانہ مفروضات اور قیاس آرائیوں کے لیے بمنزلہ اصول ومبادی ہیں، اس لئے مصنف علیہ الرحمہ نے کتاب کا بڑا حصہ تیسرے مقام سے بیسویں مقام تک انہیں مزعومہ اصول ومبادی کی تحقیق پر صرف کیا ہے،

لیکن خالص اسلامی نقطہ منظر سے پہلا اور دوسرا مقام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ "ایمان باللہ" اور "توحید ربوبیت" کے عقائد حقہ کے لئے جو اصل اسلام ہیں، یہ بنیان مرصوص کا کام دے سکتے ہیں۔

امام ابوالحسن مدائنی

(اسلامی ہند کے پہلے مورخ)

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

دوسری صدی کے نصف اول (سنہ ۱۰۰ھ تا ۱۵۰ھ) میں پورے عالم اسلام میں مختلف موضوعات پر کتابوں کی تدوین و تالیف کا دور شروع ہوا تو احادیث و آثار اور فقہ کی طرح سیر و مغازی، طبقات و تاریخ، فتوحات و غزوات، اور احداث و اخبار پر بھی کتابیں لکھی گئیں، اور تیسری صدی تک ان موضوعات پر تصانیف کا انبار لگ گیا،

اس دور میں بلاد اسلامیہ کی فتوحات و غزوات پر بہت سے علماء و ائمہ نے کتابیں لکھیں ان میں متعدد علماء نے خراسان، سجستان، کرمان، مکران، سندھ اور ہندوستان کے علاوہ بہت سے عجمی ممالک کے غزوات و فتوحات پر خصوصی توجہ دی، ہماری تحقیق میں اس دور میں امام ابوالحسن علی ابن محمد مدائنی متوفی سنہ ۲۲۵ھ رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے اسلامی ہند پر تین مستقل کتابیں لکھیں، اور یہاں کی فتوحات و امارات اور اخبار و احوال کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا۔ ابن ندیم نے ان کے بارے میں علمائے تاریخ و طبقات کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے،

قالت العلماء أبو مخنف	علماء نے کہا ہے کہ ابو مخنف عراق
بامر العراق واخبارها	کے امور و اخبار اور فتوحات کے

ابن ندیم بیان کرتے ہیں

وفتوحها يزيد على غيره	بارے میں دوسروں سے زیادہ علم
والمدائني بأمر خراسان	رکھتے ہیں، اور مدائنی خراسان،
والهند وفارس والواقدي	ہندوستان اور فارس کے بارے
بالحجاز والسيرة، وقد	میں دوسروں پر فائق ہیں، اور
اشتركوا في فتوح الشام[1]	واقدی حجاز کے اخبار اور سیر و مغازی
	میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہیں[2]

اور مدائنی کی تقریباً سوا دو سو تاریخی تصانیف میں ہندوستان کے موضوع پر ان میں مستقل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے،

(۱) کتاب ثغر الهند۔ (۲) کتاب عمال الهند (۳) کتاب فتح مکران۔[2]

مدائنی کے معاصر اور ان سے متقدم الوفاۃ مورخ علامہ واقدی متوفی ۲۰۷ھ کی ایک کتاب اخبار فتوح بلاد السند کا تذکرہ قاضی رشید بن زبیر نے اپنی کتاب الذخائر والتحف میں کیا ہے جس میں واقدی نے حضرت امیر معاویہؓ کے امیر سندھ عبداللہ بن سوار عبدیؒ کی خدمت میں راجہ قیقان کے گرانقدر تحفہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے، واقدی کی تصانیف میں اس نام کی کسی کتاب کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان کی کتاب فتوح العراق میں اس عنوان سے مستقل باب سندھ کی فتوحات کا رہا ہو، جیسے بلاذری کی کتاب فتوح البلدان میں فتوح السند کے الگ عنوان کے تحت یہاں کے غزوات و فتوحات اور امارات کا ذکر ہے، بہرحال واقدی نے مدائنی سے پہلے ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر خصوصی توجہ کر کے مستقل کتاب یا مستقل باب لکھا ہے، اس کے باوجود ہندوستان کے بارے میں مدائنی کی متعدد تصانیف اور ان کے دو شاگرد خلیفہ بن

[1] الفہرست ص ۱۴۰، [2] ایضاً ص ۱۵۰

خیاط بصری متوفی سنہ ... اور ابو الحسن احمد بن یحییٰ بلاذری متوفی سنہ ... کی بھی کتابیں ہیں یہاں کے حالات سے خصوصی اعتنا کی وجہ سے مدائنی اسلامی ہند کے پہلے مورخ ملنے جائینگے اس وقت اسی حیثیت سے انکا تذکرہ مقصود ہے، وہ دوسری صدی کے عظیم مورخ، ماہر انساب وطبقات، عالم فتوح ومغازی، راویۂ ایام واخبار اور ثقہ وصدوق محدث ہیں، اور تواریخ واحداث پر اپنی تصانیفِ کثیرہ کی وجہ سے اخباری کے لقب سے مشہور ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا،

امام ابو الحسن مدائنی کا مستقل تذکرہ حسب ذیل کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

(۱) ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار ابن قتیبہ متوفی سنہ ۲۷۶ھ نے کتاب المعارف مین دو سطر سے کم ہی میں انکا ذکر کیا ہے (۲) ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں انکا حال کم اور تصانیف کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا ہے، (۳) خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد مین نسبۃً تفصیل سے لکھا ہے جو بعد والوں کا ماخذ ہے، (۴) سمعانی نے کتاب الانساب مین تاریخ بغداد کا خلاصہ درج کیا ہے، (۵) یاقوت نے معجم الادباء میں کچھ زائد باتیں لکھی ہیں اور ابن ندیم کے حوالے سے تصانیف کا مفصل تذکرہ کیا ہے، (۶) امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں جرح وتعدیل کے انداز میں انکا تذکرہ کیا ہے۔ العبر فی خبر من غبر میں تاریخ بغداد کا خلاصۃ الخلاصہ بیان کیا ہے، اور المغنی عن الضعفاء میں ایک سطر میں لکھا ہے، (۷) ابن عماد نے شذرات الذہب میں العبر کی عبارت نقل کر دی ہے،

نام ونسب اور ولاء | ابو الحسن علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف قرشی مدائنی، مولی عبد الرحمن ابن سمرہ یا مولی عبد شمس بن عبد مناف، عام طور پر ابو الحسن مدائنی یا صرف مدائنی سے مشہور ہیں، ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں[1] بلاذری نے فتوح البلدان کے باب السند میں[2] خطیب نے

---

[1] ص ۲۲۲ [2] ص ۴۴۰

تاریخ بغداد میں[5] ابن ندیم نے الفہرست میں[6] سمعانی نے کتاب الانساب میں[3] یاقوت نے معجم الادبار میں[4] مدائنی کے نام ونسب اور ولاء کے بارے میں اتنا ہی لکھا ہے، جسے مدائنی کے شاگرد رشید حارث بن ابو اسامہ نے بیان کرکے کہا ہے کہ یہ معلومات خود مدائنی نے اپنے نسب کے بارے میں مجھے دی ہیں، خطیب نے لکھا ہے،

محمد بن جریر الطبری قال:	طبری کا قول ہے کہ علی بن محمد بن عبد اللہ
علی بن محمد بن عبد اللہ	بن ابی سیف مولیٰ عبد الرحمن بن سمرہ
بن ابی سیف، مولی عبد الرحمن	کے نسب اور ولاء کے بارے میں
بن سمرة، اخبرنی الحارث	ان کے شاگرد حارث بن ابو اسامہ نے
انه هو الذی اخبره بنسبه	مجھ سے بیان کیا ہے کہ خود مدائنی نے انکو
وولائه[5]	یہ معلومات دی ہیں۔

اور ابن ندیم نے لکھا ہے۔

قال الحارث بن ابی اسامة	حارث بن ابو اسامہ نے بتایا ہے کہ
المدائنی ابو الحسن علی بن محمد بن	مدائنی کا نام ونسب اور ولاء یوں
عبد اللہ بن ابی سیف المدائنی	ہے، ابو الحسن علی بن محمد بن عبد اللہ
مولی شمس بن عبد مناف[6]	ابن ...... ابی سیف، مولی
	شمس بن عبد مناف۔

مدائنی کے اجداد میں کوئی بزرگ فاتح سجستان حضرت عبد الرحمن بن سمرہ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی قرشی رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، اسی لئے مدائنی ولاءً قرشی ہیں

[1] ص ٣٤٥ ج ١٢ [2] ص ١٤٠، [3] ص ٥١٥ ج ٢، [4] ص ٣٠٩ ج ٥ [5] تاریخ بغداد ص ٥٥ ج ١٢
[6] الفہرست ص ١٤٠۔

اور مولی عبدالرحمٰن بن سمرہ [illegible] بن جہان کہے جاتے ہیں مدائنی کے پردادا ابو سیف غالباً حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کے ساتھ کابل یا سندھ کے علاقہ سے بصرہ گئے، اور مسلمان ہوئے، جو حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں سجستان وکابل کے ساتھ سندھ و مکران کے بعض علاقوں کے مشہور فاتح ہیں، وہ پہلی بار ۳۳ھ میں سجستان کی مہم پر آئے، دوسری بار ۴۲ھ میں یہاں کی بغاوت فرد کرنے کے لئے آئے، اور سندھ و مکران کے بعض نواحی علاقے فتح کئے، آخر میں بعہد معاویہ بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں ۵۱ھ میں انتقال فرمایا، بصرہ کے جس علاقے میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ مقیم تھے اس کو سکۃ ابن سمرہ کہتے تھے، یہاں ان کا شاندار اور وسیع و عریض قصر تھا، اسی میں ان کے کابلی غلاموں نے ایک عظیم الشان مسجد کابلی طرز تعمیر پر بنائی تھی، بعد میں یہ علاقہ ان کی اولاد کا مسکن بنا اور سکۃ بنی سمرہ کہلایا جس کے مالک حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کے پوتے عتبہ بن عبداللہ نامی ایک بزرگ تھے، بلاذری کا بیان ہے[1]

وکان عبد الرحمٰن قدم بغلمان	حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کابلی غلام
من سبی کابل فعملوا له مسجداً	لائے تھے جنھوں نے ان کے قصر واقع
فی قصرہ بالبصرۃ علی بناء کابل	بصرہ میں کابلی طرز تعمیر پر ایک مسجد بنائی

۴۳ھ میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے کابل کی مہم کے سلسلے میں افغانستان کے علاقہ زرنج کے حاکم سے دو ہزار غلاموں پر صلح کی تھی، پھر آگے بڑھ کر ہندوستان کے بعض نواحی علاقے فتح کئے، بلاذری نے لکھا ہے،

فاتی زرنج فحصر مرزبانها فی	حضرت ابن سمرہؓ نے زرنگ کے حاکم
قصرہ فی یوم عید لهم فصالحه	کا اس کے قلعہ میں وہاں کے قومی

---

[1] فتوح البلدان ص ۳۸۸

علی ابنی وصیف، وغلب ابن سمرۃ علی مابین زرنج وکش من ناحیۃ الھند،[1]

جشن کے دن محاصرہ کیا، اور ۲۰۰۰ آبنے دو ہزار غلاموں پر ان سے صلح کی اور حضرت ابن سمرہؓ ہندوستان کی جانب زرنگ اور کچھ کے درمیانی علاقہ پر قابض ہو گئے۔

ہو سکتا ہے کہ کابل کے جنگی قیدیوں اور غلاموں میں کچھ لوگ ہندوستانی علاقہ کے بھی رہے ہوں جن میں مدائنی کے جداعلیٰ بھی شامل تھے، اور اسی آبائی وطنی تعلق کی بنا پر انھوں نے ہندوستان کے غزوات وفتوحات اور امارات وحادثات پر مستقل کتابیں لکھیں۔

اس زمانہ میں عام طور سے غلمان و موالی اپنے آقاؤں کے ساتھ ان کے جوار میں رہتے تھے اس لئے مدائنی کا خاندان بھی بصرہ کے سکۂ ابن سمرہ میں رہتا تھا۔

بصرہ میں پیدائش اور نشو ونما۔ بصرہ کے اسی سکۂ ابن سمرہ میں مدائنی بالاتفاق مورخین ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی نشو ونما ہوئی، ابن ندیم نے لکھا ہے۔

ومولدہ سنۃ ۱۳۵ھ وقال محمد بن یحیی عن الحسین بن فہم عنہ انہ قال ولدت سنۃ خمس وثلاثین ومائۃ[2]

مدائنی کی ولادت کے بارے میں حسین ابن فہم نے کہا ہے کہ خود مدائنی کا قول ہے کہ میری ولادت ۱۳۵ھ میں ہوئی۔

خطیب نے مدائنی کے شاگرد حارث بن ابواسامہ کا بیان نقل کیا ہے،

---

[1] فتوح البلدان ص ۳۹۴ [2] الفہرست ص ۱۴۷۔

وکان مولده ومنشأه بالبصرۃ	مدائنی کی ولادت اور نشوونما بصرہ
ثم [illegible] الی بغداد	میں ہوئی ہے، پھر وہ مدائن گئے اس کے
ثم [illegible] الی بغداد [illegible]	بعد بغداد چلے گئے، اور وہیں رہے حتی
یزل بہا حتی توفی بہا۔[1]	کہ وہیں فوت ہوئے۔

نیز خطیب، سمعانی اور یاقوت نے لکھا ہے کہ مدائنی بصری ہیں، مدائن میں قیام کیا، پھر وہاں سے بغداد منتقل ہو گئے، اور وفات تک یہیں رہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بصری المولد والمنشار اور بغدادی الوفاۃ ہونے کے باوجود درمیان میں کچھ مدت قیام مدائن کی وجہ سے مدائنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

اس وقت بصرہ کی آبادی پر تقریباً ایک سو تیس سال گزر چکے تھے، اور پہلے عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح کا دورِ خلافت تھا۔ ۱۴ھ میں بصرہ کی تعیر و تعمیر فوجی و حربی نقطۂ نظر سے ہوئی تھی، اس لئے یہاں فاتح عربوں اور مفتوح عجمیوں کی آبادیاں زیادہ ہوئیں، سواد بصرہ میں دیگر بلاد عجم کی طرح ہندوستان بھی شامل تھا، اور یہاں کا حربی اور شہری نظام بصرہ کے مرکز سے وابستہ تھا، اس لئے یہاں ایران کے اساورہ کی طرح ہندوستان کے زط (جاٹ) سیابجہ اور مید وغیرہ بڑی تعداد میں آباد ہو گئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بصرہ کے سرکاری خزانہ (بیت المال) کی حفاظت پر ہندوستان کے چالیس اور ایک روایت کے مطابق چار سو سیابجہ مامور تھے، جن کا سردار ابو سالمہ نامی ایک مسلمان جاٹ تھا۔[2]

اس دور میں بصرہ اسلامی و عجمی تہذیب و ثقافت کا مجمع البحرین تھا، تابعین اور تبع تابعین کے برکات و حسنات عام تھے، اسلامی علوم و فنون کے ائمہ تدریس و تعلیم اور تدوین و تالیف میں

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵ [2] فتوح البلدان ص ۳۷۹

معروف تھے، جن میں اکثریت طبقۂ موالی کی تھی۔ اسی ماحول میں مدائنی نے آنکھیں کھولیں اور دینی وعلمی نشوونما پائی، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ بصرہ میں گزارا۔
بصرہ میں تعلیم۔ جیسا کہ معلوم ہوا بصرہ اس وقت علم وعلماء سے معمور ومشحون تھا، اور ائمۂ دین کی کثرت عام تھی، مدائنی نے اپنے مولد ومنشار میں رہکر انھیں حضرات سے تعلیم حاصل کی اور یہاں کے شیوخ سے احادیث کی روایت کی، ان کے شیوخ واساتذہ میں یہ بصری علمار نمایاں مقام ومرتبہ کے مالک ہیں، حمّاد بن سلمہ بصری متوفی ۱۶۷ھ، مبارک بن فضالہ بصری متوفی ۱۶۵ھ، ابوبکر ہذلی (سلمی بن عبداللہ بن سلمی) بصری متوفی ۱۶۷ھ، سلام بن ابی مطیع بصری متوفی ۱۷۳ھ، اور ان کے تلامذہ میں خلیفہ بن خیاط متوفی ۲۴۰ھ، محمد بن صالح قرشی بصری متوفی ۲۵۲ھ اور ابن شبہ بصری متوفی ۲۶۳ھ قابل ذکر ہیں۔
مدائنی اپنے مولد ومنشار کی بلدی تاریخ پر خصوصی نظر رکھتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام بصرہ ہی کے زمانے میں ان کے علمی وتحقیقی ذوق میں پختگی آگئی تھی، چنانچہ ان کے شاگرد بلاذری نے تمصیر البصرۃ کے باب میں وہاں کے تاریخی آثار وعلائم کے متعلق ان کی متعدد روایات درج کی ہیں، مثلاً صفحہ ۳۴۴ پر حمام ابوبکرہ، صفحہ ۳۴۵ پر احنف بن قیس کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری اور گفتگو، صفحہ ۳۵۳ پر قصر ہزار درّ، صفحہ ۳۵۶ پر خطۂ زیادان، صفحہ ۳۵۹ پر نہر یزید بن مہلب، صفحہ ۳۶۰ پر قطعۂ طلبان، اور صفحہ ۳۶۱ پر خطۂ کوسجان کے بارے میں مدائنی کے حوالہ سے اہم معلومات درج ہیں۔
دیگر مقامات میں تحصیل علم | مدائنی کے شیوخ واساتذہ میں بصری، کوفی، مکی، مدنی، بغدادی سب ہی شامل ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ کتابوں میں ان کے کسی استاد یا علمی سفر کا ذکر نہیں ہے صرف امام ذہبی نے العبر میں اتنا لکھا ہے۔

سمع ابن ابی ذئب وطبقتہ[1] مدائنی نے امام ابن ابی ذئب اور ان کے
معاصرین سے حدیث کا سماع کیا ہے،

امام ابن ابی ذئب (محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب) مدنی متوفی ۱۵۹ھ مدینہ منورہ کے مفتی و فقیہ تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدائنی نے مدینہ منورہ کا سفر کرکے امام ابن ابی ذئب سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے، مدائنی کے شیوخ میں امام ابن ابی زائدہ (یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ خالد بن میمون کوفی) متوفی ۱۸۳ھ ہیں جو مدائن کے قاضی تھے، اور وہاں کے عہدۂ قضا ہی کے زمانہ میں فوت ہوئے غالباً مدائنی نے وہاں کے زمانۂ قیام میں قاضی ابن ابی زائدہ سے روایت کی ہے، نیز اس زمانہ کے عام رواج کے مطابق مدائنی نے بصرہ، کوفہ، مکہ، مدینہ، مدائن اور بغداد کے ائمۂ حدیث و فقہ سے تحصیل و تکمیل کی ہوگی، یہ بلاد و امصار اس وقت اسلامی علوم کے دار العلم اور ائمۂ دین کے گہوارے تھے،

شیوخ و اساتذہ | جیسا کہ معلوم ہوا مدائنی کے شیوخ و اساتذہ کے نام ان کے تذکرہ نگاروں نے نہیں لکھے ہیں صرف امام ذہبی نے سمع ابن ابی ذئب وطبقتہ لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مدائنی نے امام ابن ابی ذئب کے علاوہ ان کے معاصر ائمۂ حدیث سے سماع و روایت کا شرف پایا ہے۔

ذیل میں ہم مدائنی کے چند شیوخ و اساتذہ کے نام پیش کرتے ہیں، جو ان کے دو شاگردوں کی کتابوں میں ان سے روایت کے سلسلے میں ملتے ہیں، خلیفہ بن خیاط کی تاریخ خلیفہ، اور بلاذری کی فتوح البلدان ہمارے پیش نظر ہے، ان ہی دونوں کتابوں سے مدائنی کے اساتذہ کے نام درج کئے جاتے ہیں، اگر بلاذری کی انساب الاشراف اور طبری کی تاریخ وغیرہ میں تلاش و جستجو کی جائے تو مزید نام مل سکتے ہیں، ان دونوں مؤرخوں نے بعض مقامات پر مدائنی کے شیوخ اجمالی طور سے

---

[1] العبر فی خبر من غبر ص ۳۹۱ ج ۱ و شذرات الذہب ص ۵۴ ج ۲

بیان کئے ہیں، مثلاً خلیفہ نے ایک مقام پر لکھا ہے،

وحدثنی علی بن محمد عن اشیاخہ صہ۱ اور بلاذری نے ایک جگہ وحدثنی المدائنی عن اشیاخہ صہ۳ اور دوسری جگہ وحدثنی المدائنی علی بن محمد بن ابی سیف عن اشیاخہ صہ۲۹ لکھا ہے۔

خلیفہ اور بلاذری کی کتابوں میں مدائنی کی جو روایات موجود ہیں ان کی پوری سند نقل کردی گئی ہے، تاکہ ان کے سلسلۂ سند کے رواۃ و رجال کے نام بھی معلوم ہو جائیں جس سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوگا۔ جن اساتذہ کے حالات فی الحال مل سکے اُن کا مختصر تعارف لکھ دیا ہے، ان میں ائمۂ حدیث و فقہ، عُبّاد و زُہّاد اور علمائے تاریخ و سیر سب ہی شامل ہیں۔

(۱) حدثنی علی بن محمد، عن اسحاق بن ابراہیم الازدی (خلیفہ صہ۲۹۲)

(۲) علی بن محمد، عن ایوب بن عتبہ عن یحیی بن ابی کثیر، عن ابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن (خلیفہ صہ۵)

ابویحییٰ ایوب بن عتبہ متوفی سنہ ۱۶۰ھ قاضیٔ یمامہ بنی قیس ثعلبہ سے ہیں، انھوں نے یحییٰ بن ابی کثیر، عطار بن ابی رباح، قیس بن طلق حنفی وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ابوداؤد طیالسی، اسود بن عامر بن شاذان، قاضی ابویوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، آدم بن ابی ایاس وغیرہ نے روایت کی ہے۔[1]

(۳) حدثنی المدائنی عن ابی اسمٰعیل الطائفی، (بلاذری صہ۷۴)

(۴) وحدثنا ابوالحسن عن بقیۃ بن عبدالرحمٰن عن ابیہ (خلیفہ صہ۳۱۶)

(۵) وحدثنی المدائنی عن جہم بن حسان (بلاذری صہ۳۳۴)

---

[1] تاریخ بغداد ج۷، ص ۳ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۰۸

(۶) ابوالحسن، عن حباب بن موسیٰ، عن عاصم بن بہلتہ، عن زر بن جیش،

(خلیفہ ص ۱۲) ابوالحسن عن حباب بن موسیٰ، عن جابر عن ابی الحمس ا ۱ء (ایضاً ۲۱۹)

ان کے شیخ عاصم بن بہلہ کوفی متوفی سنہ ۱۲۷ھ ابن ابی النجود کی کنیت سے مشہور ہیں،

اور یہ مشہور قاری ہیں۔

(۷) فحدثنی علی بن محمد، عن حماد بن سلمۃ، عن علی بن زید، عن سعید بن مسیب

(خلیفہ ص ۲۶) وحدثنا علی بن محمد وموسیٰ بن اسمٰعیل عن حماد بن سلمۃ عن

ھشام بن عروۃ عن ابیہ (ایضاً ص ۳۲، ص ۸۲، ص ۹۴، ص ۱۰۱)

ابوسلمہ حماد بن سلمہ بن دینار بصری متوفی سنہ ۱۶۷ھ مفتی بصرہ، مشہور ائمۂ دین میں ہیں،

مولیٰ تیم یا مولیٰ قریش ہیں، انھوں نے ثابت بنانی، قتادہ، حمید الطویل، انس بن سیرین،

ہشام بن عروہ کے علاوہ تابعین کی ایک بڑی جماعت سے روایت کی، اور ان سے ابن جریج،

سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی، شعبہ، قطان وغیرہ نے روایت کی[۱]

(۸) ابوالحسن، عن خلاد بن عتبہ، عن علی بن زید، عن عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ

(خلیفہ ص ۲۰) خلاد بن عتبہ کے شیخ ابوالحسن علی بن زید بن عبداللہ بن ابی ملیکہ

تیمی بصری متوفی سنہ ۱۲۹ھ مشہور محدث ہیں۔

(۹) حدثنا علی بن محمد بن ابی سیف عن سلام بن ابی مطیع، عن قتادۃ، عن

سعید بن مسیب (خلیفہ ص ۲۹، ص ۹۰) ابوسعید سلام بن ابی مطیع بصری متوفی سنہ ۱۶۴ھ

بصرہ کے خطبا و عقلا میں سے تھے، انھوں نے ابوعمران جونی اور ائمۂ حدیث کی ایک بڑی

جماعت سے روایت کی ہے، امام احمد نے ان کو ثقہ صاحب سنت بتایا ہے[۲]

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱ [۲] العبر ص ۲۶۳

(۱۰) ابوالحسن، عن سلمہ بن عثمان، عن زید بن علی، عن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ (خلیفہ ص۱۵۳)

سلمہ بن عثمان کوفی متوفی (۱۰۰ھ) نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مرسل حدیث کی روایت کی ہے، جسے ان کے بھانجے مسعر نے ان سے سنا ہے[۱]

(۱۱) فحدثنا علی بن محمد، عن عبداللہ بن عمر الانصاری عن ھشام بن عروہ، عن ابیہ (خلیفہ ص۸۰)

ان کے شیخ ہشام بن عروہ بن زبیر بن عوام اسدی متوفی ۱۴۶ھ مشہور تابعی اور محدث ہیں،

(۱۲) وحدثنی المدائنی، عن عبداللہ بن القاسم عن فروہ بن لقیط (بلاذری ص۳۲۳)

(۱۳) حدثنا علی عن عبدالرزاق عن معمر عن قتادہ عن الحسن، (خلیفہ ص۲۲۲)

ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع صنعانی متوفی ۲۱۱ھ مشہور امام و حافظ حدیث ہیں، انھوں نے اپنے والد ہمام، چچا وہب اور معمر، عبیداللہ بن عمر، ابن جریج، امام مالک، امام اوزاعیؒ سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ان کے استاد سفیان بن عیینہ اور معتمر بن سلیمان کے علاوہ اور بہت سے محدثین نے روایت کی ہے[۲] حدیث میں ان کی مشہور کتاب المصنف چھپ گئی ہے،

(۱۴) وحدثنی (علی بن محمد بن ابی سیف) عن ابن المبارک عن مجالد عن الشعبی (خلیفہ ص۱۱۰)

حضرت ابوعبدالرحمٰن، عبداللہ بن مبارک مروزی متوفی ۱۸۱ھ مشہور ائمہ اسلام میں سے ہیں، انھوں نے موسیٰ بن عقبہ، ابن ابی ذئب، اعمش، ہشام بن عروہ، اوزاعی، شعبہ، سفیان ثوری، لیث بن سعد، امام مالک وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے معمر بن راشد، ابن عیینہ، معتمر بن سلیمان وغیرہ نے روایت کی، ان کے تلامذہ اور انکے شیوخ و اقران کی بڑی تعداد ہے[۳]

---

[۱] تاریخ کبیر بخاری ج ۲ قسم ۱ ص ۸۴ [۲] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۱ [۳] الجرح ج ۵ ص ۳۸۲،

(۱۵) قال حدثنا عثمان بن عبد الرحمٰن (خلیفہ ص۲۰) وحدثنی علی بن محمد عن عثمان بن عبد الرحمٰن، عن الزہری (ایضاً ص۱۹۰، ۱۹۹)

ابو عمر عثمان بن عبد الرحمٰن زہری متوفی ایام خلیفہ ہارون، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہیں، وقاصی اور مالکی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، عطاء بن ابی رباح، نافع مولی بن عمر، محمد بن منکدر، ابن شہاب زہری اور سائب بریدی سے روایت کی، حجازی ہیں، بغداد میں حدیث کی روایت کی[1]

(۱۶) علی بن محمد، عن المبارک بن فضالہ عن الحسن (خلیفہ ص۳) ابو الحسن عن مبارک بن فضالہ، عن معاویہ بن قرۃ (ایضاً ص۱۴) علی بن ابی سیف عن المبارک بن فضالہ۔ عن الحسن (ایضاً ص۱۴)

ابو فضالہ مبارک بن فضالہ بن ابی امیہ بصری متوفی ۱۶۵ھ مولی زید بن خطاب نے حسن بصری، بکر بن عبداللہ مزنی، محمد بن منکدر، ہشام بن عروہ سے روایت کی، تیرہ[۱۳] چودہ[۱۴] سال تک امام حسن بصری کے حلقۂ درس میں شریک رہے، نہایت عابد و زاہد تھے[2]

(۱۷) وحدثنا علی بن محمد، عن ابن ابی ذئب، عن الزہری، عن سالم عن ابیہ (خلیفہ ص۲۳)

ابو الحارث محمد بن عبد الرحمٰن بن مغیرہ بن حارث بن ابی ذئب، ہشام بن شعبہ مدنی متوفی ۱۵۹ھ ابن ابی ذئب کی کنیت سے مشہور ہیں، عکرمہ مولی بن عباس، نافع مولی ابن عمر، سعید بن ابی سعید مقبری سے روایت کی۔ اور ان سے سفیان ثوری، معمر بن راشد، عبداللہ ابن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، واقدی وغیرہ نے روایت کی، مدینہ منورہ میں فتویٰ دیتے تھے، فقہائے مدینہ میں سے تھے، تمام رات عبادت و ریاضت میں گزارتے تھے[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۷۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹ [3] ایضاً ج ۹ ص ۳۰۳

(۱۸) ابوالحسن عن محمد بن صالح الثقفی عن ابن جریج عن ابن ابی ملیکہ (خلیفہ ص۲۰۶)

(۱۹) قال ابوالحسن عن علی بن سلیم (خلیفہ ص۲۲۳)

ابوسلیم علی بن سلیم الجزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور ان سے مسعر اور ابوعوانہ نے روایت کی۔[1]

(۲۰) علی بن محمد عن علی بن مجاھد، عن حنش بن مالک (خلیفہ ص۱۵۱) وحدثنی المدائنی عن علی بن مجاھد، عن محمد بن اسحق، عن الزھری (بلاذری ص۳۲۲)

قاضی ابومجاہد علی بن مجاہد بن رفیع کابلی متوفی بعد ۱۸۰ھ قبیلہ کندہ یا عبدالقیس کے مولی اور مدائنی کے ہم وطن یعنی کابل کے موالی میں سے تھے، ان کی کتاب المغازی مشہور ہے، انھوں نے ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی، موسیٰ بن عبیدہ زبدی، مسعر، محمد بن اسحاق، یونس بن ابواسحاق، عیینہ بن سعید، حجاج بن ارطاۃ، سفیان ثوری وغیرہ سے روایت کی اور ان سے جریر بن عبدالحمید، محمد بن عیسیٰ بن طباع، ابوصالح سلمویہ، احمد بن حنبل وغیرہ نے روایت کی۔[2]

(۲۱) وحدثنی المدائنی عن علی بن حماد، وسحیم بن حفص وغیرھما (بلاذری ص۳۱۱)

(۲۲) وحدثنی علی عن قراد عن عثمان بن معاویۃ عن ابیہ عن عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ (خلیفہ ص۱۳۲)

ابونوح عبدالرحمٰن بن غزوان خزاعی بغدادی متوفی ۲۰۷ھ مولی عبداللہ بن مالک کا لقب قراد ہے، انھوں نے عوف، شعبہ اور حجاج وغیرہ سے روایت کی، امام احمد نے ان کو عقلاء میں شمار کیا ہے، علی بن مدینی نے ثقہ کہا ہے اور ابن معین نے لاباس بہ بتایا ہے۔[3]

---

[1] تاریخ کبیر بخاری ج ۳ قسم ۲ ص۲۷۷ [2] ایضاً ج ۳ قسم ۲ ص ۲۹۰ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۷۰
[3] طبقات ابن سعد ج ۷ ص۳۳۸

(۲۳) وحدثنی المدائنی عن علی بن حماد و سحیم بن حفص وغیرهما (بلاذری ص۳۰۰)

ابوالیقظان سحیم بن حفص متوفی سنہ ۱۹۰ھ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، انساب عرب کے زبردست عالم و مصنف ہیں، مدائنی نے کہا ہے کہ سحیم انکا لقب ہے، اصل نام عامر بن حفص ہے، حفص کے سب سے بڑے لڑکے کا نام محمد تھا جس کی وجہ سے ان کی کنیت ابومحمد تھی، اور ان کا رنگ سیاہ تھا، اس لئے اسود کے نام سے بھی مشہور تھے، اور ابوالیقظان کا بیان ہے کہ ان کی والدہ نے پندرہ دن تک انکا نام عبید اللہ رکھا تھا، اس کے بعد مدائنی نے بتایا کہ جب میں سلسلۂ روایت ابوالیقظان کہوں تو یہی ابوالیقظان مراد ہیں، اور اگر سحیم بن حفص عامر بن حفص، عامر بن ابومحمد، عامر بن اسود، سحیم بن اسود، عبید اللہ بن حفص، اور ابواسحٰق کہوں تو بھی یہی ابوالیقظان مراد ہوتے ہیں۔[1]

(۲۴) قال ابوالحسن، عن الهذلی (خلیفه ص۲۰۱) قال ابوالحسن عن الهذلی عن الجلاد بن ابی سبرة، عن سنان بن سمرة بن المحبق الهذلی (ر ص۲۰۳) فحدثنا ابوالحسن عن الهذلی عن قتادة. (ر ص۲۰۳) وحدثنی المدائنی عن ابی بکر الهذلی والعباس بن هشام عن ابیه، عن عوانة، (بلاذری ص۳۵۰)

ابوبکر سلمہ بن عبداللہ بن سلمی بصری ہذلی متوفی سنہ ۱۶۷ھ تواریخ و اخبار کے مشہور عالم ہیں امام شعبی اور معاذۃ العدویہ اور دوسرے اہل علم سے روایت کی ہے۔[2]

(۲۵) وحدثنی علی بن محمد، عن النضر بن اسحٰق، عن قتادة (خلیفه ص۱۱۹)

ان کے شیخ حضرت قتادہ بصری متوفی سنہ ۱۱۷ھ مشہور تابعی ہیں،

(۲۶) علی بن محمد، عن مسلمة عن داؤد، عن عامر، و ابی معشر (خلیفه ص۹) علی بن محمد

---

[1] الفہرست ص ۱۳۸ [2] العبر ج ۱ ص ۲۵۲

عن مسلمہ بن محارب، عن داؤد بن ابی ھند (خلیفہ ص ۱۲۳، ص ۱۷۱، ص ۲۰۲) حدثنا ابوالحسن، عن مسلمہ بن محارب عن حرب بن خالد بن یزید بن معاویہ (ص ۲۱۵) وحدثنی علی بن محمد المدائنی عن مسلمہ بن محارب وغیرہ (بلاذری ص ۴۲۶)

مسلمہ بن محارب بن سلیم بن زیاد زیادی متوفی ــــــــہ نے اپنے والد محارب سے روایت کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کے پاس لکھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عجم کے غیر مسلم یا اعدائے اسلام کسی قوم سے مقابلہ کے وقت میری مدد نہ کریں۔[1]

(۲۷) ابوالحسن عن ابی معشر عن زید بن اسلم وغیرہ ( )

ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی متوفی ۱۷۰ھ مولی بنی ہاشم صاحب المغازی اور باتفاق اہل علم اعلم الناس بالمغازی ہیں، انھوں نے نافع مولی ابن عمر، ہشام بن عروہ، موسی بن یسار، محمد بن منکدر وغیرہ سے روایت کی اور ان سے سفیان ثوری ابن مہدی وکیع، قاضی ابویوسف، وغیرہ نے روایت کی ہے، اخباری ہونے کے ساتھ حافظ حدیث و فقیہ تھے ان کی کتاب المغازی بہت مشہور رہی۔[2]

(۲۸) وحدثنی علی بن محمد بن ابی الذیال، عن حمید بن ھلال (خلیفہ ص ۱۲۳)

(۲۹) وحدثنی علی بن محمد المدائنی عن ابی محمد الھندی عن ابی الفرج (بلاذری ص ۴۲۶)

ابو محمد ہندی بغدادی مولی بنی تمیم ہیں، انھوں نے ابو الفرج کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ راجہ داہر کے قتل کے بعد محمد بن قاسم پورے سندھ پر قابض ہو گئے۔[3]

(۳۰) حدثنی علی بن محمد، عن ابی زکریا العجلانی (العجلی) عن ابی الزبیر، عن

---

[1] تاریخ کبیر ج ۴ ص ۳۸۰، [2] تاریخ بغداد و تہذیب التہذیب وغیرہ، [3] فتوح البلدان ص ۴۲۶ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۱۲۰، تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۶،

جابر بن عبد اللہ (خلیفہ ص۲۳) وحدثنا علی بن محمد عن ابی زکریا یحییٰ بن یمان) العجلانی (العجلی) عن سعد بن اسحٰق عن ابیہ (رر ص۲۳۷) حدثنا ابو الحسن عن ابی زکریا العجلانی (العجلی) عن نافع عن ابن عمر (رر ص۱۹۰)

ابو زکریا یحییٰ بن یمان عجلی کوفی متوفی ۱۸۹ھ نے اپنے والد کے علاوہ ہشام بن عروہ اعمش اسمٰعیل بن ابو خالد، معمر، منہال بن خلیفہ، سفیان ثوری، حمزہ بن زیات وغیرہ سے روایت کی، امام سفیان ثوری کے علوم کے سب سے زیادہ ناشر ہیں بڑی متقشفانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، کثرت عبادت کی وجہ سے راہب کہے جاتے تھے، بغداد میں حدیث کی روایت کی[1]

(۳۱) علی بن محمد، عن یحییٰ بن زکریا، عن مجالد، عن الشعبی (خلیفہ ص۱۶۳)

ابو سعید بن زکریا بن ابو زائدہ خالد بن میمون بن فیروز ہمدانی کوفی متوفی ۱۸۳ھ ابن ابی زائدہ کی کنیت سے مشہور ہیں، حلقۂ موالی سے ہیں، اپنے والد کے علاوہ اعمش، عبد اللہ بن عون عاصم الاحول ہشام بن عروہ یحییٰ بن سعید انصاری، داؤد بن ابو ہند وغیرہ سے روایت کی ہے، ایک قول کے مطابق امام ابن ابی زائدہ نے کوفہ میں سب سے پہلے حدیث کی تدوین کی ہے، امام ابو حنیفہؒ کے پوتے اسمٰعیل بن حماد کا قول ہے کہ یحییٰ بن ابی زائدہ علم حدیث میں معطر دلھن کے مانند ہیں، ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ وہ مدائن میں قاضی تھے، اور بزمانہ قضا وہیں ۱۸۳ھ میں فوت ہوئے[2] غالباً مدائنی نے اسی زمانہ میں ان سے روایت کی جب کہ دونوں مدائن میں سکونت پذیر تھے۔

(۳۲) ابو الحسن، عن یعقوب بن داؤد الثقفی (خلیفہ ص۹۹)

(۳۳) قاضی علی بن محمد، روی عن موسیٰ بن عقبہ (خلیفہ ص۱۰۰)

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۶
[2] [illegible]

موسیٰ بن عقبہ بن ابو عیاش مدنی متوفی سنہ ۱۴۱ھ مولی آل الزبیر نے حضرت ابن عمرؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے، ام خالد صحابیہؓ سے روایت کی ہے، ان کی کتاب المغازی نہایت مستند ہے، امام مالکؒ کا قول ہے کہ مدینہ میں ان سے بڑا مغازی کا کوئی عالم نہیں ہے، تم لوگ اس مرد صالح کی کتاب المغازی کو پڑھو پڑھاؤ کیونکہ وہ اس بارے میں صحیح ترین کتاب ہے[1]

غالباً مدائنی کی روایت موسیٰ بن عقبہ سے براہ راست نہیں ہے ان کی وفات کے وقت مدائنی کی عمر چھ سال کی تھی۔

(۳۴) قال ابو الحسن عن شیخ من الانصار والمصعبی وغیرھم (خلیفہ ص۵۹۳)

(۳۵) قال ابو الحسن عن رجل من اھل مکۃ عن صالح بن کیسان عن عبدالعزیز بن مروان (خلیفہ ص۲۱۵)

(۳۶) محمد بن احمد بن القاسم حدثنا المدائنی حدثنا ابو بکر بن ابی النضر حدثنا ابو النضر، حدثنا عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار عن ابی حازم عن سھیل بن سعد الساعدی (تاریخ جرجان ص۳۹۸)

ابو بکر بن ابی النضر ہاشم بن قاسم کنانی متوفی سنہ ۲۴۵ھ نے اپنے والد ابو النضر سے اور قراد ابو نوح، محمد بن بشر عبدی، اسود بن عامر قعنبی سے روایت کی اور ان سے امام بخاری، امام مسلم، ابو قدامہ سرخسی، ابو حاتم رازی نے روایت کی ہے،[2]

(۳۷) ابو مالک الخزاعی عن ابی الحسن المدائنی عن کلیب بن خلف عن ادریس بن حنظلۃ قال الخ (تاریخ جرجان ص۹۰)

چچ نامہ میں سندھ کی فتوحات کے سلسلہ میں مدائنی کی جو روایات ہیں، ان میں ان

---

[1] تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۳۶۰ [2] تاریخ بغداد ج۱۴ ص۳۸۶

اسامہ [illegible] ، اسحٰق بن ایوب ، بشر بن خلیفہ ، حاتم بن قبیصہ ، [illegible] ازدی ،
عبدالرحمٰن [illegible] ، ابو اللیث ہندی مولیٰ بنی تمیم ،

مدائنی کے مذکورہ بالا شیوخ و اساتذہ کے نام اور ان کے سلسلۂ سند کے [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ائمہ حدیث و فقہ کی تعداد علمائے تواریخ و اخبار سے کہیں زیادہ ہے ، ان میں چند نام ایسے بھی ہیں جن سے مدائنی نے کسی خاص واقعہ یا محدود واقعات کی روایت کی ہے ۔

اصحاب و تلامیذ | دوسری اور تیسری صدی کا زمانہ دینی علوم و فنون کے شیوخ و اصحاب کی کثرت کے لحاظ سے مشہور ہے چنانچہ ہر اسلامی شہر میں زیادہ سے زیادہ معلمین و متعلمین نظر آتے تھے ، اسی دور میں مدائنی نے بھی علمی و دینی سرگرمی میں حصہ لیا اور بہت سے اہل علم نے ان سے فیض حاصل کیا جن میں ائمہ حدیث ، اور علماء تواریخ و اخبار سب ہی شامل ہیں ، مگر ان کے اساتذہ کی طرح انکے تلامذہ کے نام بھی ان کے تذکرہ میں نہیں ملتے ہیں ، صرف خطیب بغدادی نے روی عنہ لکھکر ان کے پانچ تلامذہ زبیر بن بکار ، احمد بن ابی خیثمہ ، احمد بن حارث الخزاز ، حارث بن ابو اسامہ ، حسن بن علی بن متوکل کے نام کی تصریح کرکے وغیرہم لکھا ہے ، جن کو سمعانی اور یاقوت نے بھی نقل کیا ہے [1] کتب طبقات و رجال میں تلاش و جستجو سے مدائنی کے تلامذہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے ، چنانچہ ان کے دو ممتاز شاگرد جو ان کے بالکل ہم مذاق اور اس درجہ متاثر تھے کہ انھوں نے بھی اپنے استاد کے تتبع میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے دلچسپی لیکر اپنی تصانیف میں یہاں کے غزوات و فتوحات ، اخبار و حوادث اور امارات و ولایات کو خاص طور سے بیان کیا یعنی خلیفہ بن خیاط اور ابو الحسن بلاذری ، ان کے نام بھی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵ ، کتاب الانساب ج ۱ ص ۵۱۵ ، معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۹ [illegible]

مدائنی کے تلامذہ میں نہیں حالانکہ مدائنی سے انھوں نے براہ راست بہت زیادہ روایت کی ہے،

(۱) ابو عمرو خلیفہ بن خیاط شیبانی عصفری متوفی سنہ ۲۴۰ھ شباب کے لقب سے مشہور ہیں، تواریخ و ایام کے حافظ، رواۃ حدیث کے ناقد و مبصر، اور مستقیم الحدیث و صدوق تھے، سفیان بن عیینہؒ، یزید بن زریع، ابو داؤد طیالسی وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح اور تاریخ کبیر میں روایت کی ہے، نیز ابو یعلی موصلی، عبداللہ بن امام احمدؒ، حسن بن سفیان ثوری وغیرہ نے روایت کی ہے[1] بسلسلۂ تحصیل علم خلیفہ کے بصرہ سے باہر جانے کی تصریح نہیں ملتی ہے، اغلب یہ ہے کہ انھوں نے مدائنی سے ان کے قیام بصرہ کے زمانہ ہی میں کسب علم کیا ہے، تاریخ خلیفہ اور طبقات خلیفہ دونوں کتابیں چند سال ہوئے چھپ گئی ہیں، تاریخ خلیفہ ہمارے پاس موجود ہے، جو تاریخ سنین پر قدیم ترین کتاب مانی جاتی ہے، خلیفہ نے اس میں سنہ ۱ھ سے سنہ ۲۳۲ھ تک کے اہم واقعات اور وفیات اختصار کے ساتھ درج کئے ہیں، اس میں انھوں نے پچاس سے زائد روایات اپنے استاد مدائنی کی درج کی ہیں، اور اکثر مقامات پر علی، علی بن محمد، ابو الحسن لکھا ہے، بعض جگہوں میں ان کا پورا نام علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف بھی لکھا ہے، مگر کہیں مدائنی کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ نے بصرہ ہی میں ان سے روایت کی ہے، اس کتاب میں خلیفہ نے بہت سے مقامات پر ہندوستان کے غزوات و فتوحات اور احوال بیان کئے ہیں، جو یہاں کے بارے میں نہایت اہم اور نادر معلومات ہیں اور دوسری کسی کتاب میں نہیں ملتی ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے واقعات میں کہیں مدائنی کا نام نہیں آیا ہے بلکہ واقعات دوسروں کی روایت سے اور بعض بغیر سند کے درج کئے ہیں، جب کہ دوسرے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶۱ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰

بہت سے واقعات مدائنی سے نقل کئے ہیں، یہ کتاب مدائنی کی زندگی میں لکھی گئی ہے۔

(۲) ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد بلاذری بغدادی متوفی سنہ ۲۷۹ھ نہایت ثقہ اور مشہور مورخ و نساب ہیں، ان کی تصانیف میں سے فتوح البلدان کے علاوہ انساب الاشراف کا معتد بہ حصہ چھپ چکا ہے، ان دونوں کتابوں میں بلاذری نے اپنے استاد مدائنی کی بہت سی روایتیں درج کی ہیں، صرف فتوح البلدان کے مختلف مقامات میں پچیس[۲۵] سے زائد روایات ان سے منقول ہیں، اس کے باب فتوح السند کی ابتداء ہی اخبرنا علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف سے کی ہے، درمیان میں بھی ان کے نام کی تصریح کے ساتھ واقعات بیان کیے ہیں، بعض محققین کا خیال ہے کہ فتح سندھ کا پورا باب مدائنی کی کتاب یا روایت سے ماخوذ ہے، البتہ بعض دوسرے رواۃ کے نام تائیدی طور سے آگئے ہیں یا کوئی نئی بات دوسرے سے نقل کی ہے، بلاذری نے اس کتاب میں عام طور سے ابوالحسن اور علی بن محمد کے ساتھ المدائنی کی نسبت ظاہر کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بغداد میں مدائنی سے روایت کی ہے، اور اس وقت وہ قیام مدائن کی وجہ سے مدائنی کی نسبت سے مشہور ہو چکے تھے،

(۳) ابوجعفر احمد بن حارث بن مبارک الخزاز بغدادی متوفی سنہ ۲۵۸ھ مولیٰ خلیفہ ابوجعفر منصور صاحب المدائنی کی نسبت سے مشہور ہیں، ابن ندیم نے ان کو "صاحب المدائنی" لکھا ہے، اور ان کی متعدد تصانیف کا ذکر کیا ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ احمد بن حارث الخزاز نے مدائنی سے ان کی تصانیف کی روایت کی ہے، وکان صدوقاً من اہل الفہم والمعرفۃ" ان سے امام ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوسعید سکری نحوی، ابواحمد جریری نے روایت کی ہے، نہایت وجیہ و شکیل تھے، سر بڑا، داڑھی لمبی چوڑی اور دہن کشادہ تھا،

انتقال سے ایک سال قبل سے سرخ خضاب استعمال کرنے لگے تھے، کہتے تھے کہ میں نے سنا ہے کہ منکر نکیر میت پر خضاب دیکھ کر آسانی کرتے ہیں۔[۱]

(۴) ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب نسائی بغدادی متوفی ۲۷۹ھ مشہور حافظ حدیث ہیں، بقول خطیب بغدادی نہایت ثقہ حافظ حدیث ہیں، مختلف فنون کے جامع، اخبار و ایام میں صاحب نظر، اور ادب کے امام ہیں، ہر فن اس کے مشہور و مستند امام سے حاصل کیا ہے، چنانچہ علم حدیث یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبلؒ سے علم الانساب مصعب بن عبد اللہ زبیری سے، ایام الناس ابوالحسن مدائنی سے، اور علم ادب و عربیت محمد بن سلام جمحی سے حاصل کیا، ان کی کتاب التاریخ الکبیر کے بارے میں خطیب نے لکھا ہے کہ یہ ان کی بہترین و مفید ترین تصنیف ہے، اس سے بہتر اور مفید کوئی تاریخ میرے علم میں نہیں ہے، وہ اس کتاب کی روایت بالمشافہ کرتے تھے، تاریخ ابن ابی خیثمہ کی روایت و سماعت امام ابوالقاسم بغوی جیسے اکابر شیوخ نے کی ہے۔[۲]

(۵) ابومحمد حارث بن محمد بن ابواسامہ تمیمی متوفی ۲۸۲ھ نے مدائنی کے علاوہ علی بن عاصم، یزید بن ہارون، محمد بن عمر واقدی وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ابوبکر بن ابی الدنیا اور امام محمد بن جریر طبری نے روایت کی، حارث بن ابواسامہ کی روایت سے امام طبری اور خطیب نے مدائنی کے بعض اہم حالات بیان کئے ہیں، محمد بن محمد اسکافی کا بیان ہے کہ میں نے امام ابراہیم حربی سے حارث بن ابواسامہ کے بارے میں سوال کیا اور کہا میں ان سے حدیث کا سماع کرنا چاہتا ہوں مگر وہ اسپر درہم وصول کرتے ہیں تو امام ابراہیم حربی نے کہا کہ تم ان سے حدیث حاصل کرو کیونکہ وہ ثقہ ہیں، ۲۸۲ھ میں چھیانوے[۹۶] سال کی

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۴ ۳، فہرست ابن ندیم ص ۱۵۲ [۲] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۶۲، العبر ج ۲ صـ۶۴

(۶) ابو عبد اللہ زبیر بن بکار بن عبد اللہ بن مصعب مدنی متوفی ۲۵۶ھ نے ابو الحسن مدائنی، سفیان بن عیینہ، ابو ضمرہ انس بن عیاض، نضر بن شمیل وغیرہ سے روایت کی، مکہ مکرمہ کے قاضی تھے، بغداد میں حدیث کی روایت کی، نہایت ثقہ و ثبت محدث تھے، انساب و اخبار کے زبردست عالم تھے، ان کی کتاب جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا کا معتد بہ حصہ چھپ چکا ہے، اور میرے پاس ہے، اس کتاب میں بعض واقعات مدائنی سے مروی ہیں مثلاً صفحہ ۳۰۰ پر وحدثنی ابو الحسن المدائنی وغیرہ ہے، زبیر بن بکار چوراسی سال کی عمر میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے۔[1]

(۷) ابو محمد حسن بن علی بن متوکل بن میمون متوفی ۲۹۱ھ مولیٰ عبد الصمد بن علی ہاشمی نے ابو الحسن مدائنی، شریح بن نعمان، عاصم بن علی، عفان بن مسلم، خالد بن ابو یزید قرنی سے روایت کی، خطیب نے ان کو ثقہ بتایا ہے۔[2]

(۸) ابو عبد اللہ محمد بن صالح بن مہران بصری قرشی متوفی ۲۵۲ھ مولیٰ بنی ہاشم ہیں، ابو النطاح کی کنیت سے مشہور ہیں، اپنے والد کے علاوہ ابو الحسن مدائنی، ابو سلمہ محمد بن عبد اللہ انصاری، ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ، اسد بن عمرو بجلی، عون بن کہمس بن حسن، معتمر بن سلیمان اور واقدی وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے عباس بن جعفر بن ابو طالب، عبد اللہ بن ابن یونس، ابن ابی الدنیا، احمد بن علی خزاز وغیرہ نے روایت کی، بغداد میں حدیث کی روایت کی، ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ وہ اخباری ماہر انساب اور سیر کے راوی تھے، کتاب الدولہ ان کی تصنیف ہے۔[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۴۶۷ [2] ایضاً ج ۷ ص ۳۷۲ [3] ایضاً ج ۵ ص ۳۵۷ [4] تہذیب التہذیب

(۹) ابوزید عمر بن شبہ بن عبیدہ بن ربطہ نمیری بصری متوفی سنہ ۲۶۲ھ موالی بنو نمیر ہیں، انھوں نے عبدالوہاب ثقفی، غندر، ابو عاصم النبیل محمد بن سلام جمحی، ہارون بن عبداللہ، ابراہیم بن منذر سے روایت کی، ذہبی نے ان کو الحافظ الاخباری صاحب التصانیف لکھا ہے، ابن ندیم نے ابن شبہ کو شاعر، اخباری، فقیہ، صادق اللہجہ، غیر غیرہ خول الروایہ کی صفات سے یاد کیا ہے، اور تواریخ و اخبار میں ان کی بائیس۲۲ کتابوں کے نام بتائے ہیں، جن میں تاریخ مدینہ بھی ہے[1]

مدائنی مدائن میں | مدائنی کی زندگی عراق کے تین شہروں میں بسر ہوئی، بصرہ میں پیدا ہوئے، اور یہیں نشو ونما پاکر ایک مدت تک رہے، پھر مدائن گئے، اور آخر میں بغداد پہنچے اور یہیں پیوند خاک ہوئے، خطیب نے لکھا ہے،

وهو بصري، سكن المدائن	وہ بصری ہیں، مدائن میں رہے پھر وہاں
ثم انتقل عنها الى بغداد	سے بغداد منتقل ہوگئے، اور تادم مرگ
فلم يزل بها الى حين	وہیں رہے۔
وفاته،	

اور ان کے شاگرد حارث بن ابو اسامہ کا بیان ہے،

وكان مولده ومنشوه	ان کی ولادت اور نشو ونما بصرہ میں
بالبصرة، ثم سار الى المدائن	ہوئی، پھر مدائن گئے، اس کے بعد بغداد
بعد حين، ثم سار الى	چلے گئے، جہاں مقیم رہے یہانتک کہ
بغداد فلم يزل بها حتى توفي بها[2]	یہیں فوت ہوئے۔ (باقی)

---

[1] الفہرست ص ۱۶۳، العبر ج ۲ ص ۲۵ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۴ - ۵۵

دریافت تذکرہ حدیقۂ ہندی

از جناب سید عارف نوشاہی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی

بھگوان داس ہندی (۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء۔ زندہ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء) نے فارسی شعرا کے احوال و اشعار پر دو کتابیں لکھ کر پاکستان و ہند میں فارسی تذکرہ نویسی میں وقیع اضافہ کیا، ان تذکروں کی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ ان میں مؤلف نے صرف برصغیر کے (یا یہاں مقیم بیرونی) شعرا کو جگہ دی ہے، ہمارا اشارہ مندرجہ ذیل دو تذکروں کی طرف ہے:

۱۔ سفینۂ ہندی۔ (تالیف در ۱۲۱۹۔۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۴ء۔۱۸۰۵ء) محمد شاہ بادشاہ کے جلوس ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء سے لے کر ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء (و ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء) کے درمیانی عرصہ میں موجود فارسی گو ہندوستانی شعرا کا تذکرہ ہے،[1] بھگوان داس "سفینۂ ہندی" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"حالا کہ یک ہزار و دو صد و نوزدہ ہجری مطابق جلوس سال چہل و ہفتم...۔

---

[1] "سفینۂ ہندی" کے مرتب جناب عطاء الرحمن کا اپنے مقدمہ میں یہ لکھنا صحیح نہیں کہ یہ تذکرہ شاہ عالم بادشاہ کے جلوس ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے، بھگوان داس نے خود وضاحت کی ہے کہ "احوال شعرای معاصرین را از آغاز جلوس فردوس آرام گاہ از صد جا یکجا کردہ تالیفی دیگر ساختم......... باید دانست کہ مقصود...... از ذکر فردوس آرام گاہ اشارہ بہ محمد شاہ پادشاہ است" (سفینۂ ہندی، پٹنہ ص ۱۱

شاہ عالم ثانی بادشاہ خلد اللہ ملکہ و ابقاءاست ، احوال شعرائے معاصرین را از آغاز جلوس فردوس آرام گاہ از صد جا یکجا کردہ تالیفی دیگر ساختم "۔[۱]

تذکرۂ "سفینۂ ہندی" (اور اس کے مؤلف) کا مفصل تعارف ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے اپنی کتاب "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" مطبوعہ مؤسسۂ مطبوعاتی علمی تہران ۱۹۶۴ء صفحہ ۵۰۰ تا ۵۱۱ اور احمد گلچیں معانی نے "تاریخ تذکرہ ہائے فارسی" مطبوعہ دانشگاہ تہران، تہران ۱۳۴۸ ہجری شمسی، جلد اول صفحہ ۲۳۶ تا ۲۴۰، درج کیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۸ء میں سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن کاکوی پروفیسر شعبۂ فارسی ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ "سفینۂ ہندی" ادارۂ مذکورہ کی طرف سے شائع ہو چکا تھا۔[۲]

۲۔ حدیقۂ ہندی، (تالیف در ۱۲۰۰ھ / ۸۶-۱۷۸۵ء) یہ ابتدائے اسلام سے لے کر ۱۲۰۰ھ تک کے ہندی و پاکستانی شعراء کا تذکرہ ہے۔ بھگوان داس "سفینۂ ہندی" کے دیباچہ میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"سابق در سنۂ یک ہزار و دویست تذکرۂ حدیقۂ ہندی مشتمل بر حالات شعرائے ماضی و حال کہ در ہند تولد و نشو و نما یافتہ اند، بہ قید قلم شکستہ در آوردہ و بعضی علوم مفیدہ در و مندرج نمودہ، آن حدیقہ ایست جان افزا و آن تالیفی ست دل کشا "۔[۳]

---

[۱] بھگوان داس، سفینۂ ہندی، پٹنہ، ص ۱ [۲] بھگوان داس ہندی اور سفینۂ ہندی کے بارے میں مزید دیکھئے،

۱۔ "انیس الاحبا" مؤلفہ موہن لعل انیس (تالیف در ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء) جناب عطاء الرحمان کاکوی نے "سفینۂ ہندی" پر اپنے مقدمے میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے لیکن ہمیں ان کے اس خیال سے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶)

"سفینۂ ہندی" ہی میں اپنے ذاتی حالات کے ضمن میں جہاں وہ اپنی دوسری تصانیف کا ذکر کرتے ہیں تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حدیقۂ ہندی" مشتمل بر حالات شعرای ماضی وحال کہ در ہندوستان جنت نشان تولد یا نشوونما یافتہ اند، از ابتدای ظہور اسلام تا سنہ یک ہزار و دویست ہجری تالیف نمودہ، چنانچہ آن تالیف ہم تذکرہ و ہم تاریخ است"[1]

جس طویل مدت پر "حدیقۂ ہندی" محیط ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک مفصل اور مبسوط تذکرہ ہے، "سفینۂ ہندی" اس سے بعد کی تالیف ہے۔ سفینۂ ہندی کے محتویات بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں، جہاں مصنف نے اکثر تفصیلات اس لیے چھوڑدی ہیں کہ وہ پہلے تذکرۂ "حدیقۂ ہندی" میں آچکی تھیں، اس قسم کی شہادتیں ہمیں ابوالمظفر عالی آفتاب (صفحہ ۲-۳)، نواب برہان الملک (صفحہ ۳۳-۳۶)، محمد فاخر مکین (صفحہ ۱۸۱-۱۸۷)، کے حالات کے سلسلے میں ملتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ۱۴۵) اتفاق نہیں کہ "علاوہ ازین (انیس الاحبا) ہیچ جا ذکر ہندی مسطور نیست۔" (سفینۂ ہندی، عرض مرتب، صفحہ الف) کیونکہ مندرجۂ ذیل کتب میں بھی بھگوان داس ہندی کا ذکر موجود ہے،

۱۔ "روز روشن مولفہ مولوی محمد مظفر حسین صبا، تالیف در ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) طبع اول مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء و طبع ثانی بتصحیح و تحشیہ محمد حسین رکن زادہ آدمیت، کتاب خانۂ رازی، تہران ۱۳۴۳ ہجری شمسی، طبع بھوپال صفحہ ۹۶-۹۷ اور صفحہ ۱۰۵ اور طبع تہران صفحہ ۱۰۹-۱۱۰ اور صفحہ ۲۲۳-۲۲۴ پر علی الترتیب بذیل بعنوان "بسمل، بھگوانداس لکھنوی" اور "بھگوان داس لکھنوی" ہمارے مولف کے حالات درج ہیں۔

C.A. Story: Persian Literature London Luzac - ۲ & Co: 1953

حاشیہ ص ۸۰۰ (بحوالہ علی رضا نقوی: تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، ص ۵۱۰)، [1] سفینۂ ہندی ص ۱ (حاشیہ ص ہذا) [1] سفینۂ ہندی ص ۲۲۲

خود مولف کے ذاتی حالات بھی اسی "کفایت" کے شکار ہو گئے "سفینۂ ہندی" میں اپنے مختصر احوال درج کر چکنے کے بعد وہ یہ اضافہ کرتے ہیں ۔

"تمام این حالات مشرحاً در قصیدہ و نسب نامہ بنظم در آوردہ ، داخلِ تذکرہ حدیقہ ہندی ساختہ ام ، این مختصر گنجایش آن ندارد ۔"[1]

تذکرۂ "سفینۂ ہندی" پر کام کرنے والے محققین نے تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کے بارے میں اپنی آراء کا یوں اظہار کیا ہے۔

جناب عطا کاکوی ۔

" ہندی صاحب تصانیف نثر و نظم بودہ ، بر نظم قدرت کامل داشت و در ہر صنف نظم ، مثنوی ، قصاید ، غزلیات ، رباعیات وغیرہ داد سخن می داد ، وو دواوین و سہ مثنویات بر قدرت کلامش دال اند ، در نثر کیے این تذکرہ (سفینۂ ہندی) و دیگرے سوانح النبوت مشتمل بر احوال رسول اکرمؐ و دو اندوہ اما مان نوشت وے این امر باعث حیرت است و موجب حسرت کہ آن ہمہ تصانیفش تاکنون از نظر شائقین پوشیدہ اند ، الا این تذکرہ کہ بنام سفینۂ ہندی مشہور است و یک نسخۂ واحد آن در کتب خانہ مشرقی خدا بخش خان (بانکی پور) پٹنہ محفوظ است ۔ پوشیدہ نماند کہ بھگوان داس یک ضخیم تذکرہ شعراے فارسی مشتمل بر احوال شعراے ماضی و حال در ۱۲۰۰ھ بنام حدیقۂ ہندی ہم تالیف کردہ بود ، آن ہم ہنوز مفقود است۔"[2]

"سفینۂ ہندی" کے ضمیمۂ الف میں عطا کاکوی صاحب مزید لکھتے ہیں ۔

" ہیچ از تصانیف ہندی دستیاب نمی شود ۔ صرف یک نسخۂ سفینۂ ہندی در کتبخانہ پٹنہ

---

[1] سفینۂ ہندی ۔ ص ۲۲۲ [2] ایضاً ، عرض مرتب صفحہ الف ،

[illegible]

جناب [illegible] نقوی :-

"تذکرۂ "حدیقۂ ہندی" مشتمل بر احوال "شعرای ماضی وحال" کہ در ہندوستان تولد یا نشو ونما یافتہ اند از ابتدای ظہور اسلام تا سنہ یکہزار و دویست ہجری این کتاب ہم تذکرہ وہم تاریخ است"[1]

بھگوان داس کی تمام تالیفات کا ذکر کر چکنے کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

"غیر از "سفینۂ ہندی" نسخہ اے از ہیچکدام از کتب فوق امروز بجا نماندہ است"[2]

جناب گلچین معانی :-

"حدیقۂ ہندی۔ تذکرہ مہم ومفیدی است وقطعاً مؤلف آن بمنابع زیادی رجوع داشتہ، ولی بطوریکہ عطاء الرحمٰن کاکوئی، در مقدمۂ سفینۂ ہندی (صفحہ الف) مذکور داشتہ، نسخۂ آن مفقود ہست"[3]

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۰۰ [2] تذکرہ نویسی فارسی در ہند وپاکستان، ص ۱۰۳۔

بھگوان داس نے "سفینۂ ہندی" میں "حدیقۂ ہندی" کے علاوہ اپنی مندرجہ ذیل تالیفات کا ذکر کیا ہے، (۱) سلسلۃ المحبت (مثنوی)، (۲) منظر الانوار (مثنوی)، (۳) مہر ضیار (مثنوی)، (۴) شوقیہ (دیوان)، (۵) ذوقیہ (دیوان)، (۶) سوانح النبوۃ (سیرۃ النبی وحالات دوازدہ امام)، (ص ۲۴۲ - ۲۴۳)

مظفر حسین صبا نے "تذکرۂ روز روشن" میں بھگوان داس لکھنوی کی ایک اور مثنوی "نعت چین" کا ذکر کیا ہے "مثنوی نعت چین بکمال فصاحت وبلاغت موزون نمودہ" (طبع بھوپال ص ۱۰۹، طبع تہران ص ۲۰۲) بظاہر یہ مثنوی "سفینۂ ہندی" کے بعد تالیف ہوئی ورنہ مصنف سفینۂ ہندی میں اپنی دوسری تالیفات کے ساتھ اس مثنوی کا بھی ضرور ذکر کرتے۔

[3] تاریخ تذکرہ ہای فارسی، تہران ۱۳۴۸ ش ج ۱ ص ۶۲۴۔

اتنے اہم اور مفید تذکرہ کے مفقود ہونے کی خبر سے نہ صرف فارسی شعر و سخن سے گہرا شغف رکھنے والے لوگ مایوس تھے، بلکہ اس کے "عدم موجود" ہونے سے فارسی تذکرہ نویسی میں بالعموم اور ہند و پاکستان میں فارسی تذکرہ نگاری کی تاریخ میں بالخصوص ایک باب خالی پڑا تھا۔

ہم فارسی ادب کے علاقہ مندوں اور محققوں کو یہ خبر پہنچاتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ بھگوان داس ہندی کے تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کا ایک مخطوطہ قم (ایران) کے کتابخانۂ عمومی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ نجفی مرعشی مدظلہ العالی میں موجود ہے، آیۃ اللہ سید شہاب الدین نجفی مرعشی کا یہ ذاتی کتب خانہ اب پبلک لائبریری کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس کتب خانہ کے مخطوطات کی فہارس مرتبہ سید احمد حسینی کی پہلی چھ جلدیں ہماری نظر سے گزری ہیں، فہرست کی دوسری جلد میں تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کے بارے میں فہرست نگار نے جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ بعینہ نقل کی جا رہی ہیں،

مخطوطہ نمبر ۹۰،

حدیقۂ ہندی (تراجم۔ فارسی)

از۔ بھگوانداس ہندی (ق ۱۳)

در سال ۱۲۰۰ پس از اینکہ مؤلف کتابہای بسیاری از تاریخ و تذکرہ ہا دوداوین خواندہ بود و سہ مثنوی بنام "سلسلۃ المحبۃ" و "منظر الانوار" و "مہر ضیا" و دو دیوان بنام "شوقیہ" و "ذوقیہ" سرودہ بود، بر آن شد کہ کتابی بپردازد متضمن حالات امراء و وزراء و مشایخ و سخن سرایان از مرد و زن ہندی کہ دارای آثار شعری می باشند، در اثر این اندیشہ کتاب حاضر را با این فصول و ابواب تالیف نمود۔

باب اول :۔ وصف آصف الدولہ و میرزا محمد فاخر و توصیف ہندوستان، در یک مقدمہ

باب دوم :۔ ذکر پردگیان معنی، دارای چہار فصل

چمن اول :۔ پادشاہان و شاہزادگان شاعر

چمن دوم :۔ وزرا و امرای شاعر

چمن سوم :۔ مشایخ و فقرای شعر پرداز

چمن چہارم :۔ سایر شعرای صاحب حال

بستم جمادی الاول سال ۱۲۱۱ بپایان رسیده است[1]

آغاز : "آغاز سخن سپاس حضرت آفریدگاریست تعالی شانہ کہ مشتی خاک را برگزیده بطغرای لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ انجام :

در میان سخنوران انام نظم من محضر خردمندیست

ہندوم ہند زاد و بوم نیست زین دو باعث تخلص ہندیست

نستعلیق ہندی، شاید بخط مؤلف، در حاشیہ تصحیح و اضافہ شده، نسخہ را موریانہ خورده است، عناوین شنگرف و دیباچہ دوم نوشتہ نیست، جلد تیماج قرمز ۲۶۳ گ (ورق) ۱۱ س، ۵/۲۳×۱۴ سم[2]

حدیقہ ہندی" کا دریافت ہونا کیا کم خوشی کا مقام تھا مگر محولہ بالا نسخہ قم کے بارے میں یہ گمان کہ وہ مصنف کا خود نوشتہ ہی اور اسکے حواشی پر تصحیحات و اضافات بھی پائے جاتے ہیں، مزید نشاط انگیز ہی۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلی فرصت میں اس کرم خوردہ مجلد کے عکس یا مائیکرو فلم حاصل کی جائے اور اسے جدید انداز میں مرتب کرکے شائع کردیا جائے تاکہ برصغیر کے بعض فارسی شعرا کے حالات اور آثار و اشعار کے بارے میں موجود خلا پر ہوسکے،

---

[1] غالبا بھگوان داس ۱۲۱۱ھ تک حدیقہ ہندی پر اضافات کرتے رہے ہیں، [2] سید احمد حسینی، فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ عمومی حضرت آیۃ اللہ العظمی نجفی مرعشی مد ظلہ العالی

تلخیص و تبصرہ

افریقہ میں اشتراکیت کا خطرہ

(از ضیاء الدین اصلاحی)

اس وقت براعظم افریقہ پر قابض ہونے کے لئے مختلف عالمی قوتوں کے درمیان کشمکش برپا ہے، ایک طرف اشتراکی تحریک یہاں اپنا اثر و نفوذ بڑھا رہی ہے، دوسری طرف مغربی استعماری طاقتیں اس کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہیں، تیسری طرف صیہونیت بھی استعمار پسندوں کی مدد سے اس براعظم کے ملکوں میں دخل انداز ہونا چاہتی ہے،

ان عالمی قوتوں کے وسائل و ذرائع جدا جدا ہیں لیکن اسلام دشمنی میں سب متحد ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسی طاقت ہے جو ان کے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کو پاش پاش کر سکتا ہے۔

اسلام دشمنی سے قطع نظر کمیونزم کی افریقہ پر حریصانہ نظر اس لئے بھی ہے کہ یہ دنیا کے مالدار براعظموں میں ہے اس کا رقبہ کل کرۂ ارضی کے رقبہ کا ۱/۵ ہے جبکہ اسکے باشندے پوری دنیا کے باشندوں کے مقابلہ میں صرف ۸ فیصدی ہیں ہر چیز کی عالمی پیداوار میں اس کا بڑا حصہ ہے، دنیا کا ۷۰ فیصدی ہیرا، ۵۵ فیصدی سونا اور ۲۲ فیصدی تانبا یہیں ہوتا ہے، انکے علاوہ دوسری معدنی اور کیمیاوی اشیاء کی بھی بہتات ہے، جنگلوں سے لکڑیاں اور چراگاہوں سے گھاس وافر مقدار میں ہوتی ہے، سمندر سے حاصل ہونے والی دولت اور معدنی اشیاء الگ ہیں نائیجیریا کے تیل کے علاوہ لیبیا، الجزائر، نائجیریا اور زمبیا وغیرہ میں پٹرول کے چشمے ہیں

افریقہ رقبے کے لحاظ سے ایشیا کے بعد دوسرا بڑا براعظم ہے اور ۱۹۶۲ء کی مردم شماری کے مطابق اسکے باشندوں کی تعداد ۳۰۰ ملین ہے اور ممالک کی کثرت کی وجہ سے اقوام متحدہ میں سیاسی نمائندگی کے اعتبار سے بھی اس کا بڑا وزن ہے، اور جغرافیائی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے، اس بناء پر اسکے لیے اشتراکی اور مغربی مسیحی قوتوں کے درمیان کشمکش کا ہونا تعجب خیز نہیں۔

اشتراکی قوتیں افریقہ پر غالب آنے کیلئے اسلام سے اسلیے برسرپیکار ہیں کہ انکا خیال ہے کہ اسکی تعلیمات کے اندر اشتراکیت کے الحادی نظریات کے مقابلہ کی پوری صلاحیت و قوت موجود ہے، اسی لئے وہ مسلمانوں کو اپنے ان باطل افکار و نظریات کی طرف مائل کرنا چاہتی ہیں جنکا سرچشمہ روحانیت کے بجائے مادیت والحاد ہے۔ کمیونسٹوں کا اصلی منصوبہ یہ ہے کہ روس ایشیا کی طرح یہاں سے بھی اسلام کا اثر و نشان مٹا کر اسے سرخ اشتراکی پرچم کے نیچے کر دیں تاکہ مارکس لینن اور بلگانن کا مادی اشتراکی نظریہ یہاں کے مسلمانوں کا عقیدہ اور دستور حکومت بنجائے کیونکہ یہ اسلامی براعظم سمجھا جاتا ہے، ۱۹۶۲ء کی مردم شماری کے مطابق اسکے ۳۰۰ ملین باشندوں میں ۲۵۰ ملین مسلمان ہیں۔

روس، چین اور انکی حاشیہ بردار حکومتیں افریقہ میں اپنا تسلط و اقتدار قائم کرنے کیلئے پوری تیاری اور قوت کے ساتھ میدان میں آگئی ہیں، اسی غرض سے انھوں نے یہاں کی آزادی پسند اور استعمار دشمن وطنی تحریکوں کی طرف رخ کیا ہے حالانکہ ان تحریکوں کو اگر قدیم استعمار سے چھٹکارا مل بھی جائے تو وہ اشتراکیت کی صورت میں ان سے بھی زیادہ خطرناک استعمار کا شکار ہو جائیں گی جس کے فوجی و سیاسی تسلط کی سخت گرفت قبائل اور حکومتوں کو بالکل ہی بے بس و مجبور بنا دیتی ہے۔

اس زمانہ میں دنیا کی سب سے خطرناک قوت اشتراکیت ہے، یہ دنیا کی تمام حکومتوں کو اپنے قبضہ میں کر کے ماسکو کے سامنے سرنگوں کرنا چاہتی ہے اور ماسکو کو ان کا پایہ تخت بنانا چاہتی ہے اس وقت افریقہ اسکا خاص نشانہ ہے اس سے پہلے وہ مشرقی ایشیا میں ویتنام اور کمبوڈیا کو اپنا شکار بنا چکی ہے۔

اشتراکی طاقتوں نے عرب و اسرائیل کشمکش سے فائدہ اٹھا کر مصر جیسے اسلام کے مضبوط و محفوظ قلعہ میں دخل اندازی کرنی چاہی تھی لیکن یہ منصوبہ ناکام ہو گیا، مگر اسکے بعد بھی اس نے ہار نہیں مانی اور اب وہ مشرقی افریقہ کی ایک حکومت میں اپنے قدم جمانا چاہتی ہے۔ اس علاقہ پر عالمی اشتراکی تحریک کی نظر اسلئے مرکوز ہو گئی ہے کہ یہ عالم اسلام کے قلب یعنی دنیائے عرب سے بہت قریب ہے، یہاں اشتراکی انقلاب کے اثرات ظاہر ہو چکے ہیں، ایتھوپیا میں اسکے موافق نظام حکومت قائم ہو چکا ہے، صومالیہ اور تنزانیہ میں بھی اسکی لہریں چل رہی ہیں اور بحر احمر کے جنوبی مدخل میں اسکی فوجی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، سوڈان کو اشتراکیت کے اثر و نفوذ میں لانے کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا مگر وہاں کی کمیونسٹ پارٹی ٹوٹ پھوٹ گئی حالانکہ اسے مشرقی افریقہ کی سب سے طاقتور کمیونسٹ پارٹی سمجھا جاتا تھا۔ موزمبیق پر اشتراکی اقتدار قائم ہو چکا ہے،

مغربی افریقہ میں بھی اشتراکیت کا عمل دخل شروع ہو چکا ہے، انگولا میں بائیں بازو کی کمیونسٹ پارٹیاں اپنا نظام حکومت قائم کرنے کیلئے وہاں کی آزادی پسند اپنی حلیف پارٹی کی مدد کر رہی ہیں، وہ زائر کی حکومت کو بھی امداد دیکر وہاں کمیونسٹ نظام حکومت قائم کرنے کیلئے مداخلت کر رہی ہیں، یہ افریقہ کی مالدار اور رقبے کے لحاظ سے بھی بڑی حکومت ہے، کمیونسٹ مختلف افریقی حکومتوں کے درمیان اختلاف اور کشمکش بھی پیدا کر رہے ہیں، اریٹیریا کے باغی انقلاب پسندوں سے جنگ کرنے کیلئے ایتھوپیا کی فوجی حکومت کو امداد پہنچا رہے ہیں، جنوبی مغربی افریقہ میں نامیبیا کی آزادی کی تحریک میں روس مداخلت کر رہا ہے، چین تنزانیا اور اسکے قریب کی بعض افریقی حکومتوں میں اشتراکیت کی بنیادیں قائم کر رہا ہے، زمبیا، روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کو بھی وہ مالی اور فوجی امداد دے رہا ہے اور ایسے افراد کو تربیت دے رہا ہے جو مجاہدین کی صفوں میں داخل ہو کر تخریب کاری شروع کر دیں تاکہ جب یہ ممالک آزاد ہوں تو ان کی باگ ڈور اس کے قبضہ میں رہے۔

اشتراکی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے افریقیوں میں استعمار کے خلاف نفرت و اشتعال بھی پیدا کر رہے ہیں، کمیونسٹ تحریکیں افریقیوں کا انتخاب کر کے انہیں تربیت دینے کے لیے ماسکو بھیجتی ہیں تاکہ یہ اپنے ملکوں کی قیادت کریں اور کمیونسٹ نظام حکومت قائم کرنے کے لیے مفید و معاون بنیں۔

روس اور چین کی طرح فرانس کے کمیونسٹ بھی اشتراکی افکار کی اشاعت کے لئے ان افریقی ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جن کی زبان فرانسیسی ہے، افریقہ کے مختلف شہروں میں اشتراکی پروپیگنڈے کے دفاتر قائم ہوگئے ہیں، پمفلٹ اور رسالے شائع کرکے تقسیم کرتے ہیں،

افریقیوں کی غربت و جہالت، بغاوت پسندی، استعمار دشمنی اور قبائلی و طبقاتی نظام کی وجہ سے بھی ان کی سرزمین اشتراکیوں کے لیے ہموار ہوگئی ہے، اس لئے کمیونزم کے الحادی اثرات برابر جڑ پکڑتے جا رہے ہیں،

افریقہ میں عیسائی قوت دم توڑ رہی ہے، کروڑوں ڈالر خرچ کرلے، بیشمار تعلیمی اور فلاحی ادارے قائم کرنے اور متعدد معاشی منصوبے بنالے کے بعد بھی جب ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کہ افریقہ تمام تر عیسائی علاقہ بن سکے بلکہ الٹے وہاں اسلام کی ترویج و اشاعت ہو رہی ہے اور افریقی حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ امراء، رؤسا اور وزراء بھی اسلام قبول کرکے مسیحیت چھوڑ رہے ہیں تو اس سے گھبرا کر عیسائیوں نے بھی افریقہ میں کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر عالمی اشتراکی تحریک کے لئے راہ ہموار کرنا شروع کر دیا، لیکن دنیا کے سامنے یہی ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ افریقہ میں اشتراکیت سے برسرپیکار ہیں،

بالآخر تمام تحریکوں کی طرح اشتراکیت کا انجام بھی افریقہ میں بے اثر ثابت ہوگا کیونکہ تمام افریقی قبائل کے نزدیک دین ہی سب سے قیمتی متاع ہے، کمیونسٹ اور دنیا کی اور دوسری تمام طاقتیں متحد ہوکر بھی نہ افریقہ کو اسلام سے منحرف کرسکتی ہیں اور نہ اسے اسلامی براعظم بننے سے روک سکتی ہیں، اس سے پہلے بھی اسلام کی راہ میں دشوار گذار گھاٹیاں حائل ہوتی رہی ہیں، مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرنے والے افکار و نظریات اٹھتے رہے ہیں، اور نہایت زبردست قوتیں اسلام سے جنگ کرتی رہی ہیں لیکن ان سب کو شکست فاش ہوئی، گذشتہ دور کی طرح آج بھی ہم اسلام ہی کے ذریعہ فتح و نصرت حاصل کریں گے، اسلام کا نور دنیا سے کبھی مٹ نہیں سکتا، اس لئے افریقہ میں تمام اشتراکی سرگرمیوں کے بعد بھی اسلام باقی رہے گا، اور اس کے ماننے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوگا اور اشتراکیت کو یہاں

ناکام ہو کر الٹے پاؤں لوٹ جانا پڑے گا۔

البتہ افریقہ میں اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر یہاں اسلامی دعوت و تبلیغ کے نظام کو بہت مستحکم اور منظم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کے دشمنوں کے ارادے خاک میں مل جائیں، نوجوانوں پر خاص طور سے دھیان دینا چاہیے، یہی مستقبل کا سرمایہ اور اثاثہ ہیں، مگر یہی آسانی سے اشتراکی جال میں گرفتار بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اشتراکیت ہمیشہ نوجوانوں ہی میں پھیلتی اور پھولتی ہے،

منظم اسلامی دعوت و تبلیغ ہی کے ذریعہ اشتراکیت کی ذلت دخواری کا سامان مہیا کیا جا سکتا ہے جو افریقیوں پر اپنا تسلط جما کر ان کو اسی طرح غلام بنانا چاہتی ہے جس طرح اس سے پہلے سفید فام لوگوں نے ان کو غلام بنایا تھا،

جب اشتراکیت وسیع اسلامی دنیا سے ایک ایسی اسلامی سلطنت کو کاٹ کر اپنے حیطۂ اقتدار میں کر سکتی ہے جو امت کے برگزیدہ افراد اور علماء و فضلا کا گہوارہ رہی ہے اور جس کی خاک سے علوم حدیث و تفسیر میں امام بخاریؒ اور ریاضیات میں خوارزمی اور بیرونی جیسے اصحاب کمال پیدا ہو چکے ہیں، اسی طرح جب وہ دنیا کی مختلف اسلامی آبادیوں کے ۴ ملین سے زیادہ لوگوں کا رشتہ ان کے مسلمان بھائیوں سے کاٹ سکتی ہے اور اشتراکی چین اپنی سرزمین کے ۱۰ ملین سے زیادہ مسلمانوں کا تعلق ان کے مسلمان بھائیوں سے ختم کر سکتا ہے اور جنوبی مشرقی ایشیا میں اسلام سے جنگ کرنے کیلئے جدوجہد کر سکتا ہے تو کیا ایسی صورت میں اسلامی سلطنتوں اور عرب حکومتوں کو افریقہ کی سرزمین پر ہونے والے واقعات کے مقابلہ میں چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا چاہیے، اگر وہ خاموش رہے تو اشتراکیت مشرقی ایشیا اور مغربی افریقہ پر چھا جائے گی اور دنیائے اسلام کے قلب یعنی عالم عربی کو بھی بقیہ اسلامی ملکوں سے الگ تھلگ کر دے گی،

رابطۂ عالم اسلامی (مکہ)، ادارۂ مجمع البحوث الاسلامیہ (قاہرہ)، ادارۂ جامع ازہر، جمعیۃ دعوت اسلامی (لیبیا)، ادارۂ تحفظ قرآن (تیونس)، رابطۂ علماء مغربیہ اور جملہ افریقی ملکوں کی وزارت اوقاف اور ادارۂ امور اسلامی وغیرہ جو کچھ جدوجہد کر رہی ہیں ان سے وہ کمیونزم کے چیلنج کو روک سکتی ہیں اور نہ ان جگہوں سے اسکو ختم کر سکتی ہیں جہاں وہ پھیل رہا ہے۔

[illegible] ایک [illegible] ہے [illegible]

معاملہ اپنے دائرہ میں جو [illegible] ہیں کسی کا ایک [illegible] معمولی واسطہ [illegible] اشتراکی اسلامی مکاتب معمولی زبان کی تعلیم کے مدارس کھول دینے یا افریقی ملکوں کے کسی پایہ تخت میں مسجد تعمیر کر دینے سے اس خطرہ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو افریقہ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے،

مبلغین کو اسلام کا پیغام اور عربی ثقافت و تہذیب کو افریقہ کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کیلئے بڑے بڑے شہروں سے لیکر معمولی معمولی دیہاتوں بلکہ جنگلوں اور جھاڑیوں میں پہنچنے کی ضرورت ہے اور تمام اسلامی اور عربی حکومتوں، مسلم جماعتوں اور افراد کو اسوقت افریقہ کے مسئلہ پر توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اشتراکی خطرہ سے باہر آ سکے۔

جن حکومتوں کو اللہ نے پٹرول کی دولت سے نوازا ہے انکو اپنی سالانہ آمدنی کا ایک معتدبہ حصہ افریقہ میں دعوت اسلامی کے مقدس کام کیلئے وقف کر دینا چاہئے، ابھی تک جو کچھ مالی انتظام کیا گیا ہے وہ کمیونزم کے خطرہ کے مقابلہ کیلئے کافی نہیں ہے،

اسلام کو افریقہ میں اشتراکی تحریک کے مقابلہ کیلئے ایک بڑی طاقت بن کر ظاہر ہونا چاہئے تاکہ افریقہ سے اشتراکیت کا استیصال ہو جائے، یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو دین کے حامل، اسلامی عقائد میں راسخ، افریقی قبائل کی تاریخ، انکی زبان، لہجے، رسوم اور عادات وغیرہ سے واقف ہوں،

مسلمان مبلغوں کو افریقہ میں جنگ کرنے والوں کی صفوں میں داخل ہو کر کام کرنا چاہئے کیونکہ جو لوگ کسی خاص مقصد کی خاطر جنگ کر رہے ہوں اگر انکے اندر دینی شعور بیدار ہو جائے اور وہ اسلامی عقیدہ میں راسخ ہو جائیں تو انکو شکست سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا کیونکہ عقیدہ کی خاطر لڑی جانے والی جنگ کا انجام فتح و کامرانی ہے،

ماضی میں مسلمانوں کی غفلت نے جنوب ایشیا اور دنیا کے دوسرے خطوں کی ایسی سرزمینیں گنوائی ہیں جو کبھی اسلامی علوم و فنون کا مخزن اور دینی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہی ہیں اب افریقہ کے اشتراکیت کے گود میں چلے جانے کا خطرہ اور اندیشہ لاحق ہے اسلئے مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کو بیدار ہونا اور اپنے افریقی بھائیوں کی مدد کیلئے کمربستہ ہو جانا چاہئے۔

(تلخیص، [illegible] الوعی الاسلامی کویت، جنوری [illegible])

مطبوعات جدیدہ

فقہ الزکوٰۃ :- مرتبہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی ترجمہ و تلخیص جناب شمس پیرزادہ صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت عمدہ صفحات ..، تقریباً قیمت ۲۵ روپیے، پتہ ادارہ دعوۃ القرآن ۵۹۔ محمد علی روڈ بمبئی۔

زکوٰۃ اسلام کا بنیادی رکن ہے، اس کتاب میں اس کی حقیقت و روح کے علاوہ اس کے قدیم اور بعض نئے مسائل پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے، اسکے مصنف ڈاکٹر یوسف القرضاوی جامع ازہر کے فاضل قطر یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے صدر اور عربی زبان کے نامور مصنف اور خطیب ہیں، انھوں نے متعدد علمی، دینی اور فقہی مسائل پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، غالباً ان میں فقہ الزکوٰۃ سب سے اہم اور مفید ہے، یہ کتاب نو ابواب کا مجموعہ ہے، ہر باب کے اندر کئی کئی مباحث اور فصلیں ہیں پہلے باب میں زکوٰۃ کی فرضیت اور اسلام میں اس کی عظمت و اہمیت کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں بہت اجمال کے ساتھ اسلام سے پہلے غریب اور کمزور طبقہ کی حالت بیان کی گئی ہے، اور غریبوں کے بارہ میں قدیم مذاہب اور ان کے مقابلہ میں اسلام کی امتیازی رعایت کا تذکرہ ہے، پھر مکی دور میں انفاق کی تلقین اور مدنی دور میں اس کی فرضیت کا ذکر ہے، نیز زکوٰۃ کے مانعین و منکرین کی دنیوی و اخروی سزا کا بیان ہے، دوسرے باب میں جن لوگوں پر زکوٰۃ فرض ہے اور جن پر نہیں فرض ہے دونوں کے بارہ میں فقہا کے اختلافات کی تفصیل درج ہے، تیسرا باب کئی فصلوں پر مشتمل ہے، اس میں اس مال کا ذکر ہے جس پر زکوٰۃ فرض یا نہیں فرض ہے، نیز اسکے مقدار نصاب

وغیرہ کی تعیین کی گئی ہے، جیسے موقوفہ اراضی، حرام مال، قرض، بونس، پراویڈنٹ فنڈ، مویشیوں، سونے چاندی، نقدی و کاغذی سکوں، زیور، تجارتی مال، زرعی پیداوار، شہد، حیوانی پیداوار یعنی ریشم اور دودھ، معدنیات، سمندر سے حاصل ہونے والی چیزیں، موجودہ ذرائع آمدنی، کرایہ کے مکانوں، سواریوں، کارخانوں، کمپنیوں کے حصے، بانڈ اور عشری و خراجی زمینوں کی زکوٰۃ پر سیر حاصل بحث ہے، چوتھے باب میں زکوٰۃ کے آٹھ قرآنی مصارف کی وضاحت کی ہے۔

پانچویں باب میں زکوٰۃ ادا کرنے کے طریقہ کے سلسلہ میں حکومت سے اس کے تعلق اور اس کے لئے بیت المال کے قیام کی ضرورت واضح کی ہے، اور اموال ظاہرہ و باطنہ کی زکوٰۃ کے فرق و یکسانی، زکوٰۃ میں نیت اور چیزوں کے بجائے ان کی قیمت ادا کرنے وغیرہ کا بیان ہے، چھٹے باب میں زکوٰۃ کے فائدے اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات دکھائے ہیں، اسی طرح صدقۂ فطر کے وجوب، احکام اور حکمتوں کا ایک مستقل باب میں ذکر ہے، آخری باب میں زکوٰۃ اور ٹیکس کی حقیقت بتائی گئی ہے، اور دونوں کی مشترک اور مختلف خصوصیات اور نوعیتیں دکھائی گئی ہیں، اس میں یہ بحث بھی ہے کہ زکوٰۃ کے باوجود اسلامی حکومت ٹیکس عائد کر سکتی ہے، اور ٹیکس کے بعد بھی زکوٰۃ کی ضرورت باقی رہتی ہے، آخر میں زکوٰۃ کو موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت اور مفید اسکیم ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مسلم اصحابِ فکر کے علاوہ بعض غیر مسلموں کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے، شروع میں زکوٰۃ اور صدقہ کے لغوی و شرعی معنی کی تشریح کی گئی ہے، سب سے آخر میں مختلف اشیاء کے نصاب اور عہد نبوی میں رائج اوزان اور پیمانوں کی مقدار موجودہ اوزان کے لحاظ سے بتائی گئی ہے، مصنف نے ہر بحث کو قرآن و حدیث کے نصوص اور فقہا کے اقوال کی روشنی میں دلائل کے ساتھ لکھا ہے، اور قدیم مسائل میں فقہا کے اختلافات مع دلائل تحریر کئے ہیں، اور آخر میں ان کے بارہ میں اپنی ترجیح و محاکمہ بھی نقل کیا ہے، اس سے ان کی مجتہدانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے

. . . جن قدیم مسائل میں اب وسعت پیدا ہوگئی ہے ان کو اور بعض نئے مسائل پر بھی نمونے دلیل گفتگو کی ہے، اس طرح کے مسائل میں گو کہیں کہیں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا، ابھی تک اردو میں زکوٰۃ پر ایسی مفید اور جامع کتاب موجود نہیں تھی، اس لیے جناب شمس پیرزادہ نے اس کی یہ تلخیص شائع کی ہے، تلخیص میں نہ کوئی ضروری اور اہم پہلو چھوٹنے سے رہ گیا ہے اور نہ کتاب کے تسلسل اور روانی میں فرق آیا ہے، ترجمہ بھی سلیس اور شگفتہ ہے مگر بعض جگہ اردو اور ہندی لفظوں کی جمع عربی قاعدہ کے مطابق لکھی گئی ہے جیسے زمینیات (ص ۲۳۳) "اگرچہ کہ" کا استعمال عموماً صحیح نہیں ہوا ہے۔

قصر علم: مرتبہ، جناب شوکت علی خان صاحب، سائز، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۱۲ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت درج نہیں، پتہ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک،

راجستھان میں ٹونک ایک بڑا علمی مرکز تھا، اس ریاست کے فرمانرواؤں کے علمی ذوق کی بدولت یہاں چھوٹے بڑے متعدد کتب خانے قائم ہوئے لیکن ریاست ہی کی طرح اس کی قدیم علمی یادگاریں اب مٹ چکی ہیں، تاہم کتب خانے موجود رہ گئے تھے، مگر وہ بھی ناقدری کا شکار ہو کر تلف اور برباد ہو رہے تھے، اس لیے وہاں کے علم دوست حضرات کی کوششوں سے چند برس قبل راجستھان کی صوبائی حکومت کو ان علمی خزانوں کی حفاظت کا خیال ہوا، اور اس نے عربی فارسی ریسرچ ڈائرکٹریٹ قائم کر کے ٹونک اور راجستھان کے تمام کتب خانوں کی عربی و فارسی کتابیں اس میں منتقل کرادیں، اور صاحبزادہ شوکت علی خان کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا، جو اپنے علمی ذوق اور ٹونک کے کتبخانہ سے دیرینہ تعلق کی بنا پر واقعی اس کے مستحق تھے، اب ان کی نگرانی میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا ہے، اور شعبۂ تصنیف و تالیف کی طرف سے یہ پہلی کتاب شائع ہوئی ہے،

جو کتب خانہ کی تاریخ اور اس کے نوادر و مخطوطات کے علاوہ ریاست کے دوسرے کتب خانوں کے بارہ میں مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین خود فاضل مرتب اور ٹونک کے ایک دوسرے فاضل مولوی حکیم محمد عمران خاں صاحب کے قلم سے ہیں، اور پہلے معارف وغیرہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان سے ٹونک اور راجستھان کے متعدد کتب خانوں اور ان کے اہم مخطوطات کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوتے ہیں اس طرح یہ مجموعہ علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے، لیکن فاضل مرتب کے مضامین میں عموماً کتابوں کے مصنفین کے سنین وفات کا ذکر نہیں ہے اور بعض کتابوں کے مندرجات کا خلاصہ بھی نہیں دیا گیا ہے، حالانکہ ان کے بغیر مخطوطات کے تعارف میں کمی رہ جاتی ہے، وہ ایک جگہ مشہور مورخ اور سیاح مسعودی کے متعلق لکھتے ہیں، "ہندوستان آنا تو یہاں کی کتب سے بھی ثابت ہوتا ہے، آخر عمر میں یہیں قیام پذیر ہو گئے تھے (ص ۱۴۵) یہ درست نہیں ہے آخر عمر میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور فسطاط میں انتقال ہوا جیسا کہ خود مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے، قصائد حسن غزنوی کے ایک نسخہ کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اول صفحہ پر ایک مہر مختار خان حسینی سبزواری کی ثبت ہے، جو شاہجہانی امراء میں سے تھے اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ شاہجہانی دور سے قبل کا ہے (ص۸۰) حالانکہ شاہجہانی امیر کی مہر ثبت ہونے کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی دور کا ہے نہ کہ اس سے قبل کا جیسا کہ خود انھوں نے بھی ص۹۱ پر یہی لکھا ہے "شاہجہاں کے عہد زریں کی یادگار ہے" ص۵۳ پر مرآت آفتاب نما کو مرآت آفتاب نامہ لکھا ہے،

مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ؛ مرتبہ جناب مولوی عبد الرحمن ناصر صاحب اصلاحی جامعی تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۷۰ قیمت للعہ پیسے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ (۲) کاشانۂ ناصر، سیدھا سلطان پور، بینا پارہ۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی۔

یہ اردو کے جوان مرگ ادیب نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کی طالب علمی کے زمانہ کے چند خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے ایک عزیز ہم وطن مولوی عبد الرحمن ناصر اصلاحی کو لکھے تھے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی طرح ان سے اس کے ادبی و علمی ذوق اور شوق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے جو مکتوب نگار کو شروع ہی سے تھا، یہ سب خطوط بے تکلفی سے لکھے گئے تھے اس لئے ان میں بے ساختگی ہے، ان سے خلیل مرحوم پر کام کرنے والوں کو مدد ملے گی، مکتوب الیہ مرتب نے شروع میں مرحوم کے مختصر حالات اور خطوط پر توضیحی حاشیے بھی لکھے ہیں جو ان کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہیں۔

"ض"

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں احادیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری رہا، احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں، محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر تھیں اور نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کر کے اُن کے مجموعے مرتب کیے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، و تبع تابعین کے مقدس سلسلہ کے مکمل ہونے کے بعد سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاریؒ پر ایک مختصر اور صاحب موطا امام مالکؒ کی سوانح عمری وہ لکھ بھی چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے بعد ان کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیر ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالکؒ اور ائمہ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام عبدالرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات سوانح اور فن حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات سوانح اور ان کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بعد اور اس کے بعد کے تمام قابل ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ: مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول: ۰۰-۱۷ قیمت: حصہ دوم: ۰۰-۱۹

"منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال

مارچ سنہ ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

شذرات

معارف کی گذشتہ اشاعت میں رومن امپائر اور یورپ کی عیسائی حکومتوں میں جو غدار پیدا ہوتے رہے، ان کا ذکر آیا تھا، قدیم ہندوستان کے ایسے غداروں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے،

قدیم ہندوستان کی سیاست پر ایک مستند اور اہم کتاب ارتھ شاستر ہے، اسکو چندر گپت موریا کے زیرک اور تیز فہم وزیر چانکیا نے لکھا، اس میں خاندان موریا کے قبل کے راجاؤں نے اپنی حکمرانی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ معاصر راجاؤں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے، ان میں تنازع اللبقاء ہمیشہ جاری رہا، زبردست کا بول بالا رہتا، کوئی راجا کسی دوسرے راجہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی بھروسہ نہ کرتا، وہ معاہدہ کو اپنی طاقت کے بڑھ جانے سے بلاپس وپیش توڑ دیتا زیادہ طاقتور ہوجاتا تو دوسرے پر فوج کشی کر دیتا، اخلاق و مروت کو سیاست میں جگہ نہیں۔ دیجاتی کھلم کھلا عیاری اور دغابازی کے وسائل اور ذرائع اختیار کئے جاتے، جن میں چھپ کر قتل کرنا بھی شامل تھا، راجہ اپنے خاندان کے ارکین سے ہمیشہ ڈرتا رہتا تھا، حکومت کی خاطر باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے دشمنی رکھتا، منظم جاسوسی پر حکومت کا انحصار رہتا، فاحشہ عورتیں اس کام میں زیادہ مشاق سمجھی جاتیں،

چانکیا نے موریا خاندان کے مشہور راجہ چندر گپت موریا کو اسی قسم کی تعلیم دی، اس نے اس پر عمل کرنے میں اس لئے پس وپیش نہیں کیا کہ وہ اپنے میں بہت سی خامیاں پاتا تھا، وہ

مگدھ کے ایک شاہی خاندان سے ضرور تھا، مگر اس کی ماں یا نانی ایک نیچ ذات کی عورت تھی، اس وجہ سے وہ اپنے کو ذلیل محسوس کرتا تھا، اس کے اوائلِ زندگی میں مہا پدنند ایک نائی نے مگدھ کے راجہ کی رانی سے ناجائز تعلقات پیدا کر لئے، تو اس نے رانی سے مل کر راجہ کو قتل کر دیا، اور خود گدی پر بیٹھ گیا، چندرگپت کو اس نے اپنی راہ کا روڑا سمجھ کر جلاوطن کر دیا، اس زمانہ میں سکندرِ اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، چندرگپت نے اس سے مل کر مگدھ پر حملہ کرنے کی دعوت دی، مگر سکندر یہاں تک نہیں پہونچ سکا، مہا پدنند کے بعد اس کا ایک بدچلن بیٹا نند گدی پر بیٹھا، لوگ اس سے خوش نہ تھے، چندرگپت نے اس کے خلاف لشکرکشی کر کے اس کو قتل کر ڈالا، اور گدی کا مالک بن بیٹھا،

چندرگپت نے اپنے حامیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، ان کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آیا، مگر اس کے ظلم کو لوگ اس لئے بھول گئے کہ اس نے اپنی فتوحات سے اپنی حکومت کا دائرہ خلیج بنگال سے لے کر بحیرۂ عرب تک پھیلا دیا تھا، اپنی غیر معمولی کامیابی کے باوجود وہ اپنی جان کو ہمیشہ خطرے میں محسوس کرتا، وہ دن کے وقت سونے یا دو راتوں کو مسلسل ایک ہی کمرے میں گذارنے کو اپنے لئے خطرناک سمجھتا، اس کے مشیر ان سازشی لوگوں کی کھوج لگایا کرتے جو ان راستوں میں چھپتے رہتے تھے، جو چندرگپت کی خوابگاہ تک جاتے تاکہ رات کے وقت اس میں داخل ہو کر اسکو قتل کر دیں،

اس کا جانشین اس کا بیٹا بندوسارا گدی پر بیٹھا، جو متراگھاٹ یعنی دشمن کش کے لقب سے مشہور ہوا، اس کا جانشین اشوک ہوا، جس کی پارسائی اور حکمرانی کی دھوم ہے، اس کے متعلق ایک روایت ہے کہ اس کے سو بھائی تھے، ان میں سے وہ ننانوے کو قتل کر کے گدی پر بیٹھا، گو موجودہ تحقیق سے اس کی تردید کی جاتی ہے، وہ خاندانی طور پر کم نسل تھا، برہمن کم نسلوں کو خاطر میں نہیں لاتے، شاید اسی لیے وہ ہندوازم اور برہمنزم سے علیحدہ ہو کر

بودھ مت کی طرف مائل ہوگیا، اپنی مساعی جمیلہ سے اسکو ایک عالمگیر مذہب بنا دیا جس سے اس کی شہرت اور بڑھی، مگر معلوم نہیں اس نے بڑھاپے میں کس مصلحت سے ایک بدچلن عورت تشیارکشا سے شادی کرلی، جس نے اس کے لڑکے سے بھی ناجائز تعلقات پیدا کرلیے، اس کے وزراء اس سے آخر میں کچھ ایسے آزردہ ہوئے کہ اس کے سارے اختیارات بالکل سلب کرلئے اور اس کی جگہ اس کے پوتے سامپرتی کو گدی پر بیٹھایا، اور وہ گمنامی میں کہیں مرگیا،

اس کی زندگی ہی میں اس کے ایک بیٹے جلوک نے بودھ مت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، وہ کشمیر کا راجہ بن کر شیو کی پوجا کیا کرتا تھا، اشوک کا جانشین سمپرتی جین مذہب کا مربی ہوگیا، پھر برہمن بھی کھل کر سامنے آگئے، اور بودھ مت کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرنے میں لگ گئے، اس افراتفری میں اشوک کی شاندار سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اس کے آخری راجہ کو اس خاندان کا ایک فوجی سردار پشی متر قتل کرکے خود راج کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے سنگ خاندان کی حکومت شروع ہوئی ۔

پشی متر نے نہ صرف ہندو مت کا احیاء بلکہ بودھ مت کی ساری خانقاہوں کو جلا کر خاکستر کیا، مگدھ سے جالندھر تک جو بھی بدھ راہب تھے، ان کو بے دریغ قتل کیا۔ بودھ مت کے خلاف ہندو راجاؤں اور برہمنوں کی ایذا رسانی روز بروز اتنی بڑھتی گئی کہ جہاں سے یہ مذہب نکلا تھا وہاں سے بالکل دربدر ہوگیا۔

سنگ خاندان کی حکومت میں زیادہ تر فتنہ و فساد رہا، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے ایک راجہ اگنی متر کا ایک چہیتا بیٹا اس کے سامنے ایک ناٹک دیکھ رہا تھا، تو ایک شخص متر دیو نے اس کا سر تلوار کے وار سے اس طرح الگ کر دیا جس طرح کنول کو اس کی ڈالی سے کیا جاتا ہے، اسی خاندان کے آخری بدچلن اور شرابی راجہ دیو بھوتی کو اس کے ایک برہمن وزیر بسدیو نے

قتل کر دیا، اور گدی کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے کنو خاندان کی حکومت چلی، اس خاندان کے آخری راجہ سسرمن کو دکن کے خاندان اندھریا سات واس کے راجہ نے ہلاک کیا، اندھر خاندان کو کشان خاندان کے راجہ کنشک نے ختم کیا، جو بہت ہی جلیل القدر فرمانروا گذرا ہے، کشان وسط ایشیا کے ایک خانہ بدوش قبیلے سے تھے، مگر وہاں سے آکر ہندوستان کے فرمانروا ہو گئے، کنشک نے ہندوستان کے بہت سے علاقے اپنے زیرنگیں کئے، مگر وہ تو چاہتا تھا کہ جہات اربعہ پر حکمرانی کرے، مگر اس کی لڑائیوں سے اس کی رعایا اس سے بے حد برگشتہ ہو گئی اسکو حریص اور سفاک سمجھنے لگی، جب وہ بیمار پڑا تو اس کو ایک رضائی اڑھادی گئی، اور اس کے اوپر ایک شخص بیٹھ گیا، جس کے بعد اس نے وہیں کی وہیں جان دیدی، کنشک کی وجہ سے بودھ مت کو پھر فروغ ہونے لگا تھا،

کشان خاندان کے بعد گپت خاندان کی حکومت شروع ہوئی، تو برہمنی ہندو مت کا پھر سے احیاء ہونے لگا، اسی خاندان کا ایک رکن راجہ سانگ بنگال کا حکمران تھا، اس نے ہرشن وردھن کے بھائی کو دغا بازی سے قتل کر دیا، اس کو بدھ مذہب سے بھی بڑی نفرت تھی، اس کی بیخ کنی کے لئے برابر تلا رہتا، بودھ گیا کے مقدس بودھی درخت کو اکھاڑ کر جلوا دیا، جس کے نیچے راجہ اشوک نے بے انتہا عبادتیں کی تھیں، اس نے پاٹلی پتر میں اس پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کرا دیا جس پر بودھ کے قدم کے نشان بنے ہوئے تھے، تمام خانقاہوں کو برباد کر ڈالا بھکشوؤں کو اپنی مملکت کے حدود سے جلاوطن کرا دیا۔

ہرشن وردھن ہندوستان کے نامور حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر جب وہ بودھ مذہب کی طرف مائل ہونے لگا تو برہمنوں نے اس کو قتل کر دینے کی سازش کی، اس نے قنوج کے پاس گنگا کے کنارے ... ہیون سانگ چینی کی تعلیمات کی ترویج کے لیے ایک شاندار خانقاہ

بدھ مت کی طرف مائل ہوگیا، اپنی مساعی جمیلہ سے اسکو ایک عالمگیر مذہب بنادیا جس سے اس کی شہرت اور بڑھی، مگر معلوم نہیں اس نے بڑھاپے میں کس مصلحت سے ایک بدچلن عورت تشیارکشا سے شادی کرلی، جس نے اس کے لڑکے سے بھی ناجائز تعلقات پیدا کرلیے، اس کے وزراء اس سے آخر میں کچھ ایسے آزردہ ہوئے کہ اس کے سارے اختیارات بالکل سلب کرلئے اور اس کی جگہ اس کے پوتے سامپرتی کو گدی پر بیٹھایا، اور وہ گمنامی میں کہیں مرگیا،

اس کی زندگی ہی میں اس کے ایک بیٹے جلوک نے بودھ مت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، وہ کشمیر کا راجہ بن کر شیو کی پوجا کیا کرتا تھا، اشوک کا جانشین سمپرتی جین مذہب کا مربی ہوگیا، پھر برہمن بھی کھل کر سامنے آگئے، اور بودھ مت کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرنے میں لگ گئے، اس افراتفری میں اشوک کی شاندار سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اس کے آخری راجہ کو اس خاندان کا ایک فوجی سردار پشی متر قتل کرکے خود راج کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے سنگ خاندان کی حکومت شروع ہوئی ۔

پشی متر نے نہ صرف ہندو مت کا احیاء بلکہ بودھ مت کی ساری خانقاہوں کو جلا کر خاکستر کردیا مگدھ سے جالندھر تک جو بھی بدھ راہب تھے، ان کو بے دریغ قتل کیا، بودھ مت کے خلاف ہندو راجاؤں اور برہمنوں کی ایذا رسانی روز بروز اتنی بڑھتی گئی کہ جہاں سے یہ مذہب نکلا تھا وہاں سے بالکل دربدر ہوگیا۔

سنگ خاندان کی حکومت میں زیادہ تر فتنہ و فساد رہا، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے ایک راجہ اگنی متر کا ایک چہیتا بیٹا اس کے سامنے ایک ناٹک دیکھ رہا تھا، تو ایک شخص متر دیو نے اس کا سر تلوار کے وار سے اس طرح الگ کر دیا جس طرح کنول کو اس کی ڈالی سے کیا جاتا ہے، اسی خاندان کے آخری بدچلن اور شرابی راجہ دیو بھوتی کو اس کے ایک برہمن وزیر بسودیو نے

قتل کر دیا، اور گدی کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے کنو خاندان کی حکومت چلی، اس خاندان کے آخری راجہ سسرمن کو دکن کے خاندان اندھریا سات واس کے راجہ نے ہلاک کیا، اندھر خاندان کو کشان خاندان کے راجہ کنشک نے ختم کیا، جو بہت ہی جلیل القدر فرمانروا گذرا ہے، کشان وسط ایشیا کے ایک خانہ بدوش قبیلے سے تھے، مگر وہاں سے آکر ہندوستان کے فرمانروا ہو گئے،

کنشک نے ہندوستان کے بہت سے علاقے اپنے زیر نگیں کئے، مگر وہ تو چاہتا تھا کہ جہاں اربعہ پر حکمرانی کرے، مگر اس کی لڑائیوں سے اس کی رعایا اس سے بے حد برگشتہ ہو گئی، اسکو حریص اور سفاک سمجھنے لگی، جب وہ بیمار پڑا تو اس کو ایک رضائی اڑھادی گئی، اور اس کے اوپر ایک شخص بیٹھ گیا، جس کے بعد اس نے وہیں کی وہیں جان دیدی، کنشک کی وجہ سے بودھ مت کو پھر فروغ ہونے لگا تھا،

کشان خاندان کے بعد گپت خاندان کی حکومت شروع ہوئی، تو برہمنی ہندو مت کا پھر سے احیاء ہونے لگا، اسی خاندان کا ایک رکن راجہ سانگ بنگال کا حکمران تھا، اس نے ہرش وردھن کے بھائی کو دغا بازی سے قتل کر دیا، اس کو بدھ مذہب سے بھی بڑی نفرت تھی، اس کی بیخ کنی کے لئے برابر تلا رہتا، بودھ گیا کے مقدس بودھی درخت کو اکھاڑ کر جلوا دیا، جس کے نیچے راجہ اشوک نے بے انتہا عبادتیں کی تھیں، اس نے پاٹلی پتر میں اس پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کرا دیا جس پر بودھ کے قدم کے نشان بنے ہوئے تھے، تمام خانقاہوں کو برباد کر ڈالا، بھکشوؤں کو اپنی مملکت کے حدود سے جلاوطن کرا دیا۔

ہرش وردھن ہندوستان کے نامور حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر جب وہ بودھ مذہب کی طرف مائل ہونے لگا تو برہمنوں نے اس کو قتل کر دینے کی سازش کی، اس نے قنوج کے پاس گنگا کے کنارے . . . ہیون سانگ چینی کی تعلیمات کی ترویج کے لیے ایک شاندار خانقاہ

بنوائی، مگر برہمنوں نے آگ لگا کر اس کو برباد کر دیا، پھر ایک شخص نے اپنے خنجر سے اس پر قاتلانہ حملہ کیا، لیکن وہ ناکام رہا، اس نے اقبال جرم کے سلسلہ میں انکشاف کیا کہ برہمنوں نے اس کو اس کام کے لئے بھیجا تھا، اس کے بعد سرغنوں کو سزائے موت دی گئی، اور تقریباً پانچ سو برہمنوں کو جلاوطن کر دیا گیا،

راجاؤں کی باہمی نفاق پروری اور دشمنی کی وجہ سے ہندوستان بیرونی حملہ آوروں کی ایک جنت بنا ہوا تھا، پورا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوتا رہا، انکے حکمران ایک دوسرے سے ہمیشہ دست وگریبان رہتے، کوئی راجہ اپنی اولوالعزمی اور سپہگری سے ان منتشر علاقوں کو ایک لڑی میں پرو دینے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ ملک ایک معلوم ہوتا ورنہ پھر علحدہ علحدہ ریاستوں میں بٹ جاتا، اس افراتفری کی وجہ سے یونانی یہاں آئے تو پنجاب اور اسکے آس پاس کے علاقوں پر ان کا تسلط تقریباً دو سو برس تک رہا، اسی طرح پارتھی، خوارزم، سمرقند اور ہرات کے بے آب وگیاہ علاقے سے ہندوستان آئے، تو انھوں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی، پھر باختر کا خانہ بدوش قبیلہ پہاڑی دروں کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا، تو ٹکسلا اور جمنا کے کنارے متھرا میں اپنی بستیاں بسائیں، اور ایک صدی سے زیادہ تک پارتھیوں کے ماتحت حکمراں رہے، اسی طرح سینتھی اور سکائی قبیلوں کے لوگ جو دریائے جیحون کے شمال میں رہتے تھے، یہاں آکر بڑے حصے قابض رہے، کشان بھی خانہ بدوش تھے، وہ وسط ایشیا سے آئے تو انھوں نے یونانیوں، پارتھیوں اور سینتھوں کا قلع قمع کر دیا، مگر پھر وہ خود گپت خاندان سے مغلوب ہو گئے۔

ہندوؤں کو اس نفاق پروری سے عبرت حاصل کرنا چاہئے تھا، مگر انکی انتشار پسندی جاری رہی، راجستھان راجپوتوں کا بڑا مرکز تھا، مگر کبھی یہ ایک راجہ کے زیرنگیں نہیں رہا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا، پھر خود ان ریاستوں میں بڑی ریشہ دوانیاں رہیں، مثلاً میواڑ کے راجپوتوں کی

یخ بہت ہی درد انگیز طریقے سے بیان کی جاتی ہے، مگر اسی کے راجہ لکھا رانا نے مارواڑ کی ایک ایسی بھکاری سے خود شادی کر لی جس کی اس کے لڑکے چندر سے ہونے والی تھی، اور جب اس سے ایک بچہ موکل جی پیدا ہوا تو اسی کو چندا کے بجائے اپنا جانشین بنایا، پھر تو شدید جنگ ہوئی جس میں موکل جی کا قتل ہوا، اسی خاندان کے راجہ کمبھو کو اس کے لڑکے نے قتل کیا، مگر کمبھو کے لڑکے کو رائے مل نے بے دخل کیا، اور خود راجہ بن بیٹھا، رانا رتنا کے جانشین بکرماجیت کو قتل کر کے ایک مجہول النسب راجپوت بن بیر راجہ بن بیٹھا، اس نے رانا سانگا کے ایک نوزائیدہ بچہ کو قتل کرنا چاہا، وہ روپوش کر دیا گیا، جس سے خانہ جنگی جاری رہی، بن بیر معزول کیا گیا، اسی خاندان کا رانا پرتاب سنگھ جب اکبر سے لڑا تو اس کا بھائی اکبر کی حمایت میں لڑا، ایسے اختلافات سے راجپوتوں کی تاریخ بھری ہوئی ہے،

بعض راجپوت راجہ تعدادِ ازدواج کی وجہ سے بڑے کثیر العیال ہوتے، اشوک کے سو بھائی بتائے جاتے ہیں، راجہ مان سنگھ کچھواہہ کی پندرہ سو بیویاں تھیں، ان راجاؤں کا بڑا لڑکا تو قانونی طور پر گدی پر بیٹھ جاتا اور لڑکے اقتدار اور جاگیر کی ہوس میں چھوٹے چھوٹے قلعے، گڑھ، اور گڑھی بنا کر اپنے علاقے کے حکمراں ہو جاتے، اور جب تھوڑی طاقت حاصل کر لیتے تو ارتھ شاستر کے اصول اپنے کمزور ہمسایہ راجا پر حملہ آور ہو جاتے، پھر ان راجپوتوں کی بہت سی قسمیں ہو گئیں، راٹھور، سیسودیہ، کچھواہہ، ہاڈا، گوڑ، چوہان، شیخاوت، بندیلہ، چندراوت وغیرہ، وہ آپس میں اس طرح لڑتے رہتے کہ بقول جدو ناتھ سرکار جاگیر کی خاطر بیٹا باپ سے برسرپیکار ہوا، بھائی اپنے سگے بھائی سے متحارب ہوا، داماد نے خسر کو چھوڑا، اپنے ہم مذہبوں اور ہم قبیلوں سے لڑنے میں ندامت محسوس نہیں کی، ضرورت ہوئی تو پھر تو اہم فوجی قلعے اور مورچے بھی مسلمان بادشاہوں کے حوالے کر دیتے، مندروں کے انہدام سے بھی زیادہ آزردہ نہیں ہوتے (ہسٹری آف اورنگ زیب جلد ۱ صفحہ ۲۹، جلد ۵ صفحہ ۱۱۰، ۳۱۰، ۲۱۱، ۴۵۵)

سیواجی کے بارہ میں کہاجاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے خلاف نیشلزم اور حب الوطنی کی جنگ لڑا، مگر سیواجی کا داماد اچل جی اورنگ زیب کے دربار کا پنج ہزاری منصب دار بنکر رہا، راجہ دیان کوجی کا لڑکا سیواجی کا بھتیجا تھا، وہ اورنگ زیب کے دربار سے منسلک ہونے کے لئے شش ہزاری منصب کا خواستگار تھا، مادھاجی نراین بھی سیواجی کا بھتیجا تھا، وہ اپنے لڑکے اور بھتیجے کے ساتھ اورنگ زیب کا طرف دار ہوگیا تھا،

اورنگ زیب کے ہندو فوجی امراء میں رائے سنگھ سیسودیہ، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، کیرت سنگھ، مترسین، اندرمن بندیلہ، امرسنگھ، کمار سنگھ، راجہ جے سنگھ وغیرہ اس کے خلاف برابر لڑتے رہے، خود سیواجی نے سلہیر کے محاصرہ میں امر سنگھ اور اس کے بیش ساتھیوں کو گرفتار کرکے اسکے ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کرڈالا،

مرہٹوں نے پیشواؤں کی نگرانی میں راجپوتانہ پر بار بار حملے کرکے جو غارتگری اور خونریزی کی وہ ہندوستان کی تاریخ کی بڑی المناک داستان ہے، اور جب احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان میں ان سے لڑا تو راجپوتوں کا کوئی قبیلہ ان کی حمایت میں نہیں پہونچا اور ایک ابھرتی ہوئی قوم اس جنگ کے بعد بالکل دب کر رہ گئی،

اوپر کی تفصیلات سے ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کون کس کیلئے غدار ہوا، اور کس کی غداری سے ملک کو نقصان پہونچتا رہا، معارف کی پانچ اشاعتوں میں غداروں کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اُس سے یہ اندازہ ہوگا کہ سیاسی اقتدار کی خاطر ہر قوم اور ہر مذہب میں ایسے غدار پیدا ہوتے رہے ہیں، تو کیا تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاست اور بادشاہت کے معاملہ میں بیٹے اور داماد کا کوئی لحاظ نہیں کیاجاتا، بادشاہ کا کوئی حقیقی رشتہ دار نہیں ہوتا ہے شہزادے کیکڑوں کے مانند ہوتے ہیں وہ انکی طرح اپنے والدین کو کھاکر ہضم کرجانے میں مشاق ہوتے ہیں، مگر اسلام کی تو یہ تعلیم نہیں رہی، ہمارے رسول اکرمؐ اپنی سیاسی اور معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر موقع پر نذیرو بشیر رہے، اگر آپ کے پیرودن نے آپ کی پیروی نہیں کی تو یہ سراسر اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

تمہید جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دار المصنفین اور اڈیٹر معارف کی رحلت کو چھ سال ہوگئے ہیں، مگر وہ اب تک میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، دار المصنفین کے احاطہ میں ان کو آتے جاتے، اس کے کتب خانہ مین داخل ہوتے، میز پر ان کو لکھتے ہوئے پاتا ہوں، ان کی آواز سنائی دیتی ہے کہ وہ مجھکو پکار رہے ہیں، دار المصنفین کے متعلق باتیں کر رہے ہیں، میں کچھ کہہ رہا ہوں، وہ سن رہے ہیں، یا وہ کچھ کہہ رہے ہیں، میں سن رہا ہون، ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں، خفا بھی ہو رہے ہیں، دلجوئی بھی کر رہے ہیں، وہ میری زندگی کے کچھ ایسے ضروری جزبن گئے تھے کہ ان کے بعد دار المصنفین وہی ہے، اس کے احاطہ کے اندر آم کے درختوں کی ڈالیاں پہلے ہی کی طرح جھومتی رہتی ہیں، اس کے سبزہ کی لہلہاہٹ پہلے ہی کی طرح باقی ہو، اس کے چمن کے پھولوں کی شادابی اور رعنائی اسی طرح قائم ہے، صبح ہوتی ہے، شام بھی آتی ہے، رات بھی گذر جاتی ہے، مگر میں اپنے دل کے نہاں خانہ کو روندھا روندھا، اجڑا اجڑا، بے کیف، اور مغلس کا ایک چراغ پاتا ہوں،

ان کے ساتھ میں جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء تک یعنی ان کی زندگی کے آخری دن تک رہا، ان کی دم سازی، دل نوازی اور کرم فرمائی کے خزانے سے جو بیش بہا دولت مل سکتی تھی، ان سے برابر ملتی رہی، ان کی دائمی مفارقت سے یہ چھین لی گئی، جو شاید اب دنیا میں کسی اور گوشہ میں نہ مل سکیگی، میں دار المصنفین ان کے یہاں آنے سے گیارہ سال بعد آیا، وہ مجھ سے آٹھ نو سال سن میں بڑے تھے، مگر ہم دونوں رفتہ رفتہ اس طرح گھل مل گئے کہ ہم اور وہ ہم سن اور ہم درس معلوم ہونے لگے تھے، میں ان کے دل کا ترجمان بن گیا تھا، تو وہ میرے دل کی زبان بن گئے تھے،

ان کی وفات کے بعد ان کے حالات زندگی لکھنا چاہتا تھا، معارف کے ناظرین کا تقاضا تھا کہ ان کے لیے معارف کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے، مگر دل یہ کہتا کہ ان کے حالات کوئی لکھتا تو ہم ہی لکھتے، جب لکھنے کا خیال آتا تو اپنے قلم کو نگار اور دل کو خوں چکاں پایا، غمناکی اور سوگواری کے ہجوم میں جو کچھ لکھنا چاہتا قلم ساتھ نہ دیتا، اس تاخیر پر دل ملامت کرتا۔

جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا تو خیال ہوا کہ ایک ہمدم اور ہمراز کے سوانح حیات قلم بند کرنے میں رسمی سوانح نگاری کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی تو شاید یہ حق صحیح طور پر ادا ہو جاتا، ہم دونوں کی زندگی کچھ ایسی ملی جلی رہی کہ ان کے حالات زندگی کو ضبط تحریر کرنے میں میری ذات بھی سامنے آجاتی ہے، مولانا حالی نے یادگار غالب لکھتے وقت تحریر فرمایا تھا کہ غالب کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش نہیں آئے ہیں جن کو پھیلا کر ان کے سوانح حیات کو طویل کیا جا سکتا تھا، ان کی شاعری، ان کی زندگی کا اہم باشان واقعہ ہے، شاہ صاحب کی زندگی بھی ہنگامہ خیز واقعات سے خالی رہی، مگر انھوں نے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ اور ان کے بعد دار المصنفین کی آبرو بن کر جو زندگی گذاری اور پھر یہاں اکاون سال تک

اکر اپنی تصنیفی زندگی میں جو علمی کارنامے انجام دیئے وہی درحقیقت ان کی زندگی کا اہتمام ماننا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے میں کہیں کہیں میری حقیر ذات بھی سامنے آجائے گی، جس طرح لوگوں نے ۳۰ سال تک مجھکو ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور زندگی گذارتے دیکھا، اسی طرح اگر اس کتاب کے ناظرین ان کے ساتھ ایک بار پھر مجھ کو دیکھیں تو تعجب نہ کریں، کچھ دل کے تقاضے، کچھ قلم کی بے راہ روی اور کچھ رسمی سوانح نگاری سے ہٹ کر، شاہ صاحب مرحوم کو پیش کرنے اور ایک خاص ماحول میں لا کھڑا کرنے کی بیجا اور بے جا خواہش کی بنا پر یہ تحریر کچھ سے کچھ ہو جائے تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں ہم دونوں کا اصل میدانِ عمل دارالمصنفین ہی رہا، اس لیے اس چمن کی روداد کے بغیر شاہ صاحب کھڑے نظر نہیں آسکتے تھے، ان کے ذاتی حالات اور علمی کارناموں کے سلسلہ میں سید صاحب مولانا مسعود علی ندوی نیز دارالمصنفین کے اور دوسرے خدمت گذاروں کے ذکر کے ساتھ اس ادارہ کی اور بہت سی باتیں ناگزیر طور پر قلم بند ہو جائیں گی، جو کچھ قلمبند ہو رہا ہے، اس کو زیادہ تر دارالمصنفین کے علمی اسٹیج پر جلوہ افروز رکھا گیا ہے، ان کے ساتھ مل کر دوسرے فرائض انجام دینے کے ذکر کرنے میں ناظرین کو کہیں میری خود ستائی اور خود بینی کا شبہ بھی پیدا ہو تو وہ مجھکو مطعون کر کے میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھ کو خود بینی کی لعنت سے محفوظ رکھیں، آمین،

شاہ صاحب کا خاندان شاہ صاحب کو اپنے نسب اور خاندان پر بجا طور پر فخر تھا کیونکہ وہ نویں صدی ہجری کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ حضرت احمد عبدالحق توشہ رودولوی کے خاندان سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، ان کے دادا شیخ داؤد ہندوستان کے فرمانروا سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) کے عہد میں بلخ سے

ہندوستان آئے، و وکچھ دنوں دہلی میں رہے، مگر جب سلطان علاء الدین خلجی نے ان کو ردولی ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں جگہ دی تو وہیں آکر سکونت پذیر ہوگئے، وہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ بھی تھے، ان کے صاحبزادے کا نام محمد عمر تھا، جو صلاح و تقویٰ سے آراستہ رہے، ان کے دو صاحبزادے تھے، ایک شیخ تقی الدین اور دوسرے شیخ احمد جن پر بچپن ہی سے نور باطن اور معرفتِ حق کا غلبہ رہا، پیر کی تلاش میں کچھ دنوں سرگرداں رہے، پھر پانی پت میں آکر حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے خلافت پائی، مگر سوزشِ عشقِ الٰہی اور طلبِ معرفت کا جذبہ اتنا غالب رہا کہ اولیاء اللہ کی تلاش میں مختلف مقامات کی سیاحت کی، سندھ، پنجاب، بنگال اور بہار بھی پہنچے، پھر ردولی آکر مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوکر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مجدد ہوئے، اس کو سب سے زیادہ فروغ ان ہی کی ذات اقدس سے ہوا، اور درویش صاحب تصرف، مظہر خوارقِ عادات و کرامات، صاحب ذوق و شوق و سکر و فقر و تجرید تسلیم کیے گئے، ایک سو آٹھ سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۶ھ میں وفات پائی، ردولی میں ان کا مزار اقدس اب تک مرجعِ خلائق ہے،

ان ہی کے خانوادہ سے شاہ صاحب تھے، نویں صدی ہجری سے اب تک ان کے خاندان میں بہت سے مشائخ اور بزرگانِ دین گذرے، اس لحاظ سے ردولی ایک مقدس قصبہ بنا رہا، شاہ صاحب کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا عبد الحلیم کو اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل تھی، خود شاہ صاحب کے نانا جناب شرف الدین صاحب اپنے زمانہ کے اچھے عالم تھے، حیدرآباد دکن حضور نظام کی ریاست میں ایک اچھے عہدہ پر فائز تھے، وہاں سے پنشن پانے کے بعد اپنے وطن ردولی ہی میں آخر وقت تک مقیم رہے،

وہ شاہ امداد اللہ صاحب کی کے مرید بھی تھے، اور مکہ معظمہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، ان ہی کی نگرانی میں شاہ صاحب نے بچپن میں تربیت اور ابتدائی تعلیم پائی، گاؤں کے ایک مولوی صاحب سے گلستان و بوستان پڑھی جس سے ان کی استعداد فارسی کی نشو ونما ہوئی

شاہ صاحب کے خاندان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی رقمطراز ہیں،

شاہ صاحب قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے اس نامور و بلند مرتبہ فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس نے دور آخر میں حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے عزت و شہرت حاصل کی مخدوم صاحب نویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ اور شیوخ طریقت میں سے تھے، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد تھے اور اس میں تو شبہ نہیں کہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو ان کی ذات سے نئی زندگی ملی، اس شاخ پُر ثمر میں ان سے بلند پایہ کوئی عارف و محقق نظر نہیں آتا، افسوس ہے کہ بیشتر اولیائے متقدمین اور شیوخ طریقت کی طرح انکے بھی حالات و ملفوظات کو قلمبند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، اور جب اس کا ارادہ کیا گیا تو اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ سوائے مشہور کرامات اور چند خاندانی روایات کے کوئی مواد نہیں مل سکا، ان ہی کے سلسلہ کے مشہور شیخ طریقت حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے جن کو دو واسطوں سے مخدوم صاحبؒ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، ان کے حالات و ملفوظات جمع کرنے کی کوشش کی جس کے اردو ترجمہ کی سعادت شاہ صاحب کے حصہ میں آئی، لیکن اس میں بھی وہ تفصیلات اور جزئیات نہیں ملتیں جن سے انکی شخصیت و مقام کا پورا اندازہ کیا جا سکے، لیکن بعض بزرگوں کا کوئی واقعہ اور ان کی

زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ کتابوں میں ایسا نقل ہو گیا ہے کہ ان کی شخصیت و مرتبہ پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے، میرے نزدیک ان کے فضائل و مناقب کے پورے دفتر کی قائم مقامی کرتا ہے، اور حقیقتاً کوزہ میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ منصور بچہ تھا، جو اس کی زبان سے انا الحق نکل گیا، یہاں تو اللہ کے ایسے بندے ہیں جو سمندر کے سمندر پی چکے ہیں، اور ڈکار نہیں لیتے، یہ جملہ تنہا انکی زندگی کے اصل جوہر اور ان کے مقام کی بلندی کو واضح کرتا ہے، یعنی عالی ظرفی، تحمل، استقامت اور دریا سے گذر جانا، اور دامن کو تر نہ ہونے دینا، (پرانے چراغ جلد اول)

مدرسۂ فرنگی محل کی تعلیم شاہ صاحب اپنے نانا صاحب اور اپنی خواہش پر عربی کی تعلیم پانے کے لیے لکھنؤ میں فرنگی محل کے مدرسہ میں داخل ہوئے، یہ مدرسہ اس وقت وہاں کے مشہور عالم مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی نگرانی میں چل رہا تھا،

شاہ صاحب اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی مولانا عبد الباری فرنگی محلی، فرنگی محل کے بانی ملا نظام الدینؒ کی اولاد میں تھے، اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الوہابؒ سے تعلیم پاکر قسطنطنیہ گئے، جہاں ایسے استاد سے تحصیل علم کی جو آگے چل کر شریف مکہ ہوئے، سنہ ۱۹۰۵ء میں فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ قائم کیا، جو ایسا مقبول ہوا کہ اس زمانہ کی ریاستوں میں سے نانپارہ، محمود آباد اور رام پور سے اس کو امداد ملتی رہی، اسی مدرسہ میں شاہ صاحب کا داخلہ ہوا، ان کے نانا جناب مولوی شرف الدین صاحب کو مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بڑی عقیدت تھی، وہ اس وقت تک ایک جید عالم کے ساتھ ایک مذہبی پیشوا اور اہم سیاسی رہنما بھی بن چکے تھے، سنہ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی تحریک میں حصہ لیا، سنہ ۱۹۱۰ء میں مؤید الاسلام کے صدر ہوئے، سنہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ہلال احمر کے رکن بنائے گئے،

۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی تاسیس کی، اور کانپور کی مسجد کے شہید ہونے پر جو تحریک چلی اس میں نمایاں حصہ لیا، مؤید الاسلام کا ایک وفد لے کر مانٹیگو کے پاس لندن گئے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۱۹ء میں علماء کی جماعت کے ساتھ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی، خلافت کی تحریک میں گاندھی جی کو اس کی تائید کرنے پر راضی کیا، ۱۹۱۹ء میں مرکزی خلافت کمیٹی قائم کی، اسی زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر بنائے گئے، ترک موالات کی تحریک میں ان کی شرکت کی وجہ سے بڑی جان پیدا ہو گئی، گاندھی جی کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کی وجہ سے گاؤکشی بند ہو جائیگی، ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں خلافت اور جزیرۃ العرب کی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اجمیر کی درگاہ کمیٹی کے رکن بھی تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بڑی دلچسپی رکھی، قادریہ سلسلہ سے تعلق تھا، ان کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی، جس میں جہانگیرآباد کی رانی، بارہ بنکی کے قدوائی اور علی گڑھ کے شروانی خاندانوں کے ارکین، خواجہ عبد المجید کی بیگم، اور بہن، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور سید جالب دہلوی وغیرہ سب ہی تھے، اسی طرح انھوں نے دین اور سیاست دونوں کو ملا رکھا تھا، ۱۹۲۶ء میں ان کی وفات ۶۰ سال کی عمر میں ہو گئی، استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات پر معارف میں بڑے غم انگیز شذرات لکھتے ہوئے اپنے انتہائی غم و الم کا اظہار اس طرح کیا،

"ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین و ملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہم رنگ شہدا تھے، ذاتی اخلاق، جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی، ان کے اوصاف گراں مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماویٰ اور تنگدستوں کے دستگیر تھے،

عبادت گذار، شب زندہ دار اور حق کے طلب گار تھے، ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علما ء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جد وجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، انھیں کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، (معارف جنوری ۱۹۲۶ء)

فرنگی محل اور شاہ صاحب کے خاندان سے جو تعلقات رہے، اس کی تفصیل مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اس تحریر سے معلوم ہوگی،

"فرنگی محل کے خاندان کے حضرت مخدوم صاحبؒ کے خاندان سے تقریباً ساڑھے تین سو سال کے تعلقات تھے، بانی درس نظامی استاد الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے، اور ان کے تعلق سے ان کے تینوں بھائی بھی سید صاحب کے دست گرفتہ اور وابستۂ دامن تھے لیکن ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید سہالوی، مخدوم صاحب کے سلسلہ میں قاضی گھاسی بن داؤد الہ آبادی سے بیعت تھے، اس وقت سے فرنگی محل کے علما، مخدوم صاحب سے نسب ونسبت کا تعلق رکھنے والوں کے ساتھ پیرزادوں اور صاحبزادوں کا سا معاملہ کرتے ہیں۔"

شاہ صاحب فرنگی محل کے مدرسہ میں داخل ہوئے تو مولانا عبدالباری ہی کی نگرانی میں رہے، جو ان کی بڑی سعادت اور خوش قسمتی تھی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی حضرت احمد عبدالحق توشہ، ردولوی کے روحانی کمالات سے بہت متاثر تھے، ان کے خاندان کے ہر فرد سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، اپنے صاحبزادے مولانا جمال میاں کی شادی اسی درگاہ کے سابق سجادہ نشین جناب شاہ حیات احمد صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے کی، شاہ صاحب اسی خاندان کے ایک

زد تھے، اس لیے فرنگی محل میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، اس زمانہ میں فرنگی محل کے مدرسہ کے مشہور مدرس مولانا عنایت اللہ تھے شاہ صاحب مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ ان کا بھی ذکر ضرور کرتے، وہ بھی حضرت شاہ احمد عبد الحقؒ کے بہت معترف تھے، شاہ صاحب اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب کبھی فرنگی محل گئے، وہاں کے لوگوں نے ان کو نذرانے پیش کیے، جو وہ بہت تکلف کے ساتھ قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے، یہ واقعہ برابر بیان کرتے کہ ایک مرتبہ وہ فرنگی محل گئے تو اس وقت مولانا عبدالباری کے بھتیجے اور ان کے جانشین مولانا قطب الدین عبدالوالی نے جو قطب میاں کے نام سے مشہور تھے، نذر پیش کی، انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کیا کہ ان کا یہ معمول نہیں، اور وہ اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے، قطب میاں نے فرمایا کہ یہ تو ہمارا حق ہے، اور آپ کو لینا پڑے گا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم وہ فرنگی محل کے مدرسہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں چلے آئے، یہاں سے فضیلت کی سند حاصل کی، وہاں تین سال رہے، ندوہ کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ، مولانا حیدر حسن، مولانا شبلی فقیہ اور مولانا عبدالسبحان دسنوی، مولانا عبدالودود اور مولانا عبدالرحمن نگرامی کا ذکر برابر کرتے، مولانا حفیظ اللہ اس زمانہ میں مہتمم تھے، مولانا حیدر حسن حدیث کا درس دیتے، مولانا شبلی فقہ پڑھاتے، مولانا عبدالودود معقولات اور مولانا عبدالرحمن نگرامی تفسیر پڑھانے میں مشہور تھے، شاہ صاحب مولانا عبدالرحمن نگرامی کے فضل وکمال، وسعتِ نظر، انکسار، اپنے شاگردوں سے محبت وشفقت اور خدا کے سوا ہر بڑائی سے نفرت کا ذکر برابر کرتے، مولانا عبدالسبحان ادب کے استاذ تھے، وہ ندوہ کی تعلیم سے جیسے ہی فارغ ہوئے، ان کو اور ان کے ہم درس مولوی ریاست علی ندوی کو سنہ ۱۹۲۴ء میں دار المصنفین بلا لیا گیا، اور ان کا ماہانہ وظیفہ پچیس روپیہ مقرر ہوا۔

شاہ صاحب کی پہلی شادی

شاہ صاحب کی شادی بہت ہی کمسنی میں ہوگئی تھی، شاید ۱۰ برس کے رہے ہوں گے کہ ان کی شادی ان کی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے ہوگئی تھی، جن سے ایک صاحبزادے شاہ داؤد احمد ہیں، وہ آج کل کراچی میں ہیں، ایک بچہ اور ایک بچی کے باپ ہیں، شاہ صاحب کے خسر جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب اکاؤنٹنسی کا امتحان لندن سے پاس کیے ہوئے تھے، وہاں سے آکر بھوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل ہوگئے تھے، شاہ صاحب کی پھوپھی کے انتقال کے بعد ان کی شادی گیا کی ایک متمول بیوہ سے ہوگئی تھی، وہ گیا ہی میں رہنے لگے تھے، وہیں ۱۹۶۱ء میں وفات پائی، حضرت شاہ احمد عبد الحق ردولویؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، ان کے سالانہ عرس میں ضرور شریک ہوتے، قوالوں کو بڑی فیاضی سے نذرانے دیتے، کبھی کبھی تو شیروانی اور اپنی گھڑی تک ان کو دیدیتے، شاہ صاحب ان کا ذکر خیر برابر کرتے رہتے، ان کے حالات خود اس طرح لکھے ہیں کہ ان کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونہ تھی، وہ حضرت مخدوم عبد الحق ردولوی قدس سرہٗ کی اولاد میں تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، وہ علی گڈھ کالج کے پرانے تعلیم یافتہ تھے، تہجد کی نماز تک کبھی ناغہ نہیں ہوئی، لندن کے قیام کے زمانہ میں بھی روزے نماز کی پابندی میں فرق نہیں آیا، اس زمانہ میں جب تک ذبیحہ کے متعلق پورا اطمینان نہ ہوجاتا گوشت نہ کھاتے تھے، سبزی اور انڈے پر ہی قناعت کرتے تھے، پہلی جنگ عظیم چھڑنے کے بعد ایڈن جہاز سے واپس آرہے تھے، جس کو جرمنی نے تارپیڈو کر دیا تھا، اس کے جو مسافر بچ گئے تھے، ان میں ایک شاہ صاحب بھی تھے، انھوں نے کل سامان چھوڑ کر صرف کلام مجید ساتھ لے لیا تھا، انھوں نے معمولی حیثیت سے ترقی کی اور بڑی دولت پیدا کی اور فیاضی کر ان کو مذہبی و ملی کاموں اور غریبوں اور مسکینوں پر صرف کیا، ان کے ... کوئی مستق

واپس نہ جاتا تھا، اہم کاموں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیدیتے تھے خواجہ کمال الدین مرحوم کو کلام مجید کے جرمن ترجمے کے لئے دس ہزار روپیہ دیے تھے، تحریک خلافت کے زمانہ میں خلافت کمیٹی اور اس کے لیڈروں کی بھی مدد کرتے رہے، اس زمانہ میں ترکوں کی مدد کے لیے ہندوستان میں جو انگورہ فنڈ قائم ہوا اسکے پُرجوش معاون تھے، مسلم یونیورسٹی سے بڑا تعلق تھا، کئی سال تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے اسکے علاوہ اور ہر قسم کے دنیاوی اعزازت سے انھوں نے ہمیشہ دامن بچایا، بہت سے غریب گھرانے ان کی ذات سے پرورش پاتے تھے، مگر خود انکی زندگی بڑی سادہ اور دوسروں کے لیے نمونہ تھی، (معارف فروری ۱۹۶۰ء)

شاہ صاحب کے والد مرحوم | شاہ صاحب کے والد مرحوم جناب ابوالحسنات صاحب کو انکی جوانی ہی میں خلل دماغ کا مرض ہوگیا تھا، جو انکی وفات تک قائم رہا، شاہ صاحب سے چھوٹے انکے بھائی شاہ امام احمد صاحب تھے، انھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی

شاہ صاحب اپنی والدہ مرحومہ کا ذکر بہت والہانہ انداز میں کرتے،

شاہ صاحب کی ازدواجی زندگی | انکی پہلی اہلیہ شادی کے بعد مشکل سے پانچ چھ سال زندہ رہی ہوں گی کہ اللہ کو پیاری ہوگئیں، انہی کی مفارقت کے غم میں ۵۔۶ سال تک شادی نہیں کی۔

ان کی والدہ نے بہت اصرار کرکے ان کا دوسرا نکاح ردولی ہی میں جناب منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی سے کر دیا۔ ان سے ایک لڑکی ... غوثیہ سلمہا ہیں، جو شاہ مصطفیٰ احمد مرحوم کے نواسے اور چودھری سرفراز احمد مرحوم کے صاحبزادے چودھری محمد اویس صاحب سے بیاہی گئی ہیں، اور ماشاء اللہ کئی بچوں کی ماں ہیں، اپنے رئیس شوہر کے ساتھ فارغ البالی کی زندگی سے مالا مال ہیں،

ردولی کے عرس سے استفادہ | شاہ صاحب بچپن سے حضرت مخدوم عبد الحقؒ کے عرس کے موقع پر وہاں کی محفل سماع میں شرکت کرتے رہے، گو جب دارالمصنفین آئے تو اس میں ان کی شرکت کم ہونے لگی، مگر یہاں وہ برابر اس محفل کا ذکر کرتے اور کہتے کہ ایسی مہذب، مودب اور باوقار محفل

کہیں اور نہیں ہوتی، قوال اس میں زیادہ تر فارسی کی بہت اونچی نعتیں اور غزلیں پڑھتے ہیں، جو بہت ہی ادب کے ساتھ سنی جاتیں، وہ لکھتے کہ ان کے ذوق شعری اور فارسی شاعری سے لگاؤ ان ہی محفلوں سے ہوا، اس کی تائید مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی اپنے مضمون میں یہ لکھ کر کی ہے کہ ان محفلوں کا اثر ان کی طبیعت میں آخر آخر تک رہا، انھوں نے کئی بار فرمایا کہ اچھے اشعار کا یاد رہ جانا، اور فارسی اور اردو کلام کا پاکیزہ ذوق سماع کی ان ہی محفلوں کا فیض ہے،

اسی فیض کی بدولت ان کو جامی اور فرید الدین عطار کی نعتوں کے بہت سے اشعار یاد تھے، جو ان کو سفر حج کے موقع پر بہت کام آئے۔

شاہ صاحب کی مضمون نگاری

وہ دار المصنفین آئے تو ان کی دبی ہوئی علمی اور ادبی صلاحیتیں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی اور صحبت میں خوب ابھریں، حضرت سید صاحب تربیت دینے کے سلسلہ میں نئے رفقاء سے معارف کے لئے اخبار علمیہ لکھواتے عربی اور انگریزی جرائد کے اچھے مضامین کے ترجمے یا تلخیص کراتے، یا کتابوں پر ریویو اور تقریظ لکھنے کو کہتے، شاہ صاحب نے بھی شروع میں معارف کے لیے یہ سب کچھ کیا، اسکے علاوہ ان کا قیام دار المصنفین ہی کے احاطہ میں رہا، جہاں ان کی نظروں کے سامنے حضرت سید صاحب برابر جلوہ گر رہے، ان کے شاگرد غیر شعوری طور پر محسوس کرتے کہ ان کے آفتاب علم کی شعاعیں برابر ان پر پڑ رہی ہیں، اور ان کے ذہن و دماغ میں علمی گرمی اور حرارت پہونچ رہی ہے، حضرت سید صاحب کا دستور یہ بھی تھا کہ کتب خانہ کے اندر، پھر کھانے اور چائے پر اپنے شاگردوں کو بہت ہی وزن، وقار اور اختصار کے ساتھ مخاطب کرتے، جس میں محبت اور لینیت کے ساتھ علم و فن کی عشوہ گری بھی ہوتی، انکی علمی کرامت یہ تھی کہ دو چار جملوں میں اپنے شاگردوں کے ذہن کے بند دریچے کھولدیتے

پھر زیادہ استفسار کرنے یا کریدنے کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ یک محسوس ہوتا کہ جو کچھ معلوم نہ تھا، اب معلوم ہوگیا ہے، اور تاریکی میں روشنی پھوٹ پڑی ہے، شاہ صاحب نے سید صاحب کے اس انداز تربیت سے پورا استفادہ کیا، اپنے استاد محترم کی نگرانی میں قلم پکڑا تو صاحب قلم ہونے کے مدارج تیزی سے طے کرنے لگے، انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں معارف کے لیے اخبار علمیہ بھی لکھے، مضامین کی تلخیص بھی کی، ترجے بھی کیے، اس زمانہ میں عرب کی جو مختلف حکومتیں جہاں جہاں تھیں ان پر عربی میں ایک کتاب آئی تھی، حضرت سید صاحب کی فرمایش پر معارف کے لیے اس کی تلخیص کرتے رہے جس کا سلسلہ کئی برسوں تک چلا، یہاں تک کہ یہ ایک کتاب بن گئی، اس کا ذکر آگے آئیگا۔

باقیات فانی پر تقریظ ان چیزوں کے علاوہ شاہ صاحب کی پہلی جاندار تحریر باقیات فانی پر تھی، جو مئی ۱۹۲۷ء کے معارف کے باب التقریظ والانتقاد میں شایع ہوئی، دار المصنفین میں آئے ہوئے ان کو ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، ان کی علمی زندگی کا ابتدائی دور تھا، گویا قلم پکڑنا سیکھ رہے تھے، مگر باقیات فانی پر جو تقریظ لکھی اس کو آج بھی جب کہ اردو میں تنقید نگاری کا فن بہت آگے جا چکا ہے، کوئی پڑھے گا، اور اسکو یہ نہ بتایا جائے کہ اس کے لکھنے والے نے اپنی عمر کے کس حصہ میں اس کو لکھا تھا تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ یہ کسی کہنہ مشق نقاد اور اہل قلم کی لکھی ہوئی ہے، اس میں ادب کی ایسی گل کاریاں بھی ہیں، جن کی شامہ نوازی آج بھی ہو سکتی ہے، مثلاً اس تحریر کے شروع میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے کچھ حصے یہ ہیں،

"آزاد، حالی اور اکبر شاعری کی دوسری صنفوں کو مثلاً قصائد، قطعات، رباعیات کو قدیم طرز کے تنگ کوچہ سے آزاد کرکے جدید طرز شاعری کے وسیع میدان میں لے آئے، مگر غزل میں آکر یہ بوڑھے بھی اپنے

عشق و محبت کی قدیم داستانوں کو نہ بھلا سکے، اور اپنی جوانی کی روداد حسن و عشق کے اظہار میں کوئی تاویل، تحریف اور تغیر مناسب نہ سمجھی، نوجوان اقبال نے جدید تعلیم و خیالات کے زور سے اپنے لئے نیا راستہ نکالا اور یکہ و تنہا اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اپنا سفر شروع کر دیا، غزل کی دنیا میں انقلاب در حقیقت حسرت نے پیدا کیا، اگر وہ قید خانہ کی بےکاری میں کام پیدا کرنے کے لیے شاعری نہ کیا کرتے تو ان کی اولیت کے نمبر کو کوئی مٹا نہیں سکتا تھا، جوہر کا حال ان سے مختلف رہا، ان کو زلیخائے شاعری کا دیدار زندان یوسف ہی میں نظر آتا رہا جب باہر آئے، تو مصر قومی کے قحط کے بندوبست سے ان کو فرصت نہ ملی، حسرت کے بعد عزیز، فانی، اصغر اور جگر نے موسم کے اس تغیر کو بالکل نمایاں کر دیا، اور غزل کی زمین پر پرانے گل و ریاحین کے بدلے نئے نئے رنگ اور نئے نئے پھول کھلائے، اس دور کے خیالات جو ابھی تک درجہ تکوین میں ہے پچھلے دور سے جو ختم ہو چکا، بالکل مختلف ہیں، اصطلاحات، محاورات اور زبان و طرز ادا میں غیر معمولی فرق پیدا ہے"،

کیسی دلآویز تحریر ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لکھنے والے کی پہلی کوشش ہے اور ابھی وہ لکھنے کی تربیت حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے،

اسی باقیات فانی میں اردو شاعری پر مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ۳۰ صفحے کا ایک مبسوط ریویو ہے، اس میں انھوں نے فانی اور غالب کا موازنہ بھی کیا تھا، جس سے شاہ صاحب کو اتفاق نہ تھا، اس پر وہ بہت ہی خوبصورت انداز میں یہ تبصرہ کرتے ہیں،

"غالب کے گلاب آمیز بادہ کو فانی کی سوڈا واٹر ملی ہوئی شراب سے کوئی مناسبت نہیں، فانی کے صرف دس پانچ اشعار ایسے مل سکتے ہیں جو غالب کے اشعار کے مقابل میں پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن غالب کے بیسیوں اشعار ایسے ہیں کہ فانی کا خیال وہاں تک بشکل پہونچ سکتا ہے"

یہ تبصرہ ایسا ہے جس سے آج کا بڑے سے بڑا نقاد اختلاف نہیں کر سکتا ہے، شاہ صاحب رشید احمد صاحب کی خوبیوں کے بڑے معترف رہے، ان کے چھوٹے بھائی نیاز احمد صدیقی ان کے ہمراز اور دمساز تھے، لیکن انھوں نے ان تعلقات کا خیال کئے بغیر رشید صاحب کی تنقید نگاری پر اس بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔

"وہ صرف ایک خاص قسم کے خیالات کی تعبیر و ادا کے لیے موزوں ہیں، سنجیدہ ظریفانہ مضامین کے طرز خاص کے موجد ہیں، اور اس بزم میں ان کے یہ قہقہے محفل میں رونق پیدا کرتے ہیں، مگر فلسفیانہ اور ٹھوس خیالات ان کے قہقہوں کی گونج میں منتشر ہو جاتے ہیں، بہرحال وہ سرو دبستان ہے، امید ہے کہ یہ سرود بعض سرمستوں کی یاد دہانی کا فرض ادا کر دے گا"

اس میں جناب جگر مرادآبادی کی بھی ایک تحریر فانی کی شاعری پر تھی جو شاہ صاحب کو پسند نہیں آئی، اس کے ہلکے پن کو انھوں نے یہ لکھ کر ظاہر کیا،

تیسرے حصہ میں جناب جگر مرادآبادی کا ۱۰ صفحے کا تبصرہ ہے، ہمارے خیال میں یہ حصہ بالکل غیر ضروری تھا، نقاد شاعر نے خود بھی اس کلیہ کو سمجھ لیا ہے کہ ہر شاعر کا نقاد ہونا ضروری نہیں،

اس کے بعد فانی کی شاعری پر طویل تبصرہ ہے، جس کا خلاصہ شاہ صاحب کے الفاظ میں

اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، (۱) کہ مرنے کے بعد خاک عاشق کا دامن یار سے لپٹ کر دل کی بھڑاس نکالنا ایک پامال مضمون ہے، جس کو سیکڑوں شعرانے نظم کیا ہے، لیکن فانی کی ندرت سے ان کو کوئی نسبت نہیں، ان کی خاک بھی دامن یار سے لپٹی ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں احترام حسن کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے، خاک عاشق کی گستاخ دستی پر یار کی عتاب آلود نگاہ پڑ جاتی ہے، ذرہائے خاک میں احساس تقصیر پیدا ہوتا ہے، اور وہ حالت فنا میں بھی کانپ اٹھتے ہیں، (۲) خزاں کی بربادیوں اور بہار کی رنگینیوں کے مناظر شعرا کے یہاں بہت دیکھے گئے، لیکن فانی کی تعبیر نے جو بہار پیدا کر دی ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، ان کے یہاں خزاں اور بہار صرف معشوق کی دو مختلف کیفیتوں کے مظاہر ہیں (۳) آہ دنالۂ عشاق کا کارگر حربہ ہے کہ اسی کے اثر سے محبوب مشق ستم چھوڑ کر مائل بہ کرم ہو جاتا ہے، لیکن اسی غم خوار عشاق کی تاثیر فانی کے یہاں سرمایۂ انفعال و ندامت بن جاتی ہے، اور اس کے بدولت کرم تو کجا لطف ستم بھی چھن جاتا ہے، (۴) شعرا عموماً ہجر کے مصائب و عشق کی نامرادیوں سے تنگ آکر موت سے مصائب کا خاتمہ چاہتے ہیں لیکن فانی کا عشق ان سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے، ان کے یہاں عشق میں مرنا شہادت کا ہم پایہ اور کسی کی یاد میں جان دینا خدا کی راہ میں کام آنے کے برابر ہے (۵) فراق کی راتوں میں دل کی تڑپ کا مضمون شعرا نے مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے، لیکن فانی کی تڑپ سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، ان کے یہاں ہر درد و ہر کرب کی آخری حد یہ ہے کہ سکون ہو جائے، اس لئے انتہائی اضطراب کے بعد سکون لازمی ہے، لیکن فانی اس سکون کو سکون ہی نہیں مانتے، بلکہ اضطراب کی دوسری شکل سمجھتے ہیں، (۶) رشک کی یہ صورت شاید پہلی دفعہ فانی کے ذریعہ سے دنیا میں ظاہر ہوئی کہ عاشق نگاہ و التفات کا پیاسا موجود ہے، معشوق آئینہ خانہ میں

حسن و جمال کی رعنائی دیکھتا ہے، ساتھ اسکو یہ بھی خیال آتا ہے کہ عاشق کو میرے عکس سے رشک نہ آجائے کہ وہ حیرت سے مجھکو تک رہا ہے، اس لئے فوراً عاشق کے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے کہ اس کے جذبۂ رشک کا اندازہ لگائے (۸) معشوق کے ہاتھوں عاشق کا قتل اور اس قتل بے گناہی کا قصاص، روز محشر پر اٹھا رکھنا ایک عام بات ہے، لیکن فانی دنیا ہی میں انتقام اور زبردست انتقام لینے کے حامی ہیں، (۹) کلیم اور طور کا واقعہ شعراء کا خاص موضوع ہے، لیکن فانی عام شعراء کے برخلاف یہ دکھاتے ہیں کہ طور پر ذات کی تجلی نہ تھی، صفات کی جلوہ آرائی تھی، (۹) برق و نشیمن کی چشمک بہت قدیم ہے، لیکن فانی نے ہوس تعمیر ہی کو برق سے تعبیر کیا ہے، (۱۰) شاعری میں چاک گریبانی عام چیز ہے، لیکن فانی اسکو چاک تعبیر نہیں کرتے بلکہ گریبان کا دامن سے گلے ملنا کہتے ہیں (۱۱) فانی کی شاعری محض عشق کے جذبات لطیفہ تک محدود نہیں بلکہ اس میں اخلاق و تصوف کے حکیمانہ اور نازک مسائل ہیں، وحدت الوجود کو انھوں نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے سمجھایا ہے، ان کی شاعری میں خودداری کا بھی پیام ہے، (۱۲) اگرچہ فانی کا رنگ یاس و ناکامی ہے، جس میں شوخی کی زندہ دلی کو بار نہیں، تاہم ان کا کلام اس سے خالی بھی نہیں (۱۳) ان کے یہاں زبان کی بھی حلاوت ہے، بندش و ترکیب کا حسن بھی ہے، دل وفا خراب، اشک اندازہ دامن، اور نالۂ خموش مسلسل وغیرہ جیسی نئی ترکیبیں بھی ہیں (۱۴) ان کا خاص رنگ سوز و گداز اور خستگی دل ہے، اس سے مطلب نالہ و شیون یا مرثیہ و ماتم نہیں، بلکہ درد آشنا دلوں کی وہ واردات ہیں جو سامع کے دل پر بھی وہی تاثرات طاری کر دیتی ہیں، جنھوں نے ان کے قلب کو بیک حسرت کدہ بنا دیا تھا، اس خلاصہ سے اصل متن کی ادبی رنگینی، تحریر کی شگفتگی اور تنقیدی ژرف بینی کا اندازہ ہوگا،

یہ تقریظ اس وقت شایع ہوئی تھی جب خود فانی زندہ تھے،

وہ اس سے ضرور محظوظ ہوئے ہونگے، اور یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک فانی کی شاعری پر اتنا متوازن اور سیر حاصل تبصرہ شائع نہیں ہوا تھا، اور جس بہتر ادبی پیرایہ میں یہ لکھا گیا ہے، اس کی داد آج بھی مل سکتی ہے، دبستان شبلی کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اس کی طرف سے شعر و ادب پر تنقیدیں شایع ہوتی ہیں، تو ہر دعوی کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے، آج کل کے نقادوں کی طرح کوئی ایسی بات نہیں کہی جاتی ہے کہ ان کے ناظرین اسکو اس لئے صحیح سمجھیں کہ وہ کہہ رہے ہیں، شاہ صاحب نے اوپر جتنی باتیں کہی ہیں، ان کو خود فانی کے اشعار نقل کرکے باوزن بنایا ہے، اس طرح اسکے انداز بیان اور فانی کی شاعری میں حقائق کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، مگر شاہ صاحب برابر اس کو اپنے ابتدائی دور کی ایک کوشش سمجھتے رہے، اس لئے اس کی اہمیت ان کی نظر دن میں زیادہ نہیں رہی، اور جب انھوں نے اپنے ادبی مضامین کا ایک انتخاب "ادبی نقوش" کے نام سے مرتب کیا تو اس میں اس تقریظ کو شامل کرنا پسند نہیں کیا، شاہ صاحب کی اس ادبی اٹھان کو دیکھ کر دارالمصنفین کے کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ان کو صرف شعروادب پر مضامین اور کتابیں لکھنے کیلئے مخصوص کردیا جائے، اور ادبی کتابیں لکھوانی چاہئیں، لیکن حضرت سید صاحب شعروادب سے متعلق تحریروں کو علمی دسترخوان کی محض چٹنی قرار دیتے تھے، جو ان کے نزدیک صرف ذائقہ بدلنے کے لئے تو ٹھیک ہے، مگر اس کو علمی دسترخوان کے سنگین کھانوں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے، اسی لئے شاہ صاحب کی علمی زندگی کا رخ بدل گیا،

شاہ صاحب نے اگست ۱۹۲۵ء کے معارف میں صراط الحمید پر بھی ایک تقریظ لکھی، یہ جناب محمد الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے حج کا سفر نامہ تھا،

انوار العیون فی اسرار المکنون کا اردو ترجمہ
۱۹۲۰ء میں شاہ صاحب نے اپنے جد امجد شیخ العالم مخدوم شیخ احمد عبد الحق صاحب توشہؒ کے ملفوظات انوار العیون فی اسرار المکنون کا اردو ترجمہ اپنے ایک بزرگ جناب عزیز احمد احمدی صاحب کی فرمایش پر کیا، اس مجموعہ کو حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے مرتب کیا تھا۔ جو حضرت احمد عبد الحقؒ کے پوتے جناب شیخ محمد بن محمد عارف سے بیعت اور شیخ احمد عارف کے داماد تھے، ان کو حضرت احمد عبد الحق صاحبؒ سے غیر معمولی عقیدت رہی، اس لیے انھوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا، جو گو حضرت احمد عبد الحقؒ کی وفات کے تقریباً دو سو ۲۰۰ سال بعد قلمبند کیا گیا، مگر یہی ان کے حالات، مناقب اور تعلیمات کا مستند ماخذ ہے، عام مجموعۂ ملفوظات کی طرح اس میں بھی بہت کچھ اغلاق اور ابہام ہے، جس کا سمجھنا آسان نہیں، اس لئے اردو میں اس کے ترجمے کی ضرورت تھی، شاہ صاحب نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا، اور اس کا ترجمہ تھوڑی مدت میں کرکے اپنے بزرگ جناب عزیز احمد احمدی کے سپرد کر دیا، جس کو انھوں نے معارف پریس ہی میں چھپوایا، شاہ صاحب کی عالی ظرفی اس ترجمہ میں اس حیثیت سے ظاہر ہوئی کہ انھوں نے مترجم کی حیثیت سے اس میں کہیں اپنا نام نہیں آنے دیا ہے، لیکن راقم سطور کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ترجمہ ان ہی کا کیا ہوا ہے،

اسی سال اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مہاجرین حصہ اول دار المصنفین کی طرف سے شایع ہوئی جس کی تکمیل میں شاہ صاحب کا بھی حصہ رہا۔

مہاجرین حصہ اول کی تکمیل شاہ صاحب کے آنے سے پہلے ان کے ہمنام حاجی معین الدین احمد ندوی کا قیام بھی کچھ دنوں دار المصنفین میں رہا، وہ پٹنہ ضلع کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے، مگر استھانواں ضلع پٹنہ میں آباد ہو گئے تھے، دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے پہلے تو

خلفائے راشدین لکھی جو دارالمصنفین کی مقبول مطبوعات میں سے ہے، پھر وہ مہاجرین حصہ اول کے لکھنے میں مشغول ہوئے، مگر اس کو ختم کرنے سے پہلے ان کو رام پور کے کتب خانہ میں وہاں کی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کے لئے بلا لیا گیا، وہ وہاں چلے گئے، تو مہاجرین حصہ اول نامکمل رہ گئی، سید صاحبؒ اس وقت تک شاہ صاحب کی تصنیفی صلاحیت سے مطمئن ہو چکے تھے اس لئے ان کو اس کے بقیہ حصہ کو مکمل کرنے کو کہا، ان ہی کے حکم سے شروع میں ۳۰ صفحہ کا ایک بہت ہی فاضلانہ مقدمہ لکھا، اگر ان کے بجائے یہ مقدمہ حضرت سید صاحب کے نام سے شایع کر دیا جاتا، تو اس کے محققانہ رنگ کی وجہ سے کسی کو بھی شبہہ نہ ہوتا کہ یہ مقدمہ ان کا نہیں ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو اختصار سے یہاں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ شاہ صاحب کی جو ابتدائی علمی و تحقیقی اٹھان تھی وہ بھی سامنے آجائے۔

اس میں مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف قبیلوں اور خانوادوں کی تاریخ ہے، جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے شروع ہوتی ہے، اس کے تین دور کئے گئے ہیں، پہلے دور میں حضرت اسمٰعیلؑ سے عدنان تک کے مختصر حالات ہیں، دوسرے دور میں عدنان سے فہر تک کی تفصیلات ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ اور عدنان کے درمیان تقریباً چالیس پشتیں تھیں، عدنان کے مختلف قبائل کا ذکر کر کے ان کی تجارت، مذہب اور خانہ جنگیوں پر اجمالی تبصرہ ہے، ان کے مذہب کو حضرت ابراہیمؑ نے پاک صاف کر کے توحید کی تعلیم دی مگر چند ہی پشتوں کے بعد ان میں بت پرستی رائج ہو گئی جو تمام عرب میں پھیل گئی۔

اس کے بعد قریش کی تاریخ بہت تفصیل سے لکھی گئی ہے، قبیلہ قریش اور چھوٹے چھوٹے دس خانوادوں پر مشتمل تھا، جو سب کے سب فہر کی نسل سے تھے، فہر کے تین لڑکے تھے،

محارب، حارث، غالب، محارب اور حارث کی نسل زیادہ نہ پھیلی، مگر حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح فاتح بیت المقدس، عقبہ بن نافع فاتح افریقہ اور عبد الملک بن قطبی والی اندلس وغیرہ بنو حارث ہی سے تھے، البتہ غالب کی اولاد بہت پھلی پھولی، اس میں سے حسب ذیل خانوادے زیادہ مشہور ہوئے، اکابر صحابہ کن کن قبیلوں سے تھے، وہ ان پر نظر ڈالنے سے سامنے آجائیں گے

(۱) بنو ہاشم، رسول اللہ صلعم اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ، حضرت حمزہؓ اور آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ وغیرہ اسی قبیلہ سے تھے،

(۲) بنو تیم۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عمرؓ بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہؓ بن جدعان کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا،

(۳) بنو عدی، حضرت عمرؓ بن خطاب اور سعید بن زیدؓ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

(۴) بنی عبد دار میں حضرت عثمانؓ بن طلحہ اور مصعبؓ بن عمیر تھے،

(۵) بنی اسد سے حضرت زبیر بن عوام، ورقہ بن نوفل اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ تھیں،

(۶) بنو مخزوم سے خالدؓ بن ولید، عیاشؓ بن ربیعہ، ابو جہل، ام المومنین سلمہؓ تھیں،

(۷) بنو جمح سے صفوان بن امیہ اور محذورہؓ (موذن نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تھے،

(۸) بنو امیہ سے حضرت عثمانؓ، امیر معاویہؓ اور ابو سفیانؓ وغیرہ تھے،

(۹) بنو سہم سے عمروؓ بن العاص فاتح مصر تھے،

شاہ صاحب اس کی طرف بھی ذہن منتقل کراتے ہیں کہ عام عربوں کی طرح یہ قریش بھی سخت جنگجو تھے، ان کے یہاں بات بات پر تلواریں نکل آتی تھیں، ان کی بہت سی لڑائیاں مشہور ہیں، ان ہی میں اصحاب فیل کا واقعہ ہے، حرم کعبہ کی تولیت کے لیے قریش، کنانہ، خزاعہ اور قضاعہ میں دو ہولناک لڑائیاں ہوئیں، خانہ کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں

جو خونریز جنگ ہونے کو تھی، اسکو انھوں نے آنحضرؐ صلعم کو آپ کی بعثت سے پہلے حکمیت مان کر روک دیا، پھر حرم کی تولیت اور ان کے انصرام و انتظام کے لئے جو کچھ کیا گیا تھا، اس کی تفصیل بتاتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ قصی نے حرم کی تولیت لے کر ایک چھوٹی سی جمہوریت قائم کی، جو باہمی مشورے سے چلتی تھی، اس سے قریش کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوا، قصی نے علیحدہ علیحدہ فوجی، عدالتی اور مذہبی نظام کے ذریعہ سے بہت سے عہدے قائم کئے، ان میں خانہ کعبہ کے مذہبی نظم و نسق کو زیادہ اہمیت دی، حج کے موقع پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہوتا تھا، اس سے بڑی آمدنی ہوتی تھی، لاکھوں روپیے نقد اور جنس کی صورت میں جمع ہوتے تھے، اس انتظام میں تمام قبائل کو شریک کیا گیا، خانہ کعبہ کی نگرانی اور حج کے موسم میں حاجیوں کو پانی پلانے کا کام بنو ہاشم کے سپرد کیا گیا، حجاج کے خورد و نوش وغیرہ کا انتظام بنو نوفل کو دیا گیا، خانہ کعبہ کی کلید برداری بنو عذرا کو حاصل تھی، خانہ کعبہ میں کچھ تیر رکھے ہوئے تھے، ان سے ضرورت کے وقت استخارہ کیا جاتا تھا، اس کی حفاظت کی خدمت بنو جمح کو دی گئی، کعبہ کے بتوں کے لئے جو مال یا جائداد وقف کی جاتی اس کی نگرانی بنو سہم کے متعلق تھی، اہم کاموں کے مشورہ کے لیے قریش ایک عمارت دارالندوہ میں جمع ہوتے، جو خانہ کعبہ کے بالمقابل اس غرض سے تعمیر کی گئی تھی کہ مشورہ میں بنو اسد کی رائے لینی ضروری تھی، انسداد ظلم کے لئے بھی ان کے یہاں ایک انجمن تھی، یہ تمام تر معلومات ایسی ہیں جو شاید اردو میں پہلی دفعہ پیش کی گئیں،

پھر قریش کے مذہب کا ذکر خاص انداز میں کیا گیا ہے، جو اگرچہ ابراہیمی تھا لیکن ان میں اصنام پرستی اس قدر پھیل گئی تھی کہ دین حنیف کے خد و خال بالکل دھندے رہ گئے تھے، . . . . قریش کے مخصوص بت اساف اور نائلہ چاہ زمزم

کے پاس نصب تھے، وہ ان کے پاس قربانی کیا کرتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ یہ قبیلہ بنو جرہم کے مرد و عورت تھے، لیکن بعض گناہوں کے باعث پتھر ہو گئے، لات بنو ثقیف کا بت تھا قریش اور کنانہ بھی اس کی پوجا کرتے تھے، اس کی تاریخ یہ ہے کہ لات مکہ میں ایک پتھر تھا جس پر حجاج کے لئے ستو گوندھا جاتا تھا، اسی نام کا ایک شخص بنی ثقیف میں تھا، وہ مر گیا تو لوگوں کا خیال ہوا کہ وہ مرا نہیں بلکہ صنم پتھر میں گھس گیا ہے، اس وہم سے اس کی پرستش شروع ہو گئی، عزیٰ بنو غطفان کا بت تھا، مگر قریش بھی اس کی پرستش کرتے تھے یہاں قربانیاں کی جاتی تھیں، منات بنو خزاعہ اور ہذیل کا بت تھا، قریش اس کی بھی پوجا کرتے، ان کا اعتقاد تھا کہ لات عزیٰ اور منات خدا کی بیٹیاں ہیں، جو قیامت کے دن ان کی سفارش کریں گی، ان میں سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو خانہ کعبہ کے عین وسط میں نصب تھا اور بہت معزز ہلانا جاتا، یہ سنگ سرخ کا انسانی مجسمہ تھا، اس کے سامنے انسان کی بھی قربانی کی جاتی، خانہ کعبہ کے اندر اور بت بھی تھے، جن کی تعداد ... تین سو ساٹھ تھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی بھی وہاں مورتیں تھیں، حج کے موقع پر طرح طرح کی بدعتیں رائج ہو گئی تھیں مثلاً خاموش حج کرتے، منہ سے نہ بولتے ایک شخص دوسرے کو لگام لگا کر گھسیٹتا ہوا طواف کراتا تلبیہ میں خدا کے نام کے ساتھ بتوں کے بھی نام لیتے اس بت پرستی کے ساتھ ان میں شراب خوری، قمار بازی، دختر کشی، عیاشی اور اوہام پرستی بکثرت رائج تھیں مگر وہ اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے،

اس زمانہ میں تجارت کی بڑی اہمیت تھی اس لئے شاہ صاحب اس کی پوری تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قریش زراعت کو عار سمجھتے ان کے تجارتی قافلے ملکوں ملکوں پھر کر بیوپار کرتے تھے، ان کی تجارت بہت ہی بااصول اور منظم تھی گو رہزنی اور لوٹ مار عام تھی مگر قریش کے کاروان تجارت سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا

اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش حرم کے متولی ہونے کی وجہ سے، جیران اور خدا کے پڑوسی کہلاتے تھے، اور ان کا بہت احترام کیا جاتا، آگے چل کر جو بڑے بڑے صحابہ ہوئے وہ بھی تجارت کیا کرتے تھے، عرب کی دس تجارتی منڈیاں تھیں اُن میں قریش زیادہ تر بازار ذوالمجاز اور عکاظ میں شریک ہوتے۔

شاہ صاحب نے اس زمانہ کے شعر و ادب کا بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

شاعری اور زبان آوری کا مذاق تمام عرب میں تھا، قبیلہ مضر کی زبان زیادہ معتبر تھی مگر قریش زیادہ فصیح اللسان مانے جاتے تھے، ان میں بڑے بڑے باکمال شعرا پیدا ہوئے، خاص بنو ہاشم میں متعدد شعرا تھے، تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ رواج تھا، اگرچہ یہ عام نہ تھی تعلیم مردوں تک محدود نہ تھی، بعض عورتوں نے بھی تعلیم کی ان تمام تفصیلات کو لکھنے کا مقصد اس ماحول کو سامنے لانا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور اسلام کی تبلیغ کی گئی، شاہ صاحب نے اسلام کے ظہور کا ذکر جس طرح کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے، یہ انشاپردازانہ طرز ادا بھی ان کی تصنیف و تالیف کے ابتدائی دور کا نمونہ ہے، مگر اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ باوقار تحریر ان کے تصنیفی مستقبل کے روشن ہونے کی شہادت دے رہی تھی،

قریش بلکہ پورے عرب پر جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی کہ دفعۃً افق مکہ پر برق تجلی چمکی اور نور حق کا اجالا تمام عرب میں پھیل گیا، ابھی آفتاب رسالت کی کرنیں پھوٹی ہی تھیں کہ خیرہ چشموں کی آنکھیں تاب نظارہ نہ لاسکیں اور ہر چہار جانب سے ظلم و تعدی کے بادل امنڈنے لگے کہ نور حق کی روشنی کو تاریکی میں چھپا دیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کی ابتدا ہی کی تھی کہ ہر طرف مخالفت کے طوفان اٹھنے لگے، مگر سیل صداقت برابر پھیلتا گیا، یہاں تک کہ ریگستان عرب کو رشک گلزار بنا دیا، (ص ۳۱ - ۳۵)

اس کے بعد قریش نے رسول اللہؐ اور آپ کے پیرووں کے ساتھ جو ظلم و تعدی کی اس کا اجمالا

ذکر ہے، پھر حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت کی تفصیل ہے، جو مہاجر وہاں پہونچے ان کے نام بھی درج ہیں، مشرکین نے وہاں بھی پہونچ کر ان کے اخراج کی جس طرح کوشش کی اس کی بھی داستان ہے، اشاعت اسلام میں رسول اللہؐ کے مصائب لیکن آخر کامیابی کا ذکر مفصل طریقہ پر کیا گیا ہے، ہجرت مدینہ سے پہلے جن قبائل نے اسلام قبول کیا، اس کی بھی تفصیل ہے، اور جب قریش کے مظالم ناقابل برداشت ہو گئے، تو مدینہ میں جا کر مسلمان پناہ لینے لگے، جو مسلمان وہاں ..... ہجرت کرکے پہونچے اُن میں سے اکثروں کے نام بھی دیئے گئے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور مدینہ ہجرت فرما گئے، پھر فتح مکہ تک اس ہجرت کا جو سلسلہ جاری رہا، ان سب کی تفصیلات دی گئی ہیں،

آخر میں شاہ صاحب نے مہاجرین کے فضائل و مناقب کلام پاک اور احادیث کی روشنی میں دکھائے ہیں، جو گو ان کی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں لکھی گئی لیکن اس سے ان کی بالغ نظری کی نشان دہی ہوتی ہے، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ مہاجرین کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اسلام کی خدمت سے پہلو تہی نہ کرتے تھے، فاقہ پر فاقہ کرتے، مگر ان کی جانفروشیوں میں فرق نہ آتا، اس کے بعد رقمطراز ہیں:

" مہاجرین کی ایک نمایاں فضیلت یہ تھی کہ ان کا دامن نفاق کے داغ سے پاک و صاف تھا، اس لئے منافق وہ لوگ تھے، جو در پردہ تو اسلام کے دشمن تھے، مگر خوف سے اس کا اظہار نہ کر سکتے تھے، یا وہ تھے جو مال و دولت کی طمع میں مسلمان ہوئے تھے، یا وہ تھے، جو خوف سے اسلام لائے تھے، اور مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اسلام ان تینوں چیزوں کی آمیزش سے پاک تھا، اس لئے کہ

جب یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے اُس وقت اسلام بالکل ابتدائی
حالت میں تھا، نہ اس کے پاس مال وزر تھا، نہ قوت وحکومت تھی، بلکہ
اس زمانہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی جان اور مال خود خطرہ میں پڑ گیا
تھا، اس لئے ان کا اسلام خالصۃً للہ تھا،

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مہاجرین کی دوستی اور دشمنی دونوں کھلی ہوئی تھیں، وہ
وہ اس طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ نفاق انصار کے قبیلوں میں ظاہر ہوا اسی لیے مکی
سورتوں میں کہیں نفاق ومنافقت کا تذکرہ نہیں ہے، مدنی سورتوں میں اس کا بکثرت
ذکر آتا ہے،

یہ مقدمہ اس لئے قابل قدر ثابت ہوا کہ جب مہاجرین کی دو جلدیں دارالمصنفین
سے شایع ہوئیں تو اس مقدمہ کی روشنی میں مہاجرین اور انصار کے تعلقات کو سمجھنے میں
مدد ملی، آگے چل کر ان میں جو کشمکش اور آویزش پیدا ہوئی، تو اس مقدمہ کی روشنی
میں یہ پتہ چلانا آسان ہوگیا کہ کس کس موقع پر قبائلی تعصب سے اسلام کو نقصان پہونچا،
اور کہاں اسلام کی اصلی اور سچی تعلیمات سے ان نقصانات کی تلافی ہوتی رہی، اس
مقدمہ کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ گذر چکا ہے، لیکن اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے
اس کو پڑھ کر ناظرین محسوس کریں گے، کہ ان سے ان کے ذہن میں جلا، معلومات میں تازگی
اور ایمان میں حرارت پیدا ہوئی،

پہلے کہا گیا ہے کہ مہاجرین حصۂ اول کو جناب حاجی معین الدین صاحب ندوی
نامکمل چھوڑ گئے تھے، شاہ صاحب نے طویل مقدمہ لکھنے کے ساتھ اس میں حضرت
عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ دونوں کے حالات ۴۰ صفحے میں

لکھ کر مکمل کیا، اس طرح اس کتاب کے چار سو بیس صفحون میں ان کے لکھے ہوے صفحات کی تعداد ۲۶ ا ہے، حاجی معین الدین احمد ندوی ایک پختہ کار مصنف سمجھے جاتے تھے، شاہ صاحب نے جب مہاجرین اول مین جو کچھ اضافہ کیا، اسوقت وہ تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں بالکل مبتدی تھے، مگر اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے متعلق یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ شاہ صاحب کا لکھا ہوا ہے، توکسی کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوگا کہ یہ حاجی معین الدین صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے،

حضرت عبداللہ بن عباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، جب آپؐ نے اس دارفانی سے رحلت فرمائی تو وہ صرف سترہ برس کے تھے، مگر اس طفولیت کے زمانہ میں آپ کی عزت اور احترام کا جو نقش ان کے دل میں بیٹھا اس کی صحیح تصویر شاہ صاحب نے کھینچ دی، وہ لکھتے ہیں،

سعید بن جبیر تابعی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا پنجشنبہ کا دن، کون پنجشنبہ اتنا کہنے پائے تھے اور ابھی مبتدا کی خبر بھی نہ نکلی تھی کہ زارو قطار رونے لگے، اس قدر روئے کہ سامنے پڑے ہوئے سنگ ریزے ان کے آنسوؤں سے تر ہوگئے، ہم لوگون نے کہا ابو العباس پنجشنبہ کے دن میں کیا خاص بات تھی بولے اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری نے شدت پکڑی تھی،

اسی کے ساتھ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں ان کی شجاعت اور جانبازی، حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی آویزش میں ان کی اصابت رائے اور بصرہ میں ان کی گورنری، پھر مکہ میں آکر عزلت نشینی، کوفہ جانے سے پہلے امام حسین رضی اللہ عنہ کو صائب مشورہ دینے، قرآن پاک کی تفسیر وتاویل میں انکی مہارت

اور آیات قرآنی کے شان نزول اور ناسخ و منسوخ کے علم، ان کی وسعت نظر دقیقہ رسی اور قوت استنباط، حدیث کی روایات کو معلوم کرنے کی ذاتی کاوش و جستجو اور ان کو بیان کرنے میں احتیاط، حلقۂ درس میں ان کی مقبولیت، ان کی تقریر کی شیرینی اور معاصرین کا احترام وغیرہ کی مرقع آرائی شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اپنے ایمان میں حرارت پیدا کر سکتے ہیں،

اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی سیرت اور کردار کا بہت ہی جاندار نقشہ کھینچا ہے، جب وہ اسلام لاتے ہیں، تو شاہ صاحب اس کا ذکر اپنی تحریر کی شگفتگی کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں،

"ساقی توحید کے صلاے عام پر نزدیک والوں نے اپنے کان بند کر دیے تھے، لیکن تشنہ کامان حق دور دراز ممالک سے دشوار گذار منزلیں طے کر کے آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے، حضرت ابو موسیٰؓ یمن سے چل کر مکہ آئے اور بادۂ اسلام کے ایک ہی جام میں سرشار ہو گئے، وہ مکہ میں قبیلہ عبد شمس سے حلیفانہ تعلق پیدا کر کے پھر مراجعت فرمائے وطن ہوئے کہ اپنے اعزہ اور احباب کو بھی یہ مژدۂ جانفزا سنائیں،

(باقی)

حیات سلیمان

یہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی محض سوانح عمری ہی نہیں، بلکہ سید صاحب کے عہد کی تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں اور ان کے نتائج و اثرات کی بڑی ہی معلومات افزا تاریخ ہے، بہت ہی دلچسپ، دلآویز اور دلکش، اور اردو کے سوانحی ادب کے ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ۔

از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۔۔ ۲۲

امام ابوالحسن مدائنی

(اسلامی ہند کے پہلے مورخ)

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ، بمبئی،

(۲)

مدائنی مدائن میں کیوں گئے، کب گئے اور کتنے دنوں وہاں مقیم رہے ان باتوں کے بارے میں ان کے تذکرہ نگار خاموش ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود وہ مدائنی کی نسبت سے مشہور رہے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے کہ جو شخص کسی شہر میں چار سال تک مقیم ہو وہ اس شہر کی طرف منسوب ہوگا[1]

محدثین کے اس اصول کے رو سے مدائنی کم از کم چار سال تک مدائن میں مقیم رہے، ان کے شیوخ میں امام ابن ابی زائدہ مدائن کے قاضی تھے، اور زمانۂ قضا ہی میں ۱۸۳ھ میں وصال فرمایا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدائنی یہاں ۱۸۳ھ کے حدود میں سکونت پذیر تھے، مدائن عراق کا قدیم ترین شہر تھا جو کسرائیوں کا مرکزی مقام تھا، اسی کے قریب بغداد آباد ہوگیا تھا، بقول خطیب بغداد سے ایک دن کی مسافت سے کم دوری پہ تھا، گویا مدائن بغداد کا نواحی شہر تھا، اور کسی نہ کسی درجہ میں اسکی مرکزیت باقی تھی،

مدائنی بغداد میں | اسی طرح مدائنی کے بغداد جانے کا زمانہ بھی معلوم نہیں ہے البتہ یہ بات

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۳۳

یقینی ہے کہ وہ ۲۱۳ھ سے پہلے یہاں آچکے تھے، یاقوت کی روایت کے مطابق ان کو خلیفہ مامون نے ایک مرتبہ اپنے میر منشی ابوجعفر احمد بن یوسف کے ذریعہ دربار میں بلوایا تھا، اور احمد بن یوسف کا انتقال ۲۱۳ھ میں ہوا، اس لئے مدائنی اس سے پہلے بغداد آگئے تھے یہاں کی مدت اقامت مدائن کے مقابلہ میں طویل ہے، اور یہیں مدائنی کی شخصیت ابھری اور ان کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہوئے،

اس زمانہ میں بغداد ہر علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا، ہر طبقہ کے اہل علم اپنے قدر دانوں کی بدولت پُرسکون اور نشاط انگیز ماحول میں خوش وقت تھے، اسی دور میں اسلامی علوم و فنون کی امہات الکتب کی تالیف و تدوین ہوئی، مدائنی کو بھی بغداد میں اطمینان و سکون کی فضا میں آگے بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ملا، ایسے مواقع حسن اتفاق سے بہت کم اہل علم کو ملتے ہیں،

اسحاق بن ابراہیم موصلی کی قدردانی اور نوازش

بغداد میں مدائنی کو اسحٰق موصلی جیسا صاحب علم، علم و فن کا قدرداں اور محسن مل گیا اور وہ اس کے ندماء و متعلقین میں ایسے شامل ہوے کہ اسی مکان سے ان کا جنازہ نکلا، ابن ندیم نے ان کی وفات کے سلسلے میں تصریح کی ہے،

مات المدائنی......	مدائنی کی وفات اسحٰق بن ابراہیم
فی منزل اسحٰق بن ابراھیم	موصلی کے مکان میں ہوئی۔ مدائنی
الموصلی وکان منقطعاً الیہ[1]	کا ان سے خصوصی تعلق تھا۔

یاقوت نے اس سے واضح انداز میں لکھا ہے،

واتصل باسحٰق بن ابراھیم	مدائنی اسحٰق بن ابراہیم موصلی سے
الموصلی۔ فکان لایفارق	یوں گھل مل گئے کہ ان کے مکان سے

[1] الفہرست ص ۱۴۷،

منزلہ وفی منزلہ کانت وفاتہ[1] | جہاں نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ ان کی وفات وہیں ہوئی۔

ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم تمیمی موصلی متوفی ۲۳۵ھ صاحب کتاب الاغانی ابتداء میں محدث فقیہ تھے، انھوں نے حدیث کی روایت سفیان بن عیینہ ہشیم بن بشیر، ابو معاویہ ضریر وغیرہ سے کی، اور ادب وعربیت کی تعلیم اصمعی اور ابو عبیدہ وغیرہ سے حاصل کی، ان سے زبیر بن بکار، ابوالعیناء، میمون بن ہارون وغیرہ نے روایت کی، علم موسیقی وغناء میں مہارت و براعت کی وجہ سے یہ فن ان کے دیگر علوم پر غالب آگیا، اور انھوں نے اس فن میں کتاب الاغانی لکھی اور صاحب الاغانی کی نسبت سے مشہور ہوئے، اہل علم وفن کے بڑے قدردان تھے، سخاوت میں نیک نامی اور شہرت رکھتے تھے، عباسی خلفاء کے درباروں میں ان کی بڑی قدرو منزلت تھی[2]، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصلی کے آب ودانہ اور بغداد کی خاک گور کی کشش نے مدائنی کو مدائن سے بغداد کھینچا تھا، موصلی کی قدردانی اور مدائنی کے تشکر و امتنان کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے، مدائنی کے تلمیذ اور مشہور حافظ حدیث امام احمد بن ابی خیثمہ کا بیان ہے کہ میرے والد یحیی بن معین اور مصعب بن زبیری تینوں اہل علم شام کو مصعب بن زبیری کے دروازے پر بیٹھا کرتے تھے، ایک دن شام کا واقعہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے سے ایک خوش پوش وخوش وضع آدمی موٹے تازے گدھے پر گزرا، اس نے مجمع کو سلام کرکے یحیی بن معین سے کچھ بات کی، ابن معین نے اس سے کہا ابوالحسن! کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اسی شریف آدمی کے پاس جارہا ہوں جو میری آستین کو اوپر سے نیچے تک دراہم ودنانیر سے بھر دیتا ہے، ابن معین نے کہا ابوالحسن! وہ کون شخص ہے؟ اس نے

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۹ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۸

جواب دیا وہ ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم موصلی ہے، اس کے بعد جب وہ آدمی چلا گیا تو ابن معین نے دو بار ثقہ ثقہ کہا، میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ تو بتایا کہ یہ مدائنی ہیں۔[1]

یہ واقعہ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں اور یاقوت نے معجم الادباء میں اختصار کے ساتھ لکھا ہے، اور دونوں میں مدائنی کے بارے میں ابن معین کا قول تین بار ثقہ ثقہ ثقہ ہے۔[2]

خلیفہ مامون کے دربار میں: مدائنی کے علم و فضل کی شہرت نے عباسی خلفاء و امراء کو بھی ان کی طرف متوجہ کیا، عجب کیا ہے کہ عباسی دربار تک مدائنی کی رسائی میں ان کے محسن موصلی کا ہاتھ رہا ہو، جو خود بھی خلفاء کے نزدیک معظم و مکرم تھے، اس سلسلہ میں یاقوت نے خلیفہ مامون کے مدائنی کو بلانے اور ان سے علمی و سیاسی گفتگو کرنے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، مدائنی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ مامون (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) نے احمد بن یوسف کو حکم دیا کہ مجھے دربار میں طلب کیا جائے، اور جب میں دربار میں پہنچا تو مامون نے میرے سامنے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ذکر چھیڑا، میں نے انکے بارے میں چند حدیثیں بیان کیں، یہاں تک کہ مامون نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بنو امیہ کے لعن طعن کا تذکرہ کیا، اس پر میں نے مامون کو بتایا کہ ابو سلمہ مثنیٰ بن عبد اللہ (محمد ابن عبد اللہ انصاری کے بھائی) نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ ان کو ایک شخص نے سنایا کہ میں نے ملک شام میں رہتے ہوئے وہاں کسی کا نام علی، حسن، حسین نہیں سنا، عام طور سے معاویہ، یزید، ولید نام سنتا تھا، ایک مرتبہ میں ایک شخص کے پاس سے گزرا جو اپنے دروازے پر بیٹھا تھا، مجھے پیاس لگ رہی تھی، میں نے اس سے پانی مانگا، اس نے یا حسن کہہ کر اپنے لڑکے کو آواز دی، اور کہا کہ اس آدمی کو پانی پلاؤ، میں نے ازراہ تعجب

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲، ص ۵۵ [2] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۳، معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰

ن سے پوچھا کہ تم نے حسن نام رکھا ہے ؟ اس نے کہا میں نے اپنے لڑکوں کے نام حسن
سین، جعفر رکھے ہیں، بات یہ ہے کہ اہل شام اپنی اولاد کے نام اللہ کے خلفاء کے نام پر
رکھتے ہیں حالانکہ ہم لوگ اپنی اولاد کو لعن طعن اور سب و شتم سے یاد کرتے رہتے ہیں،
اس لئے میں نے اپنے لڑکوں کے نام اللہ کے دشمنوں کے نام پر رکھے ہیں، اب اگر میں
ان کو لعنت و ملامت سے یاد کرونگا تو یہ لعنت اللہ کے دشمنوں پر ہوگی، میں نے کہا کہ
میں تم کو اہل شام میں سب سے اچھا سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ اہل جہنم میں تم سے
بدتر کوئی نہیں ہے،

مدائنی کہتے ہیں کہ مامون نے یہ واقعہ سن کر کہا

لاجرم قد ابتعث اللہ علیہم	اللہ تعالیٰ ایسی جماعت ضرور پیدا
من یلعن احیاءھم،	کرے گا جو ان کے زندوں اور
وامواتھم، ویلعن من	مردوں پر اور ان کے صلب و رحم
فی اصلاب الرجال وارحام	میں رہنے والوں پر لعنت کرے گی
النساء، یعنی الشیعۃ[1]	یعنی شیعہ،

ابوجعفر احمد بن یوسف متوفی ۲۱۳ھ خلیفہ مامون کے افاضل کتاب (کاتبوں
اور سکریٹریوں) میں سے تھا، بڑا ذہین و فطین اور جامع اوصاف، جید الکلام، فصیح اللسان
حسن اللفظ، ملیح الخط اور بہت اچھا شاعر تھا،[2] مامون کا اس کو مدائنی کے بلانے کے لیے حکم دینا
کسی خاص وجہ سے تھا، یہاں پر یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ مدائنی کا مولد و منشاء
بصرہ عثمانی الفکر تھا، اور اہل بصرہ شیعہ علیؓ کے مقابلہ میں شیعہ عثمانؓ بنکر بنو امیہ کے حامی

۱؎ معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۱ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۵ ص ۲۱۶

وطرفدار تھے، شاید خلیفہ مامون کو مدائنی کے عثمانی الفکر ہونے کی خبر ملی ہو، اور اس نے ان کو بلاکر اس بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا ہو، اور مدائنی کے خیالات معلوم کئے ہوں غالباً مدائنی کے بغداد آنے کے بعد جلد ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا،

معمر بن اشعث کے متعلق علماء کی سربراہی مدائنی بغداد کے علمی حلقوں میں معزز و محترم مانے جاتے تھے اور ہر طبقہ میں ان کی مقبولیت تھی، معمر بن اشعث نامی ایک قدردان کے یہاں چند علماء رہتے تھے، ان میں مدائنی بھی شامل تھے، بلکہ ان سب کے سربراہ تھے، ابن ندیم نے لکھا ہے کہ معمر بن اشعث کے متعلقین و منتسبین میں حفص الفرد، معمر، ابوسمر، ابوالحسن مدائنی، ابوبکر الاصم، ابوعامر عبدالکریم بن روح جیسے اہل علم تھے، ان میں مدائنی متکلم تھے [۱]

مدائنی اور ابن عائشہ مدائنی کے ہم وطن اور معاصر علماء میں مشہور محدث ابوعبدالرحمن عبیداللہ بن محمد تیمی بصری متوفی ۲۲۸ھ عیشی، عائشی اور ابن عائشہ کی نسبت وکنیت سے مشہور ہیں، نہایت ثقہ محدث ہونے کے ساتھ اخبار و انساب اور تواریخ کے بھی زبردست عالم تھے، ان کا شمار بصرہ کے اعیان و سادات میں ہوتا تھا، ان کی سخاوت کا شہرہ عام تھا [۲] ان ہی ابن عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابوالحسن نے میرے پاس آکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شامی علاقوں پر حملہ کا واقعہ بیان کیا اور اسی ضمن میں ان کے رہنما رافع کے بارے میں شاعر کا یہ شعر سنایا ؎

لِلّٰہِ دَرُّ رافعٍ اَنّٰی اھْتَدٰی فَوَّزَ من قُراقِرَ الی سُوٰی

خمساً اذا ساربھا الجیش بکی

مدائنی کے اس شعر میں لفظ الجیش کہنے پر میں نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ اگر یہاں لفظ

---

[۱] الفہرست ص ۱۴۰، [۲] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۴۵، العبر ج ۱ ص ۴۰۲

جیش ہوتا تو بکی (واحد) کے بجائے بکوا (جمع) کا صیغہ ہوتا، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ مدائنی کا علم کتابوں کے مطالعے کا نتیجہ ہے یعنی انھوں نے اساتذہ سے باقاعدہ نہیں پڑھا ہے،

ابو احمد عسکری نے اپنی کتاب التصحیف میں اس واقعہ کو بیان کر کے لکھا ہے، کہ الجیش بکی صحیح ہے، اور ابن عائشہ کا یہ کہنا کہ لوکان الجیش لکان بکوا وہم ہے، جیش کے لیے بکی جائز ہے، اور اسکو لفظ واحد پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ طفیل غنوی یا اوس بن حجر نے کہا ہے،[1]

ان یک عار بالقنان انیتہ فرار ی، فان الجیش قد فرا

علم نحو و عربیت کا یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ اسم جنس مثلاً جیش، نوح، قوم وغیرہ اپنے لفظ کے لحاظ سے واحد اور معنی کے اعتبار سے جمع ہوتا ہے، اور اس کے لیے واحد اور جمع دونوں کے صیغے اور ضمیریں جائز ہیں، اگر مذکورہ بالا واقعہ صحیح ہے، اور ابن عائشہ نے مدائنی کی روایت میں اسے غلط قرار دیا ہے تو مدائنی کی خاموشی ان کے علمی وقار اور ابن عائشہ کے احترام کی دلیل ہے،

یہ عہد صدیقی میں ۱۳ھ کا واقعہ ہے، جب کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے قتال مرتدین کے بعد شامی مہمات کی طرف رخ کیا، اور عین التمر کے بعد بنو کلب کے چشمہ قراقر پر یلغار کی، پھر وہاں سے نکل کر بنو کلب کے دوسرے چشمہ سوی پر حملہ کیا، اس مہم میں حضرت خالدؓ کے دلیل اور رہنما رافع بن عمیر طائی تھے، جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے،[2]

للہ در رافع انی اھتدی فوز من قراقر الی سوی

ماء اذا مارامہ الجیش انثنی ما جازھا قبلک من انسی

مدائنی کے آخری دن اور انتقال مدائنی کے جستہ جستہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش پوش، شریف النفس اور با اخلاق و با مروت انسان تھے، کھلے ذہن و مزاج

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰ [2] فتوح البلدان ص ۱۱۸

مالک تھے، تصنع اور نام ونمود سے متنفر تھے، اپنے محسنوں کے حسن سلوک کا برملا اعتراف کرتے تھے، اپنے بڑوں کے ادب و احترام میں آگے تھے، اس لیے اہل علم، خلفاء اور امراء میں یکساں مقبول تھے، اور زہد و تقویٰ کی حد تک اپنی زندگی بسر کرتے تھے، زندگی کے آخری حصہ میں یہ رنگ اور بھی نکھر گیا تھا، اور مسلسل روزہ رکھنے لگے تھے، ان کے تلمیذ حارث بن ابواسامہ کا بیان ہے

انہ سرد الصوم قبل موتہ	مدائنی اپنے انتقال سے تین سال پہلے
بثلاث سنین وانہ کان قد	سے مسلسل روزہ رکھتے تھے، حالانکہ ان کا
قارب مائۃ سنۃ فقیل لہ	سن سو سال کے قریب کا ہو چکا تھا
فی مرضہ ما تشتھی؟ فقال	مرض الموت میں پوچھا گیا کہ آپ کی
اشتھی ان اعیش[1]	کیا خواہش ہے، تو کہا کہ زندہ رہنا
	چاہتا ہوں،

اور سمعانی اور یاقوت کی روایت میں تین سال کے بجائے تیس سال روزہ رکھنے کی تصریح ہے[2]

ان ابا الحسن المدائنی سرد	ابو الحسن مدائنی انتقال سے تیس سال
الصوم قبل موتہ بثلاثین سنۃ	پہلے سے مسلسل روزہ رکھتے تھے،

بلکہ ذہبی اور ابن العماد نے مستقل روزہ رکھنے کی تصریح کی ہے،

وکان یسرد الصوم[3]	مدائنی برابر روزہ رکھا کرتے تھے

بڑھاپے کی آخری منزل میں جینے کی تمنا بظاہر روزہ اور دوسرے نیک اعمال کے لیے تھی، حدیث شریف میں اس مومن کے لئے بشارت آئی ہے جسکی عمر میں زیادتی کے ساتھ نیکی میں بھی کثرت ہو،

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۲، ص ۵۵، ۲؎ کتاب الانساب ج ۱ ص ۵۱۵ معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۹
۳؎ العبر ج ۱ ص ۱۰۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۵۴

مدائنی کا وصال بغداد میں ان کے محسن اسحٰق بن ابراہیم کے مکان میں ذی قعدہ ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ کو ہوا، اس وقت انکی عمر نوے سال سے زائد تھی، ذہبی نے العبر میں، ابن العماد نے شذرات الذہب میں ۲۲۴ھ بتایا ہے، جب کہ خطیب، سمعانی، یاقوت اور ذہبی نے میزان الاعتدال میں ۲۲۴ھ اور ۲۲۵ھ ...... دونوں سنین علی اختلاف الروایہ نقل کئے ہیں، ابن ندیم نے صرف ۲۲۵ھ لکھا ہے، ابن ندیم کا بیان ہے،

مات المدائنی سنۃ خمس	مدائنی، ۲۲۵ھ میں فوت
وعشرین ومائتین، ولہ ثلاث	ہوئے اس وقت انکی عمر ترانوے[۹۳]
وتسعون سنۃ فی منزل اسحٰق	سال تھی انکا انتقال اسحٰق بن ابراہیم
بن ابراھیم الموصلی وکان	موصلی کے مکان میں ہوا، ان کے موصلی
منقطعا الیہ[۵]	سے خصوصی تعلقات تھے،

انتقال کے وقت مدائنی کی عمر کے بارے میں سب ہی تذکرہ نویس ترانوے[۹۳] سال کی تصریح کرتے ہیں، جب کہ خود مدائنی کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۱۳۵ھ میں ہوئی تھی، اس کی رو سے ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں انتقال کے وقت ان کی عمر نوے[۹۰] سال کی ہونی چاہئے۔

اقران و معاصرین کی نظر میں | مدائنی ابتدا میں محدث کی حیثیت سے ابھرے اور انتہا میں اخباری کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور علمائے حدیث کی طرح علمائے اخبار واحداث میں ثقہ و مستند تسلیم کئے گئے اور ان کے معاصرین نے ان کے صدق و ثقاہت کا برملا اعتراف واظہار کیا، گزر چکا ہے کہ ایک مرتبہ مدائنی حافظ ابوخیثمہ زہیر بن حرب متوفی ۲۳۴ھ،

---

۵ الفہرست ص ۱۴۴

امام یحییٰ بن معین متوفی ۲۳۳ھ اور امام مصعب بن عبداللہ زبیری متوفی ۲۳۶ھ کی مجلس سے گزرے تو امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین نے ان کے بارے میں تین بار ثقہ ثقہ ثقہ فرمایا، اور حاضرین نے خاموشی سے اس کی تائید و تصدیق کی۔

مذکورہ بالا واقعہ کے راوی مدائنی کے شاگرد احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب میں اُن کا بیان ہے کہ

قال لی یحیی بن معین غیر مرۃ اکتب عن المدائنی کتبہ ۔

ابن معین نے بارہا مجھ سے کہا کہ تم مدائنی کی کتابیں لکھا کرو اور ان سے ان کی روایت کرو۔

امام ابو قلابہ رقاشی (عبدالملک بن محمد بصری متوفی ۲۷۶ھ) کا بیان ہے کہ میں ابو عاصم النبیل (ضحاک بن مخلد بصری متوفی ۲۱۲ھ) کے سامنے ایک حدیث بیان کی اُنھوں نے کہا کہ یہ حدیث کس کی سند سے ہے، اور اس کے راوی کون لوگ ہیں؟ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے، میں نے کہا کہ اس کی سند نہیں ہے، البتہ اسے ابوالحسن مدائنی نے مجھ سے بیان کیا ہے ابو عاصم النبیل نے یہ سنتے ہی کہا۔

سبحان اللہ ابوالحسن اسناد[1] سبحان اللہ ابوالحسن خود ہی سند ہیں،

یہ چاروں ائمہ دین اپنے دور میں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب تھے، انھوں نے مدائنی کو سند و ثقہ قرار دے کر ان کے علم و فن کے معتبر و مستند ہونے کی شہادت دی ہے، البتہ ان کے ایک معاصر محدث و مورخ ابن عائشہ (عبیداللہ بن محمد بصری متوفی ۲۲۸ھ) نے ان سے ایک شعر سن کر اپنے خیال کے مطابق ایک غلطی نکالی اور اسی کی بنا پر ان کے

---

[1] تاریخ بغداد ج۱۲ ص۵۴،

بارے میں کہا۔

وعلمت ان علمہ من	میں سمجھ گیا کہ مدائنی کا علم کتابی ہے
الصحف[1]	(درسی نہیں ہے)

مطلب یہ ہے کہ ابن عائشہ کے خیال میں مدائنی نے شیوخ و اساتذہ سے روایت کرنے کے بجائے انکی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور اپنے طور پر ان کو سمجھا ہے، مگر اس واقعہ کے ناقل ابو احمد عسکری نے اسکو ابن عائشہ کا وہم قرار دیکر مدائنی کی تائید و توثیق کی ہے، مشہور اخباری عالم ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی متوفی سنہ ۲۴۵ھ مدائنی کے متاخر اور ناقد معاصر ہیں، انھوں نے کتاب المحبّر میں (ص ۵۲) "قال المدائنی" کہہ کر روایت کی ہے،

مشہور امام نحو ثعلب (ابو العباس احمد بن یحییٰ نحوی متوفی سنہ ۲۹۱ھ) اگرچہ مدائنی کے معاصرین میں سے نہیں، مگر انھوں نے اپنے ابتدائی ایام میں مدائنی کا آخری زمانہ پایا ہے۔ ان کا قول ہے،

من اراد اخبار الجاھلیۃ	جو شخص زمانۂ جاہلیت کی تاریخ معلوم
فعلیہ بکتب ابی عبیدۃ	کرنا چاہے وہ ابو عبیدہ کی کتابیں
ومن اراد اخبار الاسلام	پڑھے اور جو شخص زمانۂ اسلام کی تاریخ
فعلیہ بکتب المدائنی،[2]	معلوم کرنا چاہے وہ مدائنی کی کتابیں پڑھے،

علامہ ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ اخباری متوفی سنہ ۲۱۰ھ اخبار و تواریخ کے مشہور عالم و مصنف ہیں، قریش کی شاخ قبیلہ بنو تیم کے غلام ہیں، خاندان فارس کا تھا، مدائنی کے معاصر ہیں، انھوں نے بھی عجم کی فتوحات پر کتاب فتوح خراسان، کتاب فتوح آرمینیہ اور

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵

کتاب فتوح الاہواز تصنیف کی ہے،[۱]

مدائنی کا مقام و مرتبہ | مدائنی محدثین کے جرگے سے نکل کر علماء اخبار و احداث میں شامل ہوگئے تھے، اس لئے بعد میں محدثین نے ان کو اخباری کی حیثیت دیدی، وہ خود بھی حدیث کی روایت کے بجائے تواریخ و انساب کی تدوین و روایت میں مصروف ہوگئے، ابن عدی نے "الکامل فی الضعفاء" میں ان کے بارے میں لکھا ہے،

لیس بالقوی فی الحدیث	مدائنی حدیث میں قوی نہیں ہیں،
وھو صاحب اخبار، قل ماله	وہ صاحب اخبار ہیں، ان کے یہاں
من الروایات المسندۃ[۲]	مسند احادیث قلیل ہیں،

ذہبی نے ابن عدی کا یہ قول میزان الاعتدال میں صرف نقل کر دیا ہے، البتہ انھوں نے "المغنی فی الضعفاء" میں اس کے ساتھ اپنی یہ رائے بھی لکھی ہے،

المدائنی الاخباری صدوق	مدائنی اخباری صدوق ہیں ابن عدی
قال ابن عدی لیس بالقوی[۳]	نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں ہیں،

بخلاف اس کے ذہبی نے کتاب العبر میں صرف یہ لکھا ہے،

وثقه ابن معین وغیرہ[۴]	یحییٰ بن معین وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے،

ابن العماد نے بھی شذرات الذہب میں یہی لکھا ہے،[۵] اور یاقوت نے لکھا ہے

وکان ثقۃ اذا حدث عن	مدائنی جب ثقات سے روایت کریں
الثقات،[۶]	تو وہ ثقہ ہیں،

---

[۱] الفہرست ص ۱۰۴ [۲] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۳ [۳] المغنی فی الضعفاء ج ۲ ص ۴۵۴

[۴] العبر ج ۱ ص ۳۹۱ [۵] شذرات الذہب ج ۲ ص ۵۴ [۶] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰

محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل کے یہ آراء واقوال مدائنی کے حق میں احادیث کی روایت کے بارے میں ہیں، جن میں ان کو ثقہ، سند، صدوق بتایا گیا ہے اور چونکہ انھوں نے اخبار واحداث کو اپنا خاص موضوع بنا لیا تھا، اس لئے احادیث وآثار کی روایت نہیں کی، اور نہ ہی سند احادیث کا اہتمام کیا، یہی وجہ ہے کہ محدثین کے نزدیک وہ اخباری رہے، اور اس بارے میں ان کی ذات ثقہ، صدوق، سند اور قابلِ اعتماد ہے، صرف ان کی ایک مسند حدیث میزان الاعتدال میں یوں آئی ہے،

مدائنی نے جعفر بن ہلال سے روایت کی	روی عن جعفر بن هلال،
انھوں نے عاصم الاحول سے، انھوں نے	عن عاصم الاحول عن ابی
ابوعثمان سے، انھوں نے ابو اسامہ سے	عثمان، عن ابی اسامة قال!
کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور حسن بن علی کو	کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحملنی
اٹھاتے تھے اور فرماتے تھے اے اللہ میں	والحسن بن علی ویقول !
ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی	اللّٰھم انی احبھما فاحبھما۔
ان کو محبوب رکھ،	

مدائنی نے فن تاریخ کو اپنی علمی سرگرمی کا محور بنا کر اس کی روایت وسند میں محدثانہ انداز اختیار کیا، اور تدلیس یا رواۃ کی جہالت سے بچنے کی کوشش کی، چنانچہ ابوالیقظان کے بارے میں تصریح کی ہے کہ ان سے روایت وسند میں انکا نام کئی طرح سے لیتا ہوں اور ابوالیقظان، سحیم بن حفص، عامر بن حفص، عامر بن ابو محمد، عامر بن اسود، سحیم بن اسود، عبید اللہ بن حفص، اور ابو اسحٰق سے میری مراد ابوالیقظان ہی ہوتے ہیں،[1]

---

[1] الفہرست ص ۱۴۸،

مدائنی اخباری و مؤرخ | مدائنی کے شیوخ و اساتذہ میں اکثر ائمہ حدیث ہیں جن میں سے بعضوں نے حدیث کے ساتھ سیر و مغازی اور تواریخ سے بھی اعتنا کیا، خاص طور سے قاضی علی بن مجاہد کابلی متوفی ۱۸۰ھ صاحب المغازی، موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ صاحب المغازی، ابومعشر سندی مدنی متوفی ۱۷۰ھ صاحب المغازی، ابوبکر ہذلی بصری متوفی ۱۶۷ھ عالم تواریخ و انساب، ابوالیقظان متوفی ۱۹۰ھ عالم انساب عرب، مؤخر الذکر کے علاوہ یہ سب حضرات علم حدیث کے شیوخ ہونے کے ساتھ تواریخ کے مستند ائمہ ہیں، اور مدائنی کی طرح علی بن مجاہد کابلی اور ابومعشر سندی، طبقۂ موالی سے ہیں، ان کا آبائی و نسلی تعلق بھی مدائنی کے آبائی و نسلی وطن سے ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی شیوخ سے متاثر ہو کر مدائنی کا اشہب قلم تواریخ و انساب، اخبار و احداث اور غزوات و فتوحات کے میدان کی طرف مڑ گیا، اور اسکی وسعت اور رنگینی نے باہر نکلنے نہ دیا، اسی لئے مدائنی کے تلامذہ کی اکثریت ائمہ تاریخ کی ہے، ان کا تمام تر تصنیفی سرمایہ اخبار و احداث پر مشتمل ہے، اور وہ بعد میں اخباری کی نسبت سے مشہور ہوئے، ان کے سب سے پہلے تذکرہ نگار ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے کتاب المعارف میں انکا ذکر علمائے تاریخ میں کر کے لکھا ہے،

والاغلب علیہ روایۃ الاخبار[۱]	مدائنی پر اخبار کی روایت کا غلبہ ہے

ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب متوفی ۲۹۱ھ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے،

من اراد اخبار الجاھلیۃ فعلیہ بکتب ابی عبیدۃ،	جو شخص زمانۂ جاہلیت کی تاریخ پڑھنا چاہے اس کو ابوعبیدہ کی کتابیں

---

[۱] المعارف ص ۲۳۴

ومن اراد اخبار الاسلام فعلیہ بکتب المدائنی۔ | جو شخص اسلامی تاریخ پڑھنا چاہے اسکو مدائنی کی کتابیں پڑھنی چاہئیں، اور دیکھنی چاہئیں۔

خطیب اور سمعانی نے لکھا ہے۔

وکان عالماً بایام الناس واخبار العرب وانسابھم عالماً بالفتوح والمغازی، ورادیۃ الشعر صدوقاً وثقاً فی ذالک۔[1] | مدائنی ایام ناس، اخبار عرب اور انساب عرب کے عالم تھے اسی طرح فتوح ومغازی کے عالم اور شعر کے راوی تھے، ان علوم میں صدوق و ثقہ تھے،

ذہبی نے العبر میں ان کا تعارف الاخباری، صاحب التصانیف، والمغازی والانساب کے الفاظ سے کرایا ہے، اور میزان الاعتدال میں الاخباری صاحب التصانیف اور المغنی فی الضعفاء میں الاخباری صدوق لکھا ہے۔ سمعانی نے کہا ہے، وھو صاحب الکتب المصنفۃ اور شذرات الذہب میں بھی الاخباری، صاحب التصانیف، والمغازی والانساب ہے۔

الغرض مدائنی کے تذکرہ نویسوں نے ان کو اخبار و احداث سیر و مغازی، انساب عرب، اشعار عرب اور فتوحات میں صاحب الکتب المصنفہ اور ان علوم کا امام مانا ہے، اور ان ہی میں ان کو شہرت و ناموری ملی،

تاریخی تصانیف | مدائنی کی زندگی کے ابتدائی ۶۵ سال دوسری صدی میں اور آخری پچیس سال تیسری صدی کے ربع اول میں گزرے، یہ زمانہ اسلامی علوم و فنون کی تالیف و تدوین کا دور شباب ہے، اس میں ائمۂ علم و فن نے اپنے زمانہ تک کے علوم و فنون کو سینوں سے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲، ص ۵۵، کتاب الانساب ج ۲، ص ۵۱۵

سفینوں میں منتقل کیا، چنانچہ فن تاریخ میں بھی خوب خوب اور طرح طرح سے کام ہوا، درحقیقت اسی دور کی تصانیف بعد کے مصنفین کا ماخذ بنیں اور ان کو امہات الکتب کا درجہ ملا۔

اس دور میں مدائنی کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین میں فن تاریخ کے عظیم مصنف پیدا ہوئے، مثلاً ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی متوفی ۱۵۷ھ صاحب کتاب فتوح العراق جن کے بارے میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے، "وکان صاحب اخبار وانساب، والاخبار علیہ اغلب"، ہشام بن محمد بن سائب کلبی متوفی ۲۰۴ھ صاحب کتاب الجمهرة فی النسب (وھو من محاسن الکتب فی ہذا الفن (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۲) انھوں نے تاریخ وانساب میں ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں لکھیں،

محمد بن عمر واقدی متوفی ۲۰۷ھ صاحب کتاب فتوح العراق وکتاب التاریخ وکتاب المغازی

ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ متوفی ۲۱۰ھ یا ۲۱۱ھ،

محمد بن سعد بغدادی کاتب الواقدی متوفی ۲۳۰ھ صاحب الطبقات،

زبیر بن بکار متوفی ۲۵۶ھ صاحب کتاب جمهرة نسب قریش واخبارہا۔

مصعب بن عبداللہ زبیری متوفی ۲۳۶ھ،

خلیفہ بن خیاط بصری متوفی ۲۴۰ھ صاحب الطبقات والتاریخ۔

ابوالحسن احمد بن یحییٰ بلاذری بغدادی متوفی ۲۷۹ھ صاحب انساب الاشراف وفتوح البلدان۔

احمد بن اسحٰق بن جعفر یعقوبی صاحب کتاب التاریخ وکتاب البلدان۔

عمر بن شبہ بصری متوفی ۲۶۳ھ اخباری صاحب التصانیف۔

محمد بن صالح بن مہران بصری متوفی ۲۵۲ھ صاحب کتاب الدولہ۔

یہ تمام علمائے تاریخ وانساب صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں، خصوصاً غزوات وفتوحات پر انھوں نے چھوٹی بڑی کتابوں کے انبار لگائے ہیں، جن میں بلادِ اسلامیہ کی فتوحات کی طرح ہندوستان کی فتوحات کا بھی ذکر ہے، چنانچہ تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ یعقوبی اور بلاذری کی فتوح البلدان سے اگر ہندوستان کی اسلامی تاریخ مرتب کی جائے تو اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے، واقدی نے اخبار فتوح بلاد السند نامی اپنی کتاب یا کسی کتاب کے باب میں حضرت امیر معاویہؓ کے امیر سندھ عبداللہ بن سوار عبدی کی خدمت میں راجہ قیقان کو تحفہ دہدیہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے، اور ابن سعد نے الطبقات الکبریٰ میں حضرت ربیع بن صبیح بصری متوفی ۱۶۰ھ کے ہندوستان میں انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خبر مجھے بصرہ کے ایک شیخ نے دی ہے، جو ان کے ساتھ موجود تھے،

خلیفہ نے ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ کی روایت سے محمد بن قاسم کی ولایت سندھ کا ذکر کرکے عون بن حسن بن کہمس بصری سے ان کے والد کے غزوۂ سندھ میں شریک ہونے کا ذکر کیا ہے، اور بلاذری نے فتوح السند کے باب میں ہشام بن الکلبی سے روایت کی ہے، اگر ان قدیم علماء تاریخ کی کتابیں ناپید نہ ہوئی ہوتیں تو ہم کو ان سے ہندوستان کے بارے میں نہایت مستند ونادر اور اہم معلومات حاصل ہوتیں، اس سلسلہ میں اس دور کے مشہور ادیب وفلسفی اور صاحبِ طرز مصنف جاحظ (ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب بصری متوفی ۲۵۵ھ) کا ذکر بھی ضروری ہے، جس نے کتاب الحیوان، کتاب البیان والتبیین اور دیگر کتب ورسائل میں ہندوستان کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات درج کی ہیں، جن کا تعلق اگرچہ یہاں کی فتوحات وغزوات سے نہیں ہے، مگر یہاں کے بارے میں اس انداز کی معلومات دوسرے مصنفین کی کتابوں میں نہیں ہیں،

اسی طبقہ میں مدائنی کا بھی شمار ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تاریخ وانساب اور فتوح کی مختلف الانواع تصانیف کثیرہ میں اپنے طبقہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور اس کا اول کے سرخیل نظر آتے ہیں، ابن ندیم نے الفہرست میں ص ۱۴۷ سے ص ۱۵۲ تک پانچ صفحات میں ان کی تاریخی تصانیف کے نام درج کئے ہیں اور یاقوت نے معجم الادبار میں ابن ندیم کے حوالہ سے ان کو نقل کیا ہے، جن کی مجموعی تعداد دوسو سترہ سے زائد ہے، ابن ندیم نے حسب ذیل عنوانات کے ماتحت مدائنی کی کتابوں کے نام لکھے ہیں،

(۱) کتبہ فی اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۹	کتابوں کے نام
(۲) کتبہ فی اخبار قریش	۳۱	"
(۳) کتبہ فی اخبار مناکح الاشراف و اخبار النساء	۲۳	"
(۴) کتبہ فی اخبار الخلفار	۷	"
(۵) کتبہ فی الاحداث	۲۶	"
(۶) کتبہ فی الفتوح	۳۷	"
(۷) کتبہ فی اخبار العرب	۱۰	"
(۸) کتبہ فی اخبار الشعراء	۳۴	"
(۹) ومن کتبہ المولفۃ	۴۵	"

اور کتبہ فی الفتوح کے ذیل میں خالص اسلامی ہند کی تاریخ پر ان تین کتابوں کے نام ہیں (۱) کتاب ثغر السند (۲) کتاب عمال السند (۳) کتاب فتح مکران[1]

افسوس کہ مدائنی کی دوسَو سے زائد کتابوں میں سے کوئی کتاب آج موجود نہیں ہے

---

[1] الفہرست ص ۱۵۰

ورنہ ان کی تصانیف خصوصاً مذکورہ تینوں کتابوں سے اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ کا نہایت مستند و معتبر ذخیرہ ہمارے پاس ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ مدائنی اسلامی ہند کے سب سے پہلے مؤرخ اور اپنے معاصر مورخوں میں ہندوستان کی تاریخ کے سب سے بڑے عالم و مصنف تھے، جیساکہ ابن ندیم نے ابومخنف لوط بن یحییٰ متوفی ۱۵۷ھ کے تذکرہ میں علمائے تاریخ کا یہ قول نقل کیا ہے،

قالت العلماء: ابومخنف بامر العراق واخبارها وفتوحها یزید علی غیرہ، والمدائنی بامر خراسان والهند و فارس، والواقدی بالحجاز والسیرۃ وقد اشترکوا فی فتوح الشام[1]	علماء نے کہا ہے کہ ابومخنف عراق کے امور و اخبار اور فتوحات کا دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں، اور مدائنی خراسان و ہند اور فارس کے معلومات میں دوسروں پر فائق ہیں اور واقدی حجاز اور سیر و مغازی کے علم میں دوسروں سے آگے ہیں، اور شام کی فتوحات میں سب مشترک ہیں،

یہی وجہ ہے کہ مدائنی کے تلامذہ بھی اس بارے میں اپنے طبقہ میں ممتاز ہیں، اور اپنی کتابوں میں ہندوستان کی فتوحات وغیرہ کا تذکرہ کثرت سے کرتے ہیں، خلیفہ، بلاذری اور یعقوبی کی کتابیں خوش قسمتی سے زمانہ کی غارت گری سے محفوظ رہ گئی ہیں، جو اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں،

مدائنی نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر ان تین مستقل کتابوں کے علاوہ اپنی دیگر تصانیف میں بھی بہت کچھ لکھا ہوگا، اخبار خلفاء، اور اخبار عرب کے سلسلہ کی کتابوں میں خصوصاً کتاب اخبار ثقیف اور کتاب فتوح خراسان میں یہاں کے حالات ہوں گے،

---

[1] الفہرست ص ۱۴۰

بعد کے مورخوں نے مدائنی کی روایات اپنی کتابوں میں درج کر کے ان کے تاریخی سرمایہ کا کچھ حصہ محفوظ کر لیا ہے، طبری نے تقریباً پانچ سو روایات مدائنی کی بیان کی ہیں، جن کا تعلق زیادہ تر خراسان اور عراق کی فتوحات سے ہے، ایک مقام پر محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ کے سلسلہ میں مدائنی کی روایت سے ہلواث کلبی مدائنی کا ایک واقعہ لکھا ہے، بلاذری نے انساب الاشراف میں مدائنی کے حوالہ سے بہت سے واقعات و روایات کو بیان کیا ہے، اور فتوح البلدان میں کم از کم پچیس مقامات پر مدائنی کی روایات درج کی ہیں، اور اس کے باب فتوح السند کی ابتدا مدائنی کی روایات سے یوں کی ہے، اخبرنا علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف، اس کے بعض مقامات میں تصدیق یا اختلاف کی غرض سے ابن الکلبی، ابوبکر ہذلی، اور منصور بن حاتم نحوی کے بیانات بھی نقل کئے ہیں، یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سندھ کے حالات درج کئے ہیں، مگر اس میں مدائنی کے نام سے کوئی روایت نہیں ہے، البتہ پوری کتاب میں بعض مقامات پر مدائنی کا نام موجود ہے،

خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں پچاس سے زائد مقامات پر مدائنی کی روایات ان کے نام کے ساتھ درج کی ہیں، مگر ہندوستان کے واقعات میں ان کا نام ایک جگہ بھی نہیں ہے،

چچ نامہ محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ پر مشہور کتاب ہے، اس کے محرف و مصحف مطبوعہ نسخہ میں مدائنی کی تیرہ ۱۳ روایات ہیں، اور دو ۲ روایتیں محمد بن حسن، اور محمد بن حسن مدنی کے نام کی ہیں، یہ غالباً ابوالحسن علی بن محمد مدائنی کی تحریفی شکل ہے،

شاہنامۂ فردوسی میں ہجو وطنز کے مقامات

از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور پاکستان

ایران کا عظیم رزم گو شاعر استاد ابوالقاسم منصور بن حسن فردوسی ۳۲۹-۳۳۰ھ[1] (۹۴۰-۹۴۱ء) کے درمیان طوس کے ایک قصبے باژ میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق طوس کے ایک زمین دار خاندان سے تھا، خود بھی مال و جائداد کا مالک تھا۔

عہد سامانی کے مشہور شاعر دقیقی نے جسے ۳۶۶-۳۶۷ھ/۹۷۶-۹۷۷ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اپنے قتل سے کچھ عرصہ قبل شاہنامۂ ابومنصوری نظم کرنا شروع کر دیا تھا؛ لیکن ہنوز ایک ہزار اشعار سے بیشتر نہ کہہ پایا تھا کہ مذکورہ حادثے کا شکار ہو گیا، فردوسی نے اس کے اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ۳۷۰-۳۷۱ھ[2] میں شاہنامہ لکھنا شروع کیا، جس پر اس کے ۳۰ یا ۳۵ سال صرف ہوئے۔ چونکہ شاہنامہ کی تکمیل سے کوئی آٹھ نو برس پہلے ہی وہ محمود غزنوی کے دربار سے منسلک ہو گیا تھا، اس لئے اس نے شاہنامہ کا انتساب سلطان ہی کے نام کر دیا۔ لیکن بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر اس سے دل آزردہ اور پریشان ہو کر غزنین سے خراسان اور وہاں سے طبرستان کے آل باوند کے سپہبد شہریار کی خدمت میں جا پہنچا اور وہیں، جیسا کہ نظامی عروضی کا کہنا ہے "محمود را ہجا کرد در دیباچہ بیتی صد و بر شہریار خواند"[3] اس کی خواہش تھی کہ شاہنامہ کا اب شہریار ہی کے نام

[1] بقول حافظ محمود شیرانی ۳۲۹-۳۳۰ھ تنقید شعر العجم ص ۱۰۰ [2] بقول شفق ۳۶۵ھ [3] چہار مقالہ

معنون کر دے لیکن شہریار نے اتفاق نہیں کیا، اور کہا کہ محمود میرا آقا ہے، تو شاہنامہ کو اسی کے نام منسوب رہنے دے، اور اس کی ہجو میرے سپرد کر دے تاکہ میں اسے دھو ڈالوں اور اس کے عوض تجھے کچھ مال عطا کر دوں، محمود خود ہی تجھے بلائے گا، اور تجھ کو راضی کر دے گا اور یوں تیری محنت رائیگاں نہ جائے گی۔[1] بظاہر فردوسی نے یہ ہجو ایک لاکھ درہم کے عوض شہریار کے سپرد کر دی اور وہاں سے خراسان لوٹ گیا، جہاں اپنی زادگاہ میں مقیم ہوا تا آنکہ ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ[2] میں عالمِ بقا کو سدھارا اور وہیں مدفون ہوا۔[3]

ایران کے مشہور محقق و ادیب ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا کہنا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ سلطان محمود غزنوی کے نام معنون کرنے کے بعد بھی مسلسل اس میں ترمیم اور تصحیح جاری رکھی اور اس طرح مرنے سے قبل بعض اشعار اس میں سے خارج کر دیئے، اور بعض میں کچھ تبدیلی کی۔[4]

ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے شاہنامہ کی ادبی لطافتوں اور خوبیوں کو سراہتے ہوئے اسے تواریخ کا بادشاہ (شاہِ نامہ ہا) کہا ہے۔ ان کے مطابق فردوسی نے نظم شاہنامہ میں جو منفرد انداز اختیار کیا ہے اس کی بنا پر وہ کیا گذشتہ اور کیا آیندہ شعرا، سب کا استاد ہے اور کوئی بھی اس ضمن میں اس کی برابری نہیں کر سکتا۔[5]

لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن کی رائے اس بارے میں کچھ مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ فردوسی کی شہرت شاہنامہ کی بدولت ہے اور مشرقی و مغربی نقادوں نے متفقہ طور پر اس عظیم مثنوی کی ادبی قدر و قیمت کو سراہا ہے، لیکن میں بڑی ہی شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں ہرگز ان نقادوں کی اس پُرشور و شوق ستایش و تحسین میں ان کا ہم آواز نہیں ہو سکا، میرے خیال کے

---

[1] چہار مقالہ ص ۸۱ [2] حماسہ عربی در ایران ص ۱۶۶، دولت شاہ نے ۴۱۱ھ لکھا ہے ملاحظہ ہو ص ۳۰ [3] صفا جلد اول ص ۴۸۵ بعد، شعر العجم جلد ا ص ۷۷ بعد، شفق ص ۷۷ بعد [4] حماسہ سرائی ... ص ۱۸۴ [5] شفق ص ۹۲

مطابق شاہنامہ کو ایک لحاظ سے بھی معلقاتِ عربی کے برابر اور ہم پلہ نہیں سمجھا جا سکتا ۔ ۔ ۔ بجز یہ کہ زیبائی، ذوق، احساسِ فنی، لطفِ مضمون اور حسنِ بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی کسی بھی بہترین عشقیہ، غنائی یا علمی نظم کے پایہ کو نہیں پہنچتی ۔ ۔ ۔ اسمیں جو تشبیہات استعمال کی گئی ہیں وہ کچھ زیادہ ہی یکسانیت و یکرنگی کا شکار ہیں[1]"

شاہنامہ میں طنز و مزاح اور براہِ راست ہجو کے اشعار کم ہی نظر آتے ہیں، ہاں بالواسطہ طور پر یعنی داستانوں میں کسی ایک کردار کے ذریعہ دوسرے کردار کی ہجو پر مبنی اشعار ضرور مل جاتے ہیں، ڈاکٹر رضا کا قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ فردوسی ایران سے اپنی والہانہ محبت اور غیر ایرانی عناصر سے تمام تر دشمنی کے باوجود شاہنامہ میں ایک بے غرض اور غیر جانبدار شخص ہے، اور شاہنامہ میں عربوں یا ترکوں، یونانیوں اور مختلف مذاہب مثلاً زرتشتی اور اسلام وغیرہ کو جو اس نے کوئی گالی دی یا برا بھلا کہا ہے تو وہ یا تو کسی متن سے منقول ہے یا پھر کسی کردار کی زبانِ حال سے جس نے مذکورہ زبان میں بات کی اور بس[2]، حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بھی کچھ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے، اس ضمن میں وہ فردوسی کا زبردست دفاع کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں، "بحیثیت مورخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہنچائے ہیں، عیناً ذکر کر دے، مثلاً ایک معاندِ اسلام رستم سپہ سالار یزدجرد نے جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا، اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لیے کہا۔

زبان کسان از پے سودِ خویش بجویند دین اندر آرند پیش ۔ ۔ ۔

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کر دیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں مستوجبِ تشنیع ٹھہرایا جائے ۔ ۔ ۔ ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے کہ عرب کی مذمت کے اشعار:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار ۔ ۔ ۔

---

[1] براؤن (ترجمۂ فارسی) جلد ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷ [2] حماسہ سرائی در ایران ص ۱۸۷

سب کو یاد رہے لیکن وہ اشعار جو ان کے جواب میں ایرانی سفیر کو خطاب کر کے حضرت سعدؓ ابی وقاص کی زبان سے فردوسی نے ادا کیے کبھی شرمندۂ التفات نہ ہوئے ... [1] حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو بقول فروغی مرحوم بڑا ہی صاحب اخلاق، بلند نظر، نرم دل اور حسِ لطیف و ذوقِ سلیم اور طبعِ حکیم کا مالک ہو [2]، اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی زبان کو ہجو و بدگوئی، فحش و دشنام اور رکاکت سے آلودہ کرے۔ البتہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ایک طویل ہجو اس سے منسوب کی گئی ہے، جس کے بارے میں مرحوم فروغی لکھتے ہیں کہ فردوسی کے معاملے میں جو عجیب و غریب تصرفات کیے گئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے سلطان محمود غزنوی کی ہجو کی، حالانکہ نظامی عروضی (جو اس کا قریب العہد ہے) کے مطابق وہ ہجو دھو ڈالی گئی تھی اور صرف چند اشعار محفوظ رہ گئے ہونگے لیکن اس کے باوجود شاہنامہ کے بعض نسخوں میں سَو سے بھی زیادہ اشعار پر مشتمل ہجوِ محمود دیکھنے میں آتی ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ہجو کے بیشتر اشعار ہیں تو فردوسی ہی کے لیکن شاہنامہ کے مختلف مقامات پر اور داستانوں میں آئے ہیں، دراصل جن مفاد پرستوں کی خواہش یہ رہی ہے کہ مبینہ ہجو نامہ برقرار اور تمام و کمال رہے، انھوں نے شاہنامہ سے چن چن کر ایسے اشعار نکال لیے جو کسی نہ کسی طرح محمود کی ہجو سے مناسبت رکھتے تھے، اور یوں ان اشعار کو مذکورہ ہجو کی صورت دے دی [3]

---

[1] فردوسی پر چار مقالے، حاشیہ ص ۱۳۶ [2] خلاصہ شاہنامہ ص ۱۹۔ مرحوم شیرانی لکھتے ہیں، فردوسی .... ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا، بلند ہمت اتنا کہ تکلیف اور ظلم یا اور کسی قسم کی بدنصیبی کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتا۔ اگرچہ سلطان کی ناقدردانی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا تھا، تاہم کہا جا سکتا ہے کہ وہ رکیک ہجو لکھ کر انتقام لینے کے ناقابل تھا (فردوسی پر چار مقالے ص ۳۶)

[3] خلاصۂ شاہنامہ، جزو ۱۰، ص ۵۵ نیز ملاحظہ ہو چہار مقالہ ص ۱، غزنوی دربار کے ایک مشہور شاعر عثمان

شاہنامہ کے مختلف نسخوں میں اس ہجو کے اشعار کی تعداد مختلف ہے، نظامی عروضی کے مطابق اس کے صرف چھ[۲] اشعار باقی رہ گئے،[۳] قاضی نوراللہ شوشتری نے انتیس[۲۹] اشعار بتائے ہیں،[۵] جبکہ شاہنامہ مطبوعہ نولکشور میں ان کی تعداد ایک سو ایک ہے،[۶] وقس علی ھذا۔ نظامی عروضی نے یہ چھ[۲] اشعار نقل کئے ہیں۔

مرا غمز کردند کان پر سخن — بمہر نبی و علی شد کہن
اگر مہر شان من حکایت کنم — چو محمود را صد حمایت کنم
پرستار زادہ نیاید بکار — وگر چند باشد پدر شہریار
ازین در سخن چند رانم ہمی — چو دریا کرانہ ندانم ہمی
بہ نیکی نبد شاہ را دستگاہ — وگرنہ مرا برنشاندی بگاہ

(بقیہ حاشیہ ص۲۲۰) مختاری نے اپنی مثنوی "شہریار نامہ" میں اس ہجو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چو مختاری آن بادر داستان — بنام تو گفت ای شہ راستان
گرم ہدیہ بخشی درین بارگاہ — بہ پیش بزرگان با عز و جاہ
شوم شاد و افزون شود جاہ تو — چنان مدح گویم بدرگاہ تو
وگر ہدیہ ندہی ایا شہریار — زنجم کہ ہستی خداوندگار
زبان من از ہجو کوتاہ باد — ہمیشہ ثنا گوی این شاہ باد

(دیوان عثمان مختاری ص۸۳۳)

اسی طرح نظامی گنجوی نے سکندرنامہ میں اپنے ممدوح کو خطاب کرتے ہوئے اس ہجو کی طرف اشارہ کیا ہے، ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۳۰۰۔ اسی ضمن میں نظامی گنجوی ہی کے اشعار کے لیے ملاحظہ ہو فردوسی پر چار مقالے ص ۴۰، ۴۱۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بھی تفصیلی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مذکورہ ہجو کے زیادہ تر اشعار فردوسی ہی کے ہیں، اور شاہنامہ کی مختلف داستانوں میں آئے ہیں جنھیں بعض غرض مند لوگوں نے یکجا جمع کرکے انہیں ہجو محمود کے نام سے مشہور کر دیا، پھر یہ فردوسی کی شرافت طبع کے بھی خلاف تھا کہ وہ اسی محمود کی ہجو کرتا جس کی اس نے اپنی ضخیم مثنوی میں کئی جگہ تعریف و توصیف کی ہے (فردوسی پر چار مقالے ص ۶۵-۹۲)

چو اندر تبارش بزرگی نبود ندانست نام بزرگاں شنود[1]

اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

یکی بندگی کردم اے شہریار کہ ماند ز تو در جہاں یادگار...
اگر شاہ را شاہ بودے پدر بہ سر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے... مرا سیم و زر تا بہ زانو بُدے
پرستار زادہ نیاید بکار وگر چند دارد پدر شہریار
ازاں گفتم این بیت ہائے بلند کہ تا شاہ گیرد ازین کار پند
کہ شاعر چو رنجد، بگوید ہجا بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں، ملک کے ملک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے، آج تک قائم ہیں اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔[2]

شیرانی مرحوم نے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ایک طویل بحث کے بعد اس ہجو کو اس طرح فرضی اور ساختہ قرار دیا ہے کہ اپنے مقالے کے آخر میں اس کے بعض اشعار اور شاہنامہ کے مختلف مقامات کے بعض اشعار آمنے سامنے رکھ دیئے ہیں، اور شاہنامہ کے ان مقامات کے عنوانات بھی دیئے دیئے ہیں، تاکہ سارا معاملہ بخوبی روشن ہو جائے۔[3]

(حاشیہ ص ۲۲۱) [1] چہار مقالہ ص ۵۱ [2] مجالس المومنین بحوالہ فردوسی پر چار مقالے ص ۸۴
[3] شاہنامہ جلد اول مقدمہ ص ۴۳ (حاشیہ ص ہٰذا) [1] چہار مقالہ ص ۱۰ [2] شعر العجم جلد اول ص ۱۰۵، ۱۰۶ شبلی نے ۱۵ اشعار دیئے ہیں [3] ملاحظہ ہو فردوسی پر چار مقالے ص ۹۱ - ۹۶۔

اب ذرا شاہنامہ کے ایسے مقامات کا ذکر ہو جائے جن میں مختلف کرداروں نے ہجو یا طنز سے کام لیا ہے۔

ایران کے بادشاہ یزدگرد سوم کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری میں ایک لشکر ایران کی طرف روانہ کیا۔ جب یہ لشکر ایران پہنچا تو اس سے پہلے کہ ایرانی لشکر سے اس کا سامنا ہو، ایرانی سردار رستم نے حضرت سعدؓ کو خط لکھا، فردوسی نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں جہاں رستم نے ایرانیوں کی عظمت و برتری کی ڈینگ ماری ہے وہاں عربوں کو طنز و توہم کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ وہ خط کے آغاز میں یزداں کی حمد و ثنا کے بعد اپنے بادشاہ پر درود و سلام بھیجتا ہے اور اسے تاج اور تخت و نگیں کے لیے زیبائی کا باعث قرار دیتا ہے۔ پھر عربوں کی آمد کو ناپسندیدہ معاملہ کہہ کر ان کی جنگ پر آمادگی کو ایک غلط حرکت سمجھتا ہے۔ وہ حضرت سعدؓ سے خود ان کا اور ان کے بادشاہؓ کا نام و نشان پوچھتا ہے۔ اسکے بعد تند انداز میں جو سراسر تحقیر و تذلیل لیے ہوئے ہے، ان کے پھٹے پرانے لباس پر طعن و تشنیع کرتا ہے کہ تم (سعدؓ) خود بھی برہنہ ہو اور تمہارے لشکری بھی برہنہ ہیں، تم عرب لوگ صرف ایک روٹی کھا کر سیر ہو جاتے ہو، دوسرے لفظوں میں بھوکے ہی رہتے ہو، نہ تو تم کسی کروفر کے مالک ہو اور نہ کسی جاہ و حشم کے۔ پھر وہ ایران کے عظیم لشکر کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ تم عربوں کی آنکھوں میں شرم نہیں، تم عقل و دانش اور مہر و محبت سے عاری ہو اور اپنی اس ہیئت کذائی اور پست حالی کے باوصف ایران کے اس عظیم تخت و تاج کی آرزو کرتے ہوئے تمھیں ذرا بھی ندامت نہیں ہوتی۔ اپنی گدڑی سے پاؤں باہر نہ نکالو، تم (سعدؓ) اپنا کوئی دانا نمائندہ میرے پاس بھیجو تاکہ میں اپنا سوار بھیج کر اپنے بادشاہ سے تمہارے لیے تمہارے حسب خواہش مال و متاع منگوا دوں، ہمارے عظیم بادشاہ سے

مگر یہنے کی نہ سوچو ورنہ سوائے رنج وغم کے تمھیں کچھ میسر نہ آئیگا کیوں دنیا بھر کی نفرین لینے پر آمادہ ہو، باز آجاؤ . . . . میرے اس نصیحت بھرے خط پر غور کرو اور اس سلسلے میں ہر قسم کی نادانی اور جہالت سے بچو۔

اہل ایران کو اپنی وسعتِ سلطنت، عمدہ تہذیب و تمدن، خوشحالی و فارغ البالی، مال و دولت کی فراوانی اور اعلیٰ معیارِ زندگی پر بڑا ناز تھا، اس سلسلے میں وہ اپنے مقابلے میں کسی اور کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایسی صورت میں ایسے لشکر کا انھیں چیلنج کرنا جس کے عام لشکری سے لے کر سردار سپاہ تک معمولی بلکہ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس اور جن کے پاس گھٹیا قسم کے اور معمولی ہتھیار ہوں، نہ صرف انتہائی تحیر و سرگشتگی کا باعث تھا، بلکہ بڑے ہی طیش اور غم و غصہ کا بھی سبب تھا، چنانچہ اس وسیع سلطنت کی "اعلیٰ و برتر" فوج کے عظیم سپہ سالار نے اس موقع پر جس انداز میں حضرت سعدؓ کے نام اپنے خط میں لشکر اسلام اور عربوں کو برا بھلا کہا ہے تو یہ ایک قدرتی امر تھا، اور فردوسی نے اس کی اس انداز میں تصویر کشی کر کے ایک ماہر، چابکدست اور ژرف نگاہ فنکار ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

به پیش آمد این ناپسندیده کار — به بیهوده این رنج و این کارزار
جز این باز گوی این که شاه تو کیست — چه مردی و این در راه تو چیست؟
بنزد که جوی همی دستگاه — برهنه سپهبد برهنه سپاه
بنانی تو سیری و هم گرسنه — نه پیل و نه تخت و نه بار و بنه
بایران تر ازندگانی بسست — که تاج و نگین بهر دیگرکست

ملہ الفخری (تصنیف ...) کے مؤلف نے جنگ قادسیہ کے ذکر میں ایک جگہ لکھا ہے: "رستم سونے کے تخت پر بیٹھا ہے، سامنے تکیے اور فرش بھی سونے کے تاروں سے بنے ہوئے ہیں جبکہ درباریوں کے سروں پر زرین تاج جگمگا رہے ہیں، دربار کے چاروں طرف ہاتھی کھڑے ہیں. . . . ." (اردو ترجمہ کتاب مذکور ص ۱۰۰)

شما را بدیدہ درون شرم نیست ز راہ خرد مرد آزرم نیست
بدان چہر وآن ہر وآن رای وخوی چنین تاج وتخت آیدت آرزوی؟
جہان پر کز اندازہ جوئی ہمی سخن بر گزافہ نہ گوئی ہمی[1]

جب رستم کا قاصد حضرت سعدؓ کی خدمت میں پہنچتا ہے تو وہ اسے آہن اور سیم وزر میں غرق دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ ایرانیوں کو مردانگی سے عاری سمجھتے ہیں اور انھیں عورتوں کی طرح آرائش اور بناؤ سنگھار کرنے والے قرار دیتے ہیں۔ جو انداز رستم کا خط پیش کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے وہی انداز اور لہجہ یہاں بھی نظر آتا ہے، یعنی شاعر نے دونوں کرداروں کے ساتھ انصاف برتا ہے۔

ز دیبا نگویند مردان مرد ز زرّ و ز سیم و ز خواب و ز خورد
شما را بمردانگی نیست کار جہان چون زنان رنگ وبوی ونگار
ہنرتان بدیباست پیراستن دگر نقش بام و در آراستن[2]

رستم حضرت سعدؓ کے ہاتھوں مارا جا چکا اور ایرانی فوج شکست کھا چکی ہے، ایرانی بادشاہ یزدگرد سوم تک یہ خبر فرخزاد کی وساطت سے پہنچتی ہے، فرخزاد اسے کچھ مشورے بھی دیتا ہے جس سے بادشاہ اتفاق نہیں کرتا اور اس ضمن میں چند توجیہات سے کام لیتا ہے۔ فرخزاد، بادشاہ کی اس گفتار پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ بدفطرت لوگوں سے بچنا ضروری ہے، پھر وہ مختلف تشبیہات وتمثیلات سے ایسے لوگوں کو ہجو وذم کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق بادشاہ کو بدطینت افراد سے خود کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے، کیونکہ پوری کوشش وسعی کے باوصف انسان کی سرشت کو بدلا نہیں جاسکتا، فردوسی نے فرخزاد کے اس قول کو ایسے

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۲۲۶، ۲۲۷
[2] شاہنامہ چاپ کانپور جلد ۴ ص ۲۲۲

درخت کی تمثیل سے واضح کیا ہے جس کی جڑ کڑوی ہو اور اسے اگر باغ بہشت میں لگا دیا جائے جوئے خلد سے اسے پانی دیا جائے اور اس کی جڑوں میں خالص مشک اور شہد ڈالا جائے تو بھی وہ کڑوا پھل ہی دے گا۔

بد گوہران ہیچ ایمن مشو — کہ این رایکی داستانست نو
کہ ہرچند بر گوہر افسون کنی — بکوشی کزو رنگ بیرون کنی
چو پروردگارش چنان آفرید — تو بر بند یزداں نیابی کلید
درختی کہ تلخست اورا سرشت — گرش در نشانی بباغ بہشت
گر از جوی خلدش بہنگام آب — بپای انگبیں ریزی و مشک ناب
سرانجام گوہر بکار آورد — ھمان میوۂ تلخ بار آورد[1]

مذکورہ گفتگو کے بعد یزدگرد بغداد سے عازم خراسان ہوتا ہے اور ایران کے بعض پہلوانوں مثلاً کنارنگ مرد اور ماہوی کو جو اس وقت خراسان میں ہیں اپنے ایک پُر درد خط کے ذریعے اس شکست سے آگاہ کرتا ہے، اس خط میں وہ لشکر اسلام کا ذکر تحقیر آمیز لہجے میں کرتا ہے اور انھیں گالیوں سے نوازتا ہے،

یہاں جس انداز میں فردوسی نے یزدگرد کے غیظ و غضب اور اضطراب کے حامل احساسات و جذبات کی عکاسی کی ہے، وہ اس کی انسانی نفسیات میں کامل دسترس کا پتا دیتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک عظیم بادشاہ جو نسلاً بعد نسل بادشاہ ہے، اور جس کے پاس بہت بڑا اور پورے طور پر آراستہ و مسلح لشکر ہے، جب یہ سنتا ہے کہ ایک حقیر سا لشکر جس کا کوئی ماضی نہیں، جو شان و حشمت اور تخت سے عاری ہے، معمولی اور ٹوٹے پھوٹے ہتیاروں کے ساتھ مقابلے پر اتر آیا ہے اور رجز خوانی کر رہا ہے، تو وہ کیونکر ان لوگوں کی اس جرأت و

---

[1] خلاصہ شاہنامہ ص ۱۱۷،

سا نی کو برداشت کر سکے گا، لہذا یزدگرد نے اس موقع پر جو کچھ کہا اور جس انداز میں اپنے احساسات کا اظہار کیا وہ ایک قدرتی امر تھا، اور فردوسی نے اسی انسانی فطرت کی ماہرانہ عکاسی کی ہے۔

یزدگرد اپنے خط میں اپنی بدبختی کا ذکر کرتے ہوئے عربوں کو مار خوار، شیطان نژاد کہہ کر انھیں عظمت، خزانے اور تخت سے عاری یعنی حقیر و بے وقعت قوم کا نام دیتا ہے۔ اس کے مطابق یہ لوگ عقل و دانش اور نام و ننگ سے بے بہرہ ہیں، وہ اسے ایران کی انتہائی بدبختی سمجھتا ہے کہ ایسی معمولی سی قوم ایران پر چڑھ دوڑی ہے، اور اسے تباہ کرنا چاہتی ہے، اسی حصہ میں وہ دو مشہور شعر ہیں، جن کی بنا پر بیچارے فردوسی کو رافضی اور خدا جانے کیا کیا کہا گیا ہے، یہ دو اشعار یزدگرد کے طیش و غضب کی بڑی جاندار تصویر پیش کرتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ عرب، یہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور سوسمار کا گوشت کھانے والے آج اتنے دلیر ہو گئے ہیں کہ عجم کی عظیم سلطنت کی آرزو کرنے لگے ہیں، لعنت ہو آسمان پر۔ ہاں جب فرد مایہ لوگ بلند بخت ہو جاتے ہیں، تو صاحبانِ عز و جاہ کو ذلت و خواری گھیر لیتی ہے، اور ایسے ہی موقعوں پر بدی اور ظلم پھلنے پھولنے لگتے ہیں، اور نیکی غائب ہو جاتی ہے۔

از این مار خوار اہرمن چہر چند | نہ گنج و نہ تخت و نہ نامِ بلند
از این زاغ سارانِ بی آب و رنگ | نہ ہوش و نہ دانش نہ نام و نہ ننگ
نہ فرّ و نہ نام و نہ تخت و نژاد | ہمی داد خواہند ایران بباد
ز شیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائی رسیدست کار
کہ ملکِ عجم شان کنند آرزو | تفو باد بر چرخ گردان تفو[1]

[1] شاہنامہ چھاپ کانپور (جلد چہارم) میں یہ دو شعر "زشیر شتر ... الخ" نامۂ رستم بسعد وقاص کے تحت آئے ہیں اور دوسرا شعر اس طرح ہے۔ کہ تختِ عجم را کنند آرزوی :: تفو باد بر چرخِ گردان تفوی (صفحہ ۲۲۳)

بدین تخت شاہی نہادست روی شکم گرسنہ کام دیہیم جوی
شود خوار ہر کس کہ بود ارجمند فرومایہ را تخت گردد بلند[1]

سلم اور تور اپنے باپ فریدون کے نام غصہ سے بھرا اور بے ادبانہ پیغام بھیجتے ہیں جب فریدون یہ پیغام سنتا ہے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے، اور وہ جواب میں انھیں طنز و تعریض اور مذمت سے پُر پیغام بھیجتا ہے، اس پیغام میں وہ انھیں ناپاک، بیہودہ اور مغز سے عاری شیطان قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر میری نصیحت تم پر کارگر نہ ہوگی تو اپنی عقل ہی سے کام لیتے، پھر وہ انھیں ایسا بے شرم کہتا ہے، جنھیں نہ تو خدا کا کوئی خوف ہو اور نہ عقل و خرد سے کوئی سروکار۔

بگو آن دو ناپاک بیہودہ را دو اہرمن مغز پالودہ را
ز پند من از مغزتان شد تہی چرا از خردتان نماند آگہی
نہ دارید شرم و نہ ترس از خدای شمارا ہمانا خرد نیست رای[2]

فردوسی نے جہاں کسی ایک کردار کی زبان سے کسی دوسرے کردار کی ہجو و مذمت میں کچھ کہا ہے، اس میں زیادہ تر ان دو باتوں پر زور دیا ہے کہ: وہ عقل و خرد سے عاری اور خالی مغز انسان اور ننگ و شرم سے دور ہے، وہ کہیں ننگی گالی گلوج سے کام نہیں لیتا اگر اس کا کوئی کردار انتہائی غصے، اور طیش کا بھی اظہار کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اپنے مخالف کو کوا، سانپ اور اسی قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے، اور یہ امر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ فردوسی عفت و شائستگی کا قائل ہے، اور انتہائی طیش کے موقع پر بھی عریانی اور فحش زبانی کو پسند نہیں کرتا، یہ الگ بات ہے کہ جگہ جگہ بے خرد، بے مغز

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۱۳۱ [2] ایضاً ص ۳۲۔

بے شرم اور ناپاک جیسے الفاظ کے تکرار استعمال سے اشعار میں تاثیر و جاذبیت کم ہو گئی ہے، بلکہ اس رکیک و نفت دیگر نگی نے اکثر اشعار کو پھیکا بنا دیا ہے، اس کی کچھ مثالیں پہلے گذر چکی ہیں اور چند ایک آگے آئیں گی۔

کاؤس ابلیس کے بہکانے پر آسمان کا رخ کرتا ہے جب یہ خبر رستم، گیو اور طوس کو پہنچتی ہے تو وہ بہت بڑا لشکر لے کر روانہ ہو جاتے ہیں، ایک اور سردار گودرز اس سلسلے میں رستم سے بات چیت کرتا ہے بات چیت کے دوران کاؤس کو برا بھلا کہتا ہے، گویا اس حصہ میں بھی چند اشعار ہجو و طنز پر مشتمل ہیں۔ (باقی)

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،

سید اقبال احمد

وفیات

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

از ضیاء الدین اصلاحی،

۲۴/۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رام پور میں انتقال ہو گیا، إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ ممتاز اہلِ قلم، غالبیات کے ماہر اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر تھے، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے،

عرشی صاحب کا خاندانی تعلق افغانستان کے یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ حاجی خیل سے تھا، ان کے دادا مولانا اکبر علی خاں محدث پیشۂ آبا سپہگری چھوڑ کر علم و فضل کے کوچہ میں وارد ہوئے، ان کی علمی جانشینی ان کے ایک فرزند مولانا جعفر علی خاں کے حصہ میں آئی، اور سب سے چھوٹے صاحبزادے مختار علی خاں صاحب کی کم سنی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا، اس لئے یہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، مگر ان ہی کے صاحبزادے مولانا امتیاز علی خاں عرشی اس خاندان کے گل سرسبد ہوئے۔

امتیاز علی خانصاحب کی پیدائش ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو ہوئی، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد عربی قواعد اور فارسی کی درسی کتابیں مدرسہ مطلع العلوم میں پڑھیں، اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا بڑا چرچا تھا، ہونہار طلبہ ملک کے

گوشہ گوشہ سے امتحانات دینے کے لیے لاہور جاتے تھے، عرشی صاحب نے ۱۹۲۳ء میں مولوی اور عالم کے امتحانات میں اول درجہ میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لئے اورنٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا، یہاں مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ اور مولانا عبد العزیز میمن جیسے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے استاذوں کا طوطی بول رہا تھا، مولانا سید طلحہ کا تعلق حضرت سید احمد شہید بریلوی کے دودمان عالی سے تھا، عرشی صاحب کا خاندان سید صاحبؒ کا معتقد اور رام پور میں "وہابیت" کے لئے بدنام تھا، اس لئے وہ مولانا طلحہ سے زیادہ مانوس اور قریب ہوئے اور مولانا بھی اُن پر خاص شفقت فرماتے تھے،

لاہور سے واپسی کے بعد انھوں نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں داخلہ لیا اور مولانا فضل حق رامپوری سے معقولات کا درس لیا جو امام معقولات . . . مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد خاص تھے، پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی میں انٹرنس کا امتحان دیا،

تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا تو ندوۃ العلماء لکھنؤ کی سفارت کی خدمت انجام دی مگر جلد ہی اس سے دل برداشتہ ہو گئے، ڈاکٹر سید عبد العلی ناظم ندوۃ العلماء ان کے کام سے مطمئن تھے، انھوں نے باصرار رد کا مگر عرشی صاحب نے استعفا واپس نہیں لیا،

رامپور کا عظیم الشان کتبخانہ وہاں کے ریاستی حکمرانوں کی قابل فخر یادگار ہے جب ۱۹۳۲ء میں عرشی صاحب کو اس کی نظامت سپرد کی گئی، تو پھر وہ اسی کے ہو کر رہ گئے اور اس کی خدمت، ترقی اور توسیع کے لیے اپنی زندگی ہی وقف کر دی، انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے کتبخانہ کی تزئین و آرایش اور جدید انداز پر اس کی ترتیب و تشکیل کر کے

اسے ایسا ادارہ بنا دیا جس سے ان کے بعد بھی لوگ مستفیض ہوتے رہیں گے۔ ان کو کتب خانہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے پھر کسی جانب نگاہ اٹھانا بھی پسند نہیں کیا۔ ایک دفعہ ڈھائی ہزار ماہوار پر ایران و افغانستان کی ثقافتی سفارت انھیں پیش کی گئی، جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا، اور کتب خانہ سے ملنے والے ڈھائی سو مشاہرہ ہی پر قانع رہے۔ وہ اس کے لئے اپنے مزاج کے خلاف دوسروں سے سوال کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب مدتوں ریاست کے چیف منسٹر رہے، وہ فرماتے ہیں "جب سے میں چیف منسٹر ہوا ہوں کسی افسر شعبہ نے مجھے اتنا دق نہ کیا ہوگا، مجھ سے اتنے مطالبے نہ کئے ہوں گے جتنے عرشی صاحب نے، مگر سب کتب خانے کے لئے، اپنی ذات کے لئے ایک بھی نہیں۔"

اس ایثار و قربانی اور کتب خانہ کی بے لوث خدمت نے ان کو شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا، پورے ملک میں ان کا علمی وزن محسوس کیا جاتا تھا، ان کو بڑے بڑے اعزاز و انعام سے نوازا گیا، ساہتیہ اکاڈمی کے علاوہ پریسیڈنٹ اوارڈ بھی ملا، ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں یادگاری مجلے پیش کئے گئے، وہ ملک کی اہم علمی کانفرنسوں میں مدعو کئے گئے، اور بیرونِ ملک بھی تشریف لے گئے۔

غالبیات عرشی صاحب کی بحث و تحقیق کا خاص موضوع ہے، ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کر کے اردو کے محققین اور غالبیات کے ماہرین کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی اور تمام اصحاب علم و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس میں انھوں نے مرزا غالب کے ان خطوط کو جمع کیا تھا، جو نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین نواب کلب علی خاں وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے، عرشی صاحب کے مبسوط مقدمہ اور حواشی نے غالب کے خطوط میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ "انتخاب غالب" کی اشاعت بھی ان کا اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ ہے،

غالب نے سنہ ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کی فرمایش پر اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب کیا تھا، جو عرشی صاحب کے مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ فرہنگ غالب میں مختلف زبانوں کے لفظوں کی وہ تشریحات درج ہیں، جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی تھیں یہ سنہ ۱۹۴۷ء میں چھپی، سنہ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے غالب کا تمام اردو کلام شایع کر کے قدر دانوں کو بیش قیمت علمی سوغات دی یہی دیوان غالب نسخۂ عرشی کہلاتا ہے، اس میں غالب کے تقریباً تمام اردو اشعار آگیے ہیں، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) گنجینۂ معنی (۲) نوائے سروش (۳) یادگار نالہ،

وہ زندگی بھر غالب کے متعلق تحقیق و جستجو کرتے رہے، اور ان پر درجنوں مضامین بھی لکھے اُن کی غالب سے متعلق متعدد کتابیں اور تحریریں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں،

عرشی صاحب کا موضوع غالب ہی تک محدود نہ تھا؛ وہ شعر و ادب، سیر و تراجم، تاریخ و مذہب اور فلسفہ ہر چیز میں برق تھے، اور انکا شہب قلم اردو، فارسی اور عربی میں رواں دواں رہتا تھا، عربی میں ان کا اہم باشان کارنامہ امام سفیان ثوری کی تفسیر کی دریافت و اشاعت ہے، اس کے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی سے ان کی غیر معمولی کد و کاوش کا پتہ چلتا ہے، اس کے علاوہ بعض عربی دواوین اور ابو عبید قاسم بن سلام ہروی صاحب کتاب الاموال (م سنہ ۲۲۴ھ) کا رسالہ اجناس بھی انھوں نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا، فارسی میں وقائع عالم شاہی، تاریخ محمدی اور تاریخ اکبری وغیرہ کو منظر عالم پر لانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، ان کے تحقیقی کاموں میں ایک اہم چیز "نادرات شاہی" ہے، یہ خاندان مغلیہ کے آخری دور کے بادشاہ جلال الدین شاہ عالم ثانی کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے، اسکی اشاعت سے پہلی دفعہ لوگوں کو اس مظلوم بادشاہ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کا علم ہوا

عرشی صاحب نے مقدمہ میں اس کے حالات، اور شاعرانہ کمالات پر مفید گفتگو کی ہے۔

آخر میں رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی انگریزی میں فہرست مرتب کرکے چھ جلدوں میں شایع کیا انکی غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد بیشمار ہے، طالب علمی کے زمانہ میں جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو وہاں کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی کی فرمایش پر انہوں نے ایف۔ اے اور بی۔ اے کے کورس کی عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا تھا، اسی سلسلہ میں ان کو حضرت عمرؓ کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال بھی جمع کرنے کا خیال ہوا، اس کے لئے زندگی بھر مواد فراہم کرتے رہے مگر یہ کتاب نامکمل رہ گئی،

شعر بھی موزوں کر لیتے تھے، عرشی تخلص تھا لیکن شعر و سخن میں اُن کا ذوق اتنا لطیف اور معیار اس قدر بلند تھا کہ اپنا کلام پسند نہ آتا تھا، اور وہ اسے اساتذہ کے کلام سے بہت کمتر سمجھتے تھے، اس لئے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آنے دی،

مخطوطات کی تحقیق و دریافت، ان کی تلاش و جستجو اور انکو محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کرکے شایع کرنا عرشی صاحب کا خاص امتیاز ہے، وہ متن کی تصحیح و تحشیہ کے کام سے اُس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جبتک کہ انکے تمام نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیتے، اسکے لیے ان جگہوں کا سفر کرتے تھے جہاں انکے نسخے موجود ہوتے یا انکی نقلیں مہیا کرتے انکی تحریریں عالمانہ وقار و سنجیدگی کے ساتھ ہی سادگی، لینت، سلاست، روانی اور دلآویزی ہوتی تھی، انکی شخصیت باوقار تھی اور وہ بڑے وجیہ و شکیل، اور جامہ زیب تھے، چہرہ بشرہ ہر چیز سے متانت اور سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی، راقم کو دارالمصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا، گفتگو بہت شایستہ، نرم اور شیریں انداز میں کرتے تھے، خالص علمی گفتگو اس قدر پُر لطف اور دلچسپ انداز میں کرتے کہ سننے والے کو اکتاہٹ نہ ہوتی، ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، ان کی نفاست اور نظافت پسندی کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے، جو بہت اچھی اور عمدہ چھپی تھیں،

عرشی صاحب ممتاز عالم و محقق تھے لیکن وہ نہ دوسروں کو اپنے علم و کمال سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے اور نہ خود کسی سے مرعوب ہوتے تھے، رام پور کی لائبریری میں اہل علم کے علاوہ اکثر وزرا، سرکاری حکام اور عمائد بھی آتے رہتے تھے، مگر وہ ان سے اس طرح ملتے کہ علم کی آن بان میں فرق نہ آنے دیتے بلکہ آنے والے خود ان کے علمی وقار اور ذاتی وجاہت و شرافت کو متاثر ہوتے تھے، وہ بہت متوازن اور عالی ظرف تھے، بڑے بڑے انعام و اعزاز پاکر بھی آپے سے باہر ہوئے اور نہ کسی قسم کی رعونت اور پندار میں مبتلا ہوئے۔

ان کی زندگی بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے بری تھی، اُن میں خود نمائی اور خود ستائی کا مرض نہ تھا، کبھی ایسی بات نہ کہتے جس میں اظہار فضیلت کا شائبہ ہوتا، اپنے علمی کاموں کی تعریف و تحسین اور دوسروں کی شکایت و مذمت سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے، خوردوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمسروں کے قابل قدر کاموں کی داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کرنے میں ان کو بہت لذت ملتی تھی، کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لئے جو لوگ آتے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے، ان کا علم و مطالعہ بہت وسیع تھا، اسلئے ہر ایک مطلب کی کتابوں کی نشاندہی کرکے اسکی اکثر مشکلات حل کر دیتے اور اسکو متعدد کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیتے

انکو دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا اسکے علمی کاموں کے مداح اور قدر دان تھے، معارف میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت بھی تھی، ماہنامہ ریاض کراچی کے اپریل ۵۲ء کے شمارہ میں انکے خطوط "نامہ سلیمان" کے عنوان سے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کئے تھے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے زمانہ میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی میں شرکت کیلئے رام پور سے تشریف لائے تھے، مالک رام صاحب نے انکی ستّرویں سالگرہ کے موقع پر انکو ایک یادگاری مجلہ پیش کیا تھا اسمیں موجودہ ناظم دارالمصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کا عرشی صاحب پر ایک پُرمغز مقالہ بھی شامل ہے،

عرشی صاحب کا اوڑھنا بچھونا علم تھا اور بقول شیخ سعدی ؎ پئے علم چوں شمع باید گداخت کے مصداق تھے، اب انکی طرح خاموشی اور سچی لگن کے ساتھ صلہ و ستایش کی تمنا کئے بغیر علم کی خدمت کرنے والے کم یاب ہیں، اللہ تعالیٰ انکو عالم آخرت کے بلند مدارج عطا فرمائے آمین!

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث الجزء الاول — مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکنی، تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۰۰، قیمت ۲۰ روپیہ پتہ حافظ ہاؤس میلاپورن اسٹریٹ، مدراس ۱۴

یہ لائق مصنف کے اُن خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے کالی کٹ یونیورسٹی کی دعوت پر جدید عربی ادب کے موضوع پر وہاں عربی میں دئے تھے، اس سلسلہ میں ان کو مصر، شام، لبنان، عراق اور ہجر کے مشہور اصحاب کمال کے متعلق اظہار خیال کا موقع ملا تھا، زیر نظر کتاب ان خطبات کی پہلی جلد ہے، اس میں تقریباً تیس ممتاز اصحاب شعر و ادب کے سوانحی خاکے درج ہیں، شروع میں مشرق وسطی کے دو صدیوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں دولت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد عربی ملکوں پر مغلوں کے تسلط، آلِ عثمان کے تخت و تاج کے مالک ہوتے، خلافت اسلامیہ کے قیام، مغربی ممالک کی سازشوں اور عربوں کے ان کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہونے وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، پھر عربی طباعت و صحافت کے متعلق ضروری مفید معلومات قلمبند کیے ہیں، اس ضمن میں متعدد مشہور اخباروں، رسالوں اور ان کے اڈیٹروں کا تذکرہ بھی ہے، اس کتاب میں جن مصنفین و شعراء کے حالات و کمالات کی مصوری کی گئی ہے، ان میں کچھ قابل ذکر نام یہ ہیں، رفاعہ رافع طہطاوی، علی پاشا مبارک، سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، شیخ محمد رشید رضا، عبد الرحمن کواکبی، جرجی زیدان، مصطفیٰ منفلوطی، شیخ اسماعیل صبری، احمد شوقی، حافظ ابراہیم، خلیل مطران، امیر شکیب ارسلان وغیرہ، مصنف نے ان لوگوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی

ان کی خدمات اجمالاً تحریر کی ہیں، اور صرف مسلمان اربابِ قلم کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ عیسائی ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، وہ کہنہ مشق مصنف ہیں، انھوں نے کئی برس تک دار المصنفین میں تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی، پھر مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی و اردو کے صدر بھی رہے، ان کو اردو ہی کی طرح فارسی اور عربی لکھنے کا بھی اچھا ملکہ ہے، اس کتاب سے ان کے اچھے تصنیفی سلیقہ اور عربی زبان پر قدرت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے، امید ہے کہ عربی زبان و ادب کا ذوق رکھنے والے ان کی محنت کی قدر کریں گے، اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا،

محدثین کی قوتِ حفظ :- مرتبہ مولوی محمد ابوبکر غازی پوری صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۹۲، قیمت ۲ روپیہ، پتہ المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل سید واڑہ، غازی پور،

احادیث کے جمع و تدوین اور ضبط و تحریر کا عظیم الشان کام محدثین کی مقدس جماعت کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے، محدثین کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت کی قوت بے مثال تھی، زیر نظر کتاب میں انھیں محدثین کے حفظ و ضبط کے حیرت انگیز واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اس کا سلسلہ صحابۂ کرام و تابعین عظام کے دور سے شروع ہو کر اس صدی کے نامور محدث مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم پر ختم ہوا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے لئے مفید اور کار آمد ہے، مگر بعض محدثین کے حفظ کے واقعات ہی نہیں دیئے گئے ہیں، اور بعض کے احادیث کے بجائے اشعار وغیرہ کے حفظ کا ذکر ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "انکے علم اور قوتِ حفظ کو جاننے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ انھوں نے سات سو جلدوں میں قرآن کی تفسیر تالیف کی تھی" (ص ۱۳۱) حالانکہ یہ صرف وسعت علم کی دلیل ہے، محدثین کے طبقہ میں واقدی اور ابن جریر کا ذکر بے محل ہے، اول الذکر سیر و مغازی کے عالم اور موخر الذکر مورخ کی حیثیت سے مشہور ہیں،

مصنف نے امام ابوحنیفہؒ کا تابعی ہونا مدلل طور پر ثابت کیا ہے مگر خلف بن ایوب کا جو قول نقل کیا ہے (ص ۲۳) اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، عربی عبارتوں کا لفظی ترجمہ کرنے اور بعض ثقیل و نامانوس عربی الفاظ استعمال کرنے سے تحریر کی روانی و سلاست میں کمی آگئی ہے،

عرفانِ محبت :- از مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۰، قیمت ۱۲ پتہ :- مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ

مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی کی ذات شریعت و طریقت کی جامع، رشد و ہدایت کا منبع اور طالبین سلوک کا مرجع ہے، ان کی صہبائے معرفت کے اس وقت مشرقی یوپی کے لوگ خاص طور لذت شناس ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو شعر و سخن کا بھی اچھا اور ستھرا ذوق عطا کیا ہے، وہ اپنی محفلِ ارشاد و ہدایت کو اپنے پُرسوز کلام سے پُراثر اور پُرکیف بنا دیتے ہیں، اب ان کے قدردانوں اور مسترشدین نے ان کی دکانِ معرفت سے دردمندوں کے لیے دوائے دل کا سامان اُن کا مجموعہ کلام شائع کرکے کیا ہے، یہ زلف و گیسو اور گل و بلبل کی حکایت اور ہجر و وصال کی داستان نہیں ہے بلکہ صدائے ربانی اور نغمۂ لاہوتی ہے،

ہے اشارہ کچھ ان کی جانب سے　　اس لئے یہ غزل سرائی ہے
کرم ہے کرم خاص اختر پہ ان کا　　کہ جلوہ اسے اپنا دکھلا رہے ہیں

یہ ایک صاحبِ دل کا کلام ہے جس میں عشق کی مستی و سرشاری، محبت کی گرمی و شعلہ نوائی، جذبات کی لطافت و پاکیزگی اور خیالات کی معنویت و گہرائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ قلبی واردات و باطنی کیفیات کا ترجمان اور بادۂ معرفت کا ایک چھلکتا ہوا جام ہے، ....
.... جو تمامتر دل کی آواز معلوم ہوتا ہے
اس میں راہِ سلوک کے ہر مرحلہ کے نشانات اور شیخِ طریقت کی صحبت، پیرِ میخانہ کی بزم اور

چشم ساقی کے فیض کے بہت دلکش جلوے اور دلآویز مرقعے ملتے ہیں، صاحب کلام کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، وہ بتاتے ہیں کہ اس منزل پر پہنچنے کے بعد تمام حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، اور ہر سو محبوب ہی کے جلوے نظر آتے ہیں، سچا عاشق دام محبت سے رہائی کا آرزو مند نہیں ہوتا، بلکہ آتش عشق و محبت میں مرمر کے جیتا اور بسمل کی طرح تڑپتا ہے، وہ محبوب کی غلامی پر فخر کرتا ہے، اور اس میں اسکو سلطانی و فرمانروائی کا لطف ملتا ہے، اس کا احساس سود و زیاں مٹ جاتا ہے، اور وہ فرقت میں وصل اور ہجر میں حضور کی لذت سے سرشار رہتا ہے، یہ مجموعہ عشق و محبت کے ان ہی حقائق و اسرار اور ان کی کیفیتوں اور لذتوں کی شرح و تفسیر اور لاہوتی ترانوں اور سرمدی نغموں سے معمور ہے، مولانا کا کمال یہ ہے کہ عشق و مستی اور جذب و کیف کے اس عالم میں بھی ان کا ہوش قائم رہتا ہے، اور خم کے خم پی کر بھی ان کی گرفت دل اور جذبات پر باقی رہتی ہے، اس لئے نفس سے بیگانہ اور عقل کے پیچھے دیوانہ نہیں ہوتے اور بندگی کی لذت کے مقابلہ میں حال وقال کی لذتوں کو ہیچ خیال کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو توحید و رسالت کا مرتبہ شناس بننے کی دعوت اور اسوۂ محمدیؐ اختیار کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں، انھوں نے مرزا غالبؔ وغیرہ کے بعض اشعار میں اپنے ذوق کے مطابق اصلاح و ترمیم کی ہے، اس کے کچھ نمونے مجموعہ کے آخر میں دئے گئے ہیں، انکے بعض اشعار خالص فنی حیثیت سے بھی کم درجہ کے نہیں ہیں وجدانی کوائف اور عارفانہ حقائق سے معمور اس کلام کو پڑھکر دل کی دنیا بدل جاتی ہے، اور وہ انوار و تجلیات سے معمور ہو جاتی ہے۔

ایک معلم کی تگ و گذشت، معاصرین کے خطوط نامہ یادداشت } مرتبہ جناب بشیر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۱۹۲ و ۱۱۲ و ۱۴۴، قیمت ہر ایک کی دس روپیے، پتہ: سلیم بلبشرار دو سوسائٹی (رجسٹرڈ) گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں، یوپی

جناب بشیر علی صدیقی کی زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت و ترقی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف رہی ہے درس و تدریس انکا پیشہ تھا، وہ ایک فعال اور عملی شخص ہیں، بڑھاپے میں بھی انکے جوش عمل اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی ہے ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہونے کے بعد سلیم جشیر اردو میڈیم اسکول تعلیم بالغان اور اردو ٹیچر سرٹیفکیٹ کے نصاب کی ٹریننگ کی نگرانی وغیرہ کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو انکی قوت عمل اور ذوق علم و تعلیم کا ہے، انکو شروع ہی سے تحریر و تالیف کا ذوق تھا معلمی کے دور میں بھی انکا تحریری سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا، اور اب بھی جاری ہے، انکی تصنیفات زیادہ ضخیم نہ ہونے کے باوجود بضاعت کمتر و بقیمت بہتر ہوتی ہیں پہلی کتاب میں طویل تعلیمی زندگی کی سرگذشت تحریر کی ہے اس میں انھوں نے شعبۂ تعلیم سے اپنی اولین وابستگی کے وقت سے سبکدوش ہونے تک کے تمام حالات و واقعات، اشتغال، معمولات اور تجربات قلمبند کئے ہیں اسلئے اسکی حیثیت آپ بیتی کی ہوگئی انکی تعلیمی زندگی کا آغاز گورنمنٹ انٹر کالج میں معلم کی حیثیت سے ہوا تھا پھر وہ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور آخر میں گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے، انکی ملازمت کی زندگی مختلف اسکولوں اور مختلف جگہوں میں بسر ہوئی اس دور میں طلبہ، اساتذہ، پرنسپل اور انسپکٹر کے علاوہ مختلف قسم کے اشخاص و افراد سے ان کا سابقہ پڑا، ادبی کاموں کے لئے طلبہ کے تحریری و تقریری مقابلے اور سالانہ مشاعرے کرائے، کالج میگزین کی نگرانی کی، علاقائی اور ڈسٹرکٹ ریلی اسکولی زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں پیش پیش رہے، اس کتاب میں ان سب کا بے تکلفی کے ساتھ دلچسپ انداز میں ذکر ہے اس سے گذشتہ نصف صدی کے ابتدائی و ثانوی تعلیم و تدریس کے شعبہ کے اتار چڑھاؤ اور مصنف کے درسی و تعلیمی تجربات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری اور تیسری کتاب مرتب کے ساٹھ سے زائد معاصرین اور احباب کے خطوط کا مجموعہ ہے، جن خطوط میں کسی استفسار کا ذکر ہے انکا جواب بھی دیدیا ہے، اور ہر خط کا پس منظر اور اسکے مندرجات کی وضاحت بھی کر دی ہے، یہ تینوں کتابیں ایک تجربہ کار معلم اور اردو زبان کے شیدائی کی تصنیف ہونے کی بنا پر گوناگوں فوائد پر مشتمل ہیں، امید ہے معلمین و متعلمین کے حلقہ میں ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند ۵ا کتابوں پر مشتمل ہے اسی کے تحت عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں
یا رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے حصۂ اول میں عہد مغلیہ سے
مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی تاریخی
ں کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً
فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے ان کی مذہبی رواداری، انسان دوستی
م نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت ۔ ۔ ۔ روپیہ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن)

تبع تابعین حصۂ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے
ب امام ابوحنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ
دوا اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح
کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل تھا، دوسرے حصے
یں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی کے علاوہ ایک
م کا قلم، امام یحییٰ مسعودی، اور امام عبدالرزاق
وا اور دوسرے ہم، صاحب تصنیف اور
عوت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،
محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین
قیمت :- ۲۰

مرزا مظہر جانجاناں

(اور ان کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو اور فارسی کے ایک
صاحب کمال صوفی شاعر ہیں اس کتاب میں
انہی کے سوانح و حالات اور ان کا تمام اردو
کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین
عبدالرحمن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور
جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف
کے مختصر حالات ہیں،

(مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی)

قیمت :- ۱۲

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں احادیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا، یہ احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پھیلیں، دنیائے اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں، محدثین کرام کا اُمت پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں اور نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک گوشہ چھان مارا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کی تحقیق و [illegible] اہتمام کے ساتھ جمع کیا اُن کے مجموعے مرتب کئے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے مقدس سلسلہ کی تکمیل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاری پر ایک مختصر اور صاحب موطا امام مالکؒ کی سوانح عمری وہ لکھ بھی چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے بعد یہاں کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیر ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالکؒ اور ائمہ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام عبد الرزاقؒ، امام حمیدی، امام احمد بن حنبلؒ، امام طحاوی وغیرہ کے حالات سوانح اور فن حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات سوانح اور ان کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصے میں آٹھویں صدی ہجری کے نصف اور اس کے بعد کے تمام قابل ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول: ۱۷ — قیمت حصہ دوم: ۱۹ — "منیجر"

جلد [illegible] نمبر [illegible] اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس ۲۰ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

([illegible])

جلد ۱۲۷ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

معارف کے گذشتہ شذرات میں چودہ سو سال ہجری کے اندر مسلمانوں کی تاریخ کے کچھ ایسے المناک پہلو پیش کیے گئے، جن سے ہمارے بعض ناظرین کو دکھ پہونچا ہوگا، اب آئندہ چند اشاعتوں میں مسلمانوں نے فرماں روائی، جہانبانی اور جہانداری کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے اُن کا بھی جائزہ لینا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے بیعت لینے والوں سے مخاطب ہو کر انتہائی انکسار سے فرمایا: "لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو، اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کرو، ان شاء اللہ تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے، یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں اور ان شاء اللہ تمہارا قوی فرد بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے دوسرے کا حق حاصل نہ کر دوں، جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اس کو خدا ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اس کو عام مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو، اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں" آپ اپنے حکام کا انتخاب کرتے وقت نصیحت فرماتے کہ بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے، تم خدا کی راہ پر ہو جس میں افراط و تفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں جس میں مذہب کے استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے، اس لیے سستی اور تغافل کو راہ نہ دو۔

حضرت عمر فاروقؓ نے خلافت کی خدمات انجام دینے میں اپنی حیثیت ایک متولی اور شیرازہ بند کی رکھی تھی، لوگوں سے کہتے کہ تمہارے مال میں مجھ کو اسی قدر حق ہے جس قدر ایک یتیم کے مال میں متولی کا ہوتا ہے، تم کو حق ہے کہ مجھ سے مواخذہ کرو کہ ملک کا خراج بے جا طور سے نہ جمع اور نہ صرف کیا جائے، میرا یہ فرض ہے کہ تمہارا روزینہ بڑھاؤں،

سرحد کی حفاظت کروں، اور تم کو خطروں میں نہ ڈالوں، آپ اپنے عمال کو مقرر کرتے وقت ہدایت دیتے کہ وہ اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں، باریک کپڑے نہ پہنیں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازے پر دربان نہ رکھیں اہل حاجت کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں، عیاض بن غنم عامل مصر کو بیش قیمت لباس پہننے اور محل بنانے کی شکایت پر کمل کا کرتہ پہنوا کر ان سے بکریاں چروائیں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے لئے محل بنوایا جس میں ڈیوڑھی تھی، تو آپ نے اس ڈیوڑھی میں آگ لگوادی۔

حضرت عمرؓ کے ایوانِ عدالت میں شاہ و گدا، ادنیٰ و اعلیٰ، خویش و بیگانہ اور مسلم و غیر مسلم سب برابر تھے اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو آپ اس سے قصاص لیتے تھے، غیر مسلموں کا علاقہ فتح ہوتا تو اعلان فرماتے کہ ان کے مذہب و شریعت اور جان و مال کو امان ہے، رعایا کی خبر گیری کے لیے راتوں کو گلیوں میں گھوم پھر کر حالات کا پتہ چلاتے، پھر دور دراز ملکوں کا دورہ بھی کرتے رہتے، آپ کی خلافت کے زمانہ میں سونے چاندی کی گنگا بہنے لگی تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرعسرت زندگی کی یاد میں نہ اچھا کھاتے اور نہ اچھا پہنتے، بدن پر پیوند لگا ہوا کرتہ، سر پر پھٹا ہوا عمامہ، پاؤں میں بوسیدہ چپل ہوتی، اسی حالت میں بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے کاندھے پر مشک اٹھا لیتے، کام سے تھک کر مسجد کے گوشہ میں فرشِ خاک پر سو جاتے، مزاج میں سختی تھی، جو صرف حق پرستی کی خاطر تھی، فرمایا کرتے کہ میرا دل خدا کے بارہ میں جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا ہے، مگر اسی کے لیے پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

بیت المال کی رقم کو بڑی احتیاط سے صرف ہونے دیتے، ایک دفعہ بیمار پڑے، علاج میں شہد تجویز کیا گیا، جو بیت المال میں موجود تھا، مسجد نبویؐ میں جا کر لوگوں سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو تھوڑا سا شہد لے لوں گویا بیت المال پر خلیفۂ وقت کو اپنا اختیار کچھ بھی نہیں تھا، ایک بار آپ کی زوجہ ام کلثومؓ نے قیصر روم کے پاس تحفہ میں عطر کی چند شیشیاں بھیجیں، جس نے اس کے جواب میں شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر بھیجا، آپ کو معلوم ہوا تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ گو عطر تمہارا تھا، لیکن اس کو لے جانے والا قاصد

سرکاری تھا، اس کے مصارف عام آمدنی سے ادا کیے گئے، وہ جواہرات لے کر بیت المال میں داخل کر دیئے اور ان کو کچھ معاوضہ دے دیا، ملک میں جتنے اپاہج، ازکار رفتہ اور مفلوج لوگ تھے، ان کی خوراک بیت المال سے دلاتے۔

حضرت عثمانؓ عرب کے متمول ترین لوگوں میں تھے، مگر دوسرے تیسرے دن عموماً روزے رکھتے، کبھی کبھی مہینوں روزے سے رہتے، اور رات کو صرف اسی قدر کھاتے کہ سد رمق کے لیے کافی ہو، گھر میں لونڈیوں اور غلاموں کی کثرت تھی، لیکن تہجد کے وقت کسی کو بیدار کرنے کی تکلیف نہ دیتے، ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے، کبھی کبھی اچھے کپڑے بھی پہن لیتے، مگر اس کا خیال رکھتے کہ اچھا لباس پہن کر عُجب و غرور پیدا نہ ہونے پائے، اپنے زمانۂ خلافت میں ذاتی مصارف کے لیے بیت المال سے ایک حبہ بھی نہیں لیا، دن کے وقت مہماتِ خلافت میں مصروف رہتے، رات کا اکثر حصہ عبادت میں گذارتے اور کبھی ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے، آپ میں سیرچشمی اور حسن سلوک کے اوصاف اتنے تھے کہ آپ کے مخالفوں کو آپ کے خلاف غلط واقعات مشہور کرنے کا موقع ملا۔

حضرت علیؓ حضرت عمرؓ ہی کی طرح عمال کی نگرانی میں سخت تھے، اصطخر کے والی منذر بن جارود کے متعلق آپ کو معلوم ہوا کہ وہ زیادہ وقت سیر و شکار میں صرف کرتے ہیں اور فرائض منصبی میں غفلت برتتے ہیں تو ان کو لکھ بھیجا کہ تمہارے گھر کا جاہل بھی تم سے بہتر ہے، پھر انھیں معزول کر دیا، اپنی اور اپنے متعلقین کی ذات پر بیت المال کی معمولی چیز بھی صرف نہ ہونے دیتے، ایک بار آپ کی صاحبزادی ام کلثومؓ کو عمرو بن سلمہ نے ایک پیالہ شہد اور ایک پیالہ چربی بھیج دی، حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو دونوں پیالے واپس منگوا لیے، ان میں سے جو کچھ خرچ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ لگا کر اس کی قیمت ادا کر دی، خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود فرماتے کہ دنیا مردار ہے، جو اسے حاصل کرنا چاہے اس کو کتوں کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے حضرت امام حسنؓ سے بیعت کی، مگر کچھ مہینوں کے بعد

ان کو محسوس ہوا کہ ان کی خلافت متنازعہ فیہ بن جائے گی، تو مسلمانوں کا خون خرابہ روکنے کی خاطر خلافت کو خیرباد کہہ کر مدینہ میں عزلت نشینی اختیار فرمالی، اگر حضرت امام حسنؓ کے اس اسوہ کی پیروی مسلمانوں کا حکمران طبقہ برابر کرتا رہتا تو ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

امیر معاویہؓ کا جو اختلاف حضرت علیؓ سے ہوا اس سے ان کی ذات متنازعہ فیہ ضرور بن گئی، لیکن انھوں نے اپنے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے جس طرح حکمرانی کے فرائض ادا کیے اس کی بنا پر وہ بنو امیہ میں سب سے بڑے مدبر اور بیدار مغز فرماں روا سمجھے جاتے ہیں، ان کے طرز حکومت کا اصول ان ہی کے قول کے مطابق یہ تھا کہ جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو توڑنا پسند نہیں کرتا، لوگوں نے پوچھا: کس طرح؟ تو جواب دیا کہ لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں، اور جب کسی آدمی کی کوئی بات ناگوار معلوم ہوتی ہے تو اس کی زبان انعام و اکرام سے بند کر دیتا ہوں، وہ سختی سے ضرور کام لیتے، مگر ان میں حلم کا پہلو غالب تھا، کہتے کہ غصہ پی جانے سے زیادہ میرے لیے کوئی اور شے پسندیدہ نہیں، ایک موقع پر فرمایا کہ خدا ابوبکرؓ پر رحم کرے، نہ انھوں نے دنیا کو چاہا، نہ دنیا نے انھیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے چاہا، لیکن انھوں نے دنیا کو نہیں چاہا، عثمانؓ کو دنیا میں مبتلا ہونا پڑا، پھر اس کا اعتراف کر کے نادم ہوتے کہ ہم لوگ تو دنیا میں مبتلا ہو گئے، مگر پھر کہا: خدا کی قسم یہ حکومت بھی خدا ہی نے مجھ کو دی ہے، ایک دوسرے موقع پر کہا: خدا کی قسم اگر میرے سامنے خدا اور اس کے ماسوا کا سوال آتا ہے تو میں خدا ہی کو اختیار کرتا ہوں"

امیر معاویہؓ کے جانشین یزید اول کے زمانہ میں کربلا کا سانحہ پیش آیا، اس کی وفات کے بعد اس کے نوجوان لڑکے معاویہ کو حکومت دی گئی، جو اکیس سال کا ہونے کے باوجود بڑا دیندار اور صالح تھا، اس کے باپ کے زمانہ میں جو المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے ان سے اس کا دل حکومت سے پھر گیا تھا، اس لیے

تخت بیٹھنے کے بعد ہی مسلمانوں سے یہ کہکر حکومت سے دستبردار ہوگیا کہ تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بناؤ۔

بنو امیہ کے حکمرانوں میں عبدالملک بن مروان کا شمار مدینہ کے ممتاز فقہاء میں تھا، اس عہد کے اکابر علماء و ائمہ اس کے علمی کمالات کے معترف تھے، وہ اپنے اہم فرامین اور مراسلات کے سرنامہ پر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ لکھتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کرتا، اپنے سکہ پر بھی قُلْ هُوَ اللّٰه اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه نقش کرایا تھا۔

ولید بن عبدالملک کے اعلیٰ اوصاف جہانبانی کی بدولت اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی اور زندگی کے ہر شعبہ میں مرفہ الحالی کی وجہ سے بنی امیہ کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ وہ بڑا مذہبی بھی تھا، تین دن میں ایک قرآن مجید ختم کرتا، دوشنبہ اور پنجشنبہ کو پابندی سے روزے رکھتا، رمضان شریف میں روزہ داروں کے لیے کھانے بھجواتا، صلحاء و اخیار کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتا، دو مرتبہ حج بھی کیا، مسجد نبویؐ اور جامع دمشق کی تعمیر اور تزئین و آرائش میں بے دریغ دولت صرف کی۔

سلیمان بن عبدالملک اپنے اوصاف کی بنا پر مفتاح الخیر یعنی بھلائی کی کنجی کہلاتا، اہل مدینہ اور قریش کے خاندان والوں کے لیے بڑے بڑے وظائف مقرر کیے، پھر اپنے آخری وقت میں اپنے بیٹے اور حقیقی بھائی کی موجودگی میں لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا جانشین قرار دیا، جن کی وجہ سے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ ہوگئی، سلیمان کا یہ کارنامہ اس کے اور تمام کارناموں پر بھاری ہے۔

سلیمان کی تجہیز و تدفین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو شاہی سواری پیش کی گئی تو انھوں نے فرمایا: میرا خچر میرے لیے کافی ہے، اسی کے ساتھ اس فکر و تشویش کے بارے دب گئے کہ مشرق و مغرب کا کوئی ایسا فرد نہیں جس کا ان پر حق نہ ہو، مطالبہ اور اطلاع کے بغیر اس کا ادا کرنا ان پر فرض نہ ہو، پھر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدا نے جو چیز حلال اور حرام کر دی وہ قیامت تک کے لیے حلال اور حرام ہے،

ہیں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں بلکہ صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں، میں تمہاری ہی طرح معمولی فرد ہوں، البتہ تمہارے مقابلہ میں خدا نے زیادہ گران بار کیا ہے،

ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے ارکان اور دوسرے عمائد نے جو غاصبانہ طور پر جاگیریں بنائی تھیں، ان کی اسناد کا خریطہ منگایا، انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینک دیا، اپنی اور اپنے پورے خاندان کی ایک ایک جاگیر بھی واپس کر دی، ان کی بیوی فاطمہ کو ان کے باپ عبدالملک نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا، ان سے کہا کہ اس کو بیت المال میں داخل کر دو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اطاعت گذار بیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی،

انھوں نے شاہی شکوہ و تجمل کے تمام اخراجات موقوف کر دیئے، ملک کے مجبور اور معذور اشخاص کے لیے وظائف مقرر کیے، نادار قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کی ایک مد قائم کی، رعایا کے ساتھ ظلم و جور کے جتنے وسیلے تھے، سب بند کرا دیئے، ایک والی کو لکھا کہ وسوسۂ شیطانی اور حکومت کے ظلم و جور کے بعد انسان کی بقا نہیں ہو سکتی، جزیہ کی وصولی میں اتنی نرمی برتی کہ بازار کا نرخ بڑھ گیا، عمال کے نام جو فرامین بھیجے اُن سب میں احیائے شریعت اور استیصالِ بدعت کی تاکید کی، مرض الموت میں ان کے پاس صرف ایک قمیص تھی، ان کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے اپنی بہن سے کہا کہ لوگ عیادت کو آتے ہیں، دوسری بدل دو، وہ سن کر بولیں خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں، جو ایک جوڑا کپڑا تھا، اس پر پیوند پر پیوند لگے ہوئے تھے، ان کے بچے بھی اسی تنگی سے زندگی بسر کرتے رہے۔

ہشام بن عبدالملک میں امیر معاویہؓ کا حلم و تدبر اور عبدالملک کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی جمع ہو گئی تھی، اس کے زمانہ میں رومیوں کو اسلامی حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اس نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ جب تک شہادتوں سے اس کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ عامل میں ناجائز

آمدنی کا کوئی حصہ شامل نہیں، اُس وقت تک اس کو بیت المال میں داخل نہ کیا جائے، چالیس شہادتوں کے بعد ایسی آمدنی داخل کی جاتی تھی، اس کے ایوان عدالت میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہوتے، ایک مرتبہ ایک نصرانی نے اس کے لڑکے محمد کے غلام کو کسی بات پر مارا، وہ زخمی ہوگیا، محمد کے خواجہ سرا نے اس کے بدلہ میں نصرانی کو مارا، ہشام کو معلوم ہوا تو اس نے خواجہ سرا سے باز پرس کی کہ اس کو بدلہ لینے کا کیا حق تھا، اس نے محمد کے دامن میں پناہ لی، لیکن سزا سے بچ نہ سکا، وہ اپنے لڑکوں سے نماز پابندی سے پڑھواتا، ایک مرتبہ اس کا ایک لڑکا جمعہ کی نماز میں نہ جا سکا، عذر کیا کہ سواری نہ تھی، ہشام نے کہا: کیا پا پیادہ نہیں جا سکتے تھے؟ پھر سزا کے طور پر ایک سال کے لیے اس کی سواری بند کردی، اس میں بردباری بھی بہت تھی، ایک بار ایک شخص نے اس کو رودر رو سخت الفاظ کہے، اس نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اپنے امام کو برا کہنا مناسب نہیں۔

مارچ کا پورا مہینہ دہلی، اسلام آباد اور کراچی کے سفر میں گذرا، میری عدم موجودگی کی وجہ سے گذشتہ معارف کے شذرات میں طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، مثلاً ص ۱۶۵ پر ہرش وردھن کے بجائے ہرشن وردھن، ص ۱۶۶ پر سیتھی کے بجائے سینتھی، ص ۱۶۷ پر چندر کے بجائے چندا، ص ۱۶۷ اور ۱۶۸ پر سیسودیہ کے بجائے سیودیہ، ص ۱۶۸ پر رہے کے بجائے رہیں کی طباعت ہوگئی ہے، اسی طرح کی اور غلطیاں ہیں جن کو معارف کے ناظرین اپنے ذوق سے تصحیح کرکے ممنون کریں۔

چودہ سو سال ہجری کے خاتمہ پر ایک بین الاقوامی سمینار دہلی اور دوسرا اسلام آباد میں ہوا، ان دونوں میں شرکت کا موقع ملا، ان کی روداد معارف کے آیندہ شماروں میں انشاء اللہ شائع ہوگی۔

مقالات

کیا مصباح الارواح کا مصنف جمالی دہلوی تھا؟

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مصباح الارواح مثنوی کے طرز میں ایک کتاب ہے، جس میں حصۂ نثر بھی کافی پایا جاتا ہے، نثر میں آیات قرآنی و احادیث کی مختصر تشریح عارفانہ رنگ میں ہے، پھر ان ہی مطالب کو نظم کے پیرایہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، دراصل اس کتاب کا موضوع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس بیان میں عرفان اور طریقت کا رنگ غالب ہے، اس کتاب پر ایک مقالہ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاء الدین سجادی نے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور کے جشن صد سالہ تاسیس کے موقع پر پیش کیا تھا[1]، اس مقالہ میں اس کا مصنف جمالی دہلوی[2] بتایا گیا ہے، یہ جمالی کنبوہ صاحب سیر العارفین ہیں، جن کی وفات ۹۴۲ھ میں ہوئی ہے، سجادی صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مآخذ میں یہ کتاب جمالی اردستانی متوفی بسال ۸۷۹ کی طرف منسوب کی گئی ہے، مگر ان کے نزدیک یہ انتساب غلط ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

[1] یہ مقالہ "جشن نامہ" ج ۲ مشتمل خطبات و مقالات مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۷۶ء میں شامل ہے. ص ۲۵۵ تا ۲۶۲　[2] مقالہ میں ان کا نام شروع میں حامد بن خضر اللہ کئی بار درج ہو گیا ہے، واضح رہے کہ خضر اللہ کتابت کی غلطی ہے، فضل اللہ ہونا چاہیے.

"...او جالب توجہ آنکہ بسیاری از ماخذ آثار او را بہ پیر جمال (یعنی جمالی) یعنی جمالی اردستانی نسبت دادہ اند از جملہ ہدایت در ریاض العارفین فتح الابواب و شرح الواصلین جمالی دہلوی را بہ نام جمالی اردستانی ذکر کردہ است۔"

اس سے واضح ہے کہ فتح الابواب و شرح الواصلین بھی جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں،
آگے پھر لکھتے ہیں۔

"در ہر حال مصباح الارواح جمالی دہلوی کہ موضوع بحث ماست یک مثنوی[1] است کہ در حدود چہار ہزار و چہار صد و پنجاہ بیت دارد و نخستین مثنوی از ہفت بخش بیان حقایق احوال المصطفیٰ است کہ شش بخش دیگر ان بہ ترتیب۔ احکام المجین، نہایۃ الحکمۃ بدایۃ الجنۃ، ہدایۃ المعرفۃ، فتح الابواب و شرح الواصلین است۔"

اس سے واضح ہے کہ ان ساتوں تصانیف کا مصنف جمالی دہلوی ہی ہے،
آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جمالی دہلوی کی یہ ساتوں کتابیں جمالی کی تصانیف کے ایک قلمی مجموعے میں ہیں، جن میں حسب ذیل کتابیں اور شامل ہیں،

مہر قلوب، قدرت نامہ، نصرت نامہ، فرحت نامہ، مرأۃ العجیب اور شرح رباعیات با فضل،
اس حساب سے جمالی دہلوی کی ۱۳ تصانیف ہوئی ہیں،
اس کے بعد لکھتے ہیں:

"در بعضی از ماخذ آثاری دیگر نیز بہ جمالی دہلوی نسبت دادہ اند مانند مثنوی مرات المعانی و نیز کتاب سیر العارفین کہ بہ سال ۱۲۱۱ھ ق در دہلی بہ چاپ رسیدہ

---

[1] دراصل نثر کے ذکر سے صرف نظر ہوا ہے، اس سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ اس میں نظم ہی نظم ہے، مگر ایسا نہیں، جگہ جگہ نثر کی عبارتیں آ گئی ہیں، جمالی کی اکثر تصانیف کی یہی خصوصیت ہے۔ خود اردستانی کے ایک بیان میں اشعار کی تعداد پانچ ہزار بتائی گئی ہے،

وتذکرہ ای در مقامات واحوال مشائخ چشتیہ وسہروردیہ ہند دارد" (دائرۃ المعارف اسلامی)

اس بیان میں سیر العارفین کو تذکرہ سے الگ قرار دینے میں پروفیسر سجادی سے غلطی ہوئی ہے، دراصل سیر العارفین ہی تذکرۂ مشائخ چشتیہ وسہروردیہ[1] ہے

پروفیسر سجادی سے بڑا سہو ہوا ہے کہ انھوں نے مندرجۂ بالا ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف قرار دیدیا، حقیقت یہ ہے کہ مرأت المعانی اور سیر العارفین کے علاوہ جن کتابوں کا اوپر نام گنایا گیا ہے، وہ جمالی اردستانی[2] کی ہیں، مرات المعانی اور سیر العارفین البتہ جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں،

سجادی صاحب نے مصباح الارواح کی تصنیف ۸۶۸ھ بتائی ہے اور جمالی کی وفات ۹۴۲ ہجری لکھی ہے، اگر وہ انہی دونوں باتوں پر غور کر لیتے تو اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی، وفات کے وقت اگر جمالی کی عمر ۸۰ سال کی فرض کی جائے تو اس کی پیدائش ۸۶۲ ہجری قرار پاتی ہے، اور ۸۶۸ ہجری میں جب وہ مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہے اس کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اگر ۹۰ سال کی مدت میں ۹۴۲ میں وہ ۱۶ سال کا ہوگا، جمالی کی تصانیف اس تاریخ سے کچھ پہلے کی ہیں، مثلاً

---

[1] اس میں ہندوستان کے حسب ذیل ۱۴ مشائخ کا تذکرہ ہے، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ، شیخ بدر الدین محمودؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ صدر الدین عارفؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ، حضرت نجیب الدینؒ متوکل، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، حضرت جلال الدینؒ تبریزی، شیخ نصیر الدینؒ اودھی، سید جلال الدین مخدومؒ جہانیاں، شیخ سماء الدین دہلوی، بعض نسخوں میں تعداد میں کچھ کمی بیشی ہے، [2] اردستان کاشان اور اصفہان کے درمیان ایک قصبہ ہے، اصفہان سے ۱۸ فرسخ اور نزدوارہ سے ۲ فرسخ دور ہے (لغت نامہ دہخدا) میں جمالی اردستانی، جمالی دہلوی سے الگ قرار دیا گیا ہے۔

محبوب الصادقین کی ۸۶۶ھ اور روح القدس کی ۸۶۵ ہجری ہے، جمالی کی ان تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علوم ظاہری کے سارے منازل طے کر چکا تھا، اور تصوف و سلوک باطنی میں نہایت بلند مرتبہ حاصل کر چکا تھا، سوچنے کی بات ہے کہ بارہ پندرہ سال کے بچے سے ان علوم میں ایسی دستگاہ کا حصول کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات جو واضح ہو کر الصدر ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی ملک قرار دینے میں حائل ہے وہ یہ ہے کہ سیر العارفین کی روایت ہے کہ ۹۲۳ ہجری میں جمالی دہلوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جمالی کی تاریخ پیدایش ۸۶۲ قیاس کرنے پر ۹۲۳ میں اس کی عمر ۱۸ سال اور ہجری ۸۵۲ فرض کرنے پر ۷۱ سال ہوتی ہے، ۸۰ سال کی عمر توالد و تناسل کے اعتبار سے تقریباً ناممکن اور ۷۱ سال خلاف غیر عادی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۸ وغیرہ سالوں میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ جمالی دہلوی کی نہیں ہو سکتیں جس کی وفات ۹۴۲ ہے،

اب میں شہادت کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میرے سامنے[1] جمالی اردستانی کی حسب ذیل تصانیف پر مشتمل ایک قلمی مجموعہ[2] موجود ہے۔

(۱) مرآت سیا گنج دقایق جس میں قصۂ اجوبہ و عجوبہ عارفانہ رنگ میں بیان ہوا ہے، —

(۲) کنز الدقایق، (۳) روح القدس، (۴) تنبیہ العارفین (۵) محبوب الصادقین،

---

[1] راقم نے ۱۹۵۲ء میں جمالی دہلوی پر ایک مضمون "اردو ادب" میں شایع کیا تھا، اس میں جمالی دہلوی کو جمالی اردستانی سے الگ شاعر قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اس وقت مواد کی قلت کی وجہ سے بحث کا انداز دوسرا ہے، آگے اس مقالے میں پرانے مضامین کا حوالہ آیا ہے، [2] کتابخانہ مسلم یونیورسٹی، فارسی نمبر ۲۹۰ ۲۰ سطری، اشعار دو کالم میں، ورق تقریباً ۸۰، خط نستعلیق خوب، تاریخ کتابت ندارد۔

۶۔ کتاب معلومات، ۷۔ رسالہ کشف الارواح، ۸۔ راز تصوف، ۹۔ مرآت الافراد

ان کتابوں کے مصنف جمالی اردستانی ہونے کے چند اور ثبوت ہیں۔

(۱) جمالی اپنے پیر مرتضیٰ علی اردستانی مقیم اردستان سے روایت کرتا ہے،

از پیر خود[۱] قطب العارفین وسید الافراد وسلطان اولیا محب ومحبوب مصطفیٰ ومرتضیٰ

پیر مرتضیٰ علی اصفاہانی ساکن اردستان خبری دہم دفقیر از لب[۲] دوندان حضرت سالار

محققان پیر مرتضیٰ علی اردستانی علیہ الرحمہ شنیدم کہ فرمود حدیقہ حکیم سنائی" الخ

کنز الدقایق[۳] میں مذکور ہے کہ جمالی نے پیر مرتضیٰ علی اردستانی سے سنا کہ ان کی والدہ

نوشیروان عادل کے خاندان سے تھیں۔

پیر مرتضیٰ[۴] علی اردستانی قدس اللہ روحہ العزیز... درزمانی کہ نزدیک بود

خرقۂ مبارک بیرون کند وبایں فقیر ارزانی دارد

واضح ہے کہ پیر مرتضیٰ علی اردستانی جمالی اردستانی کے پیر تھے، جمالی دہلوی کے پیر کا نام

سماء الدین[۵] کنبوہ دہلوی ہے، ان کے ذکر سے جمالی دہلوی کا دیوان چھپا ہے، سماء الدین کے نام قصیدہ موجود ہے،

ان کی وفات پر دردناک مرثیہ کہا ہے، ان کے بیٹے کے مرنے پر بھی دوسرا مرثیہ لکھا ہے، سیر العارفین میں

ان کے حالات قلمبند کیے ہیں اور ان کو اور صرف ان ہی کو اپنا پیر و مرشد مانا ہے، پس جو کتابیں پیر مرتضیٰ علی

اردستانی کے مرید جمالی کی ہیں وہ جمالی اردستانی کی ہیں جمالی دہلوی کی نہیں ہو سکتیں۔

(۲) جمالی کی تصانیف میں ان کی دوسری کتابوں کا نام برابر آتا ہے، مثلاً کشف ارواح میں ہے[۶]:

---

[۱] مجموعہ رسائل پیر جمالی، مسلم یونیورسٹی لائبریری فارسی ۲۹/۴۱ ، کنز الدقائق وغیرہ۔ ورق ۲۶۲،
[۲] ورق ۲۲۴ [۳] ورق ۱۷ [۴] ورق ۶۷ [۵] سماء الدین دہلوی پر راقم نے ایک مقالہ لکھا تھا جو معارف" جنوری اور فروری ۱۹۵۵ء کے شماروں میں شایع ہوا تھا، [۶] مجموعہ رسائل ورق ۲۲۰ ب۔ اس کے پہلے کے ابیات میں مرآت، کنز الدقائق روح القدس، تنبیہ، محبوب، غزل، قصیدہ، مستزاد، حقایق، کشف اور مصباح کا نام آیا ہے،

جمالی شد تمام این کشف ارواح جہاں روشن کن از انوار مصباح

ای اخی معنی ذٰلک من انباء الغیب نوحیہ الیک درین کتاب کشف الارواح

شمۂ گفتہ شد آنچہ تعلق باہل خرابات دارد ان شاء اللہ در کتاب مصباح

الارواح بسمع مشتاقان برسد، میخواستم کہ حقیقت سورہ صف وجمعہ کہ ذکر آن در

کتاب مجبوب گذشتہ است درین کتاب بربستم نشد، این نیز حوالہ بکتاب مصباح

الارواح است۔

مرآت الافراد[1] میں لکھتے ہیں۔

" اگر شرح این کلمات خواہی کہ نیک بدانی کتاب مصباح کہ ذکر مولود حضرت

سید ولد آدم است مطالعہ کن"

مرآت الافراد[2] کے ایک نجی خط میں مصباح الارواح کے ساتھ احکام المجین اور نہایۃ الحکمۃ کا نام لیتے ہیں، یہ تینوں کتابیں پروفیسر سجادی کی فہرست میں شامل ہیں جو جمالی دہلوی کی بتائی گئی ہیں۔

" مقصود است اہل محبت در کتاب مصباح کہ مولود حضرت رسالت گذشتہ

بتامل مطالعہ کند واین کتاب را از برای آن می فرستادم کہ دو کتاب دیگر در عقب

این کتاب آمدہ است یکی احکام المجین نام دارد ودیگری نہایۃ الحکمۃ، می خواستم دو یک

جلد بنوشتم، ہنوز اندک کار تذہیب ماندہ بود، بعد از این ہرکارہ دان کہ آید وصول

خواہد یافت"

کتاب[3] مولود حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ پنج ہزار بیت رسید، والصحاست

---

[1] مجموعہ ورق ۲۶۳ [2] ورق ۲۰۰ [3] ورق ۲۰۰ ب

مراد مصباح الارواح ہے، جس کے اس نسخے میں جس کو پروفیسر سجادی نے پڑھا ساڑھے چار ہزار اشعار ہیں۔

پروفیسر سجادی کی فہرست جو جمالی دہلوی کی کتابوں کی بتائی گئی ہے، اس کی حسب ذیل دو کتابیں جمالی اردستانی اپنی بتاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

شرح[1] این کلمات در کتاب فتح الابواب کہ ذکر فتح کہ است بطلب کتاب[2] ہدایۃ المعرفہ مطالعہ کن،

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جو کتابیں مثلاً مصباح الارواح، احکام المحبین، نہایۃ الحکمہ ہدایۃ المعرفہ، فتح الابواب وغیرہ جمالی کی بتاتے ہیں وہ خود بقول جمالی اردستانی اس کی اپنی ہیں۔

(۳) جمالی دہلوی کے تین لڑکوں کا پتہ چلتا ہے، ایک بچپن میں مرگیا تھا جس کا نام حسن[3] تھا، اس کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو دیوان میں محفوظ ہے، دوسرا شیخ گدائی جس کو ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں اور اکبر کے دور میں ایسا اعزاز نصیب ہوا، جو خاندان کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہوا تھا، تیسرا بیٹا شیخ حیاتی تھا، اس کی پیدائش ۹۲۳ھ میں ہوئی، وہ شاعری کا بڑا ذوق رکھتا تھا مسائل علمی میں بھی اس کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، شیخ عبد الحق دہلوی نے اخبار الاخیار[4] میں اور عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ[5] میں شیخ کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن جمالی اردستانی کے یہاں ان میں سے کسی کا ذکر قدرۃً نہیں ملتا، اردستانی کے کئی بھی خطوط فرزند عمید الدین معروف کے نام ہیں، ان میں اپنے اشتیاق ملاقات اور جدائی کا ذکر کرتے ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ عمید الدین معروف

۱؎ ورق ۲۶۶ ب ۲؎ ورق ۲۶۰ ا ۳؎ دیکھیے اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۵۵، نیز اردو ادب ستمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۳ ۴؎ ایضاً صفحہ ۲۲۸-۲۲۹ ۵؎ ج ا ص ۲۱۰

ان کا لڑکا ہو، ایک خط میں اس کو فرزند جگر پر تاب سے خطاب کرتے ہیں (افراد ورق ۱۴۲ ب) دوسری جگہ فرزند مقبول سے (۳، ۲ ب) دوسرا بیٹا غالباً خواجہ مظفر الدین ہے۔ بانوے ایام کے نام خط میں اس بیٹے کو ان کے پاس بھیجنے کا ذکر ہے، بانوے ایام سے غالباً ان کی رفیقہ حیات مراد ہیں، انھیں لکھتا ہے کہ مظفر الدین کو میرے پاس بھیجدو، فرزند خواجہ جمال الدین محمد طائی کے بھی خط میں خواجہ مظفر الدین کو ساتھ لانے کا ذکر موجود ہے (ورق ۳، ۲) عمید الدین معروف کے خط میں متعدد آدمیوں کو سلام لکھوایا ہے، ان میں سے کسی کا تعلق جمالی دہلوی سے نہیں معلوم ہوتا، اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جمالی اردستانی کا جمالی دہلوی سے کوئی تعلق نہیں، اور جمالی اردستانی ہی مرآت الافراد کا مصنف ہے، چنانچہ اسی کتاب میں اس نے اپنی کتابوں کے نام گنائے ہیں، جن میں بیشتر وہ ہیں، جو پروفیسر سجادی نے جمالی دہلوی کی بتائی ہیں، پس سجادی صاحب کا ان کتابوں کے انتساب کے سلسلے کا قیاس سراسر غلط اور بے بنیاد ہے،

(۴) جمالی دہلوی کے دیوان کے دو نسخے مکشوف ہیں، ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں، اس میں تقریباً ۲۰۰۰ اشعار ہیں، یہ دیوان قصائد اور ترکیب بند و ترجیع بند، مراثی پر مشتمل ہے، دوسرا کلیات کا نسخہ ہے، جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے، اس میں غزلیات و قصائد قطعات، مراثی، مثنویات ہیں، ان کے علاوہ اس کا ایک تذکرہ سیر العارفین، اور دو مثنویاں مہر و ماہ اور مرأة المعانی ہیں، جمالی اردستانی کے کلام کے متعدد نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ان سے اس کی

۱؎ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں جمالی اردستانی کا جو مجموعہ رسائل ہے اس میں مرأت الافراد آخری رسالہ ہے جو ورق ۲۲۲ سے شروع ہوکر ۲۰۵ پر ختم ہوتا ہے، یہ اہم نثری تصنیف ہے جس میں عارفانہ رنگ کے

مختلف کتابوں اور رسالوں کے نام معلوم ہوتے ہیں، کلیات جمالی کے مختلف نسخوں کے مندرجات حسب ذیل تحریر تے ہیں:۔

(۱) مصباح الارواح، پیرس[۱]، کلکتہ، (۲) احکام المبین، پیرس (۳) نہایۃ الحکم، پیرس (۴) ہدایۃ الجنۃ، پیرس، (۵) ہدایۃ المعرفۃ، پیرس (۶) فتح الابواب، مجلس، پیرس (۷) شرح ابو اصلین، پیرس، کلکتہ، (۸) مہر القلوب، پیرس، کلکتہ، (۹) قدرت نامہ پیرس، کلکتہ، (۱۰) نصرت نامہ، پیرس کلکتہ، (۱۱) فرصت نامہ، پیرس کلکتہ، (۱۲) مرأۃ العجیب، پیرس (۱۳) شرح رباعیات بابا رکا شانی افضل، پیرس، (۱۴) گنج دقایق یا مرأت علی گڑھ (۱۵) کنز الدقایق، مجلس، علی گڑھ، (۱۶) شرح الکنوز نفیسی، (۱۷) روح القدس، علی گڑھ، (۱۸) تنبیہ العارفین، مجلس، علی گڑھ، (۱۹) مجبوب القصد یقین مجلس علی گڑھ کلکتہ (۲۰) میزان الحقایق نفیسی، (۲۱) کشف الارواح، مجلس، علی گڑھ، بوڈلین، (۲۲) راز تصوف علی گڑھ مجلس (۲۳) معلومات، مجلس، علی گڑھ، (۲۴) مرات الافراد، مجلس علی گڑھ (۲۵) مفتاح الفقر

(بقیہ حاشیہ ۲) چھوٹے چھوٹے رسالوں کے علاوہ متعدد دینی خطوط شامل ہیں، ان میں مصنف کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کافی مواد موجود ہے، اس رسالے کا آخری حصہ رسالہ فی تنبیہ السلاطین ہے، اس کتاب میں مثنوی کے متفرق اشعار کے علاوہ چند قصیدے شامل ہیں، دو قصیدے ۰۰ سے زیادہ ابیات پر مشتمل ہیں، متعدد غزلیں اور چند رباعیاں بھی آگئی ہیں، بقیہ دوسری کتابوں میں سوائے مثنوی کے اشعار کے غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کچھ نہیں ملتے، یہ سارے منظومات عارفانہ ہیں جن میں عشق و محبت کی شورش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، سلے اس فہرست میں ہر کتاب کے سامنے جگہ کا نام لکھ دیا ہے، جہاں کے کتاب خانے میں وہ نسخہ موجود ہے، پیرس کے نسخے کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے، کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور بوہار میں جمالی کی بعض مثنویات پائی جاتی ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے کے نسخے کا ذکر ہو چکا ہے،

(۲۹) نوریؔ علی نور، مجلس، کلکتہ، (۳۰) فضیلۃ العقل، کلکتہ، (۳۱) مشکوۃ المحبین، مجلس، (۲۹) مہر افروز، مجلس، (۳۰) استقامت نامہ، مجلس، (۳۱) ناظر و منظور، مجلس (۳۲) مثنویات (کوتاہ) مجلس (۳۳) قصائد مجلس، (۳۴) ترجیعات مجلس (۳۵) غزلیات مجلس (۳۶) رباعیات مجلس، پیرس (۳۷) مفردات وغیرہ مجلس (۳۸) مستزادات مجلس،

ان میں مرآت الافراد کے علاوہ سب منظوم کلام ہے، گو ان میں سوائے چند کے سب میں نثر کا خاصہ حصہ شامل ہے، جمالی اردستانی کا شیوہ یہ ہے کہ اول نثر میں کوئی موضوع اجمالاً ذکر ہوتا ہے پھر اس کی تفصیل اشعار میں (مخصوصاً مثنوی کے طرز میں) کی جاتی ہے، جمالی کا سارا کلام عارفانہ ہے جس میں اس کے شدید عارفانہ و صوفیانہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے،

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردستانی کا کوئی منظوم کلام جمالی دہلوی کے کلیات میں شامل نہیں علاوہ بریں دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، جمالی اردستانی کے یہاں جو عشق کا زور اور ہیجان پایا جاتا ہے وہ کسی صوفی شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا، جمالی دہلوی صوفی ضرور تھا، لیکن اس پر دنیاوی رنگ غالب تھا، متعدد بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے ابراہیم لودی کی تعریف میں اس کے قصائد موجود ہیں، اور جب اس کی شکست بابر کے ہاتھوں ہوتی ہے تو بابر کی تعریف میں اس سے پُرشکوہ نظمیں لکھتا ہے، جن میں ابراہیم لودی کی تعریض بھی ملتی ہے، اس لحاظ سے جمالی کی سیرت کی بلندی مشتبہ ہو جاتی ہے، جمالی اردستانی کے

(بقیہ حاشیہ ۲۵) نفیسی کے کتب خانے میں ۲ مثنویاں موجود تھیں، ان کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے، مجلس سے مراد مجلس شورائے ملی، تہران ہے، احمد بن یوسف شیرازی نے جمالی کے کلیات کے تین نسخوں کا تعارف فہرست ج ۲ میں کرایا ہے، بوڈلین میں جو نسخہ ہے، اس کا بھی ذکر وہاں کے کتب خانے مخطوطات فارسی کی فہرست میں ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

در محافل صدر مجلس بود بغایت دلیر بود، کمتر کسے را از اکابر در مجلس فرصت سخن دادے۔

۴ اس سلسلہ میں [illegible]

کلام میں کسی دنیاوی شخص کا ذکر تک نہیں ہے، کسی بادشاہ کی تعریف کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس کا کلام محبت خدا عشق رسول اور محبت اہل بیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، اس لحاظ سے دونوں کی الگ الگ راہیں ہیں، ایک اور اعتبار سے دونوں کے کلام میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے، جمالی اردستانی کی منظومات دراصل قرآن اور احادیث کی عارفانہ تشریح ہیں، جن میں جگہ جگہ نثر کی عبارت بھی پائی جاتی ہے، اور اسکو اس معاملے میں اتنا غلو ہے کہ مشکل سے کوئی عبارت اس خصوصیت سے عاری ملے گی، اس لحاظ سے اگر اس کے کلام سے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا انتخاب کیا جائے تو شاید قرآن کا بیشتر حصہ اور احادیث کا معتد بہ حصہ ہمارے سامنے آجائے گا، اس خصوصیت سے جمالی دہلوی کا کلام بے گانہ ہے، اس سے بطور نتیجہ صریح کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامی پر جمالی اردستانی کو جتنی قدرت حاصل تھی، اور جس کا اثر اس کے کلام میں موجود ہے، اس کا شائبہ جمالی کے کے یہاں نہیں۔

جمالی اردستانی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہر کتاب کے نثری حصے میں وہ اخی عزیز، فرزند وغیرہ کے الفاظ سے ہر جگہ خطاب کرتا ہے، یہ اس کا اپنا مخصوص طرز ہو گیا ہے، یہ جمالی دہلوی کی خصوصیت نہ تھی۔

ایک اور بات جو دونوں کے درمیان وجہ امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ جمالی اردستانی اپنی نثری تصنیف میں قدم قدم پر اشعار سے کلام کو مزین کرتا ہے، بلکہ پوری پوری غزلیں اور قصیدے درمیان میں نقل کر دیتا ہے، اس کی مرآت الافراد میں ایک قصیدہ ۱۰۰ ابیات اور دوسرا ۸۶ اشعار پر مشتمل ہے، جمالی دہلوی کا یہ شیوۂ نگارش نہیں،

ایک اور اعتبار سے دونوں کے یہاں تفاوت پایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جمالی اردستانی نے دیوان اور کلیات کی ترتیب میں مروجہ طریقے سے عدول کیا ہے، نظم و نثر،

قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ کو الگ الگ موضوع حتی الامکان نہیں بنایا گیا ہے اکثر یہ سب ملے جلے پائے جاتے ہیں، اس کے برخلاف جمالی دہلوی نے مروجہ طریقے سے اپنا کلیات مرتب کیا ہے،

جمالی دہلوی کی تصانیف خصوصاً سیرالعارفین میں ہندوستانی فضا ہے، ہندوستانی عرفائے ہندوستان میں مرتب کی ہوئی کتابیں مانند فوائد الفواد، خیرالمجالس، طبقات ناصری وغیرہ ہیں، جمالی اردستانی کی تصانیف کی فضا خالصتہً ایرانی ہے،

غرض ان وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک دونوں کے یہاں سوائے تخلص کے اشتراک کے اور کوئی چیز مشترک نہیں، دونوں دو الگ الگ شاعر ہیں، دونوں کا دور الگ ہے، دونوں کے کلام جدا جدا اور دونوں کا رنگ متضاد، یہ محض اپنی نظر کا قصور ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہ کر سکے،

پروفیسر ضیاء الدین سجادی نے جمالی اردستانی کا کلام جمالی دہلوی کی طرف منسوب کر دیا تو ان سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جمالی اردستانی کے وجود کے جب آپ قائل ہیں تو انکا کلام کہاں ہے، بہرحال یہ تو ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ جمالی اردستانی کی چند ابیات بعض کتابوں میں جمالی دہلوی کی طرف منسوب ہیں۔

محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ جمالی بہیئت گدائی میں جامی کے پاس پہنچے تو انھوں نے جمالی کے شعر کی فرمایش کی، انھوں نے یہ شعر پڑھے،

دو سہ گز کہنہ بوریا و پوستکے دلکے پر زدرد دوستکے
لنگکے زیر و لنگکے بالا نے غم دزد نے غم کالا
این قدر بس بود جمالی را عاشق رند لاابالی را

اگرچہ مجھے فی الحال کوئی قدیم سند اس واقعہ کی نہیں ملی، لیکن ریاض الشعرا[1] میں جمالی دہلوی کے تحت پہلا اور تیسرا شعر منقول ہے، لیکن ان اشعار کی نسبت جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے اس لیے کہ جمالی دہلوی ہرگز رند ولاابالی نہ تھا، وہ اچھا خاصہ درباری شاعر تھا، گو تصوف و عرفان سے لگاؤ بھی تھا، ان اشعار سے شاعر کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ جمالی اردستانی پر صادق آتی ہے، وہ عاشق تھا عشق میں سرشار دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ تقی اوحدی نے عرفات میں ان اشعار کو جمالی دہلوی کی ملکیت ماننے سے انکار کیا ہے، اور وہ حق بجانب ہے، تقی لکھتا ہے[2] :-

"پیر جمالی عراقی مولد و منشاء وے اردستان است، مانند پیران پیر، کیفی علی اردستانی بودہ... صاحب سلسلہ مرید و مولد است، مریدان خود را برداشتہ پیادہ بمکہ معظمہ پا زاد و در احد عافیت و سلامت بکعبۂ مراد و مقصود رسید ..... اشعار بسیار گفتہ، رقص پیر جمالی بدو منسوب است، چہ طبیعہ بذوق و سماع بودہ، باتفاق مریدان دست از ہستی و ہمی خویش کشیدہ، ماست بای بکوش می افشاندہ، او راست

دو گوک بود یا د بود ستکی   دکی پر زدود و دستکی
ایں قدر بس بود جمالی را   عاشق رند لاابالی را

بعضے ایں دو بیت را بہ جمالی دہلوی نسبت کردہ امر غلط و سہو است"

جمالی اردستانی کے کلیات کا ایک حصہ جو راقم کے ملاحظہ میں رہا، اس میں یہ اشعار میری نظر سے نہیں گذرے، لیکن حسب ذیل ابیات میں وہ اپنے کو رند ولاابالی قرار دیتا ہے، اور اتفاق سے یہ فقرہ مینا پہلی بیت میں پایا جاتا ہے:

[1] نسخہ کتب خانۂ دانش گاہ علی گڑھ، ورق ۸۰ ب [2] عرفات ج ۱، نسخہ بانکی پور پٹنہ۔ ورق ۱۹۱ - ۱۹۲۔

کرانشینیم رند و لاابالی · بجز از نابجز ساقی و ساغر

این نه ره بغیر لاابالی · کس می نزود پے جمالی

پروردہ عشق جز ملامت نیست · قامت عشق در سلامت نیست

تا جمالی جمال عشق ندید · رو دل در پلاس فقر کشید

تا کہ ناموش نہ بیند درے · تا خورد فاش بادہ بر سرکسے

اس طرح کے اشعار کی بنا پر جامی اور جمالی دہلوی کی ملاقات کے سلسلہ میں جو افسانہ تراشا گیا ہے، وہ محض بے بنیاد ہے،

استاد ضیاء الدین سجادی نے اپنے مقالہ کے آخر میں یہ لکھا ہے:

"درین مقالہ اہمیت کار جمالی دہلوی در این مثنوی و سایر آثارش نمودہ شدہ و باختصار دربارۂ آنہا گفتگوئے بمیان آمدہ و لے موضوع اصلی بحث ہماں مصباح الارواح است کہ برائے نخستین بار این نوع از آں صحبت می شود۔"

اس بیان میں اتنی بات ٹھیک ہے کہ مصباح الارواح پر اب تک کسی نے الگ سے کوئی مقالہ نہیں لکھا تھا، اور موصوف نے چند صفحے (۲۵۵ تا ۲۹۲) میں جمالی دہلوی اور اس کی طرف منسوب اس مثنوی کا تعارف کرایا ہے، لیکن انھوں نے مسئلہ کو بالکل الجھا کر رکھ دیا ہے، نہ وہ جمالی اردستانی سے واقفیت حاصل کر سکے اور نہ جمالی دہلوی سے، اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اس موضوع پر جو قابل ذکر مواد بیسیوں سال قبل مشرق و مغرب میں سامنے آچکا تھا، وہ اس سے مطلقاً واقف نہ تھے، ذیل میں اس سلسلہ کی بعض کوششوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں،

۱؎ مجموعہ رسائل جمالی اردستانی، نسخہ کتب خانہ علی گڑھ، ورق ۲۳۹ ۲؎ ورق ۱۰۹ الف

۳؎ ورق ۱۷۰ الف

تاکہ معلوم ہو سکے کہ تہران یونیورسٹی کے اس ایرانی پروفیسر کی تحقیق کا کیا درجہ ہے۔

اودھ کے کتب خانے میں جمالی کے کلام کے دو[2] حصے تھے، اسپرنگر نے لکھا ہے کہ جمالی کی ایک تصنیف بیان الحقائق ہے جو سات حصوں میں منقسم تھی، پہلی مصباح الارواح اور آخری شرح الواصلین، یہی بیان الحقائق مع چند اور رسالوں کے جناب سجادی صاحب کے پیش نظر تھی، اسپرنگر بھی سجادی صاحب کی طرح جمالی اردستانی کی شخصیت سے ناواقف ہے۔

اسٹورٹ نے ٹیپو سلطان کے کتاب خانے میں مصباح الارواح کے ایک نسخے کا پتہ دیا ہے، تفصیل اس کے یہاں نہیں ملتی، آکسفورڈ کے کتب خانہ بادلیان میں جمالی کے کلام کے یہ حصے موجود ہیں:

کشف الارواح، فضیلۃ العقل، نور علیٰ نور، قصائد و رباعیات، فہرست نگار نے انھیں جمالی دہلوی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی بیان الحقائق کے پہلے اور ساتویں حصے موجود ہیں، اور امپیریل لائبریری میں حسب ذیل پانچ مثنویاں موجود ہیں:

محبوب الصدیقین، مہر القلوب، فرحت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، پروفیسر ایوانو نے اسپرنگر، زاخو اور ایتھے کی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے آج سے پچاسوں سال پہلے لکھ چکا ہے کہ یہ مثنویاں جمالی دہلوی کی نہیں ہیں، ان کا بیان ملاحظہ ہو:

جمالی جو سنہ ۹۴۲ھ تک تقریباً بیس[2] کتابوں کا مصنف ہو، وہ ۶۰ سال بعد کیونکر اس قابل ہوگا کہ حج کی مشقت برداشت کرے اور وہاں سے واپسی پر سیر العارفین لکھے، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سیر العارفین کا تعلق عہد ہمایوں سے نہیں (حالانکہ یہ قیاس بے بنیاد ہے) پھر بھی حسب ذیل

---

[1] اس بحث کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "خسرو ثانی جمالی دہلوی" اردو ادب ستمبر ۱۹۶۲ء

قرائن کی وجہ سے دونوں کی شخصیت الگ الگ ثابت ہوتی ہے:

(۱) جمالی جو مذہبی مفکر تھا، اور جمالی صاحبِ سیر العارفین کے طرزِ فکر میں نمایاں فرق ہے۔

(۲) اول الذکر شیعہ معلوم ہوتا ہے، جب کہ سیر العارفین کا مصنف سنی اور صوفیہ سلاسل میں سلسلۂ چشت سے متعلق تھا۔

(۳) اول الذکر نے صرف ایرانی مشایخ کا ذکر کیا ہے، ہندوستانی مشایخ سے اس کا کلام عاری ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ عرض کرنے کی ہے کہ ایونا نے جمالی دہلوی کی وفات ۹۴۲ھ کے بجائے سہواً ۹۲۲ لکھی ہے، دراصل ۴ کا ہندسہ غلطی سے ۲ پڑھ لیا گیا ہے، دوسری بات جمالی ہندوستانی کا تشیع ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا کلام اہل بیت اطہار کی مدح سے پُر ہے، وہ حضرت علیؓ اور سیدنا حسنینؑ سے بڑی عقیدت رکھتا ہے، ان حضرات کی مدح کے سیکڑوں شعر اس کے یہاں موجود ہیں، لیکن اس نے کم از کم ایک جگہ حضرت ابو بکرؓ کا ذکر ایسے الفاظ سے کیا جو شیعہ حضرات کا عمومی مسلک نہیں ہے، وہ واقعہ یہ ہے[1]:

"حق تعالیٰ کہ فرمود یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ[2] درسایہ آیت اشارہ بصحابہ کرد، می فرماید کہ اے پیغمبر بخیز و نزدیکان را بیدار گرداں وایشاں را بایمان درآور واز غبار کفر شاں پاک گرداں کہ ایشاں ہمچنیں دلباس جان تو اند ودین اسلام بعد ایشاں قرار گیرد کہ جان بے تن قرار نگیرد واز ایں جہت بحکم اول صدیق ایمان آورد، ودیگر علی مرتضیٰ علیہ السلام کہ ابو بکر از تابان است ذلی ابو العالی طالب از متطہران است، قولہٗ تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ[3]۔

---

[1] مجموعہ رسائل جمالی، نسخۂ علی گڑھ، ورق ۲۶۸ ب [2] قرآن سورہ ۷۴، آیت ۱، ۲۔
[3] قرآن سورہ ۲: ۲۲۲

ﷺ فَانْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

یعنی گفتہ اند کہ امت گرفتار اہل شوند و بار ایشاں بر دوش خود گیرد، و گفتہ اند کہ ایشاں در خاندان دنیا بمانند و با تو سیر نکنند و اہل ایشاں را کوتاہ گرداں خصوصاً ہر کہ تو نزدیک است و فقیرست از بہر آں بود کہ صدیق گلیم بر دوش بست و ترک دنیا کرد کہ گوش سر تو ایں بشنید وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

علاوہ بریں اردستانی سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک تھے جیسا کہ خود ان کے حسب ذیل بیان سے واضح ہے:

"اوائل کتاب روح القدس در بیان روش انبیا[۲] است کہ شریعتش گویند و اواسط آں در بیان اہل طریقت و آخرش در شرح اہل حقیقت کہ ارباب عشق و محبت اند، و ایں قسم نیز اولش مشتمل بر ذکر شیخ الاسلام شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہ کہ شیخ شریعت است در شرح ... و [میانش] بیان احوال شیخ زین الملت والدین عبدالسلام کاموی قدس سرہ کہ پیر طریقت است، و آخرش مشتمل است بر بیان ظہور حضرت پیر مرتضیٰ علی اردستانی قدس اللہ روحہ العزیز کہ از ارباب تصوف و محبت و عشق و حقائق معرفت است و اہل معرفت او در سیر و سلوک و عاشقاں دانستند۔"

شیخ شہاب الدین سہروردی کی شخصیت اتنی معروف ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، شیخ زین[۳] الدین عبدالسلام کاموی شیخ کے تربیت یافتہ تھے، چنانچہ اردستانی نے

---

۱ قرآن۔ سورہ ۷۴، آیت ۲ - ۵، ۲ مجموعہ رسائل جمالی اردستانی نسخہ علی گڑھ ورق ۲، ۱

۳ شیخ زین الدین عبدالسلام کاموی کی زندگی کا یہ نہایت اہم ماخذ ہے، کئی سال سے راقم کو شیخ کے حالات کی تلاش تھی، اتفاق سے جا کر اس سلسلے میں کامیابی ہوئی ہے، اردستانی نے مرآۃ الافراد میں شیخ صدرالدین اشنوی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ درج کیا ہے، صدرالدین اپنے دور کے زبردست عالم اور فلسفی تھے، چنانچہ اپنے علم میں غلو کی وجہ سے شہر بدر بھی کر دیئے گئے تھے، شاعر بھی تھے، وصّاف کے معاصر تھے، چنانچہ اس نے ان کے متعلق دلچسپ اطلاع

آخر الذکر کے عرفان اور کسبِ فیوض کا ذکر متعدد جگہ کیا ہے۔[1]

ازاں قطب عالم شہ سہرورد — در علم بکشود بر زین فسرود

چو شد در کمالات بے مثل و طاق — فرستادہ شیخش بسوئے عراق

ضمناً ذکر ہے کہ شیخ زین الدین عبدالسلام کاموی کے نام سے شیخ اسماعیل بن عبدالمؤمن بن ابی منصور اصفہانی نے کتاب العوارف کا ترجمہ ۶۶۵ ہجری میں کیا، اس ترجمہ کو راقم نے ایک تفصیلی مضمون کے ذریعہ روشناس کرایا ہے، اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۹۷ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ان وجوہ سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ جمال الدین اردستانی سنی تھے، گو ان کی تفضیلیت بھی اسی طرح نمایاں ہے۔

آج سے ۲۶ سال قبل راقم نے ایک مضمون بعنوان "خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی" اردو ادب (جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴) میں شایع کیا تھا، اس میں جمالی اردستانی کی منظومات کے جمالی دہلوی کی طرف انتساب کو غلط بتایا تھا، اگرچہ اس وقت میرے پیش نظر نہ جمالی اردستانی کا کلیات اور نہ جمالی دہلوی کے کلیات نسخۂ رام پور تک میری رسائی تھی، پھر بھی میں اس نتیجے پہ پہونچا تھا کہ جمالی اردستانی کی تصانیف جمالی کی طرف منسوب نہیں ہو سکتیں، اس وقت میرے قیاس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ بہت مشکل سے تسلیم کیا جاسکے گا کہ ۸۶۵ھ میں شیخ جمالی دہلوی صاحب تصنیف ہو سکے گا،

(بقیہ صفحہ ۲۶۵) بہم پہونچائی ہے، ان کی شاعری کا سب سے اہم ماخذ شیخ اسمٰعیل اصفہانی کا ترجمہ عوارف المعارف ہے، ان کے والد شیخ تاج الدین اشنہی کے بھی کافی اشعار ترجمہ عوارف میں محفوظ ہیں، اشنہ جہاں سے ان دونوں بزرگوں کا تعلق ہے، اصفہان کا ایک قریہ ہے، اسی نام کا ایک قریہ ارومیہ کے جوار میں ہے، جمالی اردستانی کے بیان سے طے ہو گیا ہے کہ عماد الدین کا تعلق اصفہان والے قریے سے تھا، اشنہ سے اشنوی اور اشنہی دونوں نسبتیں منقول ہیں۔

[1] رسائل اردستانی، ورق ۶۳ ر

ساتھ ہی تصوف میں اس قدر پختہ ہو جائے گا کہ اس کے اہم مسائل شعر کے ذریعہ عام کر سکے گا، جمالی نے لکھا ہے کہ وہ شیخ سماء الدین سے رن تھنبور میں مرید ہوا، جب ان کی عمر ۶۵ سال سے زائد ہوگی، اگر شیخ کی عمر ۱۰۰-۹۰ سال کی سمجھ لی جائے تو چونکہ ان کا انتقال ۹۰۱ ہجری میں ہوا تو ان کی پیدائش ۸۰۱ھ یا ۸۱۱ھ میں ہوئی ہوگی، اور رن تھنبور کا قیام ۸۶۶ھ کے بعد کا ہوگا، گویا جس زمانے میں جمالی دہلوی صاحبِ تصانیف بتایا جاتا ہے، ابھی تصوف کے اعتبار سے طفل مکتب ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ جمالی کے ایک بیٹا[1] ۹۲۳ھ میں پیدا ہوا، اگر ۸۶۶ھ میں ان کی عمر ۳۰ سال فرض کر لی جائے (کیونکہ اس سے کم عمر کا آدمی صاحبِ تصانیف کثیرہ نہیں ہو سکتا) تو ۹۲۳ھ میں وہ ۸۷ سال سے کم نہیں ہوتے، ظاہر ہے کہ یہ عمر توالد و تناسل کے لحاظ سے زیادہ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اخبار الاخیار میں ہے کہ شروع شروع میں نام کی رعایت سے جلالی تخلص کرتے تھے، پیر کی ہدایت سے جمالی کر دیا، اس لیے اگر یہ جمالی کی ابتدائی تصانیف ہیں تو ان میں جلالی تخلص ملنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ۸۶۶ اور ۸۷۶ کے درمیان ۲۶ کتابیں لکھ ڈالیں اور ۸۷۶ اور ۹۴۲ کے درمیان صرف چند کتابیں؟ اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں۔

اس مضمون کے تقریباً ختم ہونے کے بعد مجھے کتب خانۂ مجلس کے کلیات جمالی اردستانی کا علم ہوا، جس کا ابن یوسف شیرازی نے تعارف کرایا، اس کتب خانے میں جمالی کی ۱۴ کتابوں کے علاوہ قصائد، مستزادات، غزلیات، رباعیات اور مفردات وغیرہ کا کافی حصہ موجود ہے، فہرست نگار کے

---

[1] یہ بیٹا عبدالحی تھا، جو کم عمری میں وفات پا گیا، لیکن اپنے علم و فضل کی وجہ سے کافی نام پایا، اخبار الاخیار میں اس کی بڑی تعریف ملتی ہے۔

نزدیک یہ جمالی اردستانی کی تصانیف ہیں، وہ جمالی دہلوی سے واقف ہی نہیں معلوم ہوتے۔

رسالہ معارف اعظم گڈھ (۱۹۷۶ء) کے چار شماروں میں (فروری تا جون) ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم کے مقالہ کا ترجمہ "جمالی، لودی اور مغل دور کا شاعر" کے نام سے شائع ہوا، مترجم جناب سلطان احمد صاحب ہیں، اس کے تیسرے حصہ میں "مثنویات جمالی" کے نام سے جمالی اردستانی کی پانچ مثنویوں یعنی مصباح الارواح، شرح الواصلین، محبوب الصدیقین، مہر القلوب اور کشف الارواح کا کسی قدر تفصیلی اور پانچ مختصر مثنویوں یعنی فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، فضیلۃ العقل، اور نور علیٰ نور کا بہت اجمالی تذکرہ شامل ہے، اور مضمون کی چوتھی قسط یعنی معارف مئی میں دکھلایا ہے کہ یہ منظومات جمالی دہلوی کے نہیں ہیں، ان کے فیصلہ کی بنیاد یہ قرائن ہیں:

(۱) بیان الحقائق لکھنے سے پہلے چوبیس مثنویاں لکھ چکا ہے، پس یہ کہن سالی کی تصنیف ہے، سیر العارفین اس کے ساٹھ سال بعد لکھی گئی، اس لیے یہ دونوں ایک مصنف کی کتابیں نہیں ہو سکتیں۔

(۲) ان مثنویات کا مصنف شیعہ معلوم ہوتا ہے، جمالی دہلوی سنی تھا۔

(۳) ان مثنویات کا پلان اور انداز بیان جمالی دہلوی کی دونوں مثنویوں سے مختلف ہے۔

(۴) مہر و ماہ اور مرأۃ المعانی جو جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں، دلکش انداز میں ہیں، مثنویات بالا کا انداز ایسا نہیں۔

لے لغت نامہ دہخدا میں جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، اور جمالی اردستانی کی ۱۵ مثنویوں کے نام درج کیے ہیں، ان میں مرأۃ الافراد کا بھی نام شامل کیا ہے جو نثری رسالہ ہے، کوچند قصیدے، متعدد غزلیں، دو ایک رباعیاں اور چند مختصر مثنویاں بھی درمیان میں آگئی ہیں، جمالی دہلوی کے پیر کا نام سما الدین کے بجائے بہار الدین درج ہو گیا ہے۔

لے ریحانۃ الادب ج ۱ ص ۲۸۳ میں جمالی کی تصانیف میں چند مثنویوں کے بعد اس کے دیوان، قصائد و غزلیات کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ جمالی اردستانی اور دہلوی میں فرق نہیں کرتے۔

(۵) مثنویات کے نثری حصہ کا سیر العارفین سے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں
دو مصنف کے تراوشِ خامہ کا نتیجہ ہیں۔

گو مضمون نگار طے نہیں کر سکے ہیں کہ یہ مثنویات کس جمالی کی ہیں؟ وہ جمالی اردستانی سے
ناواقف ہیں، بہرحال ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ وہ شیعہ تھا، البتہ دونوں کے دوروں کا فرق اور
دونوں کے انداز بیان میں تفاوت کا ذکر قبلاً ہو چکا ہے۔ مضمون نگار نے جمالی (اردستانی) کی
گمشدہ مثنویوں کے نام خود جمالی کی دی ہوئی فہرست کی بنیاد پر لکھے ہیں، یہ وہی مثنویاں ہیں جن کے
مختلف نسخوں کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، ان میں اب کوئی گمشدہ نہیں۔

مقالہ ختم کر چکا تھا کہ جمالی کی مثنوی مہر و ماہ کے مطبوعہ نسخے (۱۹۷۴ء) کا فاضلانہ مقدمہ جو
پیر حسام الدین راشدی صاحب کے تراوشِ خامہ کا نتیجہ تھا، نظر سے گذرا، اس میں انھوں نے
جمالی کی طرف منسوب چند مثنویوں کا نام درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا انتساب جمالی دہلوی
کی طرف غلط ہے، ان کے نزدیک وہ جمالی اردستانی کی ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے حسبِ ذیل
دلیلیں پیش کی ہیں:

(۱) دونوں کے افکار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۲) منسوب مثنویوں کا مصنف جمالی شیعہ، جبکہ جمالی دہلوی سنی تھا۔

(۳) جمالی دہلوی کی عمر ۸۰ سال فرض کرنے کے باوجود ۱۰۲۰ھ میں جو منسوب
مثنویوں کا سالِ اتمام ہے اس کی عمر ۱۴۰ سال کی ہوگی۔

(۴) جمالی دہلوی کا شروع کا تخلص جلالی تھا، وہ ان مثنویوں میں نہیں ملتا۔

(۵) ۸۶۶ھ اور ۸۷۰ھ کے درمیان چھبیس[۲۶] کتابیں ملتی ہیں اور بعد کی طویل مدت
میں صرف چند ہی کتابیں ہیں۔

(۴) سیر العارفین میں ہندوستانی صوفیہ کا نام ہے جو جمالی کی دوسری تصانیف میں بالکل ناپید ہیں۔

یہ سب دلائل وہی ہیں جو گذشتہ صفحے میں بحث میں آچکے ہیں بہرحال یہ مسلّم ہے کہ یہ جمالی شیعہ نہ تھا

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پیر صاحب نے اپنے مقدمہ میں پروفیسر سجادی کے مقدمہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کے قیاس کو غلط ٹھہرایا ہے۔

جمالی کی منظومات کا جو مجموعہ پروفیسر ضیاء الدین سجادی کے مطالعہ میں تھا، اس کا مخطوطہ پیرس کا ہے (بلوشہ ۱۷۰۵) اس کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کا مختصر ذکر فضل اللہ جمالی اردستانی دہلوی کے نام سے ایرج افشار نے فہرست مائیکروفیلمہائے کتابخانہ دانش گاہ تہران میں کیا ہے، دراصل یہاں جمالی دہلوی اور جمالی اردستانی دونوں کو ملا دیا گیا ہے، البتہ سعید نفیسی کے ایک نسخہ کے ذیل میں شرح الکنوز اور میزان الحقائق کو جمالی اردستانی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

یہ مختصر تاریخ ہے جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کی شخصیات کے سلسلہ کی کوشش کی، مگر پروفیسر سجادی کے پیش نظر صرف پیرس کے مجموعہ کا عکس تھا، بقیہ مواد ان کی دسترس میں نہ تھا، تعجب اس پر ہے کہ تہران میں اس سلسلہ میں جو کام ہوا وہ اس سے بھی ناواقف ٹھہرے بہرحال اگر ان کو تھوڑا سا اور مواد مل جاتا تو ان کے مقالہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

سجادی صاحب نے اپنے مقالہ کی خاورشناسوں سے داد چاہی ہے اور مزید اس بنا پر کہ مجھے مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف ہونے میں تامل تھا اور اس سلسلہ میں میرا مضمون نکل چکا تھا میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھا۔

جمالی اردستانی تحقیق ادبی کا دلچسپ موضوع ہے مگر یہ کافی مشکل موضوع ہے اور صرف اس شخص کے بس کی بات ہے جو فارسی کے علاوہ تاریخ اور علوم اسلامی میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔

گلدستۂ ہوش افزا بریلی

از

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، بریلی

انیسویں صدی عیسوی میں بریلی میں اردو شاعری کا تعلق خاص طور پر دو خاندانوں سے تھا، ان میں ایک خاندان نوابین روہیلہ کا تھا، نیاز احمد خاں ہوش اسی خاندان کے ایک مقتدر اور نامور شاعر تھے، راقم نے ان کے متعلق اپنی کتاب "چند شعرائے بریلی" میں لکھا ہے:

"نیاز احمد خاں ہوش کے اہتمام میں ایک رسالہ "گلدستۂ ہوش افزا" بھی نکلتا تھا جس کی طباعت مطبع نظامی کانپور میں ہوتی تھی، یہ گلدستہ بھی فراہم نہ ہو سکا"[1]

حال میں ہی گلدستۂ ہوش افزا کے پانچ شمارے بابت ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۹۱ھ تا ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ دستیاب ہو گئے، ان میں ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ کا شمارہ ناتمام ہے، اس گلدستہ کے متعلق ضروری معلومات یہ ہیں:

نام گلدستہ: گلدستۂ ہوش افزا ہمیشہ بہار، ضمیمۂ نور الانوار۔

[گلدستہ کے نام میں نواب نیاز احمد خاں کے تخلص یعنی ہوش کی رعایت ہے، گلدستہ کا یہ نام ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ کے شمارے تک ملتا ہے، البتہ اس کی نور الانوار کے ضمیمہ کی حیثیت ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں ختم ہو جاتی ہے۔ نور الانوار کے متعلق گارساں دتاسی نے یہ اطلاع دی ہے:

---

[1] چند شعرائے بریلی، ص ۱۳۳۔

" نورالانوار ایک اور اخبار ہے جو کانپور سے شائع ہوتا ہے، اس میں زیادہ تر انگریزی اخبارات کے تراجم اور اردو اخبارات کے منتخب مضامین شائع کیے جاتے ہیں، اس میں اکثر منظوم قطعات اور معمے بھی شائع ہوتے ہیں؛ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حکومت انگریزی کا مخالف اور سر سید احمد خاں کے خیالات کے خلاف ہے، اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے لکھا تھا کہ اس اخبار کے لیے زیادہ مناسب نام "ظلمت شعار" تھا، کیونکہ موجودہ لقب اس کی خصوصیات کی ضد ہے، برعکس نہند نام زنگی کافور"[1]

رجسٹرڈ نمبر: ماہ رمضان اور ماہ شوال ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں "رجسٹرڈ نمبر ۲۵ نورالانوار" ہے، مگر ماہ ذیقعدہ اور ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں یہی رجسٹرڈ نمبر ۹۱ اور ماہ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ کے شمارے میں ۲۷ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک گلدستۂ ہوش افزا ضمیمۂ نورالانوار کی حیثیت سے نکلتا رہا، اس کا رجسٹرڈ نمبر ۲۵ تھا، مگر بعد کے شماروں میں رجسٹرڈ نمبر بدل گیا، مذکورہ رجسٹرڈ نمبر کے علاوہ عنوان گلدستہ کے نیچے رمضان اور شوال ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں رجسٹرڈ نمبر ۳۴ اور ۳۹ علی الترتیب طبع ہوا، بعد کے شماروں میں اس طرح کا کوئی نمبر نہیں تھا، معلوم نہیں اس نمبر کا کیا مطلب تھا۔

تاریخ اجرا: گلدستہ میں جلد کا قرینہ ہجری سال کے اعتبار سے ہے، یعنی ایک سال کے بارہ شماروں کے بعد نئے سال کا شمارہ نمبر ایک سے شروع ہوتا ہے، مثلاً ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کا شمارہ نمبر ۱۲ پر ختم ہوا، تو ماہ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ کا پہلا شمارہ نمبر ایک اور جلد ۳ سے شروع ہوا ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۷۴ء کے شمارہ میں جلد ۲ اور شمارہ نمبر ۹ مندرج ہوا، اس حساب سے جلد (۱) اور شمارہ (۱) کی تاریخ یکم ماہ محرم ۱۲۹۰ھ ہوئی۔

---

[1] مقالات گارساں دی تاسی (۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک) ص ۳۴۱۔

قیمت پرچہ : تین آنہ سوائے محصول ڈاک، بحالت پیشگی دو آنہ فی پرچہ، ماہ شوال ۱۲۹۱ھ کے گلدستہ میں قیمت تین آنہ بحالت پیشگی مع محصول ڈاک اور چار آنہ بعد انقضائے یک ماہ شائع ہوئی مگر ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ اور بعد کے گلدستوں میں قیمت تین آنہ سوائے محصول ڈاک اور بحالت پیشگی دو آنہ طبع ہوئی۔

تاریخِ مشاعرہ : یکشنبہ اول ماہ انگریزی

نام میر مشاعرہ : جناب مولوی حکیم نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ نبیرۂ کرم الدولہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں صاحب بہادر نصیر جنگ مرحوم، شاگرد رشید جناب تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں صاحب بہادر، بہادر جنگ اسیرؔ لکھنوی۔

[نیاز احمد خاں ہوش ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، ان کا شجرۂ نسب یہ ہے : نیاز احمد خاں بن نیاز محمد خاں بن یار محمد خاں بن محمد یار خاں بن نواب حافظ رحمت خاں (متوفی ۱۷۷۴ء) والی روہیل کھنڈ۔ آپ نے فارسی زبان و ادب کی تحصیل بریلی کے معروف شاعر خلیفہ امیر الدین آزادؔ (متوفی ۱۸۶۷ء) سے کی، فن طب حکیم محمد ابراہیم لکھنوی سے حاصل کیا، ابتدا میں خلیفہ امیر الدین آزادؔ اور محسن علی خاں جوشؔ بریلوی (متوفی ۱۸۶۳ء) سے فن شعر اکتساب کیا، بعد کو میر مظفر علی اسیرؔ لکھنوی (متوفی ۱۸۵۸ء) کے شاگرد ہوئے، وہ "تاریخ روہیل کھنڈ" "مثنوی ترانہ ہوش" "حدیقۂ نعت" اور "کلیات ہوش" کے مصنف تھے۔ اعلیٰ پایہ کے قصیدہ نگار اور غزل گو تھے، پُر شکوہ غزلیں لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کا شمار صف اول کے اساتذۂ بریلی میں کیا جاتا ہے، ان کی وفات ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ راجہ غنایت سنگھ عنایتؔ نے تاریخ وفات لکھی ؎

از روے الم کہو عنایتؔ تاریخ	"جنت کو گئے نیاز احمد خاں والے"] ۱۳۰۹ھ

مقامِ مشاعرہ : بریلی کتب خانہ سرکار۔

[بریلی میں بازار کتب خانہ اور چوراہہ کتب خانہ اسی "کتب خانہ سرکار" سے موسوم ہیں، شاید ۱۹۶۲ء میں یہ قدیم و خوبصورت عمارت منہدم ہوئی، جس کی جگہ اب گھنٹہ گھر تعمیر کیا گیا ہے۔ "کتب خانہ سرکار" کی عمارت کو مفتی عنایت احمد نے ۱۸۵۵ء سے پہلے کسی سنہ میں تعمیر کرایا تھا، اس وقت مفتی صاحب بریلی کے صدر امین تھے، وہ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کے جس نے غالب کی دستنبو کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا، صدر تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ان کو فتنہ بھڑکانے کے الزام میں سزا دے کر جزائر انڈمان بھیجا گیا، مفتی صاحب کثیر التصانیف تھے، "علم الصیغہ اور حبیب الٰہ ان کی مشہور تصانیف ہیں، وہ بعد رہائی حج بیت اللہ کے سلسلہ میں جدہ کے قریب جہاز غرق ہونے کی وجہ سے فوت ہوئے (۱۷ر شوال ۱۲۷۹ھ مطابق ۹ر مارچ ۱۸۶۳ء)[1]

نام مہتمم و منصرم گلدستہ : سید رحمت علی جنون، مقیم بریلی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش بریلوی و حافظ عبد الحمید مقیم کانپور، مطبع نظامی۔

تعداد طبع اشعار بے اجرت : یازدہ شعر و یک سطر سرخی، نام صاحب کلام۔

تعداد اجرت طبع اشعار طرح زائد از یازدہ شعر : فی بیت پاؤ آنہ و سرخی و نام درصورت زیادہ ہونے ایک سطر کے فی سطر پاؤ آنہ مقرر ہوئے۔

تعداد اجرت طبع اشعار غیر طرح: فی بیت آدھ آنہ

قطعۂ تاریخ : از محمد عبد الرحمٰن خاں شاگرد مہتمم مطبع نظامی ؎

چو لالہ غنچۂ گلدستۂ ہمیشہ بہار
زرنگ طبع بصد حسن انتظام شگفت

بعطر بیزئ انفضال باغبان ازل
زشاخ تاک سے لالہ گوں بجام شگفت

گل مراد جہاں از نسیم نکہت بیز
پئے نظارۂ عشاق صبح و شام شگفت

---

[1] نزہۃ الخواطر از مولانا عبد الحی، ص ۳۴۰، مخزونہ رضا لائبریری رام پور۔

زشاغ خانۂ شاگرد بصفوانی تاریخ نوشت بلبل دل "گلشن کلام شگفت"

مصرعۂ طرح گلدستۂ حال : [بابت ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ]

مصرع جہاں میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پایا پیمبر کا۔

مصرعۂ طرح گلدستۂ آیندہ : مصرع شکر ہے ہاتھ مرا کاسۂ سائل نہ ہوا۔

مصرعۂ طرح مشاعرہ بابت جنوری : [۱۸ر جنوری ۱۸۷۵ء مطابق یکم ماہ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ]

مصرع فتنۂ محشر بھی بندہ ہے تری رفتار کا۔

[دراصل مذکورہ مصرعۂ طرح میں کلام غزل ونعت ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۲۵ر نومبر ۱۸۷۶ء کے گلدستہ میں طبع ہوا، ہر گلدستے میں مصرعۂ طرح کا قرینہ تین ماہ کی مدت پر مشتمل تھا یعنی مصرعۂ طرح بابت ماہ رواں (رمضان) مصرعۂ طرح بابت ماہ ثانی (شوال) مصرعۂ طرح بابت مابعد ماہ ثانی (ذیقعدہ) مشاعرہ بریلی کتب خانہ سرکار میں یکشنبہ اول ہر ماہ انگریزی کو منعقد ہوتا، جس کے مصرعۂ طرح کا اعلان دو ماہ پہلے گلدستے کے ذریعہ مشتہر کر دیا جاتا تھا]

تحریر سرورق : بہ نظر دفع حرج انطباع گلدستہ کے یہ التزام کیا گیا ہے کہ سکنائے شہر بریلی غزل اپنی بہت صحیح وصاف لکھ کر مشاعرہ میں اُسی وقت مرحمت فرمایا کریں اور حضرات بیرونجات خواہ شہر بانس بریلی محلہ بازار صندل خاں میں بخدمت فیض درجت جناب نواب صاحب بہادر موصوف پندرہ روز کے اندر تاریخ انطباع گلدستہ سے خواہ کانپور مطبع نظامی میں پاس مسمی عبدالمجید صاحب منصرم کے روانہ فرمایا کریں اور سکنائے شہر بریلی قیمت اجرت اشعار زائد واشعار غیر طرح ایک ہفتہ میں خواہ نواب صاحب بہادر کے پاس جمع کریں خواہ کانپور روانہ فرمائیں اور حضرات بیرونجات ہمراہ غزل کے قیمت اجرت روانہ فرمایا کریں، اگر تاریخ طبع گلدستہ سے غزل پندرہ روز پہلے روانہ فرمائیں گے تو بے تامل طبع ہوگی، اور گلدستۂ آیندہ میں شمول کی جائے گی اور جو صاحب

دس گلدستہ فروخت کرائیں گے، اُن کو ایک جلد مفت دی جائے گی، اور جو صاحب پانچ فروخت کرائیں گے، ان سے نصف قیمت ایک گلدستہ کی لی جائے گی، اور جو صاحب مبلغ ۳ے ر سالانہ پیشگی دیں گے ان سے حساب اجرت اشعار زائد نہ کیا جائے گا، کلمات کفر و شرک جس شعر میں ہوں گے وہ شعر نکال دیا جائے گا۔

[نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ کا مکان بازار صندل خاں متصل قلعۂ بریلی تھا، اس مکان میں ہنوز ان کے اہل خاندان رہتے ہیں، صندل خاں بزمانہ حافظ رحمت خاں شہر بریلی کا کوتوال تھا، آج کل بازار صندل کی بجائے بزریہ صندل خاں بولا جاتا ہے۔]

تحریر صفحۂ آخر: [گلدستہ بابت ماہ رمضان ۱۲۹۱ھ] صفحۂ آخر پر مندرجۂ ذیل اشتہار طبع ہوا: "یہ گلدستہ ضمیمۂ نور الانوار ہے، اور نور الانوار ہر ہفتے کو چھپتا ہے، اور گلدستہ ہر مہینہ میں ایک دفعہ چھپتا ہے، اور قیمت گلدستہ علاوہ قیمت نور الانوار کے ہے، پس جن مشتریان گلدستہ کو خریداری نور الانوار کی بھی منظور ہو تو ۶ے ر سالانہ پیشگی اندر میعاد دو ماہ یا عـہ سالانہ قیمت مابعد مع محصول ڈاک علاوہ قیمت گلدستہ کے عطا فرما کر طلب فرمالیویں۔"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نور الانوار کانپور ہفتہ وار اخبار تھا۔

اسی گلدستہ کی تاریخ اشاعت مولوی افضل علی ضوؔ بدایونی نے "غنچۂ بہاری ہے" سے برآمد کی ہے ؎

میرے مخدوم ہیں جو حضرت ہوشؔ — اُن سے کیا جو دے فیض جاری ہے
یعنی چھپواتے ہیں سبھوں کا کلام — عمدہ اسباب یادگاری ہے
بہر تاریخ سالِ گلدستہ — ضوؔ کہو "غنچۂ بہاری" ہے
۱۲۹۱

ورق کا سائز: لمبائی ۵ء۲۰ سینٹی میٹر × چوڑائی ۱۷ سینٹی میٹر۔ چار کالماں، مسطر ۲۹ سطری

مع عنوانات اوسطاً، گلدستے کے سرورق اور ورق آخر کے علاوہ گلدستے کے اندرونی مطالعے سے مندرجۂ ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

موضوع سخن بہ اعتبار اقسام شعر و نظم	گلدستوں میں زیادہ تر غزلیات اور کمتر قطعات، رباعیات و خمسیات شائع ہوتے تھے، گلدستوں میں مثنویات

و قصائد شائع نہیں ہوتے تھے، اسی طرح گلدستوں میں نعتیہ کلام شائع کرنے کا رواج نہیں تھا، نعتیہ گلدستے علحدہ چھپتے تھے، ان حقایق کو دیکھتے ہوئے گلدستۂ ہوش افزا کلام شعر و نظم کا بھنڈار ہے جس میں غزلیات طرحی و غیر طرحی وافر تعداد میں طبع ہوئیں، غزلیات میں نعتیہ مضامین پر مشتمل اشعار کے علاوہ مسلسل نعتیہ غزلیں بھی شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ قصائد و مثنویات نے بھی گلدستے میں جگہ پائی، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) قصیدۂ بہاریہ در مدح شاہ اودھ، تصنیف شیخ امان علی سحر لکھنوی ۔

ع فلک پہ طوطیٔ گردوں الاپتی ہے بہار

(۲) قصیدہ در مدح جناب شفاعت احمد صاحب وکیل عدالت غازی پور عُرف محمد صفات احمد خاں المدعو بہ امت خاں صاحب رئیس غازی پور، تصنیف لالہ جوالا شنکر اثیر شاگرد نسیم دہلوی۔

ع آ گئی فصل بہاری ہے چمن میں دھوم دھام

(۳) سلام، تصنیف نیاز احمد خاں ہوش ۔

(۴) قصیدہ در مدح نواب ممتاز الدولہ بہادر لکھنوی، تصنیف شیخ امان علی سحر لکھنوی،

ع آج کل باغ پہ عالم ہے گھٹا جوبن پہ

(۵) خمسہ شیخ علی حسین جنون لکھنوی بر غزل نواب حسام الدولہ بہادر حسام مرحوم ۔

(۶) رباعی ہدایت علی ہدایتؔ [بریلوی]

(۷) قطعات تاریخ طبع گلدستہ تصنیف مولوی افضل علی ضوؔ بدایونی، برج موہن لال عیارؔ بریلوی وغیرہ۔

(۸) مثنوی نغان قمرؔ مسمیٰ نسیم تصمیم در صنعت ذوبحرین از نتائج افکار یکتائے روزگار جناب کمالات انتساب حکیم فخر الدین صاحب حسنی، تخلص قمرؔ، رئیس رائے بریلی ؎

بحر رمل مسدس مقصور — بحر سریع مطوی موقوف

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات — مفتعلن مفتعلن فاعلات

یاس ہے اب عشق کی تاثیر سے — بھر گیا دل نالۂ شبگیر سے

(۹) پچپن ۵۵ بندوں پر مشتمل ایک خمسہ برغزل ناسخؔ، تصنیف بلیغؔ ؎

مصرع: طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

(۱۰) چوبیس ۲۴ بندوں پر مشتمل ایک مسدس در فضائل درود شریف، تصنیف ہدایت علی ہدایتؔ [بریلوی]

کیفیت گلدستہ: گلدستۂ ہوش افزا میں اساتذۂ لکھنؤ کو خاص طور پر جگہ دی گئی، گلدستے میں جن اساتذۂ لکھنؤ کا کلام شائع ہوا، ان کے اسماء یہ ہیں: شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی شاگرد ناسخؔ نواب ممتاز الدولہ بہادر ممتازؔ لکھنوی، منشی محمد مظفر علی خاں بہادر اسیرؔ لکھنوی، خواجہ محمد وزیرؔ لکھنوی شاگرد ناسخؔ، امام بخش ناسخؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی، آباد [مرزا مہدی حسن خاں لکھنوی] بادی علی اشکؔ لکھنوی، میر وزیر علی صباؔ لکھنوی۔

[گلدستہ میں ان شعراء کا کلام بھی چھپا جو فوت ہو چکے تھے]

مندرجۂ بالا اساتذہ کے علاوہ ان کے تلامذہ کا کلام بھی گلدستے میں شائع ہوا، اودھ کی بعض

بستیوں جیسے محمود آباد، رائے بریلی، کاکوری وغیرہ کے شعراء نے بھی گلدستہ میں جگہ پائی، چونکہ گلدستہ نوابین و امراء میں باریاب تھا، اس کے صفحات میں بعض تخلص گذار امرائے لکھنؤ و اودھ کا کلام بھی شائع ہوا، اس گلدستہ کے ذریعہ بعض غیر معروف شعرائے لکھنؤ سے واقفیت پیدا ہوئی.

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب خاں بہادر خاں (نبیرۂ نواب حافظ رحمت خاں) کو افواج کمپنی کے مقابلہ میں شکست ہوئی، جس کے نتیجے میں بریلی میں قتل و غارت گری لوٹ اور بھگدڑ ہوئی، نواب نیاز احمد خاں ہوش حیدرآباد دکن گئے اور وہاں سے لکھنؤ پہونچے، انھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں سکون کی سانس لی، مظفر علی خاں اسیر کی شاگردی اختیار کی، لکھنؤ کے امراء سے تعلق پیدا کیا، گلدستۂ ہوش افزا میں شعرائے روہیل کھنڈ کے مقابلہ میں شعرائے لکھنؤ و اودھ کا جگہ پانا ان کی سکونتِ لکھنؤ کی وجہ سے تھا.

حکومت روہیلہ کے زوال کے بعد (۱۷۷۴ء) بریلی کی شاعری پر اساتذۂ لکھنؤ کے اثرات پڑنا شروع ہو گئے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ تمام شعرائے بریلی جو تحلیل جذبات کی بجائے پرواز خیال کے دلدادہ تھے، اساتذۂ لکھنؤ کے حلقہ بگوش ہو گئے، نیاز احمد خاں ہوش ان شعرائے بریلی کے سرخیل تھے، جنھوں نے دبستانِ لکھنؤ سے مکمل استفادہ کیا۔

اس طرح گلدستۂ ہوش افزا بریلی اس اعتبار سے ادبی اہمیت کا حامل تھا کہ اس نے ان لکھنوی اثرات کی نشاندہی کی جو دبستان بریلی کی شاعری کو متاثر کر رہے تھے۔

بریلی کے پرانے گلدستوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک معروف استاذ اور اس کے تلامذہ سے وابستہ تھے، اور اس میں اسی طرز شاعری کی نمایندگی ہوتی جس کی اشاعت وہ استاذ اور اس کے تلامذہ کرتے، گلدستۂ ہوش افزا بریلی نواب نیاز احمد خاں ہو

کے حلقۂ شعرا کا ترجمان تھا، اور وہ اسی طرز شاعری کی اشاعت کرتا جس کے نواب نیاز احمد خاں اور ان کے تلامذہ حامل تھے، اس وقت بریلی میں دیگر بڑے اساتذۂ سخن نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کو مقبولیت عوام وخواص بھی حاصل تھی، مثلاً قاضی عبد الجمیل جنون (تلمیذ غالب، متوفی ۱۹۰۰ء) مولوی حسن رضا خاں حسن (تلمیذ داغ متوفی ۱۹۰۸ء) سید فضل غوث ساقی (متوفی ۱۸۹۴ء) مولانا ناصر الدین احمد ناصر (متوفی ۱۹۰۸ء) غلام بسم اللہ بسمل (تلمیذ غالب، متوفی ۱۹۰۹ء) مفتی عماد الحسن محو (تلمیذ غلام بسم اللہ بسمل، متوفی ۱۹۲۶ء) مرزا رستم یار بیگ قیصر (تلمیذ نواب عبد العزیز خاں عزیز متوفی ۱۹۲۶ء) بریلی کے معروف اساتذۂ سخن تھے، مگر ان کو گلدستہ میں جگہ نہیں ملی، کیونکہ وہ دبستانِ لکھنؤ سے نسبت نہیں رکھتے تھے۔

بریلی مدت مدید سے علمائے دین کا مرکز رہا، بریلی میں رشد و ہدایت کے لیے صوفی بھی آئے اور ان کے مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں، علماء اور صوفیوں کے دور دورے کی وجہ سے نعتیہ شاعری کو فروغ ملا، اور شاید شمالی ہند میں بریلی پہلا ادبی مرکز ہے جہاں سب سے پہلے نعتیہ دواوین مرتب ہوئے، لہٰذا نواب نیاز احمد خاں ہوش کی نعت گوئی اور گلدستۂ ہوش افزا میں نعتیہ کلام کی اشاعت بریلی کے ادبی ماحول کے مطابق تھا، البتہ گلدستہ ہوش افزا کی انفرادیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس کے صفحات میں نعتیہ کلام وافر مقدار میں شائع ہوا، حالانکہ وہ ایک نعتیہ گلدستہ نہیں تھا، میرے خیال میں گلدستۂ ہوش افزا کی اس خصوصیت کا سبب نوابین روہیلہ کی دینداری تھی، کیونکہ جملہ نوابین روہیلہ کسی نہ کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ اور عالموں اور صوفیوں کے سرپرست تھے۔

مختصر یہ کہ گلدستۂ ہوش افزا اپنے ادبی معیار، وافر کلام شعر و نظم، اعلیٰ کتابت و طباعت اور اشاعتی نظم و ضبط کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔

شعراء اور ان کا کلام : گلدستۂ ہوش افزا کے چار مکمل شماروں اور ایک نامکمل شمارہ کو

سامنے رکھ کر میں نے شعراء کی فہرست تذکروں کے انداز میں مرتب کر دی، تاکہ اس گلدستے کا مطالعہ زیادہ بامعنی ہو جائے ۔ متداول تذکروں کو سامنے رکھ کر تو سین میں بعض ضروری باتوں کا اضافہ بھی کر دیا ہے ۔

احمدؔ : منشی احمد بخش بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

خدا شاہد کہ جس کو عشق ہے روئے پیمبر کا اسے اندیشہ کیا ہے گرمیِ خورشید محشر کا

ادیبؔ ، مرزا اللہ یار بیگ ، بریلوی ، شاگرد برج موہن لال خار بریلوی تلمیذ ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

رقم کرتا ہوں میں جب وصف گیسوئے پیمبر کا سیاہی پر گماں ہوتا ہے سب کو مشکِ اذفر کا

احیاؔ : خواجہ محمد یحییٰ خلف خواجہ محمد مرتضیٰ بقاؔ لکھنوی ۔ نمونۂ کلام ؎

تاؤ کھانا صاف روشن ہے تری تلوار کا ڈھونڈتی پھرتی ہے سایہ زخمِ دامن دار کا

اشکؔ : مولوی ہادی علی [لہ] نمونۂ کلام ؎

ہمدمو! کشتہ ہوں میں تیغِ نگاہِ یار کا غسلِ میت کے لیے پانی ملے تلوار کا

اظہرؔ : حکیم محمد آغا مسیح لکھنوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ من کلامہ ؎

بند آنکھیں ہیں سحر میں کچھ خبر ہوتی نہیں کب تلک دیکھیں شبِ فرقت خبر ہوتی نہیں

اثرؔ : منشی مکھن لال ، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

جب لکھوں مضمون کوئی میں قدِ دلدار کا سرو موزوں ہو ہر اک مصرع مرے اشعار کا

امیرؔ : لالہ جوالا شنکر ۔ شاگرد نسیمؔ دہلوی [مرزا اصغر علی خاں متخلص بہ نسیمؔ دہلوی تلمیذ مومنؔ] مصنف قصیدہ در مدح جناب شفاعت احمد صاحب وکیل عدالت غازی پور ۔ مطلع قصیدہ ؎

صبحدم بادِ صبا نے یہ دیا ہم کو پیام آ گئی فصلِ بہاری ہے چمن میں دھوم دھام

لہ ان کے حالات فراہم نہ ہو سکے ۔

بہجت، مولوی محمد یوسف خاں ناگپوری، مدرس نائب ہشتم رجمنٹ مدراس، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ
من کلامہ ؎

لکھوں کچھ وصف جب میں چہرۂ پرنور سرورکا ورق دیوان کا میرے ورق ہو مہر انور کا

باقرؔ: سید باقر علی بریلوی، شاگرد سید مہربان علی فرحاںؔ بریلوی [تلمیذ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی]
من کلامہ ؎

جو اک آنسو بھی گر جائے گا اپنے دیدۂ تر کا ابھی ہو جائے گا صحرا میں پیدا چشمہ کوثر کا

بلیغؔ: [منشی سید عسکری مرزا خاں لکھنوی، تلمیذ صفی لکھنوی] پچپن بندوں پر مشتمل ایک خمسہ بر غزل ناسخؔ
مصرع۔ طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

پرتوؔ: منشی مرتضیٰ خاں لکھنوی، شاگرد حکیم سید ضامن علی شوقؔ ابن میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلامؔ

اٹھایا پھول کی صورت علی نے باب خیبر کا جہاں قائل ہے زور دست بازوئے پیمبر کا

تمیزؔ: سید اکبر علی [بریلوی، شاگرد عاشور علی خاں، سید فرزند علی انجم رضوی، تلمیذ خواںؔ بریلوی ان کے
خلف تھے] من کلامہ ؎

نہ ہو اس بات پر کیوں فخر ومباہات تمیزؔ میری ہر بزم میں وہ زینت محفل آیا

توقیرؔ: نواب احمد رضا خاں لکھنوی خلف نواب محمد جعفر خاں نبیرۂ نواب حیدر بیگ خاں، شاگرد حکیم سید
ضامن علی شوقؔ۔ نمونۂ کلام ؎

دل نے خود لوٹ لیا صبر کو رہزن ہو کر ہجر میں رنج دیئے دوست نے دشمن ہو کر

جنونؔ: سید رحمت علی بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

نشاں کچھ ضعف سے ملتا نہیں ہے جسم لاغر کا اگر ڈھونڈا کسی نے مجکو پایا تار بستر کا

جوہرؔ: جواہر سنگھ لکھنوی، شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

نورِ عرفاں ہو تو سینہ بارگاہِ عرش ہے   دل کلس ہے اس کی اک درگاہ عالی جاہ کا

ہوشؔ : نواب احمد خاں بریلوی [ابن نواب مستقیم خاں ابن نواب محمد خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں ، خاندان روہیلہ بریلی کے معروف شاعر تھے ان کے مطبوعہ دو دواوین رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں] من کلامہ ؎

سنہرے رنگ کی اوس گل کی یہ تاثیر ہوتی ہے   پہنتے ہی طلائی نقرۂ زنجیر ہوتی ہے

حکیمؔ : سید جعفر حسین لکھنوی ، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

نہیں ملتا ہے بو یہ مصحفِ رخسار دلبر کا   خدا حافظ ہے ان روز دنوں کا نے قلبِ مضطر کا

حامدؔ : شیخ حامد حسن کنبوہ بریلوی ، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

تصور جب ہے مجکو گلِ روئے پیمبر کا   تو پھر کھٹکا ہو کیونکر گرمیٔ خورشید محشر کا

حافظؔ : عبدالصمد ، شاگرد خواجہ محمد مرتضےٰ خاں بقاؔ لکھنوی ۔ نمونۂ کلام ؎

شعاعِ مہر کا اس واسطے درکار خامہ ہے   کہ تا لکھوں میں کچھ اوصاف اس روئے منور کا

حیدرؔ : نواب علی حیدر خاں بریلوی [ابن نواب عبدالرزاق خاں رزاقؔ ابن اسحاق خاں ابن مستجاب خاں ابن حافظ رحمت خاں] شاگرد عبدالقادر خاں وحشیؔ رام پوری [تلمیذ شیخ علی بخش بیمارؔ بریلوی ، شاگرد مصحفیؔ]

خمارؔ : حکیم برج موہن لال بریلوی ، شاگرد نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ [ہوشؔ بریلوی کے محتشم شاگرد تھے ، ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں   اب تو سرسبز یہاں باغِ سخن دیکھتے ہیں

حیرت کی بات ہے کہ ہندو شعرا پر مشتمل تذکرہ بہارِ سخن میں خمار بریلوی کا ذکر نہیں ملتا ، جب کہ بریلی کے کتنے ہی غیر معروف و نو مشق شعرا اس میں پیش کیے گئے ، تذکرہ ہزار داستان یعنی خمخانۂ جاوید کے ذریعہ بھی خمار بریلوی کے ضروری حالات نہیں ملتے] من کلامہ ؎

مجھے ہو خوف محشر کا، ہوں عاشق اُس ستمگر کا | قیامت ایک ادنیٰ سلب ہے فتنہ اس کی ٹھوکر کا
موا ہوں نامرادی کہ حسرتِ دیدارِ جاناں میں | کفن ہو سایۂ تارِ نگاہِ حور منظر کا
وہ عاشق ہوں جنازے کو بھی میرے بعد مرنے کے | اٹھائیں بلبلیں دے کر کفن پھولوں کی چادر کا
کروں جب حالِ سوزِ دل رقم نامہ میں اے قاصد | حروف انگارے ہوں نقطوں میں ہو انداز اخگر کا
تھا اس مہر کا وصفِ صباحت جب لکھا ہم نے | ہوا مطلع غزل کا اپنی مطلع مہرِ انور کا

خیرؔ: شیخ خیرات علی[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

وجودِ پاک احمد باعث آرائش ہستی | بہارِ گلشنِ امکاں طفیل اس ذاتِ اطہر کا

خواہشؔ: حافظ مولا بخش شاہجہان پوری، شاگرد حافظ نثار احمد تائبؔ۔ نمونۂ کلام ؎

مرے اربع عناصر میں ہے غم یارانِ سرور کا | علی مرتضےٰؓ، عثمانؓ، عمرؓ، صدیق اکبرؓ کا

دانشؔ: سعادت یار خاں بریلوی، شاگرد حافظ عبدالکریم عقیلؔ، تلمیذ نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

مذہبِ عشق میں جو شخص کہ داخل نہ ہوا | مرتبہ دونوں جہاں میں اسے حاصل نہ ہوا

راحتؔ: سید کاظم حسین، ابن سید محمد حسین فرحتؔ ابن سید سعادت علی عیشؔ ابن میر غلام علی عشرتؔ بریلوی

نمونۂ کلام ؎

کان کے بالے میں بل کھاتا ہے گیسو یار کا | حلقۂ خورشید مسکن ہو رہا ہے مار کا

سحرؔ: شیخ امان علی لکھنوی، شاگرد شیخ امام بخش ناسخؔ۔ نمونۂ کلام ؎

ہم نے سونے کے چھلے پہنائے ہیں اس حور کو | آبِ زر سے آج کھینچا ہے نہالِ طور کو

سرشارؔ: منشی مدن لال، شاگرد خواجہ محمد مرتضےٰ بقاؔ لکھنوی [سنہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء] نمونۂ کلام ؎

دور کی مہر و محبت میں ضررِ جاں کا نہیں | کیک پروانۂ شمعِ مہ کامل نہ ہوا

---

[1] غیر معروف یا مفروضہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

سپہر: [میر مہدی] لکھنوی [خلف سید مہدی، شاگرد خواجہ وزیر] نمونۂ کلام ؎

باڑھ کے ڈورے سے کچھ انگیا کی ڈوری کم نہیں • گھاٹ جو انگیا کا ہے وہ گھاٹ ہے تلوار کا

شوق: منشی امداد حسین بریلوی ابن منشی محمد بخش، سب اوورسیر محکمۂ کپتانی آگرہ، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ من کلامہ ؎

رقم جس دم کروں میں وصف گیسوئے معنبر کا
سواد خط پہ دھوکا ہو نہ کیوں کر مشک اذفر کا

شیفتہ: میر نوازش علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی شیدا۔ نمونۂ کلام ؎

ابھی سر کاٹ لے قاتل نہیں صرفہ مجھے سر کا
گر زانو سے اک سر کش مرے سر کو نہ تو سر کا

شور: سید عبدالرحیم بریلوی، شاگرد میر قاسم علی خواہاں بریلوی [متوفی سنہ ۱۹۳۰ء تلمیذ امیرالدین آزاد بریلوی[1]]

شفیق: رام نرائن، شاگرد منشی دھر مخلص۔ نمونۂ کلام ؎

آخر کار ہوا اصح بہت شرمندہ
پر یہ بندہ تو کسی بات کا قائل نہ ہوا

شفیق دل حزیں کی بہت تمنا دل سے ہے[1]
عنایت ہو اُسے روزِ جزا اک جام کوثر کا

شمس: محمد شمس الدین خوش نویس، شاگرد محمد مرتضےٰ خاں بقا لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

تیرے آتے ہی قیامت میں قیامت آ گئی
منتظر تھا فتنۂ محشر تری رفتار کا

شریف: ظہور الحسین، شاگرد مولوی عبدالغنی [محمد عبدالغنی شاہ تلمیذ محمد ہادی علی اشک]

شمس: حاجی خواجہ احمد بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

بعد مرنے کے یقیں ہے منھ نہ دیکھوں نار کا
ہے بڑا مجکو وسیلہ احمد مختار کا

کون میری سی کہے اے سیم تن مفلس ہوں میں
ساتھ دیتا ہے زمانے میں ہر اک زردار کا

شمس اُس خورشید رو کی یاد کا ہے یہ اثر
نام ہے تار شعاعی میرے جسم زار کا

شاکر: [ ] بریلوی، شاگرد میر سعادت علی عیش۔ نمونۂ کلام ؎

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عکس سبزے میں نہیں ہے گیسوئے دلدار کا ۔۔۔ دیکھ لو قصرِ زمرد میں ہے مسکن مار کا

شائق، سید احمد حسن خاں بریلوی۔ شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

دھیاں رکھیں کیوں نہ ہر دم ابروئے خمدار کا ۔۔۔ ہم سپاہی ہیں نہ کیونکر شوق ہو تلوار کا

صابر: حافظ امام الدین دہلوی، شاگرد نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

ہو گیا آئینہ عاشق آپ کے رخسار کا ۔۔۔ اب خطاب اس کو عطا ہو مرغِ آتشباز کا

عاشق: عاشق علی بریلوی، شاگرد جنون [سید رحمت علی بریلوی]

عطارد، قاضی وزیر حسن مچھلی شہری، شاگرد مرزا صابر [احمد میرزا، پدر پیارے صاحب رشید، متوفی ۱۸۹۳ء]

نمونۂ کلام ؎

بقدر حوصلہ گردش ہے زیر آسماں سب کو ۔۔۔ کہ ہر قطرہ ہے اک گرداب میں دریائے اخضر کا

عتیق: مولوی عتیق اللہ لکھنوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

وہ رشکِ مہر میرے پاس سوئے جب کبھی آکر ۔۔۔ بنے تار شعاعی پھر تو ہر اک تار بستر کا

عاقل: شیخ عزیز الدین بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

میں ہوں مداح دل سے مومنو روئے پیمبر کا ۔۔۔ مجھے ہو خوف کیونکر گرمیٔ خورشیدِ محشر کا

عقیل، مولوی حیات علی بریلوی ابن مولوی حشمت علی زکی بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

کب حسینانِ دل آزار پہ مائل نہ ہوا ۔۔۔ کوئی آفت ہوئی سینہ میں مرا دل نہ ہوا

غنی: محمد عبدالغنی شاہ، شاگرد محمد ہادی علی اشک [غنی ملازم مطبع نظامی کانپور] نمونۂ کلام ؎

وہ موحد ہوں کہ یادِ حق ہے میری زندگی ۔۔۔ دم بدم بھرتا ہوں نعرہ دل سے الا اللہ کا

(حاشیہ صفحہ ۲۸۵) خمخانۂ جاوید جلد چہارم میں ایسے بارہ شاعروں کا مذکور ہوا جن کا تخلص شاکر تھا، مگر ان میں سے کوئی بھی سعادت علی عیش کا شاگرد نہیں ہے، شاکر بریلوی غیر معروف یا مفروضہ شاعر معلوم ہوتا ہے۔

ذوقؔ: لالہ گوبند پرشاد بریلوی، شاگرد برج موہن لال خار بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

شمع گل ہوگئی کچھ رنگ ہوا اور سے اور بے حجابانہ وہ گل جب سرِ محفل آیا

نقیرؔ: لالہ کیولا پرشادؒ [   ] نمونۂ کلام ؎

شکر اے دل کہ جناب شہ طٰہٰ آئے جلوۂ عرش بریں رونقِ بطحا آئے
از سمک تا بہ سما دھوم مچی آتے ہیں صاحبِ تاج و علم شاہِ شہنشاہ آئے
مصطفیٰ حق نے کہا آپ کو اے ختم رسل ہادیٔ شرع متیں دینِ مصفا آئے
صفحۂ دین غلط پر خط نظری کھینچا مالکِ لوح و قلم باعثِ املا آئے
اپنے بندوں پہ کیے حق نے کرم دونا جملی معدنِ جود و عطا حضرت اعلیٰ آئے
جس کے خدام سے اعجاز مسیحائی ہے دردمندانِ دو عالم کے مداوا آئے
یاد مولا سے نہ غافل ہو فقیر عاجز حلِ مشکل کو ترے دیکھ یہ مولا آئے

نہیمؔ: منالال بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

رقم ہو جائے کچھ بھی وصف جب ابروئے دلبر کا گماں دیوان کے نقطوں پہ ہو خنجر کے جوہر کا

فدویؔ: شیخ نثار احمد بریلوی، شاگرد امام الدین خاں صبرؔ دہلوی۔ نمونۂ کلام ؎

تصور ہے مجھے صلِ علیٰ اس روئے انور کا دکھا دے جلوہ اے اللہ تو اپنے پیمبر کا

قیصرؔ، مرزا علی جان بیگ، شاگرد میر قاسم علی خواہاںؔ۔ نمونۂ کلام ؎

ہم لٹے عاشق زلف بت پُر فن ہو کر نقد دل مار لیا مارنے رہزن ہو کر

کوکبؔ: شیخ یحییٰ علی کاکوروی، شاگرد نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ۔ نمونۂ کلام ؎

اس لیے نظارہ وہ کرتے ہیں مجھ زار کا سایہ پڑتا ہے غضب بیمار پہ بیمار کا

ان کے حالات فراہم نہ ہوسکے۔

لطیف: جعفر حسین کانپوری، شاگرد غنی [محمد عبد الغنی شاہ تلمیذ محمد ہادی علی اشک] نمونۂ کلام ؎

بھول کر ابلیس بہکانے کو آ سکتا نہیں — رات دن ورد زباں ہے لفظ استغفار کا

محسن: سید محسن علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی عیش بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

کھینچ کر خنجر خونخوار جو ست آل آیا — سر بکف سامنے فوراً دل بسمل آیا

مضطر: سید محمد جان بریلوی، شاگرد مظفر علی خاں اسیر لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

نہ ہوتا واسطہ لازم اگر ذات پیمبر کا — عقول عشرہ کو ہرگز نہ ملتا رتبہ جوہر کا

ہیولیٰ اور صورت میں نہ ہوتا افتراق ہرگز — نہ ہوتا ملت غائی جو عنصر ذات اطہر کا

زماں آخریں کو ہے تقدم بالشرف حاصل — مقدم ہے ظہور پاک سے رتبہ موخر کا

منصب: سید منصب علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی شیدا۔ نمونۂ کلام ؎

مرے چشمک ہے آنکھوں میں طلائی رنگ سے ان کے — کہ جیسے دو حریفوں میں پڑے جھگڑا کہیں زر کا

مشہدی:[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

دریغا یہ قسمت میں ہے جمع غم — کہ ایک فریب غم رقم مجذور ہے

ممتاز: نواب ممتاز الدولہ بہادر لکھنوی[2] [ ]

ران کی مچھلی دکھا دے اے صنم — مچھلیاں ہوں پانی پانی نہر میں

مہر: عبد اللہ خاں[3]۔ [ ]

نام خدا ہے اوج مرے قال و قیل کا — پایا ہے پایہ شعر نے عرش جلیل کا

محمود: محمود خاں رام پوری، شاگرد میر احمد علی رسا رام پوری و نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

سایۂ بال ہما کو ہم ملائیں خاک میں — ہم کو مل جائے اگر سایہ تری دیوار کا

---

[1]، [2]، [3] مزید حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

مضطر: منشی جانکی پرشاد بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش ۔ نمونۂ کلام ؎

کشتہ ہوں اے ہمدمو میں سبزۂ رخسار کا　　تختۂ تربت پہ میرے رنگ ہو زنگار کا

مخلص: منشی دھر کاکوروی، شاگرد مولوی عبدالرزاق خالق ۔ نمونۂ کلام ؎

جب چھٹی زلف دوتا، وہ شوخ یوں کہنے لگا　　ورنہیں مخلص مگر تجھ کو ہماری مار کا

نیر: مولوی محمد علی حیدر بدایونی، شاگرد دلدار علی مذاق بدایونی [متوفی [illegible] ۔ تلمیذ شیخ محمد ابراہیم ذوق]

نمونۂ کلام ؎

غم شبیر میں آنسو جو نکلے ان میں ڈوبا ہے　　کفن دینا عزیزو تم مجھے اس دامنِ تر کا

ہوش: نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی، شاگرد امیر الدین آزاد و میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی] نمونۂ کلام ؎

عروج آتا ہے تنل ب سے طبعِ انور کا　　کہ شک اوجِ مضامیں پہ ہے معراجِ پیمبر کا
زمینِ شعر سے ہے پست رتبہ چرخِ اخضر کا　　مرا چوٹی کا مضموں کنگرہ ہے عرشِ اکبر کا
چراغِ کعبۂ معنی ہیں تو بندش پوشش کعبہ　　مری ہر بیت میں انداز ہے اللہ کے گھر کا
وہ میری نظم کا ہے دبدبہ جو ہر فرشتے کو　　گماں ہر صفحۂ دیواں پہ ہے دیوانِ محشر کا
یہ قدرت کی ہے میرے قلم میں یک قلم قدرت　　مرے دیواں کی جدول کا ہے پرتو خطِ مقدر کا
شہِ ملکِ معانی ہوں نہیں کس جا عمل میرا　　کتابِ نظمِ عالم اک ورق ہے میرے دفتر کا
زمانہ میرے میدانِ قلم کا ایک کونا ہے　　جسے کہتے ہیں خطِ استوا ڈورا ہے سطر کا
کسی کا طائرِ فکر اڑ سکے کیا میری مدحت میں　　قلم بہرِ شناور کا ہے جبریل کے پر کا
خیالِ نعتِ حضرتؐ سے یہ پایا مرتبہ میں نے　　وگرنہ ذرۂ ناچیز ہوں لیکن اسی در کا
عبث خورشیدِ محشر گرمیاں کرتا ہے اے گردوں　　وہ ذرہ بھی نہیں اس آفتابِ ذرہ پرور کا
دمِ آخر جو مژگانِ نبی کا دھیان آ جائے　　کھلے فصدِ رگِ عصیاں کسے وہ کام نشتر کا

دعا ہے یہ مدینے میں مجھے بلوائیے شاہا | بھروسا اب نہیں ہے عالمِ فانی میں دم بھر
بہت پچھتا رہا ہوں گردشِ قسمت سے ہر جا | میسر ہو طواف اب مجھ کو حضرت آپ کے در کا
ملوں آنکھیں میں جا کر روضۂ اکبر کی کرسی پر | کہ ہو اس مردمِ دیدہ کو دعویٰ نورِ انور کا
نہ رکھا گو مجھے عصیاں نے اس قابل کہ میں دم بھر | بنوں زاغِ سیہ بھی اس زمینِ پاکِ اطہر کا
مگر لطف و کرم سے شاہ کے امید ہے سب کچھ | میں گو بدکار ہوں پر نام لیوا ہوں پیمبر کا
تماشا دیکھنا اے ہوش تو صحنِ قیامت میں | کہ سر پر میرے ہوگا چتر دامن آلِ اطہر کا

نسیم : مرزا اصغر علی خاں دہلوی [شاگرد مومن] نمونۂ کلام ؎

کیا ملے وہ زخمِ ازل سے جس کو تو بخشے فراق | خامہ کر سکتا نہیں بخیہ شگاف آہ کا

نالاں : سید عنایت نبی بریلوی، شاگرد سید مہربان علی فرحاں بریلوی [تلمیذ آتش لکھنوی]

نمونۂ کلام ؎

ضعف سے عالم ہوا یہ مجھ جگر افگار کا | مل گیا تارِ کفن سے تار سبحِ زار کا

نور : نواب نور الحسن کنبوہ بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

دھیان جب فرقت میں آیا اُس گلِ رخسار کا | داغ دل میں میرے عالم ہو گیا گلزار کا

نوید : بریلوی[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

چل دیا بوسۂ رخسار پہ بدظن ہو کر | دوست نے کام بگاڑا مرا دشمن ہو کر

نساخ : مولوی عبد الغفور بہادر، ڈپٹی کلکٹر [ابو محمد عبد الغفور پسر قاضی فقیر محمد، ساکن فرید پور بنگال، ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ راج شاہی بنگال، شاعر، ناقد، تذکرہ نگار، مولف تذکرۂ سراپا سخن، مرزا غالب سے خط و کتابت کا تعلق تھا] نمونۂ کلام ؎

---

[1] غیر معروف یا مفروضہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

جب گیا شانے کے نیچے ہات گیسوئے یار کا　　　ہاتھ آیا عالمِ رویا میں مضموں مار کا

شاخِ شبو کی قلم ہو غنچۂ دل ہو دوات　　　وصف لکھنا ہے مجھے اس گل کے بکلاؤ کا

وصف اے نساخ ترکِ تیغ زن کا گر لکھوں　　　کاٹ کا مرکز بھی پھل ہو جائے گا تلوار کا

واجد: سید واجد علی، ساکن اورنگ آباد، ضلع بلند شہر، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

پسِ مردن نہ کیونکر نشہ ہو عشرت کے ساغر کا　　　سلامی ہوں میں اک بندہ قسیمِ حوضِ کوثر کا

وحشی: عبدالقادر خاں رام پوری، شاگرد شیخ علی بخش بیمار [بریلوی، متوفی ... تلمیذ مصحفی]

نمونۂ کلام ؎

کیجئے کوئی اشارہ ابروئے خمدار کا　　　ہاں بھلا ہم بھی تو دیکھیں کاٹ اس تلوار کا

ہدایت: ہدایت علی [بریلوی، برادر اکبر مہربان علی فرحان بریلوی، استاذ درسیات نواب نیاز احمد خاں ہوش، خود درسیات میں شاگرد مفتی محمد عیوض کے۔ صاحب دیوان و صاحب تلامذہ] نمونۂ کلام ؎

لیا ہے نام دل میں مصطفیٰ کا　　　زباں پر ورد ہے صلِ علیٰ کا

کسی کو زہد و تقویٰ کی ہے امید　　　مجھے ہے آسرا خیر الوریٰ کا

غمِ احمد سے ہے دل پارہ پارہ　　　عجب نسخہ ملا ہے کیمیا کا

ہدایت مانگ لے جو مانگنا ہو　　　یہ ہنگامِ اجابت ہے دعا کا

یوسف: شیخ یوسف علی بریلوی، شاگرد مہربان علی فرحان بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

نور اللہ کا چمکا رخِ روشن ہوکر　　　رہ گیا وادیٔ دل وادیٔ ایمن ہوکر

تذکروں کی ترتیب و مطالعے کے وقت ہمعصر گلدستوں سے مدد نہیں مل جاتی، حالانکہ ان کے ذریعہ شاعر کا نام، مولد، تخلص، تلمذ اور کلام بھی فراہم ہو جاتا ہے اور ہمعصر ادبی میلان کا پتہ بھی چل جاتا ہے، لہٰذا قدیم و جدید گلدستوں کو متعارف کرانا اہم ادبی کام ہے۔

شاہنامۂ فردوسی میں ہجو وطنز کے مقامات

از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور پاکستان

(۲)

گودرز کے مطابق آسمان میں جانے کا ارادہ کرنا دیوانوں کا کام ہے، وہ کاؤس کو بیحد خود غرض اور ایسا آدمی قرار دیتا ہے جو ہوش و خرد سے عاری اور دین و رائے سے بیگانہ ہے، اس کا دل بھی ٹھکانے نہیں اور غالباً اس کا سر بھیجے سے خالی ہے، کیونکہ اس کی ہر سوچ اور اس کی ہر فکر کسی جدت اور خوبی سے خالی ہوتی ہے اور وہ پاگلوں کی طرح عقل و خرد سے فارغ ہونے کے سبب معمولی معمولی بات پر متزلزل ہو جاتا ہے۔

چو کاؤس خودکامہ اندر جہان   ندیدم کسی از کہان و مہان

خرد نیست او را نہ دین و نہ رای   نہ ہوشش بجای است و نہ دل بجای

تو گوئی بسرش اندرون مغز نیست   یک اندیشۂ او ہمی نغز نیست

چو دیوانگانست بی ہوش و رای   بہر باد کآید بجنبد ز جای[1]

کاؤس نے تو ابلیس کے بہکانے پر آسمان پر چڑھائی کی تھی، لیکن ضحاک نے اس (ابلیس) کے اکسانے پر اپنے باپ کو قتل کر دیا، تاکہ اس کے تخت پر قابض ہو سکے، فردوسی یہ واقعہ بیان کرکے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ حقیقی بیٹا کبھی ایسے بُرے اور ظالمانہ فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا، ہاں اگر وہ ناجائز اولاد ہو تو ایک بات ہے، فردوسی نے یہاں جس انداز میں

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۱۴۰

ضحاک کو ناجائز اولاد ثابت کیا ہے، وہ شاعری میں اس کی مہارت و استادی کی دلیل ہے، بالخصوص اس شعر "مگر در نہانی ..... الخ" کو بحیثیت ذم کے اشعار کا شاہکار کہا جاسکتا ہے[1] فردوسی کسی دانا کے حوالے سے کہتا ہے کہ برا فرزند اگرچہ شیر ہی کیوں نہ ہو باپ کا خون گرانے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا، ہاں کوئی خفیہ معاملہ ہو تو پھر تجسس کرنے والے کو اس "راز" کی تلاش ہوگی، ضحاک کو اس طرح بالواسطہ طور پر ناجائز اولاد کہہ کر فردوسی نے اس کیلئے صرف بیگانہ، بیداد گر اور سبک مایہ (گھٹیا) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں، حالانکہ اس فعل پر اسے بڑے کوسنے دیے جاسکتے تھے۔

بخون پدر گشت ہمداستان ز دانا شنیدستم این داستان
کہ فرزند بد گر بود نرّہ شیر بخون پدر ہم نباشد دلیر
مگر در نہانی سخن دیگر است پژوہندہ را راز با مادر است
پسر کو رہا کرد رسم پدر تو بیگانہ خوانش مخوانش پسر
سبک مایہ ضحاک بیدادگر بدین چارہ بگرفت گاہ پدر

توران کے بادشاہ افراسیاب نے طوس کے بیٹے کیخسرو کو صلح کا پیغام بھیجا ہے، کیخسرو اس پیغام کو سراسر فریب و دروغ سمجھتا ہے، چنانچہ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ طنز کا لہجہ اختیار کرتا ہے، وہ افراسیاب کو چرب زبان محض اور اس کے باطن کو خباثت وآلودگی سے پُر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو تو ایزد پرست بھی نہیں ہے، اس کے نزدیک

---

[1] ایضاً ص ۶، محمد علی فروغی مرحوم انہی اشعار کو بطور مثال پیش کر کے لکھتے ہیں کہ فردوسی ہمارے اکثر شعراء کے برعکس اپنی زبان کو ہزلیات اور بیہودہ گوئی سے آلودہ نہیں کرتا اور اگر کہیں موقع و محل کے مطابق اسے کسی شرم آمیز بات کا ذکر کرنا ہی پڑ جائے تو وہاں وہ بہترین اور لطیف ترین عبارات سے کام لیتا ہے جیسا کہ ان اشعار میں نظر آتا ہے (خلاصۂ شاہنامہ، مقدمہ ص ۱۰)

افراسیاب کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ وہ عقل و دانش سے بہرہ ور نہیں، اور کسی جادوگر کی طرح مائل ہے، ہر چند اس کی زبان خاصی چرب و شیریں ہے لیکن کوئی بھی دانشمند ایسے فریب کار اور دروغ گو کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، ایک موقع پر افراسیاب نے کیخسرو کے والدین پر بہت ستم توڑے تھے، وہ ان کا ذکر کر کے اسے بدگوہر کہتا، اور اس کے اس فعل کو نامردی سے تعبیر کرتا ہے، اور اس ظلم و ستم کی بنا پر اسے سزاوار دوزخ ٹھہراتا ہے،

ترا چند خواہی سخن چرب ہست　　بدل نیستی پاک و یزدان پرست
دلت جادوئی را سرمایہ گشت　　سخن بر زبانت چو پیرایہ گشت
زبان چرب گویا و دل پُر دروغ　　بر مرد دانا نگیرد فروغ
بجنبید آن گوہر بد ز جای　　بیفگندی آن پاک دل رازپای
کسی گر بدیہا ت گیرد شمار　　فزون آید از گردشِ روزگار
دری از بدیہا تو بگشادہ ای　　نہالی بدوزخ فرستادہ ای[1]

اسفندیار اپنی ماں سے باتیں کر رہا ہے، باتوں کے دوران عورتوں کا ذکر آتا ہے تو وہ عورتوں کی مذمت شروع کر دیتا، اور انھیں ہجو کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق عورتیں راز چھپانے کے معاملے میں بڑی کوتاہ اندیش اور ناقابلِ اعتبار واقع ہوئی ہیں، ادھر کسی کا بھید ان تک پہنچا اُدھر وہ دوسروں تک لے اڑیں، اس لیے انہیں اپنے کسی راز سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے، پھر یہ کہ وہ کم عقل اور کوتاہ دانش بھی ہیں اس لیے ان کا مشورہ بیکار اور بے وقعت ہوتا ہے،

---

[1] خلاصہ شاہنامہ، ص ۴۲۷ - ۴۲۹ -

. . . .

گویا ان کے مشورے سے بھی بچنا چاہئے، اس کے نزدیک اگر خدانخواستہ کوئی عورت فرمانروا بن بھی جائے تو کوئی بھی اسے وہ احترام نہ دے گا جو کسی مرد فرمانروا کو دیا جاتا ہے،

ان اشعار میں حرف نون بالخصوص لفظ زن کی تکرار سے ترنم پیدا ہو گیا ہے، اس ہجو میں بھی کوئی تلخی یا گالی گلوچ کا عنصر نہیں ہے، جس کی بنا پر اسے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہو،

چنین گفت با مادر اسفندیار — کہ نیکو زد این داستان ہوشیار

کہ پیش زنان راز ہرگز مگوی — چو گوئی، سخن باز یابی بکوی..

بکاری مکن نیز فرمان زن — کہ ہرگز نیابی زنی رای زن

زنی گر جہان شد بفرمان اوی — بر او نباشد گرامی چو شوی[1]

بہرام گور عورتوں کا بڑا رسیا ہے، اگرچہ اس کے شبستان میں سو سے زیادہ عورتیں ہیں، لیکن جہاں کہیں اسے کوئی نئی لڑکی نظر آجاتی ہے، وہ فوراً اسے بیاہ لیتا ہے، ایک موقع پر وہ شکار کے لیے کسی مرغزار میں گیا ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک گڈریے سے ہوتی ہے جو اسے ایک گوہر فروش اور اس کی لڑکی کے بارے میں بتاتا ہے، بہرام اس لڑکی کی آرزو لیے لشکر سے جدا ہو کر اس طرف روانہ ہو جاتا ہے، اس موقع پر ایک لشکری جس کا نام روزبہ ہے، بہرام کی اس بری عادت اور حرص و ہوس کے بارے میں دوسروں کے سامنے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے، ان اشعار میں شوخی و طنز بھی ہے، اور ہجو و ذم بھی، اس سلسلے میں بہرام کی اچھل کود، لڑکی والوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کی حرکت اور عورتوں سے سیر نہ ہونے کی علت کی

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۳۴

. . . .

بڑے دلکش اور اچھوتے انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے، آخر میں رودزبہ عورتوں کے قرب سے پیدا ہونے والے نقصانات کو ایک ایک کر کے بیان کرتا ہے، اور اس طرح بالواسطہ طور پر عورتوں کی بھی ہجو بیان ہو گئی ہے،

چنین گفت با مہتران رودزبہ | کہ اکنون شود شاہ ایران بدہ
بگوید دہقان گو ہر فروش | ہمہ سوی گفتار دارید گوش
بجز باہد مرآن دخت را از پدر | نہد بی گمان بر سرش تاج زر
نیابد ہمی سیری از خفت و خیز | شب تیرہ زو جفت گیرد گریز
شبستان مرا و افزون از صد است | شنفتہ از ین گونہ باشد بد است
تبہ گردد از خفت و خیز زنان | بزودی شود دست چون بی تنان
کند دیدہ تاریک ورخسار زرد | تن سست گردد ولب لاجورد
ز بوی زنان موی گردد سپید | سپیدی کند زین جہان نا امید
جوان را کند گوژ بالای راست | ز کار زنان چند گونہ بلاست[1]

ایک موقع پر ایران کا بادشاہ شاپور روم تاجر کے لباس میں روم گیا، وہاں کسی ایرانی باشندے کی مخبری پر قیصر کے ہاتھوں گرفتار ہوا، قیصر کے حکم پر اس کے ہاتھ باندھ کر اسے گدھے کی کھال میں سی دیا اور ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا، لیکن شاپور قیصر کی ایک کنیز کی اعانت سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، اور ایران پہنچ گیا، پھر ان دونوں میں لڑائی ہوئی، قیصر شکست کھا گیا، اور اسے شاپور کے سامنے پیش کیا گیا، شاپور کو اس موقع پر گزشتہ واقعہ یاد آجاتا ہے، اور وہ اس کے حوالے سے قیصر کو

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۶۴۹-۶۵۰۔

ہجو و ذم کا نشانہ بناتا ہے، اب اس کا لہجہ بڑا تند ہو جاتا ہے، وہ اسے ناقابلِ برداشت الفاظ (مثلاً بد سرشت، ترسا، دشمن ایزد، دیوانہ، فریبی اور بری نسل کا برا فرد) سے خطاب کرتا، اور کہتا ہے کہ تجھے دروغ گوئی کے سوا اور کیا آتا ہے، پھر وہ دروغ کو بے فروغ آتش قرار دیتا، اور قیصر کی حمیت و غیرت کو یہ کہہ کر جوش دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اگرچہ تو قیصر ہے لیکن نہ تو شرم ہی تیرے قریب پھٹکی ہے، اور نہ تیرا دل ہی کسی خوبی سے آراستہ ہے، آخر میں شاپور ایک بھرپور طنز کے ساتھ قیصر کو گزشتہ واقعہ یاد دلاتا اور اس کی موجودہ لشکر کشی کا ذکر کرتا ہے۔

بدو شاہ گفت ای سرشت بدی ۔۔۔ کہ ترسائی و دشمن ایزدی

فریبندہ ہستی و دیوانہ ای ۔۔۔ بہر بد نژادی و بیگانہ ای

ندانید گفتن سخن جز دروغ ۔۔۔ دروغ آتشی بود بی فروغ

اگر قیصری شرم و رایت کجاست ۔۔۔ بخوبی دلِ رہنمایت کجاست

چو بازارگانان ببزم آمدم ۔۔۔ نہ با کوس و لشکر برزم آمدم

تو مہمان بنام خر اندر کشی ۔۔۔ بایران گرائی و لشکر کشی؟[1]

انوشیروان اپنے دربار کے امرا سے خاقانِ چین، ترکوں اور ہیتالیوں سے جنگ اور موافقت کے بارے میں صلاح و مشورہ کرتا ہے، یہ باخبر اور تجربہ کار امرا اہل ہیتال کی بعض برائیوں سے آگاہ ہیں، چنانچہ جس انداز میں وہ ان کا ذکر کرتے ہیں،

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ، ص ۶۲۵۔

....

وہ ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے، ان کے مطابق ہیتال کے لوگ شیطان صفت، منافق اور دشمن ایران ہیں، برائی اور خرابی ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے، ناگہاں قتل وغارت اُن کا شیوہ ہے، چنانچہ فیروز کو انھوں نے اسی بے خبری میں مار ڈالا، ان امر کا رویہ ان کے بارے میں اتنا سخت ہے کہ وہ انھیں (اہل ہیتال کو) ایک دن کے لیے بھی خوش دیکھنے کو تیار نہیں ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان بدسرشتوں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا ضرور ملنی چاہیے، ان کا ذکر بھی ان امر کو شاق گذرتا ہے، ان سے ہمدردی تو بڑی دور کی بات ہے،

همه مرز هیتال آهرمنند — دو دزدند و این مرز را دشمنند
بدیشان سزد هرچه آید ز بد — هم از شاه گفتار نیکو سزد
از ایشان اگر نیستی کین و درد — جز از خون آن شاهِ آزادمرد
بکشتند پیروز را ناگهان — چنان شهریاری چراغ جهان
مبادا که باشند یک روز شاد — که هرگز نخیزد ز بیداد داد
چنینست بادافره دادگر — همه بدکنش را بد آید بسر
ز هیتال و از لشکر غاتفر — مکن یاد و تیمار ایشان مبر[2]

بزرجمہر (نوشیرواں کا وزیر جو اپنی عقل و دانش کے لیے مشہور رہا) نے نوشیرواں کے لیے ایک پندنامہ تیار کیا جس میں دس قسم کی چیزوں اور انسانوں کو ہدفِ ہجو بنایا گیا ہے، اس کے مطابق آز (حرص) اور نیاز (حاجت وضرورت) بڑے ہی قوی اور سرکش شیاطین ہیں، ان کے علاوہ خشم، حسد، ننگ اور کینہ ہیں، انسانوں میں چغل خور، منافق اور ناپاک دین لائقِ مذمت ہیں، جب کہ دسویں زمرے میں وہ شخص آتا ہے جو ناسپاس

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ...، [2] شاہنامۂ فردوسی چاپ نفیسی ص ۲۲۱۸ ۔

اور خدا ناشناس ہے، نوشیروان اس سے پوچھتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ طاقتور شیطان کون ہے؟ بزرجمہر ان میں سے بعض کی طاقت اور درجہ کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر کے بارے میں بتانا اور ان کی بدی و زشتی کا ذکر کرتا ہے، وہ ان چیزوں کی تجسیم کرکے ان کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے،

آز ایک ستمگار اور دیر ساز دیو ہے جو کبھی سیر اور خوش نظر نہیں آتا اور جو ہر وقت اور ہمیشہ ہل من مزید کا نعرہ لگاتا رہتا ہے، جب کہ دیو نیاز غم داندوہ اور درد سے اندھا اور زرد رخسار ہے، دیو حسد اس سے کسی قدر کمتر درجہ کا ہے، یہ اس مریض کی طرح ہے جس کا کوئی طبیب نہ ہو، دوسرے لفظوں میں، ع ایسے بیمار کا مرنا ہی دوا ہوتا ہے، اگر دیو حسد کسی کو سکھی، خوش وخرم اور خوشحال دیکھتا ہے، تو پریشان اور مضطرب ہوجاتا ہے، اس کے بعد دیو نمام (چغل خور) کا درجہ آتا ہے، جو دروغ ہی کو اپنی گفتار کے فروغ کا سبب جانتا ہے، یہ چغل خور اور منافق دیو خدا سے بھی نہیں ڈرتا، اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ دو انسانوں کے درمیان دشمنی وکینہ کا بیج بوئے اور یوں انھیں ایک دوسرے سے دور کردے۔

جیسا کہ بیان ہوا یہ پند نامہ نوشیرواں کے لیے تیار کیا گیا، دراصل بزرجمہر نے ان برائیوں کی اس طرح تصویر کشی کرکے انھیں مہیب وضرر رساں ثابت کیا اور بالواسطہ طور پر ان سے بچنے کو کہا ہے اور یہ وہ انداز ہے جو براہ راست انداز سے کہیں زیادہ پُر تاثیر ہے،

چنین داد پاسخ کہ آز و نیاز   دو دیوند بازور و گردن فراز

دگر خشم و رشک ست و ننگست وکین   چو نمام و دوروی و ناپاک دین

چنین داد پاسخ بکسری کہ آز   ستمگاره دیوی بود دیر ساز

کہ او را نبینند خوشنود ہیچ   ہمہ در فزونیش باشد بسیچ

نیاز آن کہ او راز اندوہ و درد | ہمہ گونہ بنید در خسارہ زرد
گزین بگذری خسرو او یو رشک | یکی دردمندی بود بی پزشک
اگر در زمانہ کسی بی گزند.. | بیبند، شود جان او دردمند
دگر دیو نام کو جز دروغ | نداند، نراند سخن با فروغ
نماند سخن چین و دو رو دی دیو | بریدہ دل از ترس گیہان خدیو
میان دو تن جنگ و کیں افگند | بکوشد کہ پیوستگی بشکند[۱]

کسریٰ برے کاموں اور بری باتوں کے بارے میں بزرجمہر سے سوال کرتا ہے، بزرجمہر اسے بتاتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے درشتی اور سختی اور بے گناہ لوگوں کو آزار رسانی قابلِ مذمت بات ہے، پھر وہ ایسے تو انگر کو جو کھانے پینے وغیرہ میں بخیل و خسیس ہو اور ایسی عورت کو جو بے شرم اور بلند آواز ہو لائق ذم قرار دیتا ہے، اس کے مطابق تند خو نیک مرد اور وہ تنگدست لوگ بھی جو عظمت و بلندی کے جویا ہیں، لائق تحسین نہیں ہیں، اسی طرح جھوٹ خواہ وہ بادشاہ کی طرف سے ہو خواہ عام آدمی کی طرف سے، ذلت آور ہے، اور قدر و وقعت سے عاری، ان تمام کا تعلق زشتی اور بدی سے ہے، گویا ان کا ذکر اس انداز میں کر کے اس نے ان کی تذمیم کی ہے۔

چنین داد پاسخ کہ زفتی زشاہ | ستیہیدن مردم بی گناہ
توانگر کہ تنگی کند در خورش | دریغ آیدش پوشش و پرورش
زنانی کہ ایشان ندارند شرم | بگفتن ندارند آواز نرم
ہمان نیک مردان کہ تندی کنند | دگر تنگدستان بلندی کنند

---

[۱] خلاصۂ شاہنامہ ص ۷۱۔ شاہنامہ (نفیسی)، ص ۲۲۵۱

دروغ آن کہ بی زنگ و شرم است خوار چہ بر پای کاری چہ بر شہریار[۱]

بہرام چوبینہ، خسرو دوم سے جنگ کے لیے آیا ہے، جنگ سے قبل دونوں کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے ہیں، مثلاً بہرام تند لہجے میں خسرو کو بد نشان کہتا اور اس کے کردار کو بے عقلوں کے کردار وگفتار سے مشابہ قرار دیتا ہے، پھر وہ طنز سے اسے کہتا ہے کہ تو نہ تو مرد دانشمند و فرزانہ ہے اور نہ سوار جنگی، پھر کس برتے پر خود کو شاہانہ باتوں کا سزاوار سمجھتا ہے؟ لوگوں نے مجھے (بہرام کو) سلطنت کے لائق سمجھا ہے، لہذا میں تجھے یہاں زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھنے دوں گا۔

خسرو بھی اس کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے، یعنی وہ بہرام پر طعنہ زنی کرتا اور اس کی تلخی و تندی اور خود کو برتر سمجھنے کی خصلت کو ہجو و ذم کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق ایک ایسے ظالم و ستمگار دیو نے، جو قوت و طیش کا مجسمہ ہے، اس (بہرام) کو اندھا کر دیا ہے، اسی بنا پر وہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا، اور کینہ، دشمنی اور خشم کو اپنائے ہوئے ہے، اور یوں شیاطین کے نزدیک لائق تحسین و ستایش ٹھہرا ہے، وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بہرام کو مزید مطعون کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ تیرا چراغ خرد تیری آنکھوں کے سامنے بجھ گیا اور تیرے دل و جان کو نور سے خالی کر گیا ہے، تو بدبخت ستمگار ہے اپنے برے انجام سے غافل نہ ہو، اور اپنی اس ناپائدار دولت و قوت پر نہ اترا، کیونکہ نہ تو کیکڑے کے پاس عقاب کا پر ہے، اور نہ عقاب آفتاب کے پروں سے اڑ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر کوئی اپنے اپنے ظرف ہی کے مطابق اپنے کام اور معاملات انجام دیتا ہے۔ فردوسی حکیم و دانشمند تھا، اس کے نزدیک عقل و خرد سے عاری انسان، انسان ہی نہیں اور اس لحاظ سے کسی کو

---

[۱] خلاصۂ شاہنامۂ جلد ۱۶، شاہنامہ (نفیسی) ص ۲۰۴۲،

بے خرد کہہ دینا گویا بہت بڑی گالی تھی، چنانچہ شاہنامہ میں ہجو و طنز کے تقریباً تمام مقامات پر میں یہ "گالی" نظر آتی ہے اور بتکرار نظر آتی ہے،

بہ د گفت بہرام کای بدنشان | بگفتار و کردار چون بی ہشان
نہ فرزانہ مردی نہ جنگی سوار | ترا با سخنہای شاہان چہ کار
بشاہی مرا خواند ند آفرین | نمانم کہ پی بر نہی بر زمین
بہ د گفت خسرو کہ ای بدکنش | چرا گشتہ ای تند و بر ترمنش؟
ستمگارہ دیویست با خشم و زور | کزین گونہ چشم ترا کرد کور
بجای خرد خشم و کین یافتی | ز دیوان ہمی آفرین یافتی
چراغ خرد پیش چشمت بمرد | ز جان و دلت روشنائی ببرد[1]

بہرام پھر اپنی برتری کی ڈینگ مارتا اور اپنے آپ کو سلطنت کے لائق قرار دیتا ہے، جس کے جواب میں خسرو اسے ہجو و طنز کا نشانہ بناتا، اور برا بھلا کہتا ہے پھر اسکی برائیاں اور کینہ جوئی ایک ایک کرکے گنوتا جاتا ہے، غرض ذم و طنز کا یہ تبادلہ دان دونوں کرداروں میں) بڑی دور تک پھیلتا چلا گیا ہے، چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

بہ د گفت خسرو کہ ای شوم پی | چرا یادگر گین نکردی بری؟
ندانست کس نام تو در جہان | فرومایۂ بودی اندر نہان
بدی را تو اندر جہان مایہ ای | ہم از بی رہان کمترین پایہ ای"
بہ د گفت بہرام کز راہ داد | تو از تخم ساسانی ای بدنژاد"
بہ د گفت خسرو کہ ای بدکنش | نہ از تخم ساسان شدی بدمنش

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۲۶۶، ۲۶۳،

دروغ است گفتار تو سر بسر سخن گفتن کژ نباشد ہنر

بدین رای و این ہوش و این فرہی بجوئی ہمی تخت شاہنشہی[1]

بہرام چوبینہ فرار ہو کے خاقان چین کے پاس پناہ گزین ہو جاتا ہے، خسرو پرویز اس سلسلے میں خاقان کو خط لکھتا ہے، اس خط میں جہاں اس نے خاقان کو ڈانٹ پلائی ہے وہاں بہرام کو ذم آمیز الفاظ سے خطاب کیا ہے، یہاں بھی فردوسی کی شایستگی اور احتیاط کار فرما ہے، یعنی بڑی سے بڑی گالی یہ دی گئی ہے کہ بہرام بندۂ ناسپاس ہے، خداشناس اور بزرگوں کا مقام شناس نہیں، فرومایہ، بے نام اور بے آرزو ہے۔

بخاقان چینی یکی نامہ کرد تو گفتی کہ از خنجرش خامہ کرد

یکی بندہ بد شاہ را ناسپاس نہ بہتر شناس و نہ یزدان شناس

یکی خرد بی نام بی کام بود پدر بر کشیدش کہ ہنگام بود[2]

مولف "راحۃ الصدور و آیۃ السرور" نے مختلف مواقع پر شاہنامۂ فردوسی کے بعض اشعار نقل کیے ہیں، ان میں سے کچھ زمانہ اور جہاں کی ہجو میں ہیں، یہ اشعار شاہنامہ میں مختلف مقامات پر متفرق انداز میں آئے ہیں، لیکن مذکورہ مولف نے انھیں جمع کر کے صرف چند ایک مقامات پر نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

زمانہ چنین ست ناسازگار نترسی از ین چرخ ناپایدار

بمردی و دانش نیابد گذر خردمند از و نیز پیچاند سر

دروغ آزمایی ست چرخ بلند گہی شاد دارد گہی مستمند

چنین است کردار گردان سپہر ببرد ز پروردۂ خویش مہر

---

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۲۲۱، ۲۲۳ [2] ایضاً ص ۲۸۵

چو سر جوئی اش پای یابی نخست | دگر پای جوئی سرش پیش تست
بدان ای پسر کین جہان بیوفاست | پر از رنج و تیمار و درد و بلاست
هر آنگه که باشی بدو شاد تر | ز رنج زمانه دل آزار تر
جہان شادمانی نماند بجای | بباید شدن زین سپنجی سرای
ہمہ کار گردندہ چرخ این بود | ز پرورده خویش پر کین بود
نماند بتو دیگری را دہد | جہان خوانی اش بی گمان بر جہد
تو راز جہان تا توانی مجوی | گلش زہر نابست خیرہ میوی[1]

ان کے علاوہ چند اور بہی پند طرز اشعار ملاحظہ ہوں جو شاہنامہ کے مختلف مقامات سے منتخب کیے گیے ہیں۔

تو دانی کہ سالار توران سپاه | نہ پرہیز دارد نہ ترس از گناہ
بویران و آباد نفرین اوست | دل بی گناہان پر از کین اوست
تو دانی کہ او راز بدگوہرست | جہان بد نژاد است و افسونگر است

(خلاصۂ شاہنامہ، ص ۲۶۲)

اکوان دیو رستم کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس پر فردوسی گرہ لگاکر ایسے برے انسان کو دیو (شیطان) کہتا ہے، جو خدا کا سپاسگزار نہیں، اور جو مردی و مروت سے عاری ہے، ایسے شخص کو آدمی کہنا صحیح نہیں،

تو مر دیو را مردم بدشناس | کسی کو ندارد زیزدان سپاس
هر آن کو گذشت از رہ مردمی | ز دیوان شمر مشمرش آدمی

(ایضاً ص ۳۴۴)

افراسیاب کی لڑکی منیژہ کے عاشق بیژن کو گرفتار کرکے افراسیاب کے سامنے

---

[1] راحۃ الصدور۔ صفحات (مقدمہ) ۲۴-۲۲ اور ۲۶ (۴۲، ۳۶۰، ۲۶۱ (۲۵۶، ۱۳۸، ۱۴۹)

لایا گیا ہے، بیژن اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن افراسیاب تلخ اور طنز بھرے لہجے میں اسے کہتا ہے،

تو آنی کز ایران بگرز و کمند — همی رزم جستی و نام بلند
کنون چون زنان پیش من بسته دست — همی خواب گوئی بکردار مست!
بگفت دروغ آز مودن همی — بخواهی سر از من ربودن همی!
(ایضاً ص ۳۶۰)

بیژن کو کنوئیں میں قید کر دیا گیا ہے، افراسیاب کی غیرت نے برداشت نہیں کیا کہ اس کی لڑکی کسی سے عشق کرے، چنانچہ وہ اپنے ایک آدمی کو حکم دیتا ہے کہ وہ منیژہ کو بھی اسی کنوئیں پر چھوڑ آئے تاکہ یہ بیژن کی غمگساری کرے، اس کے لہجے میں بڑی تلخی اور بھرپور طنز ہے، جو اس کی انتہائی حمیت و غیرت کی غماز ہے،

وز آنجا بایوان آن بی ہنر — منیژہ کزو ننگ دارد گہر
برو با سواران و تاراج کن — نگوں بخت را بی سر و تاج کن
برہنہ کشانش ببر تا بچاہ — کہ در چاہ بین آنکہ دیدی بگاہ
بہارش توئی غمگسارش تو باش — درین تنگ زندان زوارش تو باش
(ایضاً ص ۳۶۰)

مجو از دل عامیان راستی — کہ از جستجوی آیدت کاستی
از ایشان ترا گر بد آید خبر — تو مشنو ز بدگوی و انده مخور
بترس از بد مردم بد نہان — کہ بر بد نہان تنگ باد اجہان
(ایضاً ص ۶۱۲)

بابُ التقریظ والانتقاد

تاریخ ادبِ اردو

از عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی، رفیق دار المصنفین

پیش نظر تاریخ ادب اردو پاکستان کے ممتاز اہل قلم ڈاکٹر جمیل جالبی کی لکھی ہوئی ہے، جو ان کے منصوبے کے مطابق چار جلدوں میں مکمل ہوگی، اس کی پہلی جلد آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک قدیم اردو زبان و ادب کا احاطہ کرتی ہے اور ۷۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، یہ جدید انداز کی نہایت مفصل اور مربوط تاریخ ہے۔

پہلی جلد کو ترتیب زمانی کے لحاظ سے چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں، فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی، ادبی اور لسانی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے، پھر بعد کے ابواب میں ممتاز شخصیتوں، شاعروں اور نثر نگاروں کی ادبی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اختتامیہ میں اختصار کے ساتھ روایت کے اتار چڑھاؤ کی داستان بیان کی گئی ہے۔

اردو زبان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ علاقائی بولیوں سے مل کر اس نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں اور پھر اس کے بعد اس میں ادبی سرمایہ کا ظہور کس طرح ہوا، یہ ایک طویل داستان ہے، مصنف نے کتاب کی تمہید میں اردو زبان اور اس کے ارتقاء کے اسباب پر بڑی پر مغز بحث کی ہے۔

جس طرح علاقائی زبانوں کی آمیزش سے اپ بھرنش کی نشو و نما ہوئی، پراچی اپ بھرنش، شورسینی اپ بھرنش، ماگدھی اپ بھرنش، اردھ ماگدھی اپ بھرنش اور مہاراشٹری اپ بھرنش مختلف نام پڑے،

ان اپ بھرنشوں میں شورسینی اپ بھرنش کا حلقۂ اثر سب سے زیادہ وسیع تھا، اسی طرح ملک گیر شورسینی اپ بھرنش کا جدید ترین روپ مصنف کے خیال میں اردو ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں بہت سے ماہرین لسانیات اور مصنفوں کے بیانات پیش کیے ہیں۔

کتاب کی پہلی فصل شمالی ہند سے تعلق رکھتی ہے جس میں ۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک اردو کی نشو ونما اور اس کی بتدریج ترقی دکھلائی گئی ہے، اس سلسلے میں مصنف کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ "پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے، وہ زبان جو غوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہونچی، اس کی ساخت، اس کے مزاج، لب ولہجہ اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا، قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و رواج کو دیکھتے ہیں تو ذرہ دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجاب کے اثر و رشتہ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں"، (ص ۲۳)

انھوں نے نہ صرف نواح دہلی کی بولیوں ہریانی اور کھڑی کی قدامت کو نظر انداز کر دیا بلکہ اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ قدیم اردو اور پنجابی میں بنیادی لسانی اختلافات بھی موجود ہیں۔

بہرحال اس نئی بولی کی ابتداء محمود غزنوی کے حملے کے بعد سے ہونے لگی تو سب سے پہلا نام مسعود سعد سلمان کا لیا ہے، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا، عوفی نے "لباب الالباب" میں اور امیر خسرو نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ دیوان اگر مل جاتا تو بہت سی لسانی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں، ابتدا میں جب اس زبان کا چرچا پھیلا تو فارسی کے بعض شعراء کے ہاں اور بعض فارسی تصانیف میں جو الفاظ اور محاورے راہ پا جاتے ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے، اور سب کے نمونے دئے گئے ہیں۔ . . . .

امیر خسرو کے بعض اشعار کا آدھا مصرعہ فارسی اور آدھا اردو میں ہے اور ان کے پیر بھائی امیر حسن کی بھی اسی انداز کی ایک غزل پیش کی گئی ہے جس کا ذکر صرف قلمی بیاضوں میں ہے، قلمی بیاضوں سے خواہ تائیدی شواہد کے طور پر تو پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، امیر خسرو کی بہت سی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، انمل وغیرہ جو ان سے منسوب ہیں تحقیق طلب ہیں، مگر ان سے منسوب کتاب "خالق باری" کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔ ایک گروہ اسے امیر خسرو کی تصنیف بتاتا ہے اور دوسرا ضیاء الدین خسرو کی۔ جالبی صاحب نے امیر خسرو کی تصنیف قرار دینے کے جو دلائل دئے ہیں وہ بڑی حد تک قابل وثوق ہیں۔

اس کے بعد بزرگوں کے ملفوظات کا ذکر کیا ہے جو فارسی میں ہیں لیکن عوام کی رعایت سے بعض فقرے یا مصرعے . . . اردو میں آ گئے ہیں، انھیں نقل کیا گیا ہے، ان میں وہ فقرے تو مشتبہ ہیں جو بیاضوں سے دیے گئے ہیں، لیکن صوفیہ کے احوال میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے دیے گئے فقرے صحیح ہیں، شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے بعض فقرے جو علامہ سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کے مخطوطے جواہر خمسہ اور رسالہ بہاء الدین بن ابراہیم القادری سے اپنی کتاب نقوشِ سلیمانی میں دیے ہیں، مصنف کی نگاہ سے رہ گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات افضل الفوائد سے زیادہ معتبر "فوائد الفواد" ہے، اگر ان سے مثالیں دی جاتیں تو زیادہ بہتر ہوتا، اس میں بھی بہت سے الفاظ آپ کی زبان سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے مجموعۂ ملفوظات "خیرالمجالس" کو نظرانداز کیا گیا حالانکہ اس میں بھی کئی فقرے ملتے ہیں، شیخ حمیدالدین ناگوریؒ، شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے جملے درج ہیں، فالنامے اور اشعار کا تو ذکر کیا گیا لیکن مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو

نظر انداز کر دیا گیا، ان کے ملفوظات "لطائف اشرفی" میں اردو الفاظ، دعائیں اور اردو تما ہندی میں نثر پارے ملتے ہیں، حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں نادر کاکوروی کے حوالہ سے ان کے ایک قلمی رسالہ اخلاق و تصوف کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے اور اس کا ایک اقتباس بھی دیا ہے۔

اسی طرح شیخ علاء الدین پنڈوی، شیخ نور الحق پنڈوی، مخدوم جہانیان جہاں گشت سے بھی بعض الفاظ اور فقرے منقول ہیں، شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے امین الدین کے مکتوبات میں بھی الفاظ، دوہے اور ہنڈولنے ملتے ہیں، لیکن اس کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔

صوفیائے کرام کے علاوہ ہندوؤں میں جو مذہبی تحریکیں اٹھیں ان کے علمبرداروں میں سے کئی نے اس زبان کا سہارا لیا، اس سلسلہ میں نامدیو، سادنا، روی داس، دھرم داس اور ستا کے نام لیے گئے ہیں، کبیر اور گرونانک کے کلام میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے بحث کی گئی ہے۔

بابر سے شاہجہاں تک جتنے اہم شعراء گذرے ہیں ان کا ذکر مع اشعار کے کیا گیا ہے، اس عرصہ میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سرحد کے پیر روشان کی کتاب خیر البیان کو اردو نثر کا واحد نمونہ قرار دیا ہے، اس دور کی سب سے اہم اور قابل قدر تصنیف محمد افضل پانی پتی کی "بکٹ کہانی" جو بارہ ماسہ کی روایت میں لکھی گئی اس پر نہایت دلآویز انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے اور پھر اس کا لسانی تجزیہ بھی کیا ہے۔

شاہجہاں کے زمانہ میں جب اس زبان کا رواج بڑھ جاتا ہے تو مصنف نے بتایا ہے کہ شاہی ملازمتوں کے لیے اس سے واقف ہونا ضروری تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "رقعات عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں حسب ضرورت اس زبان میں خط و کتابت بھی کرتا تھا، شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم میں ہے کہ جس زمانہ میں شجاع اور اورنگ زیب برسر پیکار تھے تو شاہجہاں نے ایک شقہ شجاع کو لکھا، یہ شقہ کسی طرح اورنگ زیب کو مل گیا اور اس کی بنیاد پر اورنگ زیب نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں لکھا تھا کہ "آں فرمان عالی

کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقمے فرمودہ شاہد این معانی وست ؟

اگر اصل ماخذ کو دیکھ لیا جاتا تو اس میں یہ لفظ نہیں ملتا، رقعات عالمگیری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی جلد اول ص ۲۱۸ پر یہ جملہ اس طرح ہے "از نوشتہ کہ بعبارت ہندی بہ شاہ شجاع قلمی گردیدہ بود" خافی خاں کی منتخب اللباب جلد دوم مطبوعہ کلکتہ کے صفحہ ۱۰۳ پر "بخط ہندوی" درج ہے، دونوں کی عبارت سے فارسی رسم الخط کے بجائے ہندوی رسم الخط مراد ہے نہ کہ زبان۔

پھر آگے چل کر بتایا ہے کہ اردو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جو فارسی کے مقابلہ میں دبی ہوئی تھی نئے رنگ روپ کے ساتھ ابھرنے لگی، اس دور کے لغت نویسوں اور مصنفوں کے ذکر کے بعد "فقہ ہندی" کا نام لیا گیا ہے جس میں فقہی مسائل کو شعر میں بیان کیا گیا ہے، اس کے مصنف کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری ہیں، حالانکہ اس کے مصنف مولانا عبدی ہیں، اس کتاب کے ایک قلمی نسخہ کا تذکرہ علامہ سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں کیا ہے، جو انھیں سفر گجرات میں ملا تھا، اس کا مصنف مولانا عبدی ہی کو بتایا ہے، اس کے خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۰۸۰ھ بعہد اورنگ زیب عالمگیر صاف تحریر ہے۔

کتاب کی فصل دوم میں گجری ادب اور اس کی روایت سے بحث کی گئی ہے اور یہ دور ۱۰۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک ہے، پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ گجرات میں عربوں کی آمد کے بعد یہاں مقامی بولی میں عربی الفاظ ملے، پھر سلاطین دہلی کے زیر نگیں آنے کے بعد اس میں فارسی الفاظ شیر و شکر ہوگئے اور حملۂ تیمور کی خبر کے بعد شمالی ہند سے لوگ یہاں آئے تو ایک ایسی مشترکہ زبان تیار ہوئی جس نے اظہار میں سہولت پیدا کردی، اسی زبان کو "گجری" نام دیا جاتا ہے۔

اس زبان کے نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات، اشعار اور گجراتی بادشاہوں کے بعض بے ساختہ جملوں سے دیئے گئے ہیں، اس کے بعد لغت کی جتنی اہم کتابیں لکھی گئیں ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے،

مسجدوں اور مزاروں پر کتبے بھی اس زبان میں لکھے گئے، ان کی نشاندہی کی ہے۔

شاہ وجیہ الدین علوی کے مجموعۂ ملفوظات "بحرالحقائق" قلمی سے فقرے نقل کیے گئے ہیں، یہ مجموعہ مصنف کو کراچی میں ملا، نام کے سلسلہ میں انھیں غلط فہمی ہوئی، اس کو اگر وہ بغور پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اس کا نام بحرالحقائق نہیں ہے، اس کتاب کا سب سے پہلے حوالہ مولوی عبدالحق کی کتاب "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ملتا ہے، اور تقریباً یہی فقرے انھوں نے بھی نقل کیے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ نام کے سلسلہ میں ان کو بھی غلط فہمی ہوئی، اس مجموعہ کی ایک نقل اتفاق سے میرے پاس بھی ہے جو مجھے حیدرآباد سے ملی، ان میں بھی یہی فقرے موجود ہیں، اس کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"ایں چند کلمہ از ملفوظ بحرالحقائق و معدن جواہر اسرار الدقائق، مفتاح کنوز معانی، کاشف امور سبحانی، شاہ وجیہ الدین العلوی طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ"

ظاہر ہے مرتب نے یہ الفاظ شاہ وجیہ الدین کے لیے بطور تعظیم کے لکھے ہیں، یہ کتاب کا نام نہیں ہے۔

نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں بہت سے صوفیہ اور شعراء کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، اُن میں شیخ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی تصانیف اور اشعار کی روشنی میں گجری ادبی روایت کا نمائندہ بتایا گیا ہے اور اکبر کی فتح گجرات کے بعد گجری میں لکھنے والے دکن کی قریب ریاستوں میں چلے جاتے ہیں تو گجری روایت کا اثر دکن میں بڑھنے لگتا ہے، اس سلسلہ میں خاص طور سے امین گجراتی کی "مثنوی یوسف زلیخا" پر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

فصل سوم میں بہمنی دور کی اردو سے بحث کی گئی ہے، ۱۳۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک میں سیاسی انقلابات سے دکن میں جس طرح اردو کے لیے فضا ساز گار ہوئی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے علاء الدین خلجی کی فتح دیوگیری اور محمد تغلق کے دولت آباد کو پایۂ تخت قرار دینے کے بعد جو بزرگ اس علاقہ میں آئے، یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہو گئی،

ان بزرگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ امیران صدہ کی بغاوت کے بعد بہمنی حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے تو یہ زبان اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور دکنی کہلاتی ہے، اس دور کی نمائندہ کتابوں میں فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" پر بڑا مفصل تبصرہ ہے، چونکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب کو مرتب بھی کیا ہے اور اس پر ایک بسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، اس لیے کتاب کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہری ہے۔

اس دور کے اہم مصنفین میں میران جی شمس العشاق اور اشرف بیابانی کی کتابوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

فصل چہارم میں عادل شاہی دور کا جو ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک ہے، تذکرہ کرتے ہوئے عادل شاہی حکمرانوں کی علم پروری اور شعر و شاعری کی سرپرستی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ان کے دور میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا، ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جگت گرو کی کتاب "نورس" اس کے ذوق شعری و موسیقی کی آئینہ دار ہے، اس کتاب کا بڑی گہرائی اور دقت نظر کے ساتھ تجزیہ کیا ہے پھر بتایا ہے کہ ملک خشنود کی "جنت سنگار"، مقیمی کی عشقیہ مثنوی "چندر بدن مہیار"، صنعتی کی مذہبی مثنوی "قصۂ بے نظیر"، نصرتی کی "گلشن عشق" اور ہاشمی کی مثنوی "قصہ" اور "یوسف زلیخا" اس دور کے شاہکار ہیں، حسن شوقی نے "فتح نامہ نظام شاہ" مرزا مقیم نے "فتح نامہ بکھیری"، نصرتی نے "علی نامہ" میں رزمیہ واقعات لکھے، شوقی نے "میزبانی نامہ" میں بادشاہ کی شادی کا نقشہ پیش کیا، عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں عادل شاہ ثانی جگت گرو کو موضوع شعر بنایا، میر مومن نے عشق نامے نجات نامے، مولود نامے، معراج نامے، شہادت نامے لکھے، شاہ داول کی طویل نظم "ناری نامہ" بھی اسی دور کی یادگار ہے، ہجویں، مرثیے بھی لکھے گئے، کسی کا تفصیل سے اور کسی کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔

اس دور میں نثر کا موضوع زیادہ تر مذہب اور تصوف رہا، برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقائق" شاہ امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل "گنج مخفی"، "وجودیہ"، "کلمۃ الاسرار"، میران جی خدا نما کی "شرح تمہیدات ہمدانی" میران یعقوب کی شمائل الاتقیاء وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، گجری روایت کی

ترسیع، ہندی رواج کا عروج بھی زیر بحث آئے ہیں، مقبل کے ابراہیم نامہ کے متعلق خیال ہے کہ یہ مثنوی بیجاپور کی ادبی روایت میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، پھر ہندی اور فارسی روایت کی کشمکش دکھائی گئی ہے اور اُن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ہاں فارسی طرز ادا اور لہجے کا رنگ بہت نکھر کر سامنے آتا ہے، فارسی مثنویوں کی تقلید میں جو مثنویاں لکھی گئیں جیسے ملک خشنود کی "جنت سنگار" امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت کا چربہ ہے" اور دونوں کا نہایت تفصیل سے مقابلہ کرایا گیا ہے ملک خشنود کی مثنوی اور غزلوں کا پہلی مرتبہ اردو تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے، نظام شاہی دربار سے وابستہ شاہ حسن شوقی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس نے فارسی غزل کے اسلوب و آہنگ سے متاثر ہوکر اردو شاعری کو ایک خاص شکل دی، اس کی مثنویوں پر تبصرہ میں اس کے شاعرانہ محاسن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جمیل جالبی صاحب کو اس کی ۳۱ غزلیں بھی دستیاب ہو گئی ہیں، جسے انھوں نے مرتب کرکے انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا ہے، حسن شوقی کی غزلوں پر ان کا تبصرہ بڑا دلآویز ہے۔

مذہبی تصانیف پر فارسی کے اثرات کے سلسلے میں شیخ داول، شیخ محمود خوش دہاں، اور شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصانیفِ نظم و نثر کا جائزہ لیا گیا ہے، شاہ امین الدین اعلیٰ کی بعض مزید تصانیف کا بھی پتہ چلا ہے، لیکن ان کا ذکر نہیں ہے، شاہ امین الدین اعلیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ریختہ اور غزلیں بھی لکھی ہیں، مثال میں جسے غزل کا عنوان دیا ہے وہ پندرہ[۱۵] اشعار کی ایک نظم ہے جو کتبہ کی شکل میں درگاہ امین الدین اعلیٰ پر ان کے کسی مرید کی لکھی ہوئی ہے، شاہ امین الدین کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ لکھا گیا ہے، حالانکہ درگاہ کے کتبہ سے بڑی کد و کاوش اور دیدہ ریزی سے پڑھنے کے بعد ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ کی تاریخ ملتی ہے، اس سلسلہ میں اکبر الدین صدیقی کا مقالہ بعنوان "کتبہ امین درگاہ بیجاپور" اردو نامہ کراچی شمارہ ماہ اپریل تا جون ۱۹۶۵ء میں شائع

ہو چکا ہے، غالباً وہ مولف کی نظر سے نہیں گذرا،

دکنی ادب کے عروج کے سلسلہ میں علی عادل شاہ ثانی تخلص شاہی کی کلیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کے دربار کے ملک الشعراء نصرتی کی تصانیف گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری پر تفصیلی گفتگو کے بعد "دیوان نصرتی" پر بڑا سیر حاصل تبصرہ ہے، نصرتی کے متعلق خیال ہے کہ اردو کا پہلا قصیدہ نگار ہے، اور قصیدہ میں اس کا نام سودا اور ذوق کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔

نئے عبوری دور کے شعراء میں سید میران میاں خاں ہاشمی، عبدالمومن مومن، محمد امین ایاغی، مرزا بیجاپوری کے کلام کے نمونے دینے کے بعد لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی فتح بیجاپور کے ساتھ ہی قدیم اردو کا مقامی رنگ اس میں باقی نہ رہا۔

فصل پنجم قطب شاہی دور سے متعلق ہے جو ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک ہے اس سلطنت کے بانی سلطان قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اس کے حکمرانوں میں ابراہیم قطب شاہ کے دور میں علم و ادب کو خوب ترقی ہوئی، دور اول کے شعراء میں فیروز، محمود اور ملا خیالی کے نام لیے گئے ہیں اور پھر محمد قلی قطب شاہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی بادشاہ نے حیدرآباد شہر بسایا، اسی کے زمانہ میں نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں، چار مینار اس کے ذوق تعمیر کا زندہ ثبوت ہے اسی کے ساتھ وہ نہایت پُرگو اور اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی ہے جس کے دیوان میں پچاس ہزار اشعار ہیں، اس کی شاعری پر طویل تبصرہ کیا گیا ہے، اسی کے دربار میں شیخ احمد گجراتی بار پاتے ہیں، انھوں نے دو مثنویاں "لیلیٰ مجنوں" اور "یوسف زلیخا" لکھیں آخر الذکر مثنوی کا ایک قلمی نسخہ مصنف کو دستیاب ہو گیا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے گجری اردو کی ترقی زبان و بیان کا قابل قدر نمونہ بتایا ہے۔

اس کے بعد نثر اور نظم میں فارسی روایت کے عروج پر روشنی ڈالی گئی ہے، پہلا نام ملا اسد اللہ وجہی کا آتا ہے، ملا وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اس کی کئی تصانیف یادگار ہیں نظم میں مثنوی قطب مشتری

اور نثر میں "سب رس" پر بیس صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ وجہی اردو کی نثر کا موجد ہے۔

فارسی روایت کی توسیع کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے عبداللہ قطب شاہ کی شاعری پر فارسی زبان و تہذیب کے گہرے رنگ کا ذکر کیا گیا ہے، قطب شاہ کے دربار کے ملک الشعراء غواصی کی کلیات کے علاوہ تین مثنویوں "مینا ستونتی" "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" جو شائع ہو چکی ہیں، ان کی خصوصیات پورے طور پر دکھلائی گئی ہیں، ابن نشاطی کی "پھول بن" میں صنائع و بدائع اور فن شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، قطب رازی کی منظوم "تحفۃ النصائح"، جنیدی کی "ماہ پیکر" سید بلاقی کے معراج نامے، عبداللطیف کے وفات نامے، معظم کے معراج نامے اور قلندر نامے، پر بھی گفتگو کی گئی ہے، گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں بتایا گیا ہے کہ کوئی بڑی تصنیف تو نہیں ملتی لیکن اس دور میں جتنی کتابیں نثر و نظم میں لکھی گئیں، ان کے اندر زبان و بیان میں صفائی و روانی پیدا ہو جاتی ہے، اس کے کلام کی خصوصیت پر بحث کرنے کے بعد اس دور کے اہم شاعر طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" کا تعارف کرایا گیا ہے، اس دور کے شاعروں میں محب، مختار، فتاحی، شغلی اور ضعیفی کے مذہبی موضوعات پر منظوم رسالوں کے بعد ضعیفی کی "ہدایات الہندی" کو جو فقہ کی کتاب ہے خاص طور سے اہمیت دی گئی ہے، مذہبی رجحانات کے سلسلہ میں خواصی، سیوک، قدرتی، اولیاء کے منظوم قصوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، فائز کی کتاب "رضوان شاہ و روح افزا" کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ فائز اور طبعی کی کتابیں معیار ریختہ سے قریب ہو گئی ہیں، مغلوں کی فتح دکن کے بعد تہذیبی اور لسانی سطح پر تبدیلیاں ہونے لگیں تو نئے ادبی معیار جو سامنے آئے اُن پر کلام کرنے کے بعد حسین ذوقی کی دو مثنویاں "وصال العاشقین" اور "نزہۃ العاشقین" قاضی محمود بحری کی مثنوی "من لگن" "بنگاب نامہ" اور ان کے دواوین کو اسی عبوری دور کا کارنامہ بتایا ہے۔

فصل ششم میں "فارسی روایت کا نیا عروج" کا عنوان دے کر ریختہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جس کا دور ۱۶۸۵ء سے ۱۷۵۰ء تک ہے، ریختہ کی روایت کے سب سے پہلے اور اہم نمائندہ ولی دکنی

کے نام، خاندان، حالاتِ زندگی، تاریخِ وفات پر بڑا تحقیقی مواد دیا گیا ہے، کلام اور اس کی خصوصیات پر نہایت دقتِ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، کاس کلام کے بیان میں دوسرے شعراء سے موازنہ بھی کیا گیا ہے، اور تقریباً ۲۸ صفحات اس کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں، یہ کتاب کا نہایت اہم اور جاندار حصہ ہے۔

ولی کے معاصرین اور بعد کی نسل میں سید محمد فراقی، داؤد اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے نام لیے گئے ہیں، سراج کے متعلق مصنف نے بتایا ہے کہ ولی کے بعد اور میر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصہ کے سب سے بڑے شاعر ہیں، ان کے کلام سے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ یہ آواز اردو شاعری میں پہلی بار سنی جا رہی ہے، سراج کے کلام پر تبصرہ بھی بڑا دلکش اور دلآویز ہے۔

ولی کے بعد کی نسل میں شاہ قاسم علی قاسم، عارف الدین خاں عاجز اور لچھمی نراین شفیق کا ذکر کرنے کے بعد یہ فصل ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد اختتامیہ ہے، پھر ضمیمے شامل کیے گئے ہیں جن میں پاکستان کے علاقوں میں اردو کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے، لیکن ان ضمیموں کو پڑھ کر قاری عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے، پنجاب میں اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ "اردو کا مولد پنجاب ہے" (ص ۶۰۲) اور جب سندھ کا ذکر آتا ہے تو لکھا جاتا ہے کہ "یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ و ملتان کے علاقہ میں عربوں کے زیر اثر بنی شروع ہوئی" (ص ۶۰۳) اسی طرح صوبۂ سرحد کے متعلق ہے کہ "اردو کی جنم بھومی درحقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے" (ص ۶۹۹) پھر جب بلوچستان پر لکھا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ "اردو کی تشکیل کی ابتداء بلوچستان سے ہوئی" (ص ۷۱۱) پھر آخر میں ہر علاقہ کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس زبان کا مولد ہر وہ علاقہ ہے جہاں مختلف زبان کے لوگ آپس میں مل جل رہے ہیں" یہ تحقیقی انداز نہیں، مورخ کو حقائق کی روشنی میں فیصلہ کن بات کہنی چاہیے، پھر بھی مصنف کے خیالات سے بعض مقامات پر اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اپنے تحقیقی مواد، طریق فکر، اسلوب تحریر کے اعتبار سے یہ گراں قدر تصنیف ہے، سرکاری فنون کے باوجود مصنف نے تن تنہا اتنی اہم کتاب لکھی جو لائق ستائش ہے، یہ ہندوستان میں کومنشیل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو چکی ہے میں مل سکتی ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

حدیث کا درایتی معیار: مرتبہ مولانا حافظ محمد تقی امینی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۴، قیمت مجلد ۲۳ روپے، غیر مجلد ۲۰ روپے۔ پتہ: ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد دہلی (۲) ادارہ علم و عرفان، امینی منزل، دودھ پور روڈ، علی گڑھ۔

محدثین نے صحیح و موضوع اور قوی و ضعیف حدیثوں میں امتیاز کے لیے روایت ہی کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کئے ہیں لیکن اصول روایت کے مقابلہ میں اصولِ درایت پر کم توجہ کی گئی ہے، متقدمین میں حافظ ابن جوزیؒ کا نام اس حیثیت سے زیادہ ممتاز ہے، اردو میں روایت کے اصول و ضوابط پر متعدد رسالے لکھے گئے ہیں، مگر درایت کے سلسلہ میں قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے، اس لیے مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے محنت، مطالعہ اور کافی غور و فکر کے بعد اس موضوع پر یہ مبسوط کتاب لکھی ہے، اس میں حدیث کا درایتی معیار بیان کرنے سے پہلے سرچشمۂ حدیث یعنی ذات نبویؐ پر مختلف حیثیتوں سے مفید اور عالمانہ بحثیں کی گئی ہیں، جن سے نبوت و رسالت کی حقیقت اور نبی و رسول کی عظمت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے، مولانا نے شعور نبوت پر جو گفتگو کی ہے وہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، اس میں اُس علم و ادراک، فہم و بصیرت اور حکمت و نورانیت کی تشریح کی ہے جو نبی کو من جانب اللہ عطا ہوتی ہے، خدا اور نبی کے درمیان رابطہ کا کام فرشتے انجام دیتے ہیں، اس لیے سفارت کے عنوان سے ان کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے۔ فہم حدیث کی طویل بحث میں امور دین سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کو وحی الٰہی سے مستنبط بتایا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں آپ کے استنباط کی فوقیت و برتری بھی ثابت کی ہے، پھر جوہر انسانیت کے تربیتی پروگرام کا مختصر

دیا ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے کلیات پر غور کرکے مرتب کیا تھا، لائق مصنف نے نبوت کے منصب پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم و فہم اور حکمت و شعور کی مفصل تشریح اس لیے کی ہے کہ سرچشمۂ نبوت کے فیضان (حدیث) کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت سامنے آجائے، یہ اس کے متن پر نقد و بحث کی بنیاد بن سکے، کتاب کے شروع میں درایت کا مفہوم بیان کیا ہے اور آخر میں قرآن و حدیث اور اقوالِ صحابہؓ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں محدثین کی کوششوں کا اجمالی جائزہ بھی لیا ہے، اصول روایت میں حدیث کی سند یعنی راوی کے حالات کی چھان بین کرکے اس کی بیان کردہ حدیث کا درجہ و مرتبہ متعین کیا جاتا ہے، اور اصول درایت میں اس کے متن و مضمون پر نقد و جرح کرکے اس کی توثیق یا تضعیف کی جاتی ہے، مصنف نے اول الذکر کے لیے خارجی نقد حدیث اور مؤخر الذکر کے لیے داخلی نقد حدیث کی اصطلاح وضع کی ہے، ان کا مقصد داخلی نقد حدیث کی وضاحت و تشریح ہے، مگر اس کے ضمن میں خارجی نقد حدیث کے بعض اصول بھی قلمبند ہو گئے ہیں، کیونکہ وہ بھی داخلی نقد حدیث کے ساتھ خاص ہیں، یا خارجی اور داخلی دونوں میں مشترک ہیں، ان دونوں کے ٹکراؤ کی بعض صورتیں بیان کرکے ان میں تطبیق بھی دی ہے، اور بتایا ہے کہ عدم تطبیق کے وقت داخلی کو خارجی پر ترجیح ہوگی، مصنف کے بعض خیالات پر ممکن ہے ظاہر بیں لوگوں کو اعتراض ہو، مگر غور و فکر کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی، مثلاً ان کا خیال ہے کہ مستند کتب کی ثقہ راویوں سے منقول روایتیں شانِ نبوت کے منافی ہونے کی صورت میں قابل قبول نہ ہوں گی، اسی طرح وہ نسخ کو قرآن مجید کے بجائے قدیم آسمانی کتابوں کے ساتھ مخصوص بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قرآن کے کسی حکم میں رد و بدل کا تعلق ذات سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اوصاف سے ہوتا ہے، اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کی نوعیت و حکمت لوگوں پر واضح نہیں ہو سکی اور تجدد پسند حضرات انھیں قرآن کے احکام میں رد و بدل پر محمول کرکے خود بھی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور دوسروں کو بھی کیا، مصنف کا خاص موضوع فقہ و اجتہاد ہے، اس پر ان کی جو متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے موجودہ دور میں فقہ

واجتہاد کی راہ ہموار ہوتی ہے، یہ کتاب فن حدیث سے ان کی دلچسپی کا نتیجہ ہے، اس کا مقصد حدیث کی معرفت و درایت کے قدیم اصول و ضوابط کی تشریح اور اس کے نئے قواعد و قوانین مرتب کرنے کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔

البیرونی اور جغرافیۂ عالم :- مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد قیمت ۱۲ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

ابوریحان البیرونی دسویں صدی عیسوی کا نامور فاضل و محقق اور علم الاقوام خصوصاً ہندوستانی علوم و مذاہب کا ماہر تھا، اس نے بڑی ہمہ گیر طبیعت پائی تھی اور اسے ہر قسم کے علوم و معارف سے دلچسپی تھی اور سب میں اس کی جدت و جودت اور تحقیق و انکشاف کے آثار و نتائج ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ عرصۂ دراز تک اس کے علمی کمالات سے ناواقف رہے، زمانۂ حال کے ایک ترکی فاضل زکی ولیدی توغان استاذ شعبۂ تاریخ استنبول یونیورسٹی نے البیرونی کے علمی کارناموں پر مفید تحقیقات کی ہیں، ان کی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ صفۃ المعمورہ علی البیرونی کی اشاعت ہے، اس میں پروفیسر توغان نے البیرونی کی چار کتابوں (۱) قانون مسعودی (۲) تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات الاماکن (۳) کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر (۴) کتاب الصیدنہ کے منتخب حصے یکجا کر کے اس کے جغرافیائی کمالات نمایاں کیے ہیں، ہندوستان کے اہل علم میں جناب سید حسن برنی مرحوم کو بھی البیرونی کی زندگی اور علمی کمالات سے بڑا شغف تھا، ترکی فاضل کی تصنیف شائع ہوئی تو انھوں نے جون ۱۹۴۲ء کے معارف میں اس پر عالمانہ تبصرہ لکھا، یہی کتاب مولانا آزاد مرحوم کی نظر سے گذری تو انھوں نے بھی البیرونی اور جغرافیۂ عالم کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور اس میں البیرونی کے علم جغرافیہ میں بعض اولیات اور اہم کارناموں کی جانب توجہ دلائی، مقالہ کی تحریر کے وقت صفۃ المعمورہ کے علاوہ البیرونی کی بعض دوسری کتابیں بھی مولانا کے پیش نظر تھیں، انھوں نے اس کے جغرافیہ سے دلچسپی اور القانون کے اہم جغرافیائی

مباحث پر روشنی ڈالنے کے علاوہ القانون کے یورپ آکسفورڈ اور ہندوستان کے بعض قلمی نسخوں کے متعلق ضروری معلومات بھی تحریر کیے ہیں اور پروفیسر توغان کی کوششوں کی تحسین بھی کی ہے، اب جناب سید احسن صاحب نے آزاد بھون کی لائبریری سے مولانا کے اس غیر مطبوعہ مقالہ کی نقل حاصل کر کے اسے شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے اس کے متعلق بعض وضاحتیں بھی درج ہیں اور یہ جناب ضیاء الحسن فاروقی کے مقدمہ و حواشی سے بھی مزین ہے، مقدمہ میں البیرونی کے حالات و کمالات خاص والہانہ انداز سے لکھے گئے ہیں، اکثر لوگوں کو مولانا کی اس تحریر کا علم نہ ہوگا، اس علمی تبرک کو شائع کرنے والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحدید نسل اور اسلامی تعلیمات: مرتبہ مولوی عبید اللہ الاسعدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے، پتہ: اسلامک بکسنٹر، حکام نگر، لکھنؤ

تحدید نسل اور ضبط تولید کی حمایت و مخالفت میں بہت لکھا گیا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں تحدید نسل کی موجودہ کوششوں اور رائج و عام صورتوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے باطل قرار دیا گیا ہے، شروع میں عالم کی تخلیق و بقاء کے طبعی نظام اور مخلوق کی رزق رسانی کے قدرتی انتظام کو بیان کر کے تحدید نسل اور بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی ضرورت کے جو اسباب بتائے جاتے ہیں اُن کا جواب دیا ہے، اور افزائش نسل اور توالد و تناسل کو نشائے قدرت بتایا ہے، مصنف نے نکاح کو افزائش نسل کی صحیح صورت قرار دینے کے بعد اس کی ضرورت، مصلحت اور شرعی اہمیت واضح کی ہے، آخر میں ضبط نسل کی صورتوں، قتل اولاد، اسقاط، نسبندی، اختصار اور عزل کے متعلق احکام شریعت بیان کیے ہیں اور اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کے نصوص کے علاوہ علمائے اسلام کے اقوال بھی پیش کیے ہیں، کتاب کی ترتیب سلیقہ سے کی گئی ہے، اور اس سے زیر بحث مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ "ض"

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

[دارالمص]نفین کا سلسلہ تاریخ ہند دو کتابوں پر مشتمل ہے اسی کے تحت عہد مجدد کے مسلمان حکمرانوں [کی مذہبی رو]اداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے حصہ اول میں عہد مغلیہ سے [پہلے کے مسلم]ان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی [حوا]لوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانرواؤں خصوصاً [مغلیہ خا]ندان کے فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے، اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی [اور مردم پرو]ری کی تفصیل پیش کی جائے گی۔ قیمت ۔۔ روپیہ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

تبع تابعین حصہ دوم

سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے [حصہ میں] امام ابو حنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ [اور] دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح [اور ان] کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے اور حصہ [دوم میں] امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی، امام لیث، امام کاظم، امام یحییٰ مسعودی اور امام عبدالرزاق [اور] دوسرے ۳۰ صاحب تصنیف اور [صاحب د]عوت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں۔ [مرتب]ہ محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین

قیمت :- ۲۰

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو اور فارسی کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے۔ مقدمہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے ہے۔ پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں۔

(مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی)

قیمت :- ۱۲ - ۰

رجسٹرڈ نمبر

مئی سنہ ۱۹۸۱ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

([illegible])

جلد ۱۲۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

چودہ سو سال ہجری کے اچھے مسلمان حکمرانوں کی جہانبانی کے اصولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف کی گذشتہ اشاعت میں صرف بنوامیہ کے دور کا احاطہ ہو سکا تھا، اب اس کے بعد کے فرمانرواؤں پر بھی ایک نظر ڈالنی ہے

عباسی خلفاء میں منصور سب سے زیادہ باوقار حکمراں تھا، مورخوں کا بیان ہے کہ وہ حزم، عقل، علم، اصابت رائے، حسن تدبیر، وقار اور حکمت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں تھا، خلوت میں خوش مزاج اور خوش اخلاق رہتا تھا، لیکن دربار میں آکر بدل جاتا، اپنے لڑکوں سے کہہ رکھا تھا کہ دربار میں وہ قریب نہ آئیں، ممکن ہے کہ ان کو اس سے نقصان پہونچ جائے، وہ نازک ترین موقعوں پر بھی مطلق نہ گھبراتا، اس کا سارا وقت حکومت کی آمدنی، اس کے مصارف، رعایا کی فلاح و بہبود کے مسائل پر غور و فکر میں گذرتا، وہ حکومت کے باغیوں کے لیے نرمی روا نہ رکھتا، لیکن امن پسند رعایا کے لیے عادل تھا، اس کا قول تھا کہ خلیفہ کو صرف تقویٰ درست رکھ سکتا ہے، سلطان کو اطاعت اور رعایا کو عدل، جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے اس کے لیے عفو و درگذر زیادہ مناسب ہے، اور وہ بڑا کم عقل ہے جو اپنے زیر دستوں پر ظلم کرتا ہے، وہ بادشاہت کو خدا کی جبل متین اور دین قیم کو اس کا عروۃ الوثقیٰ سمجھتا رہا۔

محمد مہدی بن منصور خلیفہ ہوا تو اس کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ بارالہا! میں زوال سے پناہ مانگتا ہوں، ایک بار سخت طوفان آیا تو اس نے فرش خاک پر اپنا سر رکھ کر یہ دعا کی کہ "خدایا! امت محمدؐ کی حفاظت کر، ہمارے دشمنوں کو ہماری تباہی پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اگر میرے گناہوں کی پاداش میں تونے عالم کو پکڑا ہے تو یہ پیشانی تیرے حضور میں ہے۔" اس کی نگاہ میں دولت کی کوئی وقعت نہ تھی، جو دولت ظلم و زیادتی سے حاصل کی جاتی، اس کو واپس کر دیتا۔

ہادی بن موسیٰ اپنی نجی صحبتوں میں بے تکلف رہتا، اس کے رضاعی بھائی حسین بن معاذ بن مسلم کا بیان ہے کہ میں نجی صحبتوں میں اس کو پچھاڑ کر زمین پر پٹک دیتا تھا، لیکن جب وہ دربار میں آتا تو مجھ پر اس کے خوف و ہراس اور ہیبت سے لرزہ طاری ہو جاتا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کسی شخص کو اس کے پاس آنے سے روکا نہ جائے کیونکہ اس سے برکت جاتی رہتی ہے۔

ہارون رشید کا شمار دنیا کے بہترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے، اس کی شخصیت یورپین مصنفوں کے لیے ایک دلآویز افسانہ بنی ہوئی ہے، قاضی ابو یوسف نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الخراج اسی کے لیے لکھی، اس میں انھوں نے اس کو مخاطب کرکے لکھا کہ وہ تقویٰ اختیار کرے، اس کو اپنے خدا کے یہاں وہی چیز پیش کرنی ہوگی جو چرواہا اپنے مالک کی خدمت میں کرتا ہے، وہ اپنی رعایا کے ساتھ حق و انصاف سے پیش آئے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے خوش قسمت وہ راعی ہوگا جس کی رعایا کو خوش بختی حاصل ہو، غصہ کی بنا پر مواخذہ کرنا صحیح نہیں، اگر کوئی معاملہ ایسا آئے جس میں ایک میں دنیا کا بھلا ہو اور دوسرے میں آخرت کا تو آخرت کی بھلائی قابل ترجیح ہے جو شخص خدا کے لیے تقویٰ اختیار کرتا ہے خدا اس کو ضرور بچاتا ہے، خراج کے وصول کرنے والے صالح لوگ ہوں، وہ خراج ادا کرنے والوں کی تحقیر و تذلیل نہ کریں، جب تک خبر رساں اور پرچہ نگار عادل اور ثقہ نہ ہوں ان کی اطلاعیں قبول نہ کی جائیں، ہارون رشید ان ہی باتوں پر عمل کرتا رہا۔

وہ بے کسوں اور حاجت مندوں کا ملجا اور ماویٰ بن گیا تھا، خشیت الٰہی میں روزانہ سو رکعتیں نفلیں پڑھتا تھا، روزانہ ایک ہزار درہم خیرات کرتا، اکثر حج کرتا، ایک بار اس کے سامنے یہ حدیث دہرائی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آرزو ہے کہ خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں اس حدیث کو سن کر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی، اسی کے بعد سے ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد میں شریک ہوتا، ایک اور موقع پر اس کو ابن سماک نے یہ نصیحت کی کہ کل تجھے خدا کے روبرو جانا ہے، وہاں تجھے دو مقاموں میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہے جنت یا دوزخ، یہ سن کر وہ اس قدر رویا کہ اس کی

داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

مامون بن ہارون رشید ظلم وجور کو کسی حال میں پسند نہ کرتا، اس کے ایوان عدالت میں ادنیٰ آدمی شہزادوں سے اپنا حق لے سکتا تھا، ایک بار خود اس کو ایک فریق کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا، خدام نے اس کے لیے قالین بچھانا چاہا، قاضی القضاۃ نے یہ کہہ کر رکوا دیا کہ عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں برابر ہیں، مامون نے خوش ہو کر قاضی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا، وہ بڑا بردبار بھی تھا، اس لیے عفو و درگذر سے کام لیتا، کہتا کہ اگر لوگوں کو میرے عفو کا اندازہ ہو جائے تو وہ جرائم کو میرے تقرب کا ذریعہ بنائیں، وہ حتی الوسع اپنا کام خود کرتا، اپنے ملازموں اور خادموں کو بھی تکلیف نہ دیتا، کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے، اس کے مذہبی عقائد مختلف فیہ بن گئے مگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے بڑا والہانہ لگاؤ رہا، دمشق کے دورے میں اس کو آپؐ کا فرمان ملا تو اس کو آنکھوں سے لگا کر رویا، اور اس میں جو کچھ لکھا تھا اس پر عمل کرایا۔

ایک بار ایک خارجی اس کے پاس آیا اور بڑی سختی سے بولا کہ تم جس جگہ پر بیٹھے ہو کیا متفقہ طور پر بٹھایا گیا ہے یا تم زور و ظلم سے اس پر بیٹھ گئے ہو؟ مامون نے حلم و بردباری کے ساتھ جواب دیا کہ دونوں میں سے کوئی بات صحیح نہیں، جو مسلمانوں کی سلطنت پر فرمانروائی کرتا تھا، اسی نے مجھ کو اور میرے بھائی کو یہ حکومت سپرد کی، میں چاہتا تھا کہ لوگوں سے استصواب رائے کروں، مگر اس کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتا تو اسلام کا امن خطرہ میں پڑ جاتا، نظام درہم برہم ہو جاتا، طرح طرح کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے، شاہراہوں پر بدامنی بڑھ جاتی، حجاج کے لیے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتیں، اس لیے لوگوں کی خاطر اپنی جگہ پر قائم رہا

لیکن اگر میری جگہ پر کسی اور کو متفقہ طور پر بٹھا دیں تو میں اپنی جگہ چھوڑ سکتا ہوں، خارجی نے یہ سب کچھ سنا تو یہ کہہ کر واپس ہوگیا: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، وہ بغاوت پر آمادہ تھا، مگر مامون کی باتیں سن کر مطمئن ہوگیا، مامون کہا کرتا تھا کہ معاویہؓ کی قوت عمرو بن العاصؓ کے بل پر تھی، عبدالملک کا سہارا حجاج تھا، لیکن میری قوت وعظمت خود میری ذات سے ہے۔

معتصم باللہ حکومت کے دبدبہ اور اس کی شان وشوکت کو قائم رکھنے میں ہر ممکن کوشش کرتا، مگر اپنی نجی زندگی میں سادگی کو پسند کرتا۔ واثق باللہ چھوٹا مامون کہلاتا تھا، اس نے رفاہ عام کے کام اتنے انجام دیے کہ لوگ اس کی موت کے بعد مدتوں رویا کیے، متوکل علی اللہ کا دور اپنی سرسبزی، شادابی اور فارغ البالی اور تمدنی نفاستوں اور نزاکتوں کی وجہ سے مورخین کی نظر میں عہد سرور اور عہد زریں تھا، منتصر باللہ کی ہیبت سے رعایا کانپتی تھی مگر اس کے عدل وانصاف کی وجہ سے اس کی گرویدہ تھی۔

مہتدی باللہ نے قیام عدل کے لیے قبۃ المظالم کے نام سے ایک عمارت بنوائی تھی، اس میں اگر اس کا لڑکا بھی ماخوذ ہوکر آتا تو اس کی رورعایت نہ کرتا، اس نے دربار کے تمام مسرفانہ اور عیاشانہ تکلفات کو ختم کرکے اس کو راہب کی ایک خانقاہ بنا دیا تھا، وہ کہا کرتا کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ کے راستے پر چلنے دو تاکہ بنو عباس میں بھی ایک عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوجائے، معتضد باللہؒ بڑی حکمران تھا، اپنے لشکریوں کے ساتھ میدان جنگ میں اتر کر ان کے دوش بدوش لڑتا، فوجی مہم میں اس کو اپنا لباس بدلنے کی بھی فرصت نہ ہوتی۔

مکتفی باللہ میں جہانبانی کے اوصاف تو کم تھے لیکن اپنی نرمی کی وجہ سے اپنی پوری مملکت میں محبوب رہا، راضی باللہ نے اپنی فیاضی اور سیرچشمی میں بنو عباس کے عہد زریں کی یاد تازہ کردی تھی، قادر باللہ نے اپنے زہد، تقویٰ، سیادت، دینداری، تہجد گذاری، صدقات

و خیرات کی کثرت اور کریم النفسی کی وجہ سے بنو عباس کی زوال پذیری کے زمانہ میں حکومت کے وقار کو بہت کچھ سنبھالا، اس کے بہت کچھ اوصاف ہارون رشید کے تھے، اپنے زمانہ کے عقائد کی تصحیح کے لیے ایک کتاب لکھی جو محدثین کے حلقہ میں پڑھی جاتی تھی۔

قائم بامر اللہ بڑا متقی اور دیندار حکمراں رہا، رات بھر عبادت کرتا، اکثر روزے رکھتا، اہل حاجت کی حاجت پوری کرنے میں تاخیر نہ کرتا، اس کی وجہ سے زوال پذیر حکومت میں قوت پیدا ہوئی، مقتدی بامر اللہ نے دین اور سیاست کو ایک ساتھ جمع کر کے خلافت کے وقار کو بڑھایا، اس کے دور میں خیر کی برکت ہوئی اور رزق میں کشادگی پیدا ہوئی، مستظہر باللہ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی، اس کا زمانہ رعایا کے سرور و شادمانی کا دور تھا، مسترشد باللہ شجاع، عالی ہمت، صائب الرائے، علم نواز، عابد اور زاہد ہونے کے علاوہ ملک کا خیرخواہ اور رعایا کے لیے شفیق رہا، ناصر لدین اللہ اپنی سیاست، بصیرت، تیز طبعی، حاضر دماغی کی بدولت عباسی جاہ و جلال کی آخری یادگار تھا، ظاہر باللہ نے اپنی نو مہینے کی حکومت میں عمرؓ ابن عبدالعزیزؒ کی یاد تازہ کر دی، مستنصر باللہ کی حکومت میں بڑا شکوہ و تجمل رہا، لیکن اسی کے ساتھ وہ بڑا عادل اور دیندار حکمراں تھا۔

بنو عباس ہی کے زمانہ میں سلجوقی حکومت قائم ہوئی تو اس کا فرمانروا طغرل اپنی جہانبانی کے لیے مشہور ہوا، وہ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا، تہجد کا پابند رہا، ہر جمعہ اور دوشنبہ کو روزہ رکھتا، کہتا کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عمارت بنواؤں اور اس کے پہلو میں مسجد نہ ہو، اس کا صحیح جانشین الپ ارسلان ہوا، اس کی سطوت اور ہیبت سے ایک عالم اس کے سامنے جھک گیا تھا اور وہ سلطان العالم کہلاتا، وہ اصل محاصل کے سوا ناجائز آمدنی اپنے خزانہ میں داخل ہونے نہ دیتا، اس نے مسکینوں کے لیے ایک مطبخ کھول رکھا تھا، جس میں پچاس بکرے

روزانہ ذبح ہوتے تھے، رمضان شریف میں پندرہ ہزار اشرفیاں غربار میں تقسیم کرتا۔

الپ ارسلان کا جانشین ملک شاہ ملک گیری اور ملک داری میں دنیا کے بہترین فرماں رواؤں میں شمار کیا جاتا ہے، اپنی شجاعت کی وجہ سے جس سمت رخ کیا اس کو زیر نگیں کر کے چھوڑا، اپنی عدل پروری کی وجہ سے الملک العادل کے لقب سے مشہور ہوا، رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے، پوری مملکت میں سڑکوں کے جال بچھا دیے، سرائیں بنوائیں، دریاؤں پر پل تعمیر کرائے، حرم کے خدام کے لیے جاگیریں مقرر کیں، اس کے وزیر نظام الملک کے اوصاف و کمالات فضائل و مناقب علم نوازی، مذہبی خدمات، عدل پروری، دینداری اور غربا پروری کی دھوم تھی، اس کے ایسا وزیر مسلمانوں کی تاریخ میں پھر کوئی اور نہ ہو سکا، سلجوقی فرماں رواؤں میں سنجر کا آئین جہانبانی اب تک مشہور ہے، وہ سلجوقی خاندان کی عزت و ناموس کا محافظ تھا، سلطان اعظم کے لقب سے مشہور رہا، حرمین تک میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا۔

عباسیوں ہی کے زمانہ میں زنگی خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا فرمانروا عماد الدین زنگی اپنی حکمرانی، شجاعت، عدل اور دینداری کی وجہ سے ایک بہترین فرمانروا ہوا، وہ اپنے امراء کو ان کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیتا، ان پر اعتماد بھی رکھتا تھا، لیکن ان کی پوری نگرانی بھی کرتا، اس نے صلیبی جنگ کے معارکات میں حصہ لے کر اس کا رخ بدل دیا، اس نے اپنی فوج کی تنظیم ایسی کر رکھی تھی کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتی تو معلوم ہوتا کہ دو رسیاں تان دی گئی ہیں اور وہ اس کے

درمیان سے گذر رہا ہے۔

اس کا جانشین نورالدین زنگی صلیبی جنگ کا ہیرو ہوگیا، اسی جنگ میں اس کے بھائی کی ایک آنکھ جاتی رہی تو اس نے اس پر اظہار افسوس کرنے کے بجائے یہ کہا کہ اگر میرا بھائی دیکھ سکتا کہ اس کے صلہ میں اس کو بہشت میں کیا ملے گا تو وہ اپنی دوسری آنکھ بھی قربان کردیتا۔ اس کے سپاہی اس سے بڑی محبت کرتے، بڑی پامردی سے اس کے دوش بدوش ہوکر لڑتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ لڑائی میں مارے بھی گئے، تو وہ ان کے اہل وعیال کی پوری خبرگیری کرتا رہے گا، وہ بڑا دیندار بھی تھا، اسلامی فقہ کے مطابق کھانے پینے کی جن چیزوں اور پوشاکوں کی اجازت تھی وہی خود استعمال کرتا اور اپنی رعایا سے استعمال کراتا۔

صلاح الدین ایوبی تو اپنی سپہگری، بلند حوصلگی، جہانبانی، رواداری، دینداری، جلالت، شہامت اور سطوت کے لحاظ سے دنیا کے تمام حکمرانوں کا ایسا سرتاج بن گیا کہ نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی ناول نگاروں اور گانے والوں کے لیے ایک موضوع بنا ہوا ہے، وہ ہیرو کا ہیرو ہے۔

عیسائیوں نے جب پہلی دفعہ بیت المقدس پر تسلط حاصل کیا تو ان کو فخر تھا کہ ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا، لیکن جب صلاح الدین بیت المقدس میں فاتح ہوکر داخل ہوا تو اس نے شہر کے ہر ناکہ پر ایک امیر کو تعینات کر رکھا تھا کہ کسی عیسائی کو گزند نہ پہونچے، گبن لکھتا ہے کہ وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا، مگر اس نے بیت المقدس میں داخل ہوکر جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا اس سے وہ نہ صرف تعریف وتحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے۔

مقالات

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

مہاجرین جلد دوم | یہ شاہ صاحب کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جو ۱۹۲۶ء میں دارالمصنفین سے بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی، ان کو یہاں آئے ہوئے ابھی کل چار سال ہوئے تھے کہ یہ کتاب ان کے قلم سے لکھ کر تیار بھی ہوگئی اور چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں تک پہونچ گئی، جو بہت شوق سے علمی حلقہ میں پڑھی گئی، اس میں ایک سو ایک مہاجر صحابہ کرام کے حالات ہیں، اس کتاب کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذوں کا سہارا لیا گیا ہے:

صحیح بخاری، ابن سعد، صحیح مسلم، طبری، البلاذری کی فتوح البلدان، تاریخ ابن اثیر، فتح الباری، مستدرک حاکم، استیعاب، تاریخ ابو الفداء، تہذیب التہذیب ابن حجر، تاریخ ابن خلکان، اسد الغابہ، تذکرۃ الحفاظ، موطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل، اصابہ، اعلام الموقعین ابن قیم، شرح موطا شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، ابوداؤد، جمع الفوائد، ترمذی، تہذیب الکمال، کتاب الولاۃ کندی، مقریزی، یعقوبی، اخبار الطوال، حسن المحاضرہ سیوطی، ابن خلدون، زرقانی۔

ان ماخذوں کے نام کتابیات کی مصنوعی فہرست سے نہیں لیے گئے، بلکہ جب جب ان سے مدد لی گئی ہے، اس کے حوالے نیچے حواشی میں موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان ماخذوں کا مطالعہ کر کے ان سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یوں تو اس کتاب میں جتنے مہاجر صحابہؓ کے حالات لکھے گئے اُن میں ہر ایک کی سیرت میں کچھ ایسے پہلو ہیں جن کو پڑھ کر ذہن منور ہوتا ہے، مگر اس میں حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت سلمانؓ فارسی، حضرت ا[illegible] حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید کے تذکرے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں، شاہ صاحبؒ ان کے حالات ایسے انداز میں پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہت سے دا[illegible] مضامین کا ایک مجموعہ پڑھ رہے ہیں، یہ شاہ صاحب کے انداز تحریر کی خوبی ہے جو ٹھیک دبستان شبلی [illegible] مین مطابق ہے، شروع سے آخر تک انداز بیان میں ادب، احترام اور وزن قائم رکھنے کا اہتمام ہے، جس [illegible] تحریر میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔

اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خلق نبوی، جہاد فی سبیل اللہ، مال و دولت سے استغنار، احتیاط [illegible] احتیاط فی الفتاوی، خشیت الٰہی، زہد و ورع، مشتبہات سے اجتناب، مسکین نوازی، فیاضی، سیرچشمی، اختلاف [illegible] سے احتراز، اظہار حق میں جرأت اور بے باکی کا ذکر شاہ صاحب جس خوش سلیقگی سے قلمبند کرتے ہیں، اس کو پڑھ کر [illegible] ایمان تازہ ہو جاتا ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمر کے کردار میں نزاکت اس وقت پیدا ہو گئی جب انھوں نے امیر [illegible] کے بعد یزید کی بیعت کر لی، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بیعت کرتے وقت فرمایا کہ اگر یہ خیر ہے تو ہم اس سے را[illegible] ہیں، اور اگر شر ہے تو ہم نے صبر کیا، لیکن اسی کے بعد جب مدینہ والوں نے فسخ بیعت کیا اس وقت عبداللہؓ بن [illegible] بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گئے، شاہ صاحب نے اس کی تفصیل جس طرح قلمبند کی ہے اس سے ان کا کردار [illegible] اور اونچا نظر آتا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کو بلا کر فرمایا کہ میں نے اس شخص [illegible] کے ہاتھ پر خدا اور رسولؐ کی بیعت کی ہے، اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت [illegible] کے دن ہر دھوکہ باز کا ایک ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا کہ یہ فلاں کی فریب کاری ہے، اور سب سے بڑا [illegible] فریب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شرک کیا جائے کہ ایک شخص کسی کے ہاتھ پر خدا اور رسول کے لیے بیعت کرے [illegible] اور پھر اس کو فسخ کر دے، اس لیے ہم میں سے کوئی شخص فسخ بیعت میں حصہ نہ لے، اگر کسی نے حصہ لیا تو

میرے اور اس کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔

یہ واقعہ پڑھتے وقت خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ انھوں نے شاید کسی لالچ یا خوف کی بنا پر ایسا رویہ اختیار کیا ہو، لیکن شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے جب یزید کو ولی عہد بنانا چاہا تو عمرو بن العاصؓ کو ان کے پاس ان کا عندیہ لینے کے لیے بھیجا، انھوں نے جاکر دبی زبان سے اس کا اظہار کیا اور اس کے عوض ایک رقم خطیر پیش کرنا چاہی، رشوت کا نام سن کر وہ غصہ سے کانپ اٹھے اور اسی وقت عمرو بن العاصؓ کو گھر سے نکال دیا۔

اس زمانہ میں حجاج بن یوسف کی سنگدلی اور شقاوت کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا، مگر وہ جس طرح بے باکانہ طریقہ سے اس کی سرزنش کرتے رہے اس کو شاہ صاحب نے بہت ہی خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے، لکھتے ہیں ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا، اس کو اس قدر طول دیا کہ عصر کا وقت تنگ ہوگیا، آپ نے فرمایا: آفتاب تیرا انتظار نہیں کر سکتا، حجاج نے کہا: جی میں آتا ہے کہ تمھاری آنکھیں پھوڑ دوں، فرمایا: تجھ کوتاہ بیں سے یہ بھی کچھ بعید نہیں، ایک اور موقع پر حجاج نے اپنے خطبہ میں عبداللہ بن زبیرؓ پر یہ اتہام لگایا کہ انھوں نے نعوذ باللہ کلام اللہ میں تحریف کی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تردید کی اور فرمایا: تو جھوٹ بولتا ہے، نہ ابن زبیر میں اتنی طاقت ہے، نہ تجھ میں یہ مجال ہے، مگر اسی کے ساتھ ان کے کردار کا یہ پہلو بھی ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں تلخ سے تلخ باتیں سن کر پی جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو پیہم گالیاں دینی شروع کیں، آپ نے صرف اس قدر جواب دیا کہ میں اور میرے بھائی عالی نسب ہیں، پھر خاموش ہوگئے، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس تواضع اور حلم کا نتیجہ یہ تھا کہ عام طور پر لوگوں میں آپ کو محبوبیت حاصل تھی، مجاہد کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عمرؓ کے ساتھ نکلا، لوگ بکثرت ان کو سلام کر رہے تھے، انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ لوگ مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اگر چاندی سونے کے عوض بھی محبت خریدنا چاہوں تو اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

عبداللہ بن عمرؓ کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی اس کتاب میں یہ واقعہ بھی درج ہے:

"سفیان ثوریؒ امام شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبداللہؓ بن زبیر، مصعب بن زبیر، عبدالملک بن مروان، اور عبداللہؓ بن عمر چاروں آدمی خانہ کعبہ میں جمع تھے، سب کی رائے ہوئی کہ ہر شخص رکن یمانی پکڑ کر خدا سے اپنی اپنی دلی تمناؤں کے لیے دعا مانگے، پہلے عبداللہؓ بن زبیر اٹھے اور دعا مانگی کہ خدایا تو بڑا ہے، اور تجھ سے بڑی ہی چیزیں مانگی جاتی ہیں، اس لیے میں تجھ کو تیرے عرش، تیرے حرم، تیرے نبی، اور تیری ذات کی حرمت کا واسطہ لاکر دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ حجاز پر میری خلافت اور عام خلافت نہ تسلیم کرلی جائے، اس کے بعد مصعبؒ بن زبیر اٹھے اور رکن یمانی پکڑ کر دعا مانگی کہ تو تمام چیزوں کا رب ہے، آخر میں سب کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے، میں تیری اس قدرت کا واسطہ دے کر جس کے قبضہ میں تمام عالم ہے، دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھا جب تک کہ میں عراق کا والی نہ ہو جاؤں اور سکینہ میرے نکاح میں نہ آجائے، اس کے بعد عبدالملک نے کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے زمین و آسمان کے خدا! میں تجھ سے ایسی چیزیں مانگتا ہوں جس کو تیرے اطاعت گذار بندوں نے تیرے حکم سے مانگا ہے، میں تجھ سے تیری ذات کی حرمت، تیری مخلوقات کی حرمت، بیت الحرم کے رہنے والوں کے حق کا واسطہ دے کر دعا مانگتا ہوں کہ تو مجھ کو دنیا سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک کہ مشرق و مغرب پر میری حکومت نہ ہو جائے اور اس میں جو شخص رخنہ اندازی کرے اس کا سر نہ قلم کر دوں، جب یہ لوگ دعا مانگ چکے تو وہ بادۂ حق کا سرشار اٹھا جس کے نزدیک دنیاوی طمطراق کی حیثیت سراب سے زیادہ نہ تھی، اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ تو رحمن و رحیم ہے، میں تیری رحمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں جو تیرے غضب پر غالب ہے کہ تو مجھے آخرت میں رسوا نہ کر اور اس عالم میں مجھے جنت عطا فرما۔"

صرف اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ حضرت عبداللہؓ بن عمر کا کردار کتنا بلند تھا، اور ان میں کتنی خشیت الٰہی تھی

مگر اس روایت کو شاہ صاحبؒ نے جس موثر اور باوقار انداز میں لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود سب کچھ خوف الٰہی سے متاثر ہوکر لکھ رہے ہیں، ان کی کتاب میں ان کی تحریر کا کچھ ایسا ہی باوقار انداز شروع سے آخر تک قائم ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ اُن صحابہ میں ہیں جو علم حدیث کے اساطین سمجھے جاتے ہیں، آپ صحابۂ کرامؓ کی جماعت میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کی اس فضیلت کی کہانی ذرا شاہ صاحب کی زبانی سن کر محظوظ ہوں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ابوہریرہؓ علم کا ظرف ہیں..... وہ خود اپنی کثرت روایت کے وجوہ بیان کرتے تھے کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے، حالانکہ مہاجر و انصار ان حدیثوں کو نہیں بیان کرتے، اگر معترضین اس پر غور نہیں کرتے کہ ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے، انصار اپنی زراعت کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے، میں محتاج آدمی تھا، میرا سارا وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گذرتا تھا، اور جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہ ہوتے تھے اس وقت بھی موجود رہتا تھا، دوسرے جن چیزوں کو وہ بھلا دیتے تھے میں ان کو یاد رکھتا تھا، حضرت ابوہریرہؓ کی اس توجیہ کی تصدیق کبار صحابہؓ کرتے تھے، ابوعامر روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت طلحہؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے آکر کہا: ابومحمد! آج تک ہم کو نہ معلوم ہو سکا کہ یمنی (ابوہریرہؓ) اقوال نبیؐ کا بڑا حافظ ہے یا تم لوگ، انھوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ انھوں نے بہت سی ایسی حدیثیں سنیں جو ہم لوگوں نے نہیں سنیں، وہ بہت سی ایسی باتیں جانتے ہیں جو ہمارے علم سے باہر ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ دولت والے تھے، ہمارے گھر بار اور اہل و عیال تھے، ہم ان میں پھنسے رہتے تھے، صرف صبح و شام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دے کر لوٹ آتے تھے، اور ابوہریرہؓ مسکین اور مال و متاع

کی زحمتوں اور بال بچوں کی ذمہ داری سے سبکدوش تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آپ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ہم سب کو یہ یقین ہے کہ انھوں نے ہم سب سے زیادہ احادیث نبوی سنیں، اور ہم میں سے کسی نے ان پر یہ اتہام نہیں لگایا کہ وہ بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ان کو بیان کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے کہ ابوہریرہؓ ہم سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے حاضر باش تھے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان کو بلاکر پوچھا کہ کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ میں نے فعل نبویؐ دیکھا اور قول نبوی سنا، وہی تم نے دیکھا اور سنا، عرض کی: اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر زیب و زینت میں مصروف رہتی تھیں، اور خدا کی قسم میری توجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی چیز نہیں ہٹاتی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت سے بعض اشخاص کے دل میں ان کی روایت کی جانب سے شکوک وشبہات پیدا ہوگئے، تو ان کا امتحان لیا گیا، کس طرح؟ وہ شاہ صاحب کی زبانی سنیے:

"ایک مرتبہ مروان نے امتحان کی غرض سے بلوایا اور اپنے کاتب کو نیچے بٹھاکر آپ سے حدیثیں پوچھنا شروع کیں، یہ بیان کرتے تھے اور کاتب چھپا ہوا ان کی لاعلمی میں لکھتا جاتا تھا، دوسرے سال اسی طریقہ سے امتحان لیا، اس مرتبہ بھی انھوں نے بلاکم وکاست وہی جوابات دیے جو ایک سال قبل دے چکے تھے، حتیٰ کہ ترتیب میں کوئی فرق نہ آیا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس فیاضی سے یہ علم عطا کیا، اسی فیاضی سے اس کو انھوں نے مسلمانوں کے لیے وقف عام کیا، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے جہاں بھی کچھ مسلمان مل جاتے ان کے کانوں تک اقوال نبیؐ پہونچا دیتے، ان کے علم وعرفان کی بارش سے عورتیں بھی سیراب ہوتی تھیں، کسی عورت کا کوئی فعل خلاف احکام نبویؐ سرزد ہوجاتا تو ٹوک دیتے، ان کے زمرۂ رواۃ میں حضرت

عائشہؓ کا نام بھی نظر آتا ہے، اسی سلسلہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کے دامن کمال میں جس قدر علمی جواہر تھے سب عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیے، لیکن وہ احادیث جو فتنہ سے متعلق تھیں اور جن کو آنحضرتؐ نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا تھا زبان سے نہ نکالیں کہ یہ خود فتنہ کی بنیاد بن جائیں، فرماتے تھے کہ میں نے احادیث نبویؐ دو ظرف میں محفوظ کی ہیں ایک ظرف کی تو پھیلا دیں، اگر دوسرے کی پھیلا دوں تو نرخرہ کاٹ ڈالا جائے، صوفیہ کہتے ہیں کہ وہ اسرار توحید کی امانت تھے، متکلمین کہتے ہیں وہ اسرار دین تھے، لیکن محدثین کا فتویٰ یہی ہے کہ وہ فتنہ کی حدیثیں تھیں"

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا، لیکن شاہ صاحب نے اپنی تحریر کے اعجاز کے ساتھ چند صفحوں میں ان کی عظمت کی جو مرقع آرائی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی سیرت کے بہت سے واقعات شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں قلمبند کیے ہیں مگر ان ہی میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب وہ آپ کا نام لیتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل دریا امنڈ آتا، اس کی وجہ شاہ صاحبؒ کی اس موثر تحریر سے ظاہر ہو جائے گی

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو محبت اور یگانگت ان سے (یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ سے) تھی وہ آخری لمحۂ حیات تک قائم رہی، چنانچہ مرض الموت میں آپؐ نے ان کو بلوا بھیجا، یہ حاضر خدمت ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے، ابوذرؓ آپ کے اوپر جھک گئے، اور محبوب عالم نے ہاتھ بڑھا کر چمٹا لیا، نہ معلوم یہ نگاہ واپسیں کیا اثر کر گئی کہ آخر دم تک وارفتگی کا عالم طاری رہا"

ان چند سطروں میں کیسی تاثیر ہے، اس کے لکھنے والے کے قلم کے ساتھ دل کی کیفیت کا بھی تجزیہ تھوڑی دیر کے لیے کر لیجیے۔

شاہ صاحب نے حضرت سلمان فارسیؓ کے کردار کا جو بلند نمونہ پیش کیا ہے، آج کل کے متمول مسلمان ان کی اس کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے عبرت اور سبق حاصل کر سکتے ہیں:

"حضرت سلمانؓ جب پانچ ہزار تنخواہ پاتے تھے اور تیس ہزار نفوس پر حکومت کرتے تھے، اس وقت بھی ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے، اس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو بہت ہی متنازعہ فیہ ہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد وہ امیر معاویہؓ کے طرف دار اور حضرت علیؓ کے مخالف ہو گئے، حضرت علیؓ کے خلاف صفین میں جو لڑائی لڑی گئی تو شامی فوج کے امیر العسکر حضرت عمرو بن العاصؓ ہی تھے، یہ لڑائی ختم ہوئی تو حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے اختلاف کو دور کرنے کی خاطر ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ وہ بھی حکم بنائے گئے، اور دونوں تبادلۂ خیالات کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے نئے سرے سے خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تاکہ یہ کشت و خون کسی طرح بند ہو، مگر جب ایک مقررہ تاریخ پر دومۃ الجندل میں فریقین جمع ہوئے تو ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ میں نے دونوں کو معزول کیا، اور اب لوگوں کو اختیار ہے کہ جس کو خلافت کا اہل سمجھیں اس کو اپنا خلیفہ بنائیں، مگر جب عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا: آپ لوگوں نے ابو موسیٰؓ کا فیصلہ سن لیا، انھوں نے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیا، میں بھی علیؓ کو معزول کرتا ہوں لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔

اسی کے بعد حضرت علیؓ اور معاویہؓ کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ تاریخ کی بہت ہی المناک روداد بن گئی، خارجیوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاص تینوں کو ایک ساتھ قتل کر دینا پسند کیا، مگر ان کی اس ناپاک مہم میں حضرت علیؓ نے جام شہادت

زش کیا، مگر امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ زندہ بچ گئے، جس کے بعد امیر معاویہؓ نے ان کو مصر کا والی مقرر کیا، ان کی یہ وجاہت پسندی تاریخ میں متنازعہ فیہ ہوگئی ہے، مگر مرض الموت میں ان کی جو سچی انابت ہے وہ بھی تاریخ کی ایک ایسی مثال ہے کہ سارے مسلمان اس سے بصیرت حاصل کر کے اپنی عاقبت سنوار سکتے ہیں، پھر شاہ صاحبؒ کے قلم نے اس کو اور بھی موثر بنا دیا ہے، ایسے واقعات لکھتے وقت اگر قلم کا زور بیان ساتھ نہ دے تو موثر واقعات کی تاثیر جاتی رہتی ہے، شاہ صاحبؒ نے اس واقعہ کے لکھنے میں جو تاثیر پیدا کی ہے وہ اس کے اقتباس کی طوالت کا خیال کیے بغیر اس کو صبر کر کے ناظرین پڑھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے ایمان کو تازہ کر کے اپنی عاقبت کو سنوارنے میں ایسی انابت کو مشعلِ ہدایت نہ بنالیں، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"عمرو بن العاصؓ ...... مرض الموت میں اپنی گذشتہ لغزشوں پر بہت نادم تھے، ابن عباسؓ عیادت کو آئے، سلام کے بعد پوچھا ابا عبد اللہ! کیا حال ہے؟ جواب دیا کیا پوچھتے ہو، دنیا کم بنائی مگر دین زیادہ بگاڑا، اگر اس کو بگاڑا ہوتا جس کو بنایا ہے اور اسے بنایا ہوتا جس کو بگاڑا ہے تو یقیناً کامیاب ہوتا، اگر اس وقت کی آرزو فائدہ مند ہوتی تو ضرور آرزو کرتا، اگر بھاگنے سے بچ سکتا تو ضرور بھاگتا، مگر اب منجنیق کی طرح زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوں، نہ ہاتھوں کے سہارے اوپر چڑھ سکتا ہوں، نہ پاؤں کے سہارے نیچے اتر سکتا ہوں، اے بھتیجے! مجھ کو کوئی ایسی نصیحت کر کہ اس سے فائدہ اٹھاؤں، ابن عباسؓ نے کہا: افسوس اب وہ وقت کہاں، اب وہ بھتیجا بوڑھا ہو کر آپ کا بھائی ہو گیا ہے، اگر آپ رونے کے لیے کہیں تو میں رونے کو تیار ہوں، مقیم سفر کا کیسے یقین کر سکتا ہے، عمرو بن العاصؓ نے کہا اس وقت اسّی برس کے کچھ اوپر میری عمر ہے اور تو مجھ کو پروردگار کی رحمت سے ناامید کرتا ہے، خدایا! یہ ابن عباس مجھ کو تیری رحمت سے ناامید کرتا ہے، الٰہی تو مجھے یہاں تک تکلیف دے کہ راضی ہو جا، ابن عباسؓ نے کہا: ہیہات ابو عبد اللہ جو چیز تم نے لی وہ تو نئی تھی اور جو چیز دے رہے ہو وہ پرانی ہے، عمرو بن العاصؓ نے کہا: ابن عباسؓ تم کو کیا ہو گیا ہے، جو بات

[illegible] :

پروردگار کی رحمت میں پناہ لینے کی کیسی مؤثر مرقع آرائی ہے بعض نے زیادہ تاثیر پیدا کرنے کی غرض

ایک اور روایت کا اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ابن شماسہ مہری کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کو گئے، وہ دیوار کی طرف منہ پھیر کر رونے لگے، ان کے بیٹے عبداللہ نے دلاسا دیا کہ ابا کیا آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں بشارتیں نہیں دی ہیں؟ جواب دیا: میرے پاس افضل ترین دولت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ہے، مجھ پر زندگی کے تین دور گزرے ہیں، ایک وہ دور تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت ترین دشمن تھا اور میری بڑی تمنا یہی تھی کہ کسی طرح قابو پاکر آپ کو قتل کردوں، اگر اسی حالت میں مرجاتا تو میرے لیے دوزخ یقینی تھی، پھر اللہ عزوجل نے میرے دل میں اسلام ڈالا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، یا رسول اللہ! ہاتھ پھیلائیے میں بیعت کروں گا، آپ نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے سمیٹ لیا، فرمایا: عمرو بن العاص! تم کو کیا ہوگیا؟ میں نے عرض کیا: میں ایک شرط چاہتا ہوں، فرمایا وہ کون سی شرط ہے؟ میں نے عرض کیا: میری مغفرت ہوجائے، فرمایا: عمرو بن العاص! کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے پہلے کے تمام گناہوں کو کالعدم کردیتا ہے، ہجرت اپنے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، حج اپنے پہلے کے گناہوں کو گرا دیتا ہے، اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ میرا کوئی محبوب رہا اور نہ آپ سے زیادہ میری نگاہ میں کوئی بزرگ باقی رہا، میں آپ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے آپ کو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے نظر بھر کر کبھی دیکھا ہی نہیں، اگر اس حالت میں مرجاتا تو جنت کی امید تھی، پھر تیسرا دور آیا جس میں میں نے مختلف قسم کے اعمال کیے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ میرا کیا حال ہوگا، جب میں مر جاؤں تو نوحہ کرنے والیاں میرے ساتھ نہ

نہ جائیں، جنازہ کے ساتھ آگ نہ جائے، دفن کرتے وقت مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا، دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک قبر کے پاس رہنا جب تک جانور ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم ہو جائے، تاکہ میں تمہاری وجہ سے مانوس ہو جاؤں، اور یہ غور کر لوں کہ اپنے رب کے قاصدوں کو کیا جواب دوں؟"

پہلے اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے پروردگار کی رحمت کا سہارا لینا چاہتے تھے، مگر اس دوسرے اقتباس سے عیاں ہے کہ ان کو جو عشق رسولؐ سے رہا، اس کا سہارا بھی اپنے مرض الموت میں لینے کی کوشش کی، مگر پھر خشیت الٰہی طاری ہوئی تو اس فکر سے بھی دب گئے کہ اپنے رب کے قاصدوں کو وہ کیا جواب دیں گے، موت کی ہیبت طاری ہوتی ہے، مگر اس کی ہیبت کے باوجود ایک بار پھر رحمت پروردگار کے طالب ہوتے ہیں، اس کی پوری تفصیل شاہ صاحب نے جس باوقار انداز میں قلمبند کی ہے، وہ ملاحظہ ہو؛

"موت کے وقت اپنے نگہبان دستے کو بلا بھیجا اور پوچھا: میں تمہارا کیسا ساتھی تھا؟ جواب ملا کہ آپ ہمارے نہایت سچے ساتھی تھے، ہماری عزت کرتے تھے، ہم کو دل کھول کر دیتے تھے، یہ سلوک کرتے تھے، وہ سلوک کرتے تھے، کہا: میں یہ سب سلوک اس لیے کرتا تھا کہ تم مجھ کو موت سے بچاؤ گے، یہ موت سامنے کھڑی ہوئی ہے، کام تمام کرنا چاہتی ہے، اس کو کسی طرح سے میرے سامنے سے دور کرو، یہ عجیب فرمائش سن کر ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے، کچھ دیر کے بعد بولے: ابا عبداللہ! خدا کی قسم ہم کو آپ سے ایسی فضول بات سننے کی امید نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ موت کے مقابلہ میں ہم آپ کے کچھ کام نہیں آ سکتے۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ میں نے یہ جانتے ہوئے تم سے ایسی فرمائش کی تھی کہ تم موت کے مقابلہ میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے، کاش میں نے تم میں سے کسی کو اپنی حفاظت کے لیے نہ رکھا ہوتا، افسوس ابن ابی طالب سچ کہتے تھے کہ انسان کی محافظ خود اس کی موت ہے، خدایا! میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں، طاقت ور نہیں ہوں کہ غالب آ جاؤں، اگر تیری رحمت نے دستگیری نہ کی تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔"

سخت ہوتی ہے کہ اس وقت عموماً ہوش و حواس باقی نہیں رہتے مگر حضرت عمرو بن عاص نے اپنی ہوش اپنے حواس کو جس طرح قابو میں رکھا، اس کی تصویر کشی شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے،

"عمرو بن عاص اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے کہ مجھ کو لوگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ جب ان کو موت آتی ہے تو عقل و حواس کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی حقیقت نہیں بیان کر سکتے، اس وقت ان کے لڑکے نے کہا کہ ابا آپ کہا کرتے تھے کہ مجھ کو لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جب لوگوں کو موت آتی ہے تو عقل و حواس کے ہوتے ہوئے بھی اس کی کیفیت نہیں بیان کر سکتے، آپ کی موت آگئی ہے، عقل بھی موجود ہے، ذرا اس کی کیفیت بیان کیجیے، کہا: بیٹا موت کی صفت ناقابل بیان ہے، اس کی تھوڑی حقیقت بیان کرتا ہوں، مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ جبل رضوی میری گردن پر ٹوٹا پڑتا ہے، کھجور کے کانٹے میرے پیٹ میں بھرے ہوئے ہیں، گویا میری جان سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے"

اسی ہوش و حواس کے ساتھ اپنی جان جس طرح موت کے حوالے کر دی اس کی تفصیل پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وفات نہیں پا رہے تھے، بلکہ کسی لمبے سفر پر خوش خوش جا رہے تھے، اس کے لیے اپنے گھر والوں کو خاص خاص وصیتیں کیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اس کے بعد اپنے صاحبزادہ سے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو پہلے معمولی پانی سے نہلا کر کپڑے سے خشک کرنا، پھر تازہ اور صاف پانی سے نہلانا، تیسری مرتبہ کافور آمیز پانی سے غسل دینا اور کپڑے سے خشک کرنا، کفناتے وقت ازار کس کے باندھنا کہ میں مخاصم ہوں گا، جنازہ درمیانی چال سے لے چلنا، لوگوں کو جنازہ کے پیچھے پیچھے رکھنا کہ اس کے آگے ملائکہ چلتے ہیں، اور پچھلا حصہ بنی آدم کے چلنے کیلئے ہے، قبر میں رکھنے کے بعد مٹی آہستہ آہستہ دینا، پھر دعا میں مصروف ہو گئے کہ الٰہی! تو نے حکم دیا میں نے عدول حکمی کی، تو نے ممانعت کی، میں نے نافرمانی کی، میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں، طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں، لا الٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا اللہ، یہی کہتے کہتے جان جان آفریں کے

سپرد کردی، انا غفر و انا حمید احمان۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے مرض الموت کی جو جاندار تصویر کشی کی ہے، اس کو جتنا زیادہ پڑھا جائے گا تمام ہی خشیت الٰہی، رحمت پروردگار، عشق رسولؐ، احساس معصیت، اعتراف گناہ، اور موت کے مردانہ وار مقابلہ کا جذبہ طاری ہوگا، اور اسی کے ساتھ شاہ صاحب کے اس حسن بیان پر ان کی مغفرت کے لیے دعائیں بھی زبان سے نکلیں گی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ نے اپنی اس کتاب کو قلمبند کرنے میں اپنے اسلوب بیان کو کس خوبی سے نبایا ہے، ان کے یہاں ایجاز کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں، جس کی ایک عمدہ مثال حضرت خالد بن ولیدؓ کے اوصاف کی مرقع آرائی ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو ذوق جہاد اور راہ خدا میں سر بکف رہنے میں آپ کو دربار رسالت سے سیف اللہ کا لقب ملا، تقریباً سو سوا لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھلائے، جسم میں ایک بالشت حصہ بھی ایسا نہ تھا جو تیروں اور تلواروں کے زخم سے چھلنی نہ ہوا ہو، اکثر ذوق جہاد میں کہا کرتے تھے کہ مجھے میدان جنگ کی سخت رات جس میں اپنے دشمنوں سے لڑوں اس شب عروسی سے زیادہ مرغوب ہے جس میں میری محبوبہ ہمکنار ہو آخر وقت، جب اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے، کہتے تھے کہ افسوس میری ساری زندگی میدان جنگ میں گذری، اور آج میں بستر مرگ پر جانوروں کی طرح ایڑیاں رگڑ کے جان دے رہا ہوں، خدا نے ان کے قدموں میں یہ خاص برکت دی تھی کہ جدھر رخ کیا ناکام واپس نہ ہوئے جب وہ لڑائی میں شریک ہو جاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اب لڑائی کا تنور گرم ہوا۔

ان کے ان شجاعانہ اوصاف کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ ان کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں فوج کی سپہ سالاری سے معزول کیا، اور اس معزولی کو انھوں نے بطیب خاطر قبول کیا۔ جو ان کی مزید جلالت اور بڑائی کا ثبوت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت خالدؓ کے ان تمام واقعات کو تقریباً ۲۰ صفحے میں قلمبند کیا ہے مگر اس میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو لکھی جانا چاہئیں۔ مصر سے حضرت خالدؓ پر ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے جو سیف اللہ کی تلوار کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کی ضخامت ۷۰۰ صفحے کی ہے، پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی کتاب کے ۲۸ صفحے کا جو ایجاز ہے، وہ اللہ کی تلوار کے ۷۰۰ صفحے کے اطناب پر بھاری ہے۔

مہاجرین جلد دوم کو ختم کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ اپنی کتاب سیر الصحابہؓ جلد ششم لکھنے میں مشغول ہو گئے، اس کے ساتھ وہ وقتاً فوقتاً معارف کے کالم تلخیص و تبصرہ اور اخبار علمیہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، پھر ان کی کتاب 'عرب کی موجودہ حکومتیں' کے کچھ ابواب بھی اس درمیان میں چھپتے رہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ پر ایک گستاخانہ مضمون کا تردیدی جواب

شاہ صاحبؒ کی ان علمی سرگرمیوں کے زمانہ میں لکھنؤ سے ایک رسالہ نگار نکلا کرتا تھا، جس کے مدیر نیاز فتح پوری تھے، وہ کوئی مستند اور سند یافتہ عالم نہ تھے، لیکن عالم ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، ان کا رسالہ "نگار" کہنے کو تو ادبی اور علمی تھا، لیکن اس میں کبھی کبھی اسلامی عقائد سے متعلق اشتعال انگیز مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے، جن سے علماء اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے طبقہ میں بڑی برہمی پھیل جاتی تھی، یہاں تک کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجبوراً رسالہ کے مدیر کے خلاف عدالتی کارروائی بھی کی گئی، جس کے بعد ان کو باضابطہ توبہ نامہ لکھنا پڑا، مگر ان کی کج روی پھر بھی جاری رہی۔

اسی سلسلہ میں ۱۹۳۲ء میں اسی رسالہ میں "بعض عقائد اسلامی کے کمزور ماخذ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا، جس میں حضرت ابوہریرہؓ پر گستاخانہ حملہ کر کے ان کو تاریخی اور اخلاقی حیثیت سے گرانے اور حدیث شریف میں ان کی روایتوں کو مجروح اور رد کرنے کی کوشش کی گئی۔

شاہ صاحب اپنی تصنیف مہاجرین جلد دوم میں حضرت ابوہریرہؓ کے حالات لکھنے میں ان کا اظہار مطالعہ کر چکے تھے، اس لیے مذکورۂ بالا مضمون کو پڑھ کر ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور اس کا جواب معارف کے ۲۴ صفحے میں دے کر یہ ثابت کیا کہ اس محترم ہستی کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے تدلیس، کذب، مغالطہ اور اس قبیل کا کوئی ایسا حربہ نہیں ہے جو استعمال نہ کیا گیا ہو، پھر مضمون نگار کی وسعت نظر اور سخن فہمی کا پردہ فاش کر کے یہ دکھایا کہ شروع سے آخر تک مضمون کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے پہلے تو اس کا تجزیہ کیا ہے کہ اس قسم کے مضامین لکھنے میں کیا چیز کار فرما ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریریں ایسے ہی لوگوں کے قلم سے نکلتی ہیں جو عیسائی مشنریوں اور یورپ کے مستشرقوں کے مخالف اسلام خیالات کو پڑھ کر ان کو تمام تر وحی و الہام سمجھنے لگتے ہیں، اور ان ہی معلومات کو لے کر عام مسلمانوں کے سامنے اپنی تحقیقات علمیہ کی صورت میں پیش کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی تجدید و اصلاح کا کام کیا، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا یہ سوال تھا کہ ان نام مسلمانوں کی یہ دماغی غلامی کیا ان ائمہ مجتہدین، محدثین، تابعین اور صحابہؓ کی تقلید و اتباع سے بہتر ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اسلام و رسول اسلام علیہ السلام کے احکام و پیام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کیں؟ آج بھی ایسے نام مسلمان ہیں جو اس قسم کے مضامین لکھ کر تاریخ اسلام کے لوتھر بننا چاہتے ہیں، ان سے بھی یہی سوال کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ کو جو صحابہؓ کے زمرہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایت ہیں، مذکورۂ بالا مضمون میں مشق ستم اس لیے بنایا گیا ہے کہ گلشن اسلام کے باغبانوں ہی کو مجروح کر کے روز روز کے مذہبی مناظروں کا قصہ ختم کر دیا جائے کہ جب صحابہؓ ہی جو قصر اسلام کے اساطین ہیں گرا دیے جائیں گے تو مذہب کی بوسیدہ عمارت خود بخود منہدم ہو جائے گی، اس طرح حدیث کا دفتر بے پایاں بھی ناقابل اعتبار قرار پائے گا، اور جب حدیثیں ناقابل اعتبار ہو جائیں گی تو من مانی تاویلوں کے لیے دروازہ

کھل جائے گا، شاہ صاحب اپنے مضمون نگاروں کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں:

مگر گیتی سراپا باد گیرد ۔۔۔۔۔ چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد

شاہ صاحب نے مضمون نگار کے ہر اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے، مضمون نگار کا یہ اعتراض بھی تھا کہ وہی حدیث قابل قبول ہو سکتی ہے جو ہماری عقل کے مطابق ہو، اس کا جواب شاہ صاحب نے یہ دیا:

"بعض احادیث بلاشبہ ایسی ہیں جو ہماری محدود عقل و فہم سے باہر ہیں، ان میں انفرادی عقل کو معیار قرار دینا صحیح نہیں کہ انسانوں کی عقلیں باہم متفاوت ہوتی ہیں، بہت ممکن ہے کہ ایک شے کسی خاص انسان کی عقل کے مخالف ہو، لیکن وہی شے دوسرے آدمی کی فہم کے عین مطابق ہو، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ جو مطلب دیا بس کہ جو حدیث کے نام سے مشہور ہو، بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، اور عقل کو مطلق دخل نہ دیا جائے، محدثین نے خود اصول نقد میں عقل کو ملحوظ رکھا ہے کہ جو حدیث عقل صریح کے خلاف ہو وہ ناقابل قبول ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کسی حدیث کے کسی خاص انسان کی عقل کے نزدیک خلاف عقل ہونے اور واقعۃً خلاف ہونے میں فرق ہے: اس لیے انفرادی معقول کے بجائے عقل عمومی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔"

شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"عقل میں بھی اسی عقل کو معیار نہ بنانا چاہیے جسے یورپ نے پیش کیا ہے، بلکہ کچھ اپنی گھر کی عقل، اپنے مذاق، اپنی روایات اور اپنی خصوصیات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے، اسی اندھی تقلید کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو یورپ ہی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے ہیں، بلکہ اسی کے دل و دماغ سے سوچتے اور سمجھتے ہیں، چنانچہ آج مذہب کے خلاف اس کی اصلاح کے پردہ میں جتنی آوازیں بلند ہو رہی ہیں وہ سب اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔"

پھر شاہ صاحبؒ ایسے یورپ زدہ مضمون نگاروں کو جو قرآن مجید کو تحریفات اور احادیث و سنن کو کذبات قرار دے کر اسلام کی تجدید و اصلاح کا دعویٰ کرنے والوں کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"ہمارے جدید مصلحین امت یہ نہیں سمجھتے کہ اگر یورپ عیسائیت کی مخالفت پر آمادہ ہو رہا ہے تو بجا ہے کہ وہ اس بیسویں صدی کے دور ترقی کا ساتھ نہیں دے سکی اور دور حاضر کی رہنمائی سے قاصر ہے، لیکن اسلام تو ایک ترقی یافتہ اور ابدی مذہب ہے، جو انسانی زندگی کے ہر دور میں خواہ کتنا ہی بلند اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس کا ہادی اور رہنما اور اس کی تمام دنیوی اور اخروی ضروریات کا کفیل ہے، کیا یہ قرین دانشمندی ہے کہ محض اس ریس میں کہ چونکہ یورپ اپنے اس ناقص مذہب کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے جو اس کی موجودہ ترقی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا، ہم بھی اپنے دین کامل کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جائیں، ہم کو تو اسلام کے سراج منیر کی روشنی میں خود یورپ کو راہ دکھانی چاہیے، نہ کہ الٹے اپنی اس شمع ہدایت پر پھونک ماریں"

شاہ صاحبؒ نے یہ تحریر آج سے پچاس برس پہلے لکھی تھی، لیکن ان کا یہ پیام اب بھی تمام اسلامی ممالک کے ان مصلحین کے لیے ہے جو اسلام کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اس میں یورپ کے طرز فکر کے مطابق تجدید و اصلاح چاہتے ہیں۔

آخر میں شاہ صاحبؒ مضمون نگار جیسے منکرین حدیث و سنت نبویؐ کو سامنے رکھ کر رقمطراز ہیں:

"وحی الٰہی اور سنت نبویؐ یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں، ایک کو چھوڑنے سے دوسری کبھی زندہ نہیں رہ سکتی، ان دونوں کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسے قانون اور ضوابط کا، کہ ضابطوں کے علم کے بغیر قانون پر عمل کرنا مشکل بلکہ محال ہے، اور قانون کے بغیر تنہا ضابطے بیکار ہیں"

شاہ صاحبؒ کے اس ایجاز میں اطناب کا ایک دریا اپنی بے پناہ موجوں کے ساتھ لہرا رہا ہے۔

سیر الصحابہؓ جلد ششم | ۱۹۳۲ء میں شاہ صاحب کی دوسری تصنیف سیر الصحابہؓ جلد ششم شایع ہوئی، ان کی

اس کتاب کا ماخذ مسند احمد بن حنبل، طبقات ابن سعد، بخاری، مسند دارمی، مستدرک حاکم، ابو داؤد، تہذیب الکمال، اصابہ، تہذیب التہذیب، سیرت ابن ہشام، اسد الغابہ، فتوح البلدان بلاذری، ابن عساکر، استیعاب، اعلام الموقعین، اخبار الطوال، زاد المعاد، ابن اثیر، مسلم کتاب الجہاد، فتح الباری، اصابہ، موطا امام مالک، طبری، تاریخ الخلفاء سیوطی، مروج الذہب مسعودی، یعقوبی، معارف ابن قتیبہ، البدایۃ والنہایۃ، کتاب العمدہ، تہذیب الاسماء واللغات نووی، ترمذی، الفخری، حسن المحاضرۃ سیوطی، وفاء الوفاء، خلاصۃ الوفاء، مقریزی، ابن کثیر، ابن خلدون، منہاج السنۃ، الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ، لسان المیزان۔

ان ماخذوں کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ کا مطالعہ حدیث، طبقات، تاریخ، اور رجال پر کافی ہو چکا تھا، جو برابر بڑھتا گیا۔

اس میں حضرت امام حسنؓ، امیر معاویہؓ، امام حسینؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے حالات ہیں، جن میں بہت سے متنازعہ فیہ واقعات ہیں، مگر شاہ صاحبؒ اپنے قلم کی سلامت روی سے ان کو قلمبند کرنے میں بہت ہی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، حضرت امام حسنؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے بکثرت شادیاں کیں، اور اسی کثرت سے طلاقیں دیں، بعض روایتوں میں ان کے ازواج کی تعداد نوے تک پہونچ جاتی ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ آپ کی کل دس اولادیں تھیں، یہ تعداد شادیوں کی تعداد کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادیوں کی کثرت کی روایت مبالغہ سے خالی نہیں ہے، تاہم اس قدر مسلّم ہے کہ عام رواج سے زیادہ شادیاں کیں، اس کثرت ازدواج طلاق کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے کوفہ میں اعلان کر دیا تھا کہ انھیں کوئی لڑکی نہ دے، اس کے باوجود بقول شاہ صاحبؒ عام مسلمانوں میں خانوادۂ نبویؐ سے رشتہ پیدا کرنے کا شوق اتنا غالب تھا کہ حضرت علیؓ کی اس مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ایک ہمدانی نے برملا کہا کہ ہم ضرور لڑکی دیں گے، زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوگا کہ جو عورت انھیں پسند ہوگی رکھ لیں گے، ورنہ طلاق دے دیں گے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب تک کوئی عورت آپ کے

حبالۂ عقد میں رہتی تھی اس سے بڑی محبت اور اس کی بڑی قدر افزائی فرماتے تھے، جب ناگزیر اسباب کی بنا پر کسی عورت سے قطع تعلق کرتے تھے تو آپ کے حسن سلوک اور محبت کی یاد اس کے دل میں برابر رہتی تھی، ایک مرتبہ ایک فزاری اور ایک اسدی عورت کو رجعی طلاق دی، ان کی دلدہی کے لیے دس دس ہزار نقد اور ایک مشکیزہ شہد بھیجا اور ملازم کو ہدایت کر دی کہ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہیں اس کو یاد رکھنا، فزاری عورت کو جب خطیر رقم ملی تو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی اور بارک اللہ فیہ وجزاہ خیرا کہا، لیکن جب اسدی عورت کو ملی تو یہ تحفہ دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگی اور بے اختیار حسرت بھرا ذاتیہ مصرع اس کی زبان سے نکلا جس کا مطلب یہ تھا کہ جدا ہونے والے دوست کے مقابلہ میں یہ متاع حقیر ہے۔ (ص ۱۷ ۔ ۱۸)

اس موثر واقعہ کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے انداز بیان پر بھی غور کیجیے

حضرت امام حسنؓ سے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی اور آپ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے، مگر کچھ مہینوں کے بعد اپنی کمزوری کی بنا پر خلافت سے امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے، مگر شاہ صاحبؒ نے مدلل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ آپ نے کمزوری کی بنا پر دستبرداری اختیار نہیں کی بلکہ آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہزاروں مسلمانوں کے خاک وخون میں تڑپے ہوئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا، جنگ جمل سے برابر مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتی چلی آ رہی ہیں اس لیے آپ نے اسے روکنے کے لیے خلافت کو یہ کہہ کر مدینہ کی عزت نشینی اختیار فرمائی (ص ۲۶) اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ظاہر ہو گیا کہ میرا یہ لڑکا سید ہے، خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو فرقوں میں صلح کرائے گا (ص ۲۵ ۔ ۲۴)

اگر امام حسنؓ کے اس اسوہ کی پیروی مسلمانوں کا حکمران طبقہ برابر کرتا رہتا تو آئندہ چل کر ان کی بنی بنائی، سجی سجائی سلطنتیں ختم نہ ہوتیں، اور نہ ان فتوحات سے محروم ہوتے جن کو اپنی پامردی اور سپہگری سے تو حاصل کرتے مگر اس کے بعد ہی باہمی نفاق وآویزش اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے۔ شاہ صاحبؒ نے

حضرت امام حسنؓ کے علم و فضل اور شانِ خطابت کے علاوہ ان کے اخلاق و عادات، استغنا، بے نیازی، اصلاحِ عقائد، عبادت، ضبط و تحمل، صدقات و خیرات کی جو تصویر آرائی کی ہے، وہ نہ صرف مسلمانوں کی سیرت بلکہ انسانیت کو سنوارنے کے لیے مشعلِ راہ ہے، شاہ صاحبؒ امام حسنؓ کی وفات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: ۵۰ھ میں آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے کسی وجہ سے زہر دے دیا۔ سم قاتل تھا، قلب و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے، جب حالت زیادہ نازک ہوگئی اور زندگی سے مایوس ہوگئے تو حضرت حسینؓ کو بلا کر ان سے واقعہ بیان کیا، انھوں نے زہر دینے والے کا نام پوچھا، فرمایا نام پوچھ کر کیا کروگے، عرض کیا: قتل کروں گا، فرمایا اگر میرا خیال صحیح ہے تو خدا بہتر بدلہ لینے والا ہے، اور اگر غلط ہے تو میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی ناکردہ گناہ پکڑا جائے۔ پھر زہر دینے والے کا نام بتانے سے انکار کردیا۔ (ص ۱۴۲) عفو و درگذر، حلم و کرم ضبط و تحمل کی اس سے اعلیٰ تر مثال کہاں مل سکتی ہے۔ ایسے واقعات کو قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ کے قلم نے ان کی بڑی مدد کی۔

امیر معاویہؓ کے حالات لکھنا آسان نہیں بلکہ پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل ہے، مگر شاہ صاحبؒ کا قلم اس پل صراط پر سے بڑی خوبی سے گذر گیا ہے، شاہ صاحبؒ کو اس کا اعتراف ہے کہ امیر معاویہؓ کا حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صف آرا ہونا، اپنی کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا، حضرت حسنؓ سے لڑنا، اسلامی خلافت کو موروثی حکومت میں بدل دینا وغیرہ، ان میں سے ہر ایک واقعہ ان کی ایسی کھلی غلطی ہے جسے کوئی حق پسند مستحسن نہیں قرار دے سکتا، خصوصاً یزید کی ولی عہدی سے اسلامی خلافت کی روح ختم اور اسلام میں موروثی بادشاہت کی رسم قائم ہوگئی، ان واقعات سے عوام کے ساتھ حق پسند خواص بھی ان سے بدظن ہوگئے۔ (ص ۹۳-۹۲)

لیکن اسی کے ساتھ امیر معاویہؓ میں جو غیر معمولی اوصاف تھے ان کو شاہ صاحبؒ نے نظر انداز نہیں کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان میں بے نظیر تدبر، سیاست اور قوتِ نظم تھی، ان کی حکومت ترقی یافتہ

حکومت کا ایک مکمل اور جامع نمونہ تھی، ان کے بعد کے آنے والے خلفاء کا دور بعض انفرادی اوصاف و خصوصیات میں تو ان کے دور سے ممتاز رہا، لیکن مجموعی حیثیت سے ان سے کوئی بڑھ نہ سکا، (ص ۵۰)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین اور طائف کے غزوات میں بھی شریک ہوئے، کاتب وحی بھی بنے، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں شام کی فتوحات میں شریک رہے، عزہ انہی کی کوششوں سے فتح ہوا، حضرت عمرؓ کے آخر عہد خلافت میں رومیوں نے شام کے بعض مقامات واپس لے لیے تو معاویہؓ نے ان کو زیر کر کے دوبارہ زیر نگیں کیا، حضرت عمرؓ نے قیساریہ کی مہم ان کے سپرد کی تو رومیوں کو شکست فاش دی، حضرت عمرؓ ان کے تدبر و سیاست اور علوے حوصلہ کی وجہ سے ان کو کسرائے عرب کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان کو اپنے عہد میں دمشق کا عامل بنایا، جہاں وہ چار سال تک رہے، حضرت عثمانؓ نے تو ان کو پورے شام کا والی بنا دیا تھا، ان ہی کی فوجی کارروائیوں کی وجہ سے طرابلس الشام، شمشاط، ملطیہ اور قبرص فتح ہوئے (ص ۴۲) وہ بحر روم کو عبور کرتے ہوئے تنگنائے قسطنطنیہ تک پہونچ گئے تھے (ص ۴۴) پھر جب حکمراں بنے تو نہ صرف مفتوحہ علاقوں کی بغاوتوں اور شورشوں کو کچل کر رکھ دیا بلکہ ان کے عہد میں بست، زران، رخج، غزنہ، رامنی، نسف، بیکند، بخارا، سمرقند، سندھ، روڈس اور ارواڈ وغیرہ فتح ہوئے، کوئی سال رومیوں سے نبرد آزمائی سے خالی نہیں جاتا، ہر موسم گرما میں مسلمان کبھی ایشیا اور کبھی یورپ میں ان سے مقابلہ کرتے تھے، امیر معاویہؓ کے عہد میں بحر روم کے متعدد جزیرے اسلام کے زیر نگیں ہوئے، اس طرح ان کی حکومت کے ماتحت ایشیا میں ترکستان سے سندھ کے علاقے اور افریقہ میں تونس، مراکش اور الجزائر بھی تھے، اسی کے ساتھ حکام کے انتخاب میں بڑی فراست کا ثبوت دیتے رہے، جس سے حکومت خاطر خواہ طریقہ پر چلتی رہی، فوجی نظام کو ترقی دے کر کمال تک پہونچا دیا (ص ۸۷) جبلۃ الطرطوس، مرقیہ، بلنیاس، روڈس اور مدینہ میں بڑے بڑے قلعے بنائے، بحری فوج کو اتنی ترقی دی کہ اسلامی بیڑے کو اس عہد کے مشہور رومی بیڑوں سے بڑھا دیا،

جہاز سازی کے کارخانے مصر، اردن اور عکا میں قائم کیے، اندرون ملک پولیس کا بڑا اچھا انتظام کیا، مشتبہ لوگوں پر نگرانی رکھنے کا اہتمام کیا، خبر رسانی اور پرچہ نگاری کو پہلے سے زیادہ ترقی دی، زراعت کی ترقی کے لیے نہر کظامہ، نہر ازرق، نہر شہدا کھدوائی، شام میں شہر رغش، افریقہ میں شہر قیروان، انطاکیہ میں فارس، بعلبک، حمص آباد کیے، اسی لیے تمام مورخین ان کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر، سیاست داں اور بیدار مغز فرماں روا مانتے تھے۔ (ص ۱۳۴) ان تمام واقعات کا ذکر کرکے خود شاہ صاحب اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ سیاست، تدبر، حکومت و فرماں روائی، جہاں بانی و کشور کشائی کے اوصاف جلیلہ میں ان کا کوئی معاصر ان کا حریف نہ تھا (ص ۱۳۵)

اسی کے ساتھ ان کے اور فضائل بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ انھوں نے اپنا دامن علم اتنا وسیع کر لیا تھا کہ وہ صحابہؓ جو اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے حبرالامۃ کہلاتے تھے، ان کو فقہاء میں شمار کرتے تھے (ص ۱۳۰) احادیث نبویؐ کا کافی ذخیرہ ان کے سینہ میں محفوظ تھا، کتابت میں ان کو پوری مہارت تھی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا خاص کاتب مقرر فرمایا تھا (ص ۱۳۱-۱۳۰) وہ شعر و شاعری کا نہایت اچھا مذاق رکھتے تھے (ص ۱۳۱) ان کی تقریر بلاغت اور زور بیان کا عمدہ نمونہ ہوتی تھی (ص ۱۳۱)

قیامت کے مواخذہ کا ذکر سن کر لرزہ براندام ہو جاتے تھے، روتے روتے ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی (ص ۱۳۹) ان میں ضبط و تحمل بھی بہت تھا، تلخ سے تلخ اور ناگوار سے ناگوار باتیں شربت کی طرح پی جاتے تھے، اور کہتے کہ غصہ پی جانے سے زیادہ میرے لیے کوئی شے لذیذ نہیں (ص ۱۳۹) فیاضی اور زرپاشی بھی ان کا خاص وصف تھا، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفر اور آل ابی طالب ان کے شدید مخالفوں میں تھے، لیکن ان کی مخالفت اور ان کی بدکلامیوں کے باوجود وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے (ص ۱۴۱) وہ حضرت عائشہؓ کی بڑی خدمت کرتے رہے، ان کی خدمت میں ایک لاکھ کی

نذر پیش کرتے تھے، وقتاً فوقتاً پانچ پانچ ہزار کی رقمیں بھی بھیجیں (ص ۱۴۲) ان کے پاس آثار نبویؐ میں ایک کرتہ، ناخن اور موئے مبارک تھے، وفات کے وقت وصیت کی کہ اس کرتے میں مجھے کفنانا، ناخن اور موئے مبارک آنکھوں اور منھ کے اندر بھر دینا، شاید اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے مغفرت فرمائے (ص ۱۴۲)

امیر معاویہؓ کے یہ تمام محاسن و اوصاف شاہ صاحب نے مستند ماخذوں کے سہارے بڑی وضاحت کے ساتھ قلمبند کیے ہیں، پھر ان کو اپنی کتاب میں وہ درجہ کیوں نہ دیتے، جو ان کو فرماں روائی کی تاریخ میں حاصل تھا، اور جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

ان پر جو الزامات ہیں شاہ صاحبؒ نے ان کا بھی تجزیہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ سے جو ٹکر لی اور یزید کو جو اپنا جانشین بنایا اس سے ان کے بہت سے مخالفین پیدا ہو گئے اور ان کی طرف بہت سی برائیاں منسوب کیں، بنی عباس ان کے سخت دشمن تھے، اس لیے ان کے زمانے میں ان کے خلاف نفرت انگیز خیالات پیدا کیے گئے، بہت سی غلط روایتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور تاریخوں میں بھی داخل ہو گئیں، کچھ تو بعد میں تنقید سے مسترد ہو گئیں، پھر بھی کچھ باقی رہ گئیں جن میں کچھ یہ ہیں:

حضرت حسنؓ کے زہر دلوانے میں ان ہی کا ہاتھ تھا، ان کا طرز عمل بنی ہاشم اور اہل بیت نبویؐ کے ساتھ ناپسندیدہ تھا، حضرت علیؓ پر سب وشتم کرتے تھے، بعض صحابہ کو قتل کیا اور ان کی توہین کی، ان کا طرز حکومت نہایت جابرانہ تھا، انھوں نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنا لیا تھا، حکومت کے تمام شعبوں میں بنی امیہ کو بھر دیا تھا، بہت سی بدعتیں جاری کیں، شاہ صاحبؒ نے ان تمام الزامات پر بڑی مدلل بحثیں کی ہیں، اور پوری دلائل کے ساتھ مستند ماخذوں کے حوالے سے ان کو رد کیا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ مباحث ان کی تحقیقی کاوشوں کا بڑا اچھا نمونہ ہیں۔

حضرت حسنؓ کی زہر خورانی کے واقعہ کے سلسلہ میں حدیث، طبقات اور تاریخ کی تمام کتابوں کی

چھان بین جس طرح کی ہے، ان کو پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے۔

امیر معاویہؓ کی جابرانہ حکومت کی تردید بھی سعید بن العاص کی یہ روایت نقل کر کے کر دی کہ امیر معاویہؓ کہتے تھے کہ جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہ توڑوں گا، لوگوں نے پوچھا: امیر المومنین! یہ کس طرح؟ جواب دیا: لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو وہ ڈھیل دیتے ہیں، اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں، اور جب کسی آدمی کی کوئی ناگوار بات معلوم ہوتی ہے تو انعام واکرام سے اس کی زبان بند کر دیتا ہوں (ص ۱۱۸ - ۱۱۷) یہ حکمرانی کا ایسا اصول ہے کہ آج بھی بیدار مغز حکمراں اسی پر عمل کرتے ہیں، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کے یہاں بھی حلم اور سختی دونوں تھی، اس کی تصدیق علامہ ابن طقطقی کے اس بیان سے کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ حلم کے موقع پر حلم سے اور سختی کے موقع پر سختی سے کام لیتے، لیکن حلم کا پہلو غالب تھا۔ (ص ۱۱۸)

شاہ صاحبؒ نے امیر معاویہؓ کا کردار دکھانے میں جو دو روایتیں بیان کی ہیں، وہ ضرور قابلِ غور ہیں، عبداللہؓ بن مسعدہ بن حکم فزاری بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ شام کے کسی علاقہ میں جا رہے تھے، تو انھوں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ابن مسعدہ! خدا ابوبکرؓ پر رحم کرے، نہ انھوں نے دنیا کو چاہا، نہ دنیا نے انھیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے چاہا، لیکن انھوں نے اس کو نہیں چاہا، عثمانؓ کو کچھ دنیا میں مبتلا ہونا پڑا، اور ہم لوگ تو بالکل اس میں مبتلا ہو گئے، یہ کہہ کر نادم ہو گئے، پھر کہا: خدا کی قسم! یہ حکومت بھی خدا ہی نے ہم کو دی ہے (ص ۱۳۹) حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ معاویہؓ کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ تم کیوں مغفرتِ خداوندی کے مجھ سے زیادہ مستحق ہو؟ خدا کی قسم ایسی حالت میں جب کہ اصلاح بین الناس، اقامت حدود، جہاد فی سبیل اللہ اور بڑے بڑے بے شمار امور کا بار میرے کندھوں پر ہے جو تمہارے اوپر نہیں ہے اور میں خدا کے دین پر ہوں، جو بھلائیوں کو قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگذر کرتا ہے، اس پر بھی خدا کی قسم

اگر میرے سامنے خدا اور اس کے ماسوا کا سوال آتا ہے تو میں خدا ہی کو اختیار کرتا ہوں، مسور کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب معاویہؓ کا ذکر آتا تو ان کے لیے وہ دعائے خیر کرتے تھے (ص ۱۲۶)

امیر معاویہؓ کے کردار کے ان پہلوؤں کو شاہ صاحب نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ان کی مورخانہ بصیرت کا بھی اندازہ ہوگا۔

اس کتاب میں امیر معاویہؓ کے بعد حضرت امام حسینؓ بن حضرت علیؓ کا باب ہے، جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اب تک ان کے حالات شہادت ناموں اور مرثیوں میں پڑھے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر روایتیں جذباتی ہیں، اس لیے ناقابل قبول ہوتی تھیں، مگر شاہ صاحب نے ان کو مستند ماخذوں اور معتبر حوالوں سے قلمبند کرکے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے، شاہ صاحبؒ کو حضرت حسینؓ سے وہی عقیدت ہے جو ایک سچے مسلمان کو ہونا چاہیے، اس لیے جب ان کی ولادت باسعادت کا ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

"ریاض نبویؐ میں وہ خوش رنگ ارغوانی پھول کھلا جس کی مہک حق و صداقت، جرأت و بسالت، عزم و استقلال، ایمان و عمل اور ایثار و قربانی کی وادیوں کو ابد الآباد تک بساتی اور حسن کی رنگینی عشق کی سرخی، شفق کی گلگونی اور لالہ کے داغ کو شرماتی رہے گی، یعنی ۴ھ میں علیؓ کا کاشانہ حسینؓ کے تولد سے رشک گلزار بنا۔" (ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

شاہ صاحبؒ کی تحریر کی یہ شگفتگی ان کی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور کی تھی، جو برابر بڑھتی گئی، آخر میں اس شگفتگی میں ایسی پختگی پیدا ہوئی کہ پختگی شگفتگی پر غالب آگئی۔

کربلا کا واقعہ اسلام کی تاریخ کا المناک ترین سانحہ ہے، اس کو یاد کرکے کون مسلمان ہے جو خون کے آنسو نہ روتا ہوگا، شاہ صاحبؒ بھی اس کے ذکر کرنے میں بیحد سوگوار ہوئے ہیں، ان کے قلم میں طاقت تھی، اس لیے اپنی سوگواری کا اظہار بہت موثر طریقہ پر کیا ہے، پہلے تو حضرت امام حسینؓ کی بے کسی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"اللہ اللہ! یہ نیرنگی دہر اور انقلاب زمانہ کا کیسا عجیب اور کیسا عبرتناک منظر ہے کہ جس کے نانا کے گھر کی

پاسبانی کیا کرتے تھے آج اس کا نواسہ بے برگ و نوا بے یار و مددگار کربلا کے دشت غربت میں کھڑا ہے، اور روئے زمین میں خدا کے علاوہ اس کا کوئی حامی و مددگار نہیں، غزوۂ بدر میں جس کے نانا کی حفاظت کے لیے آسمان سے فرشتے اترے تھے آج اس کے نواسہ کو ایک انسان بھی محافظ نہیں ملتا۔

پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت، عفو و کرم اور درگذر کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں:

"ایک وہ وقت تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، دشمنان اسلام کی ساری قوتیں پاش پاش ہو چکی تھیں، رحمت عالمؐ کے دامن عفو و کرم کے علاوہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہ گئی تھی، اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ابو سفیان جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ بغض و عداوت، دشمنی و کینہ پروری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ بے بس و لاچار دربار رسالت میں حاضر کیے گئے تھے، ایک طرف ان کے جرائم کی طویل فہرست تھی، دوسری طرف رحمۃ للعٰلمین کی شان رحمت و کرم، تاریخ کو معلوم ہے کہ سرکار رسالت سے اس سنگین اور اشتہاری مجرم کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا، قتل کی دفعہ عائد نہیں کی گئی، جلاوطنی کی سزا تجویز نہیں ہوئی، قید خانہ کی چار دیواری میں بند نہیں کیا گیا، بلکہ "من دخل دار ابی سفیان فھو آمن" جو شخص ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے اس کی جان و مال محفوظ ہے" کے اعلان کرم سے نہ صرف تنہا ابو سفیان کی جاں بخشی فرمائی گئی، بلکہ ان کے گھر کو جس میں بارہا مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو چکی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے ہو چکے تھے، دار الامن بنا کر وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین کی عملی تفسیر فرمائی گئی۔ (ص ۲۶۴)

اس کے بعد حضرت امام حسینؓ کی شہادت سے پہلے کا منظر دکھانے میں شاہ صاحبؒ کا قلم کچھ اور رواں ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ٹھیک بائیس برس کے بعد زمانہ کا رخ بدلتا ہے، اور ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے، ایک طرف انہی ابوسفیان کے پوتے عبیداللہ بن زیاد کی طاغوتی طاقتیں ہیں، دوسری طرف رحمۃ للعٰلمین کی تمام ذریت اولاد ہے، نبوت کا سارا کنبہ ابوسفیان کی ذریات کے ہاتھوں تہ تیغ ہو چکا ہے، کربلا کا میدان اہلبیت کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہے، جگر گوشۂ رسولؐ کی آنکھوں کے سامنے گھر بھر کی لاشیں تڑپ رہی ہیں، اعزہ کے قتل پر آنکھیں خون بار ہیں، بھائیوں کی شہادت پر سینہ وقف ماتم ہے، جوان مرگ لڑکوں اور بھتیجوں کی موت پر دل فگار ہے، لیکن اس حالت میں بھی وحوش و طیور کے لیے امان ہے، مگر جگر گوشۂ رسولؐ کے لیے امان نہیں ۔ آج وہی تلواریں جو فتح مکہ میں مفتوحانہ ٹوٹ چکی تھیں، دشت کربلا میں نوجوانان اہل بیت کا خون پی کر سیر نہیں ہوئیں، حسینؓ کے خون کی پیاس میں زبانیں چاٹتی ہیں، لیکن پیکر صبر و قرار اس حالت میں بھی راضی برضا ہیں، اور اس بے بسی میں بھی جادۂ مستقیم سے پاؤں نہیں ڈگمگاتے ۔"

(ص ۲۱۵ - ۲۱۴)

امام حسینؓ کی شہادت کے ذکر میں شاہ صاحبؒ کا قلم بہت ہی خوں چکاں ہو گیا ہے، اس خوں چکانی کو ہمارا ، قوت تحریر نے اچھی طرح ملا ہے جس میں شبلی اسکول کا رنگ پورے طور پر نمایاں ہے، امام حسینؓ کے آخری ، کی مرقع آرائی اس طرح کی گئی ہے :

"حضرت حسینؓ کی حالت لمحہ بلمحہ غیر ہوتی جاتی تھی، زخموں سے سارا بدن چور ہو چکا تھا، لیکن کسی کو شہید کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، سب اس جرم معصیت کو ایک دوسرے پر ٹال رہے تھے، شمر نے یہ تذبذب دیکھ کر پکارا، تمھارا برا ہو، تمھاری مائیں تم کو روئیں، دیکھتے کیا ہو، بڑھ کر حسینؓ کو قتل کر دو۔ اس للکار پر شامی چاروں طرف سے امامؓ ہمام پر ٹوٹ پڑے، ایک شخص نے تیر مارا، جو گردن میں آکر پیوست ہو گیا، امامؓ نے اس کو ہاتھوں سے نکال کے الگ کیا، ابھی آپ نے تیر نکالا ہی تھا کہ زرعہ بن شریک تمیمی نے بائیں ہاتھ پر تلوار ماری، پھر گردن پر وار کیا، ان پیہم زخموں نے امامؓ کو

بالکل نڈھال کر دیا، اعضار جواب دے گئے، اور کھڑے ہونے کی طاقت باقی نہ رہی، آپ اٹھتے تھے اور سکت نہ پاکر گر پڑتے تھے، عین اسی حالت میں سنان بن انس نے کھینچ کر ایسا کاری نیزہ مارا کہ فلک رفعت زمیں بوس ہو گیا، سنگ دل اور شقی ازلی خولی بن یزید سر کاٹنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن ہاتھ کانپ گئے، تھرا کے دیکھے ہٹ گیا، سنان بن انس نے اس سر کو جو بوسہ گاہ سرور کائنات تھا جسم اطہر سے جدا کر لیا۔" (ص ۲۵۲)

اس نثر نگاری میں ایک اچھے شاعر کی مرثیہ نگاری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے نوحہ کر کے اپنے جذبات کا اظہار جس طرح کیا ہے اس سے ان کے انشاء پردازانہ رنگ کا بھی اندازہ ہو گا۔

"۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ مطابق ستمبر ۶۸۰ء میں خانوادۂ نبوی کا آفتاب ہدایت ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا، اس شقاوت اور سنگدلی پر زمین کانپ اٹھی، عرش الٰہی تھرا گیا، ہوا خاموش ہو گئی پانی کی روانی رک گئی، آسمان خون رویا، زمین سے خون کے چشمے پھوٹے، شجر و حجر سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں، جن و انس نے سینہ کوبی کی، ملائکہ آسمانی میں صف ماتم بچھی کہ آج ریاض نبوی کا گل سرسبد مرجھا گیا، علیؓ کا چمن اجڑ گیا اور فاطمہؓ کا گھر بے چراغ ہو گیا۔" (ص ۲۲۲)

اس ایجاز پر اطناب قربان کیا جا سکتا ہے۔

عام طور سے اس سانحہ پر یزید ہی پر لعنت بھیجی جاتی ہے، اس میں شک نہیں کہ یزید ہی کی حمایت میں کربلا کا واقعہ پیش آیا، مگر شاید یزید کو اس سنگینی کی امید نہ تھی، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب یہ خبریں قیس یزید کے دربار میں آ کر سنانے اور حضرت حسینؓ کی شہادت کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرنے لگا تو یزید آبدیدہ ہو گیا، اور بولا: اگر تم لوگ حسینؓ کو قتل نہ کرتے تو میں تم سے زیادہ خوش ہوتا، ابن سمیہ (ابن زیاد) پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو خدا کی قسم حسینؓ کو معاف کر دیتا، اللہ حسینؓ پر اپنی رحمت نازل کرے، زہیر نے

انعام واکرام کی طمع میں بڑی لفاظی کے ساتھ شہادت کا واقعہ بیان کیا تھا، مگر یزید نے اسے کچھ بھی نہ دیا۔ (ص ۲۲۴)

"جب محصر بن ثعلبہ اہل بیت کا ستم رسیدہ قافلہ لے کر یزید کے پھاٹک پر پہونچا تو چلایا کہ میں ابن ثعلبہ امیر المومنین کی خدمت میں لئیموں اور فاجروں کا سر لایا ہوں، یزید نے یہ سن کر کہا کہ ام ثعلبہ نے جو بچہ جنا ہے وہ سب سے زیادہ شریر اور لئیم ہے، اس کے بعد حضرت حسینؓ کے سر مبارک پر ایک نگاہ ڈالی اور ایک شعر پڑھ کر کہا: خدا کی قسم حسین! اگر میں تمہارے ساتھ ہوتا تو تم کو ہرگز قتل نہ کرتا، اس کے بعد یحییٰ بن حکم نے ایک قطعہ پڑھا جس میں ابن سمیہ کی تعریف اور اہل بیت پر کچھ طعن تھا، یزید نے سن کر اس کے سینے پر ہاتھ مارا اور ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔" (ص ۲۲۸)

"یزید نے اہل بیت کے قافلہ کو اپنے سامنے طلب کیا۔۔۔۔۔ عورتوں اور بچوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا، اس وقت یہ سب نہایت ابتر حالت میں تھے، یزید نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر کہا: خدا ابن مرجانہ کا برا کرے، اگر اس کے اور تمہارے درمیان قرابت ہوتی تو تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا، اور نہ اس طرح سے تم کو بھیجتا، فاطمہؓ بنت علیؓ کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ یزید کے سامنے پیش کیے گئے تو ہماری حالت دیکھ کر اس پر رقت طاری ہوگئی اور بڑی نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کیا۔ (۲۲۹)

"یزید نے اہل بیت کو خاص حرم سرا میں ٹھہرانے کا حکم دیا، یزید خود حضرت حسینؓ کا رشتہ دار تھا، اس کی عورتیں بھی عزیز تھیں، اس ستم رسیدہ قافلہ کے زنانخانے میں داخل ہوتے ہی یزید کے گھر میں کہرام مچ گیا، ساری عورتوں نے نوحہ کیا، تین دن تک یزید کے گھر میں ماتم بپا رہا، اس دوران میں یزید برابر زین العابدین کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بلا کر کھلاتا تھا (ص ۲۳۰)

"شامی وحشیوں نے اہل بیت کا کل ساز و سامان لوٹ لیا، یزید نے اس کی فوری تلافی کی، تمام عورتوں سے پوچھ پوچھ کر جن کا جس قدر مال و متاع گیا تھا اس کا دونا مال دلوایا، سکینہ بنت حسینؓ اس تلافی مافات سے بہت متاثر ہوئیں، کہتی تھیں کہ میں نے منکرین خدا میں یزید سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔" (ص ۲۳۰)

"یزید نے اہل بیت کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ بھجوایا اور رخصت کرتے وقت زین العابدین سے کہا: ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو حسینؓ جو کچھ کہتے مان لیتا، ان کی جان بچانے کی پوری کوشش کرتا، خواہ اس میں میری اولاد ہی کیوں نہ کام آجاتی، لیکن اب قضائے الٰہی پوری ہو چکی، بہرحال جب بھی تم کو کسی قسم کی ضرورت پیش آئے تو فوراً مجھے لکھنا" (ص ۲۲۱)

بعض تاریخی واقعات ایسے ہیں جو عقیدتمندانہ جذبات میں کھو گئے ہیں، مگر جب ان کا ناقدانہ تجزیہ کیا جاتا ہے تو کچھ اور ہی نظر آتے ہیں، شاہ صاحب کی ان تحریروں میں عقیدتمندانہ جذبات بھی ہیں اور ٹھوس واقعات کی تحلیل بھی، اس لیے ان میں ایک خاص رنگ و بو ہے، یہ تحریریں اب سے پچاس برس پہلے لکھی گئی تھیں، اس مدت سے اب تک ان تحریروں کے توازن اور اعتدال پر کوئی مخالفانہ بحث نہیں ہوئی، اس لیے بھی کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مستند حوالوں پر مبنی ہے۔

اسی کے ساتھ شاہ صاحب یزید کی ولیعہدی کے سخت ناقد ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولیعہد بنا کر قیصر و کسریٰ کی تقلید کی، اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں خلافت کے لیے یزید کا نام کسی طرح لیا نہیں جا سکتا تھا، امیر معاویہؓ نے ان کو نظر انداز کرکے اس کو اپنا ولیعہد بنایا، عہد نبوت کے بعد کی وجہ سے بڑی حد تک حریت و آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا، اس لیے کچھ لوگوں نے امیر معاویہؓ کے دبدبہ و شکوہ سے مرعوب ہو گئے، کچھ لوگوں کو مال و زر کی طمع آگئی اور کچھ اختلاف امت کے خطرہ سے بچنے کے لیے خاموش ہو گئے، کسی نے خوش دلی سے یزید کو ولی عہد تسلیم نہیں کیا، اور جب وہ خلیفہ ہوا تو بھی اس نے اپنے کو اس منصب کا اہل ثابت نہیں کیا، اس نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی استبداد شروع کر دیا، عمائد سے بیعت لینے کے احکام جاری کیے، ایسی صورت میں حضرت حسینؓ اس نامنصفانہ حکم کو مان لیتے اور یزید کی غیر شرعی بیعت کو قبول کرکے تاریخ اسلام میں ظلم و ناانصافی کے سامنے سپر ڈالنے کی مثال قائم کرتے یا اس کے خلاف آواز بلند کرکے استبداد کے خلاف عملی جہاد کا سبق دیتے، ان دونوں صورتوں میں آپ نے

دوسری صورت اختیار کی، اور اس حکومت کے خلاف جو غیر شرعی طریق پر قائم ہوئی اور جس نے بہت سی اسلامی روایات کو پامال رکھا تھا، مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے حریت و آزادی کا سبق دے دیا، جس کا ثبوت خود حضرت حسینؓ اور آپ کے رفقاء کی تقریروں سے ملتا ہے (ص ۲۳۹۔ ۲۳۸)

ان تقریروں میں کیسی صداقت اور حقانیت ہے، جو ایک صاحبِ دل اور صاحبِ بصیرت ہی کے قلم سے نکل سکتی تھی۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ امام حسینؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حالات ہیں جو بڑے ہی جلیل القدر صحابی تھے، آپ کے والد ماجد حضرت زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری اور عشرہ مبشرہ میں تھے، ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقہؓ آپ کی پھوپھی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ آپ کی دادی تھیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے نانا تھے، آپ کی والدہ حضرت اسماءؓ کو بارگاہ نبوت سے "ذات النطاقین" کا محبت آمیز لقب ملا تھا، حضرت عائشہؓ آپ کی خالہ تھیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کمسن تھے، مگر حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کی بہادری کی دھاک جم گئی تھی، طرابلس کی تسخیر آپ ہی کی خوش تدبیری کا نتیجہ تھی، افریقہ کی فتح کے بعد ۳۰ھ میں طبرستان کی فوج کشی میں شریک ہوئے اور نمایاں حصہ لیا، حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش ہوئی تو اس نازک وقت میں خلیفۂ مظلوم کی حفاظت کے لیے جو سرفروش نکلے تھے ان میں ابن زبیرؓ بھی تھے، جنگ جمل میں اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کی حفاظت میں اس بہادری اور بے جگری سے لڑے کہ سارا بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا، اختتام جنگ کے بعد تلواروں اور نیزوں کے چالیسؓ سے زیادہ زخم بدن پر تھے، صفین کی خانہ جنگی میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ رفع شر کے لیے امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، لیکن جب انھوں نے یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ابن زبیرؓ نے اس کی پرزور مخالفت کی۔

(باقی)

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی اور اُن کا تذکرہ

"مہر جہاں تاب"

از جناب مولوی شمس تبریز خاں صاحب رفیق مجلس تحقیقات و نشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تاریخ اسلام پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ میں اہل بیت اور خانوادۂ نبوت نے دوسری نسلوں اور خاندانوں کے مقابلے میں اسلام کی عظیم تر خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، اور ان کا وجود ہی جوہر مایۂ ملت کا نگہبان اور روایات حرم کا پاسباں رہا ہے؛ اور ایسا ہونا فطری اور ناگزیر بھی تھا، کیونکہ اسلام اس دودمانِ عالی کے لیے قومی روایت اور خاندانی وراثت اور اسلامی روایت سے ان کا تعلق ذاتی اور جذباتی نوعیت بھی رکھتا تھا، اسلام کی خصوصیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت و نسبت کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی عترت سے خصوصی تعلق اور ان سے محبت کا حکم دیا،

عن زید بن ارقم قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم	حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا... اور میں تم میں دو گرانقدر
وانا تارک فیکم ثقلین اولهما	چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے ایک
کتاب الله فیه الهدی والنور	کتاب اللہ ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے
فخذوا بکتاب الله واستمسکوا	تو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو...
..... واهل بیتی اذکرکم الله	اور اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کا
فی اهل بیتی (ثلاثا)[1]	واسطہ دیتا ہوں، یہ آپ نے تین بار فرمایا۔

[1] صحیح مسلم، ۲/ ۱۸۷۳-۱۸۷۴ طبع قاہرہ ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء دارمی ۲/ ۳۱۰ طبع مدینہ منورہ (۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء)

اسی طرح مسند بزار میں ہے،

مثل اھل بیتی مثل سفینۃ نوح	میرے گھر والوں کی مثال سفینۂ نوح
من رکبھا نجا ومن ترکھا غرق[1]	جیسی ہے کہ جو اس پر سوار ہو گیا وہ تو بچ گیا
	اور جو اس سے الگ رہا وہ غرق ہوا،

امام ترمذیؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے اس طرح روایت کی ہے،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم
انی تارک فیکم ما ان تمسکتم بہ	میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ
لن تضلوا بعدی احدھما	جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے تو میرے
اعظم من الآخر، کتاب اللہ	بعد گمراہ نہ ہوگے، ان میں سے ایک
حبل ممدود من السماء الی الارض	دوسری سے بڑی ہے، کتاب اللہ
وعترتی اھل بیتی ولن یتفرقا	آسمان سے زمین کی طرف لٹکی ہوئی
حتی یردا علی الحوض فانظروا	رسی ہے اور دوسری چیز میرا خاندان
کیف تخلفونی فیھما[2]	اور میرے گھر والے ہیں جو روز میدان
	حشر میں اس وقت تک الگ نہیں ہونگے
	جب تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس
	نہ آئیں تو اس کا خیال رکھو کہ ان دونوں کے بارے میں تم کتنا میرا لحاظ رکھتے ہو۔"

سادات کرام کی عالمگیر اسلامی خدمات کا تعارف تو کئی مجلدات کا متقاضی ہوگا، ہم سردست یہاں حسنی سادات کی اس شاخ سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو امیر قطب الدین محمد الحسنی المدنیؒ

---

[1] مجمع الفوائد ۲/۲۳۶　[2] سنن ترمذی ۲۲۶ (دہلی ۱۲۶۶ھ)

(۱۰۰۵–۱۰۶۰ھ) کے ساتھ ہندوستان آئی، امیر قطب الدین حضرت امام حسنؓ کی تیرہویں پشت میں ایک عالی ہمت اور اہل علم بزرگ تھے، جنھیں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہندوستان جانے کا حکم اور فتح کی بشارت ملی، اور وہ سادات اور مجاہدین غزنی کے ساتھ دہلی تشریف لائے، اور قنوج، منسوہ (فتحپور) کڑا اور مانک پور کو فتح کرکے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔[۱] ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں عالی نسب سادات کے ذکر میں دہلی کے شیخ الاسلام سید قطب الدین مدنیؒ کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔[۲] سادات کا یہ خاندان ایک صدی تک کڑا، (الہ آباد) میں رہنے کے بعد جائس پھر نصیر آباد اور پھر تکیہ رائے بریلی منتقل ہوا، اس خاندان میں صلاح وتقویٰ، علم وفضل اور کبھی کبھی امارت وریاست کا بھی اجتماع رہا، بہت سے افراد بدایوں اور دوسرے علاقوں کے قاضی بھی ہوئے، اسطرح یہ گھرانہ اپنی پوری تاریخ میں علم وعمل کے لیے ممتاز رہا ہے اور اس کے ہر دور میں شریعت وطریقت کے جامع افراد سامنے آتے رہے ہیں۔

امیر قطب الدینؒ کی چودھویں پشت میں مشہور بزرگ حضرت شاہ علم اللہؒ (۱۰۳۳–۱۰۹۶) گزرے ہیں جو علم وفضل، تقویٰ اور اتباع سنت کے مقام بلند پر فائز تھے، آپ کچھ دنوں لشکر شاہجہانی میں رہے، پھر ریاضات ومجاہدات میں مشغول رہ کر حضرت مجدد سرہندیؒ (۹۷۱–۱۰۳۴ھ) کے ممتاز خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) سے خلافت پائی، انھوں نے آپ کو اپنے عمامہ اور حضرت مجددؒ کی دستار کے ساتھ رخصت کرایا، اپنے ایک بزرگ کی درخواست پر تکیہ (رائے بریلی) میں طرح اقامت ڈالی اور عبادت وریاضت، اتباع سنت اور تزکیہ نفوس میں مشغول رہ کر ۶۳ سال کی عمر میں عالمگیر کے عہد میں انتقال فرمایا

مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ، حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "درالمعارف"

---

[۱] تاریخ آئینہ اودھ بحوالہ سیرت سید احمد شہید ۱/۹، [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱ (کلکتہ ۱۸۶۲ء)

اور بحرِ زخار کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"انتقال کی شب کو عالمگیر نے خواب دیکھا کہ آج کی رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی علمار سے تعبیر دریافت کی تو انھوں نے کہا" اس رات سید علم اللہ صاحب کی وفات ہوئی ہوگی کہ وہ اتباع سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم تھے۔ سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو جناب ممدوح نے انتقال کیا"[1]

سید آدم بنوری کے خلیفہ خواجہ محمد امین بدخشی نے نتائج الحرمین میں تفصیل سے آپ کے حالات لکھے ہیں[2]

شاہ علم اللہ کے برادر عمزاد دیوان خواجہ احمد (م ۱۰۸۰ھ) مشہور عالم اور صوفی باصفا اور مشہور زمانہ عالم شیخ محب اللہ الہ آبادی کے تلمیذ تھے، شروع میں ان پر علوم ظاہری کا غلبہ تھا اسلیے علم باطن اور تصوف سے بعد تھا، شاہ علم اللہ چاہتے تھے کہ انکی طرح وہ بھی حضرت آدم بنوری سے مرید ہو جائیں مگر وہ تیار نہیں ہوتے تھے، اور یہ فرماتے تھے کہ ہم لوگ دانشمندوں اور علمار کے طبقے میں ہیں اس لیے جو شیخ علوم ظاہری پر نظر نہیں رکھتا اس کے قائل نہیں ہوتے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ وہ اگرچہ علوم ظاہری میں ممتاز نہیں، لیکن اللہ تعالٰے نے انھیں ایسے علم لدنی سے نوازا ہے جن کے مقابل یہ علوم ظاہری ہیچ ہیں، انھوں نے علوم باطنی کے کچھ نمونے بھی ان کے سامنے رکھے جس کے بعد وہ حضرت آدم بنوری کی خدمت میں جانے پر راضی ہوگئے، حضرت بنوری ان دنوں شاہجہان کی ناراضگی کے سبب عازم حجاز تھے، اور گوالیار میں ٹھیرے ہوئے تھے کہ

---

[1] سیرت سید احمد شہید ۱/۸۶، [2] حضرت کے خاندان کے ایک عالم و اہل قلم مولانا محمد الحسنی مرحوم کا لکھا ہوا تذکرہ شاہ علم اللہ بھی شایع ہو چکا ہے نیز بحر زخار، وجیہ الدین لکھنوی اور نزہۃ الخواطر جلد پنجم میں آپ کے حالات مذکور ہیں،

یہ حضرات ان کی خدمت میں پہنچے اور خواجہ احمد نے بیعت کی۔[۱]

آپ کے چاروں صاحبزادگان مولانا سید آیت اللہ، مولانا سید محمد ہدیٰ، مولانا سید ابوحنیفہ اور مولانا سید محمد (صاحب شرح کلمات نقشبندیہ) علم و تقویٰ کی جامعیت اور اتباع سنت کے لیے امتیاز رکھتے تھے اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر تھے۔[۲] اسی طرح انکی اولاد میں بھی انکے خلف الصدق اور جانشین پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے علم و دین کے اجتماع کی خاندانی روایت برقرار رکھی،

شاہ علم اللہ کے پوتے مولانا سید محمد عدل (م ۱۱۹۲ھ) پر مولانا حکیم سید عبدالحیٔ کے الفاظ میں اودھ کی خم شدہ ... کاکوری کے صوفیہ اور فرنگی محل کے علما مستفید ہوئے۔[۳] شاہ صاحب کے پرپوتے شاہ ابوسعید حسنی (م ۱۱۹۳ھ) حضرت شاہ ولی اللہ سے خصوصی طور پر مستفید ہوئے تھے اور انھیں شاہ محمد عاشق پھلتی سے تکمیل سلوک کے بعد اجازت حاصل ہوئی تھی، اور آپ کو مجاہد فی سبیل اللہ اور شہید راہ خدا حضرت سید احمد رائے بریلوی کا جد امجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کے داعی و علمبردار حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ — ۱۲۴۶ھ) حضرت شاہ علم اللہ کی نسل میں ہوئے ہیں، جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدا کردہ ذہنی و ثقافتی بیداری کو ایک اسلامی دعوت و عزیمت کی پرجوش تحریک میں بدل دیا جس کے دور رس اصلاحی اثرات سے برصغیر ہند و پاک ابتک متاثر ہیں، اور نامعلوم زمانے تک متاثر رہیں گے، حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد، انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی بھی تھی جسے انگریزوں نے وہابیت کے نام سے ...... بدنام کیا۔ شاہ علم اللہ کے پرپوتے مولانا سید محمد نعمان، سید احمد شہید کے والد ماجد سید محمد عرفان کے بھائی اور برگزیدہ عالم و درویش تھے، انھیں شاہ ولی اللہؒ سے تلمذ تھا، حج و زیارت کے بعد بیت المقدس کی زیارت کو گئے تھے، کہ وہیں انتقال فرمایا (۱۱۹۰ھ)

آپ نے خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ "اعلام الہدیٰ" کے نام سے لکھا تھا،[۴] اس خانوادہ کے اہل علم

---

[۱] اعلام الہدیٰ (قلمی)، ص ۱۶۰ [۲] تذکرہ شاہ علم اللہ ص ۱۴۰ - ۱۰۴ (۱۹۶۰ء) [۳] نزہۃ الخواطر ۳۳۴/۶
[۴] نزہۃ الخواطر ۳۰۸/۶

والی دل بزرگوں میں مولانا قطب الہدیٰ بن مولانا سید واضح شاہ عبدالعزیزؒ کے تلمیذ اور شاہ غلام علی دہلویؒ کے مرید تھے آپ نے ۱۲۲۳ھ میں وفات پائی۔ متاخرین علماء و مشائخ میں مولانا محمد علی ٹونکی حضرت سید صاحبؒ کے بھانجے اور خلیفہ تھے، فارسی میں جلاء العیون فی سیر النبی الامین المامون، لکھی، اور مخزن احمدی میں حضرت سید صاحبؒ کی تحریک کا تاریخی احاطہ کیا، ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔[۱]

حضرت احمد شہیدؒ کے خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر (۱۱۹۰ - ۱۲۸۸ھ) بڑے خوش تقریر اور صاحب کمالات بزرگ تھے، علوم دینیہ کے ساتھ اردو، ہندی اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے، اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ تحریم الحرام، قاطع البدعۃ، خیر المسالک اور وحدۃ الوجود کے نام سے چند رسالے بھی سپرد قلم فرمائے۔[۲] یوپی کے مشرقی اضلاع میں آپ کے سیکڑوں مرید تھے اور آپ کے پُراثر مواعظ سے لوگ بدعت سے متنفر اور سنتِ نبوی کے دلدادہ ہو جاتے تھے آپ کے مزید حالات اور نمونۂ کلام ناظرین آگے ملاحظہ کریں گے،

اس خاندان کے آخری ممتاز بزرگوں میں خواجہ احمد حسنی نصیر آبادیؒ (۱۲۳۱ - ۱۲۸۹ھ) کا نام آتا ہے، جو مولانا سخاوت علی جونپوری کے تلمیذ رشید تھے، مولانا فخر الدین خیالی کے بقول انھوں نے مجدد دین دیں جیسے کارنامے انجام دیے اور ان کے ہاتھوں پر ہزاروں لوگوں نے بدعات و سیئات سے توبہ کی۔[۳]

مولانا خیالی نے اُن کا تفصیلی تذکرہ 'مہر جہاں تاب' میں حالِ قال و سالِ ہجری کے ابواب کے تحت صفحہ ۷۰۰ سے صفحہ ۷۲۹ تک کیا ہے۔[۴]

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ۷/۴۵۳ [۲] نزہۃ الخواطر، ۷/۴۴۴ - ۴۴۶ [۳] اعلام الہدیٰ ص ۱۱، (شعبۂ مخطوطات ندوۃ العلماء) [۴] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی کتاب کاروان ایمان و [illegible] لکھنؤ میں [illegible] تھی،

اس دور کے بزرگوں میں مولانا سید عبدالسلام ہنسوئیؒ (۱۲۳۲ھ - ۱۲۹۹ھ) بہت قوی النسبت اور صاحبِ تاثیر عالم و صوفی تھے۔ دہلی میں شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حدیث کا درس لیا اور ان کے برادر بزرگ حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ سے منازلِ سلوک طے کیے اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔[1]

ان ہی بزرگوں میں سید شاہ ضیاء النبیؒ (۱۲۴۲ھ - ۱۳۲۲ھ) بہت بابرکت بزرگ گزرے ہیں، خواجہ احمد حسنیؒ کے خلیفہ تھے، ان کے بارے میں مولانا فخر الدین صاحب سیرۃ السادات میں لکھتے ہیں، آج کل حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اسلاف کرام کی پیروی میں پورے خاندان میں ان کی نظیر نہیں۔[2]

مولانا عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں، کہ وہ دنیا کی برکت، خلقت انسانی کے مقصد کامل (وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون) کی سچی تصویر و عملی تفسیر اور معرفت کے لب لباب تھے، ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔[3]

بزرگوں کے اسی خاندان سے مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی بھی تعلق رکھتے ہیں، جن کا تذکرہ بیان کیا جا رہا ہے۔

مولانا سید عبدالعلی صاحب

حکیم صاحب کے والد ماجد مولانا سید عبدالعلی صاحب بھی خاندانی روایات کے حامل بزرگ تھے، اور روحانیت سے آپ کو حصہ وافر ملا تھا، آپ کے نامور پرپوتے مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب فرماتے ہیں " مولانا میر عبدالعلی ایک درویش سیرت فاضل بزرگ تھے اور باوجود تحصیل علم ہونے کے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ مولانا سید احمد شہیدؒ کے مجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب سرکاری ڈاک آپ کے ہاتھ میں دی جاتی تھی تو

---

[1] حیات عبدالحئی از مولانا ابوالحسن صاحب ندوی ص ۳۹، [2] ص ۴۰ [3] ایضاً ص ۴۳ ایضاً ص ۴۱

روزِ قیامت میں حساب وکتاب کا پرچہ یاد کرکے رو پڑتے تھے۔[1]

ان کے فرزند مولانا فخر الدین صاحب لکھتے ہیں، اپنے دور کے بہت بڑے زاہد ومتقی انسان تھے، تعلقات دنیاوی اور سلسلۂ ملازمت کے باوجود باہمہ و بے ہمہ، دل بیار دست بکار کا نمونہ تھے ...... بکمال فیاضی وسخاوت تمام مشاہرہ مستحقین ومسافرین پر صرف کر دیتے اپنے لیے ایک یا دو سادہ جوڑے سے زیادہ کچھ پسند نہ فرماتے .... طبیعت میں سادگی اور انکسار کی اس درجہ تھا کہ کبھی فرش نفیس اور بستر نرم کے پابند نہ ہوئے کبھی تخت پر کبھی کرسی پر اور کبھی زمین پر پیر پھیلا لیتے اور تھوڑی دیر سو لیتے۔ شعر گوئی سے بھی ذوق تھا، اور عربی وریختہ میں اشعار کہتے تھے عربی میں علیؔ اور ریختہ میں ہجرؔ تخلص کرتے تھے، حاصل یہ کہ یہ تمام آگہی اتباع احکام شرعی اور فقر و زہد میں زندگی گزار دی اور دمِ واپسیں تک اسی حالت پر قائم رہے، وفات سے پہلے آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ "ھو السابق الاعلیٰ" تھا جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ارتحال کے وقت جاری تھا، انتقال مرض فالج میں ہوا۔ سنہ ۱۲۶۹ھ سنہ ۱۸۵۳ء میں ناگور (مدھیہ پردیش) میں انتقال فرمایا، اور ظہر کے قریب مسجد عبد الرحمان میں (جو قلعہ کے نیچے واقع ہے اور اس کفرستان میں پہلی مسجد ہے جو خود ان کی سعی سے تعمیر ہوئی) مدفون ہوئے۔[2]

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؔ | علم وادب کی دنیا میں یہ اندھیر اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اس میں حفظ مراتب اور حق شناسی وحق گوئی کے بجائے تعصب وطرفداری اور تجاہل وحق تلفی کے ذریعہ علم وفضل کی حامل شخصیتوں کے ساتھ بے انصافی اور ستم ظریفی کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے، اور جب تک کوئی ادیب واہل قلم پیشہ ور اور شہرت طلب ادیبوں کے طور طریقے نہ اپنائے وہ ناقدین ومورخین ادب کی توجہ سے محروم ہی رہتا ہے، اگر اردو ادب ہی کو سامنے رکھیے تو

---

[1] مقدمہ یادِ ایام ص ۵ [2] حیات عبد الحئی ص ۱۰۹ بحوالہ مہر جہانتاب و اعلام الہدی ۹/۱۰۸۔

اس عالم رویّے کا پتہ چل سکتا ہے کہ اردو کی تاریخ میں جن مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے ان کے کتنے معاصرین اپنی حقیقی قدر و قیمت اور جائز مقام سے کس طرح محروم کیے گئے ہیں!

ان ہی مظلومین میں مولانا فخرالدین خیالی کی ذات گرامی بھی ہے، جو عربی کے عالم، فارسی کے انشا پرداز اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور انھوں نے مشاہیر اسلام کے ساتھ عربی، اردو اور فارسی کے باکمالوں کا جامع تذکرہ "مہر جہاں تاب" لکھا اور اردو کا ضخیم دیوان یادگار چھوڑا۔ ان کے معاصرین میں غالباً صرف لالہ سری رام کو توفیق ہوئی کہ انھوں نے اپنے مشہور تذکرہ "خمخانۂ جاوید" میں مولانا مرحوم کے حالات اور اشعار کا نمونہ درج کیا، اس میں کچھ دخل ان کی عزلت پسندی اور طبیعت کی بے نیازی کو بھی تھا، جس کے بارے میں ان کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں۔

"طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا اور باایں ہمہ کمالات علمی و عملی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے"[1]

انکی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ (رائے بریلی) میں ذیقعدہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں ہوئی، ان کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں قاضی محمد معظم بن قاضی احمد نصیرآبادی سے ملتا ہے، جو شاہ علم اللہؒ کے اجداد میں تھے، ابتدائی تعلیم مولوی علی بخش جائسی، مولانا محمد ظہور نصیر آبادی، مولانا سید محمد ظاہر اور حکیم احمد جان دہلوی سے حاصل کی، ۱۲۸۳ھ میں لکھنؤ آکر مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں شریک ہوئے اور شرح وقایہ، مشکوٰۃ شریف اور جلالین پڑھی، اپنے مطالعہ کی سرگذشت انھوں نے اس طرح سنائی ہے، احیاء و کیمیائے سعادت، جواہر القرآن علامت، ضمنات ابن حجر، قول جمیل اور شاہ ولی اللہؒ کے دیگر رسائل تصوف، کنز و ہدایۂ و حیا

[1] تکملہ مہر، ص ۳۰۵

اور رد محتار، فتاوی قاضی خاں اور سراجیہ بالاستیعاب اور مسند اول تفسیر و حدیث کے بیشتر حصے، ادب میں مقامات، نفحۃ الیمن، انشا میں عجب العجاب، قصص میں الف لیلہ، شعر میں سبعہ معلقہ مع شرح کمل، ادب و تاریخ میں واقدی، حیاۃ الحیوان، کشف الظنون، تہذیب امہذیب اور علوم متعارفہ کی کتابیں تدبر و اتقان کے ساتھ مطالعہ کیں اور واہب مطلق کی عنایت سے عربی کی غامض عبارتوں پر عبور حاصل کر لیا، اور مذاق سخن کے تحت شاعری کی مشق بھی کی۔"[1]

طب حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے پڑھی، اردو شاعری میں شیخ امیر اللہ تسلیم (م ۱۳۲۹ھ) سے استفادہ کیا، ضلع بیدر میں سید محمود اصفہانی حریت سے فارسی زبان و محاورہ کی تصحیح اور مشورۂ سخن کیا، راجپوتانہ اور ساگر میں بہتم بند و بست کے اجلاس میں نائب سرشتہ داری کے عہدے پر سال ڈیڑھ سال رہے، پھر کچھ دنوں وطن رہ کر حیدرآباد کے مختلف اضلاع کے سرکاری اسکولوں میں تقریباً آٹھ سال رہے جس کی تفصیلات انھوں نے اپنے حالات میں بیان کی ہیں، کچھ عرصے بھوپال میں عدالت فوجداری میں افسر نویسی کے عہدے پر رہے، پھر وطن واپس آکر ٹونک تشریف لے گئے، جہاں نواب ابراہیم علی خان نے صیغۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کر دی تھی، ڈیڑھ سال رہنے کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری کر دی۔[2]

احسان و سلوک کے منازل خواجہ احمد حسنیؒ سے طے کیے تھے، اور مولانا سید محمد ظاہرؒ سے خلافت پائی تھی، مگر کسر نفسی کے سبب پیری مریدی نہیں اپنائی، مولانا حکیم عبد الحیؒ صاحب نے آپ کے رنگ طبیعت، سادگی فطرت اور حسن سیرت کا بڑا دلنشیں نقشہ پیش کیا ہے وہ فرماتے ہیں،

---

[1] نیر جہاں تاب ص ۹۹، [2] گل رعنا ص ۵۲۵

"مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، ہمارا انکے جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن ایک ہی طرح سے ملتے، اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر و قناعت کی صفت انکی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور انکو چھو نہیں گیا تھا، ایک چمار یا کولی رات کے وقت آتا تو گھر سے باہر نکل کر اس کا حال پوچھتے اگر وہ کسی مریض کو دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت اسکے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اسکو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے، ایک زمانہ میں طاعون شدت سے پھیلا ہوا تھا، گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے تھے، مرد و عورت لڑکے بوڑھے سب جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، ان جھونپڑیوں میں خود جاکر بیمار پرسی کرتے اور دوا بتاتے تھے الخ"[1]

مولانا عبدالحیٔ صاحب نے نزہۃ الخواطر میں بھی آپ کا جامع تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آپ ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے قابل تعریف تھے، پاک طینت، قناعت پسند، بے تکلف، گوشہ نشین، اصلاح نفس کے بے فکر مند، حوادث زمانہ کی کثرت کے باوجود صابر و شاکر، دینی امور کا خیال رکھنے والے اور عبادات کے پابند تھے، بات چیت اور پہننے اوڑھنے میں تکلف پسند نہیں کرتے تھے، کسی لباس اور کسی ہیئت میں لوگوں سے ملنے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے، آپ کا سینہ آئینہ تھا، جو گرد کدورت سے صاف تھا، آپ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے، وفات سے قریب پانچ سال پیشتر امور دنیا سے ہاتھ جھاڑ چکے تھے، اور عبادت جمعہ و جماعت قرآن کی تلاوت اور کتابوں کے مطالعہ اور تدریس میں مشغول رہتے تھے"[2]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شاہد عینی | حضرت خیالی نے اپنے تذکرہ مہر جہانتاب میں سنہ وار

[1] گل رعنا ص ۵۲۶ [2] نزہۃ الخواطر ۸/۳۵۲-۳۵۸

اپنے حالات واسفار کے تاثرات بھی لکھے ہیں، جن کا کچھ انتخاب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا اہم واقعہ جس کے وہ عینی شاہد ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے، جس کا ذکر انھوں نے تذکرہ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"ہم لوگ مولانا محمد ظاہر صاحب کے ساتھ ان کے حلقۂ مریدان میں بنارس، غازی پور، اعظم گڈھ اور جونپور کے سفر میں تھے، ایک شام جگدیش پور کے زمیندار (غالباً اس سے مراد راجہ کنور سنگھ ہیں، جو اپنے جذبۂ بغاوت کے لیے بہت مشہور ہوئے) کے پاس بیٹھے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کی خبر پہنچی، راجہ نے کہا کہ اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے اور مسافر خانہ نامی گاؤں میں ٹھہرے، اسی دوران ایک اونٹنی سوار یہ شاہی فرمان لیکر آیا کہ ملک انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور ہم کلکتہ جارہے ہیں اس خبر سے سپاہیوں میں تنخواہ کے لیے شور وشغب ہوا، مرزا آغائی چکلہ دار فوج کے سربراہ تھے، اس لیے ان کے خلاف ہنگامہ ہونے لگا، انگریز جنرل بارلو نے اسے ہاتھی پر بیٹھا کر باہر لیجانا چاہا تنخواہ داروں نے پیچھا کیا تو مسٹر بارلو نے توپ سر کر کے انھیں منتشر کر دیا۔

ہم لوگ جونپور آکر مولوی امام بخش صاحب کے یہاں ہوئے جنکے اساتذہ میں مولانا عبدالحلیم لکھنوی تھے، اور ان کے درس میں فارغ التحصیل علما رہتے تھے، ان کے تلامذہ میں مولانا سخاوت علی اور مولانا کرامت علی بھی تھے، وہاں سے اعظم گڈھ گئے، جہاں لوگ قصیدہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کے بموجب نئے انقلاب کی پیش گوئی کر رہے تھے،

از پیشترک ہر شدنی را بسخنہا   دلگو یا کہ شوند ونقارہ نوازند

مبارکپور میں مولانا سید محمد ظاہرؒ وعظ فرمانے سے پہلے مجھ سے تلاوت قرآن کراتے اور پھر

تشریح فرماتے تھے، بیشمار لوگوں نے ان سے بیعت کی اور گناہوں سے توبہ کی اسی دورے۲ مولانا کرامت علیؒ، مولوی فیض اللہ مئویؒ، شاہ محمد فصیحؒ، مولوی غلام رسولؒ ایڈیٹر زبیل رسترا) مولوی طاہر و مولوی محمد یحییٰ فرزند مولوی سخاوت علیؒ سے ملاقات ہوئی، پھر غازی پور گئے اور مولوی غیاث الدین تحصیلدار کے یہاں دس دن ٹھہرے جو سید صاحبؒ کے عقیدت مند تھے، پھر بھتری صید پور میں شیخ فرزند علی مرحوم کے فرزندوں کے ہاں تین۳ ماہ ٹھہر کر بنارس گئے۔

۱۲۷۳/۱۸۵۷ء میں میری عمر اٹھارہ سال تھی جب میرٹھ سے یہ شورش شروع ہوئی، میں نصیر آباد میں تھا، جہاں قیدیوں نے خود کو آزاد کرا لیا، ہم لوگ گھر میں بیٹھے رہے، اس ہنگامہ میں دوست دشمن کی تمیز نہیں رہی اور زمیندار آپس میں لڑنے بارہ۱۲ سال کے بچے اور نوے۹۰ سال بوڑھے بھی میدان میں تھے، ان دنوں ناگود (مدھیہ پردیش) کے تھانہ داروں نے کلکٹر کو لکھا تھا کہ خفیہ کلچوں کی پہلی روانگی کا راز نہیں معلوم ہو رہا ہے، تفتیش کے باوجود وہ کلکٹر کو بھی نہیں معلوم ہو سکا، یہ خفیہ کلچے گویا سازشی خط تھے، جن کے روانہ ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی یہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا، لکھنؤ میں برجیس قدر خلف معشوق محل تخت پر بٹھائے گئے اور ان کی ماں نے جنہوں نے اودھ کا نام روشن کیا، ہتھیار سنبھالے، شرف الدولہ کشمیری وزیر بنائے گئے، اور ممو خان مقرب ہوئے، جی لال و جوالا سنگھ فوج کے افسران مقرر ہوئے، توپوں کی گھن گرج سے کان بہرے ہو گئے تھے، اور آرام بے آرامی میں بدل گیا تھا (صدائے توپ گوشہا کر ساخت، آرامش بے آرامی ساخت) بیلی گارد و عالم باغ گولوں کی بارش سے میدان ہو گئے اور لوگوں کے سینہ و پہلو زخمی، عزتیں برباد، اور گھر غیر آباد ہو گئے۔ بیلی گارد و عالم باغ اور گزشتہ

گلو لہا داغ شد و سینہ ہر پہلو بر نہاد داغ، ناموسہا برباد رفت و خانہ دیرانی آباد (ص ۳")

نو ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، میجر گال چند سواروں کے ساتھ فیض آباد یا لکھنؤ سے کشتی کے ذریعہ الہ آباد چھاؤنی جا رہا تھا کہ کار وانسرائے رائے بریلی میں ایک ہجوم نے بندوقوں سے حملہ کر دیا، اس نے طمنچہ سے فیر کئے پھر خودکشی کر لی، شمس الدین خاں نامی شخص نے لاش کو تلوار سے زخمی کیا اور حرمت خاں نے یہ کہہ کر اس کا خون چکھا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ بغیر انگریز کا خون پیئے میں انگوٹھی نہیں پہنوں گا۔

بڑے نانا ریاں اور چھوٹے مولوی سعید الدین مظفر پور میں ہنگامہ سے الگ تھے مگر تاہم بھی انگریز دشمنی کے الزام سے بچنے کے لئے چوہیاں نامی دیہات چلے گئے جو رائے بریلی سے چار کوس تھا میں ماموں شاہ ضیاء النبی، محمد حسین خاں اور عورتوں بچوں کے ساتھ وہاں چار روز مقیم رہا، پھر ہم سب افواہوں کے سبب نصیر آباد میں ایک ماہ تک رہے اس کے بعد رائے بریلی میں انگریزی فوج آگئی اور شمس الدین خاں کو قتل اور میر بادی نامی رئیس کو ڈکیتی کے الزام میں پھانسی دی گئی، حرمت خاں نے ابراہیم شرقی کے بنائے ہوئے ایک قلعہ میں پناہ لی تو اسے انگریزوں نے مسمار کر دیا، بھاگے ہوئے لوگوں کو شہر واپس ہونے کا حکم ہوا اور ہم لوگ بھی گھر آگئے۔ (ص ۳۰۰-۳۷۷)

ذاتی سرگذشت اور جنوبی ہند کے سفر

۱۲۸۲ھ میں آگرہ کے سفر میں مولانا نواب قطب الدین خاں تلمیذ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ سے ملاقات ہوئی، وہاں نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خیموں سے بنائی ہوئی مسجد میں (جس میں ۳، ۴ سو آدمی آتے تھے) مولانا کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی اور انھوں نے میرے التماس پر سورۂ مزمل اور بار درود کی اجازت عطا فرمائی (صفحہ ۳۸۴)

لکھنؤ میں ایام تحصیل علم کے بارے میں لکھتے ہیں "مسجد دبیر الدولہ (نزد گول دروازہ) میں مقیم رہ کر مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے درس میں شریک ہوتے، وہیں طب کی بھی تحصیل کی اور ہفتے میں ایک بار شیخ امیر اللہ تسلیم کے پاس جا کر اصلاح سخن لیتے اور بھنڈرہ دروازے میں ان کے ساتھ نواب مرزا محمد تقی کے مشاعرے میں نصف شب تک شریک رہتے، جس میں اساتذۂ وقت میں منشی فدا علی عیش   تمہر کے فرزند میر کلو عرش، میر خطا شاگرد ناسخ، میر اثر فضلی شاگرد نسیم، میاں عصمت ریختی گو، مرزا مچھو بیگ عاشق اور دوسرے شعراء آتے تھے۔" (صفحہ ۸۶)

وہ سنہ ۱۲۹۰ھ میں حیدر آباد پہنچے جہاں آٹھ سال تک رہے۔ اس عرصے میں جن شہروں میں انھیں رہنے کا اتفاق ہوا انکی تاریخ اور عمارتوں کا تعارف کرایا ہے، سلطنت آصفیہ کے انتظامیہ اور امراء کے تعارف کے ساتھ حیدر آباد کی تمدنی اور ثقافتی زندگی پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے (ص ۹۹، ۱۳۰-۱۳۰) وہاں سے وطن آکر ایک عزیز کے ساتھ بھوپال گئے، اور نواب صدیق حسن خان کے صاحبزادوں کی تقریب نکاح میں شرکت کی اور وہاں چند سال مقیم رہے، حیدر آباد کی طرح وہ اس اسلامی ریاست کی بھی بہت تعریف کرتے اور وہاں کے نظم و نسق اور علماء کا تعارف کراتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان کی سادہ زندگی، . . . . . ، رعایا پروری اور دینی خدمات کی دل کھول کر تعریف کرنے کے بعد ان کے مدار المہام مولوی جمال الدین خان (م ۱۲۹۹ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ عام مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے اور پیرانہ سالی کے باوجود جمعہ و جماعت کی پابندی کرتے، ہر جمعہ کو وعظ کہتے اور ترجمۂ قرآن کا درس دیتے انھیں کی توجہ سے بھوپال میں حفاظ بھی ترجمۂ قرآن سے واقف تھے، تمام مساجد میں امام و موذن مقرر تھے اور وہاں جاڑوں میں گرم پانی مہیا رہتا تھا، اور وہ اپنے یہاں سے چار سو طلبہ کو وظیفہ دیتے

غرض یہ دونوں اقتطاب میں سے تھے "آگے چل کر لکھتے ہیں"۔

الموجز ایں شہر بقدر دانی و فیض رسانی	قصہ مختصر ایں شہر والیۂ ملک کی
والیۂ ملک دام اقبالہا و برکت قدر	قدر دانی اور نواب والاجاہ کی ہنر
افروزی و ہنر پروری نواب والا جاہ	پروری کے سبب علماء و حفاظ، حکماء
مجمع علماء و حفاظ و حکماء و دبیران و	ادباء اور حکام و شعراء کا مرکز بن
ناظمان ملک و ہم اہل سخن بود و گردیدم	گیا تھا، میں نے جب بھی دیکھا اس کے
حدیث نبوی در بغل و خبر ش بر زبان	بغل میں حدیث اور زبان پر ارشاد
میگشت و قانون ریاست ہم بیشتر بر	نبوت تھا، قانون ریاست بھی زیادہ
فتوی شرعی زبود لہ	تر شریعت پر مبنی تھا، (باقی)

لہ مرجان تاب ۱۴۸

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

اسلامی علوم و فنون پر ہندوستان کے علماء اور مصنفین نے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور اہل علم ان سے متمتع بھی ہو رہے ہیں، لیکن اب تک ان کی کوئی جامع فہرست مرتب نہیں ہو سکی تھی، اس کمی کی طرف مولانا حکیم سید عبد الحئی صاحب نزہۃ الخواطر نے توجہ کی، اور الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک فہرست مرتب کر دی، جس کا ترجمہ اسلامی علوم و فنون ہندوستان کے نام سے مولانا ابو العرفان ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء نے کیا ہے، اور دار المصنفین نے نہایت اہتمام سے لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا ہے، اس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کی فہرست کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل علمی و تحقیقی و ذہنی و فکری تاریخ بھی قلمبند ہو گئی ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

قیمت -/۱۰ منیجر

سال رواں کے تین بین الاقوامی سمینارون
کے
سفر کی سرگذشت

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

ادھر گذشتہ چار مہینون مین تین اہم بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، پہلا سمینار تو جنوری کے آخری ہفتہ میں دہلی میں ہوا، اس کا عنوان یہ تھا کہ گذشتہ چودہ سو سال ہجری میں اسلام اور مسلمانون نے دنیا کو کیا دیا، اس کا افتتاح وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کیا جن کا خطبہ عام طور سے بہت پسند کیا گیا، انھوں نے جب یہ کہا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے تو یہ آواز سرکاری طور پر پہلی دفعہ سنی گئی، ورنہ اب تک ہندو مورخین اور خصوصاً ارباب سیاست تو اسی پر زور دیتے رہے کہ یہ ہندو مت، بودھ مت اور جین مت کی طرح اس ملک کا مذہب نہیں، وزیر اعظم کے اس اعلان کے بعد امید ہے کہ اسلام سے متعلق بیان کے غیر مسلمون کے سوچنے کا ڈھنگ بدل جائے گا، ہماری وزیر اعظم نے بڑی فراخدلی سے اس کا بھی اعتراف کیا کہ ہم ان کارنامون کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو مسلمانون نے یہاں آکر تمدن، تہذیب، کلچر، آرٹ اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں انجام دیے، اگر اس فراخدلی اور رواداری کا اظہار ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اس کے بعد ہوتا تو اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی، امید ہے کہ ہماری وزیر اعظم نے اپنے خطبہ میں ہندوستانی ذہن کو جس طرح جھنجھوڑا ہے، اس کے اچھے اثرات ہی مرتب ہونگے، افسوس اس کا ہے کہ یہ خطبہ

چھپوا کر تقسیم نہیں کیا گیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کر کے عام کئے جائیں،

وزیر اعظم نے اس موقع پر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، نائب وزیر تعمیرات و مکانات حکومت ہند دہلی کے مجموعۂ کلام عقیدت کے پھول کی رسم اجرا بھی کی۔ جناب عارف صاحب نے از راہ نوازش بڑے احترام کے ساتھ ایک نسخہ اس خاکسار کو بھی پیش کیا، اس میں زیادہ تر ان کا نعتیہ کلام ہے، جمہوریۂ ہند کے نائب صدر جناب ہدایت اللہ صاحب نے اس کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے کہ عارف صاحب کے مجموعۂ کلام میں تخیل کی پاکیزگی، درد و اثر اور سوز و تپش پوری طرح موجود ہے، تصوف، اخلاق کے جذبات کا اظہار ضبط و توازن اور احتیاط کے تقاضوں کے ساتھ ہے انہوں نے اپنی نعت گوئی، قومی اور اخلاقی مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تبصرہ نگار اس پر جو کچھ لکھ سکتے تھے، نائب صدر صاحب ہی نے لکھکر سب کے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔ خود عارف صاحب نے اس کتاب کے شروع میں شاعری میں صنف نعت کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ صرف ان کی نعت گوئی کا انداز ظاہر ہوتا ہے، بلکہ ان کے اہل دل ہونے کی بھی غمازی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ عشق محمدیؐ کا دعوی تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، البتہ بصد ادب عرض کرونگا کہ نعت کہتے وقت آقائے نامدار کا تصور آتا ہے تو اکثر دل میں طوفان گریہ اٹھکر آنکھیں اشک برسانے لگتی ہیں۔ پھر اس کے بعد ان کی نعتوں میں تاثیر و نفوذ کی کیفیت کیوں نہ پیدا ہو، ان کی نعت کا ایک شعر یہ بھی ہے،

بڑی مشکل میں ہے امت کرم فرمائیے اس پر   خدارا یا رسول اللہ خدارا یا رسول اللہ

ایسی آواز ہندوستان کی حکومت کی مسند وزارت پر بیٹھنے والے کے منہ سے شاید پہلی دفعہ سنی گئی، اور یہ وہی کہہ سکتا ہے جو واقعی صاحب ایمان و ایقان ہو۔

اس سیمینار کی دوسری نشست کی صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کی۔ اس سے پہلے ان کے خاص خطبے ہو گئے تھے، ان کی شیریں بیانی اور جدت کی ایسی تقریریں ہوئیں کہ تمام سامعین متاثر ہوئے۔

اس کی فضا شروع سے آخر تک بڑی خوشگوار رہی، تقریباً ۲۵ مقالات اس کے لئے لکھے گئے، کسی مقالہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی، پروفیسر ڈاکٹر پی۔ ان پوری نے بہت ہی موثر انداز میں کہا کہ پولیٹیکل اسلام کچھ اور ہے، اور ریلیجیس اسلام کچھ اور ہے، ریلیجیس اسلام کے ذریعہ ہی سے اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے، جس میں رواداری، فراخدلی، ہمدردی اور انسان دوستی کے سارے پہلو دکھائی دیں گے، ارک شنترا یونیورسٹی کے ڈاکٹر اس۔ بی۔ پی نگم نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کا ایک فتویٰ پڑھ کر سنایا جس میں ہندوؤں کے ساتھ پوری رواداری کی ترغیب تھی، بڑودہ یونیورسٹی کے پروفیسر آر۔ ان مہتا نے اُن تمام شہروں اور عمارتوں کی تفصیل بتائی، جو مسلمانوں نے وہاں آباد اور تعمیر کیں، پونا کے پروفیسر اے۔ آر۔ کلکارنی نے مرہٹوں کے نظام سلطنت پر اسلام کا جو اثر پڑا، اس کی وضاحت کی، پھر سپریم کورٹ کے جج کرشن آئیر نے سارے سامعین کو یہ کہہ کر چونکا دیا۔

"میں نے اسلامی قوانین کا گہرا مطالعہ کیا ہے، پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلامی قوانین اور صرف اسلامی قوانین ہی دنیا کے لئے بین الاقوامی قوانین بن سکتے ہیں۔"

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں ان کو دنیا کا فاضل ترین جج قرار دیا گیا تھا، ان کی یہ رائے نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ پوری دنیا میں قابل غور و فکر ہے۔

اس سیمینار کے آخری اجلاس کو جناب ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے خطاب کیا

مخاطب کیا ان کا یہ تحریری خطبہ بھی چھپ کر تقسیم ہونے کے لائق تھا، اس کو سنتے وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی مسلمان بول رہا ہے، سیکولرزم کی لیپ پوت نہیں کر رہا ہے، ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کر کے اپنی میٹھی تحریر اور میٹھی آواز میں وہ ساری باتیں کہہ دیں جو ان کو کہنا چاہیے تھیں۔

خاکسار کا مقالہ انگریزی میں ہندوستان میں صوفی ازم اس کے مختلف سلسلے اور اس کے کارنامے کے عنوان سے تھا، یہ جناب بدر الدین طیب جی کی صدارت میں پڑھا گیا، جن کی کرسی ایک آئی۔ سی۔ ایس کی کرسی بنی ہوئی تھی، وہ مقالہ نگاروں کی سرزنش کرنے میں بالکل تامل نہ کرتے، ایک صاحب کے مقالہ کو تو بالکل irrelevant قرار دیا، میں نے جب اپنا مقالہ ختم کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ It is an excellent Paper مجھ کو بھی چونکا دیا، میں نے اس کو اپنے موضوع کی برکت تصور کیا،

اس سیمینار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہندوستانی مقالہ نگار لودی ہوٹل میں بڑے آرام سے ٹھہرائے گئے، ان کی ہر طرح کی خاطر تواضع کی گئی، ان کے لئے کئی جگہوں پر شاندار دعوتوں کا بھی انتظام تھا، خود نائب صدر نے حیدرآباد ہاؤس میں ان کو ایک پر تکلف ڈنر دیا، اس سے پہلے کے بین الاقوامی سیمیناروں کے ہندوستانی نمایندوں کو ڈیڑھ سو روپیے دیدئے جاتے تھے کہ وہ جہاں چاہیں اپنے قیام و طعام کا انتظام کریں، کبھی ایسا ہوا کہ یہ مجبور اور لاچار مقالہ نگاروں نے خوانچہ والوں کے ذریعہ سے اپنی شکم پری کی، مگر اس سیمینار میں قیام و طعام کی نوعیت بدلی ہوئی تھی، البتہ اس میں یہ تفریق ضرور کی گئی کہ بیرونی مہمانوں کے لئے جن پتھ ہوٹل میں انتظام کیا گیا، شاید ان کو ہندوستانی نمایندوں سے زیادہ برتر سمجھا گیا، مگر پاکستان کے علاوہ کوئی اور بیرونی مہمان اس سیمینار کے لئے نہیں آیا، پاکستان کی عطیہ خلیل صاحبہ (کراچی یونیورسٹی) اپنی تقریروں کی وجہ

جات میں۔

اجلاس کے بعد مہمانوں کو دہلی اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں کی سیر کرائی گئی۔ اس سیمینار کو ہر طرح کامیاب بنانے میں جناب نصر اللہ بیگ صاحب ایڈیشنل سکریٹری وزارت تعلیم اور جناب پی۔ آر۔ گرد ور ڈائرکٹر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے انتھک کوشش کی۔ دونوں حضرات اپنے متعدد رفقاء کے ساتھ مہمانوں کی خاطر تواضع میں پیش پیش رہے۔ اگر اس سیمینار کے تمام خطبات اور مقالات چھاپ کر شائع کیے گئے تو امید ہے کہ یہ اس ملک کی جذباتی ہم آہنگی میں بہت ہی مفید ثابت ہوں گے۔

اس سیمینار میں میرے لیے ایک پر کیف یاد جناب ضیاء الدین احمد ڈیسائی کی رفاقت تھی۔ ہم دونوں اودی ہوٹل کے ایک کمرے ہی میں ٹھہرے۔ ان سے پہلے بھی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، مگر تین روز کی رفاقت میں انھوں نے اپنی شرافت طبع، عمدہ اخلاق، عزیزانہ خدمت گذاری، ملنساریت اور علمی ذوق کا جو ثبوت دیا اس کی یادوں کی شمع برابر فروزاں رہے گی۔ وہ اس وقت مرکزی حکومت کی طرف سے ناگپور میں ڈائرکٹر آف ایپی گرافی ہیں، اور وہاں سے ایپی گرافیا انڈیکا کے نام سے انگریزی میں ایک بہت ہی معیاری جرنل نکالتے ہیں، جس میں پرانی عمارتوں کے عربی اور فارسی کتبات پر سیر حاصل مضامین ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ دنیا کے بہترین رسالوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ اس میں زیادہ تر انہی کے مضامین ہوتے ہیں، جن سے ان کی شہرت باہر کے ملکوں میں پھیل چکی ہے۔ وہ گجرات کے رہنے والے ہیں۔

دوسرا بین الاقوامی سیمینار اسلام آباد میں نیشنل ہجری سیلے بریشن کے نام سے ہوا۔ اس کا موضوع تقریباً وہی تھا جو دہلی کے سیمینار کا تھا۔ یہ ۱۸ر ۲۰ مارچ کو ہوا۔

ہندوستان سے جو وفد اس کے لیے ہوائی جہاز سے نئی دہلی سے روانہ ہوا اس میں ہم سفر مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر برہان، جناب سید اوصاف علی [illegible] آف اسلامک اسٹڈیز

نئی دہلی، پروفیسر مسعود الحسن، گجرات یونیورسٹی تھے، جناب نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی تھے، جناب سید صباح الدین اور جناب ناصر فاروقی صاحبان نے سفر میں جو سہولتیں پہونچائیں اس کے لئے انکا ممنون ہوں، پشاور کے ایک اور سمینار کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اور ڈاکٹر صدیقی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ نئی دہلی بھی شریک ہوئے، جو لوگ اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے، اس کا ہر کمرہ ٹی۔ وی ریفریجریٹر ریڈیو اور دوسرے جدید سامانوں سے آراستہ و پیراستہ تھا، نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے ایک بڑا ہال بھی تھا۔

یہاں پرانے ملنے والے بڑی گرم جوشی سے ملے، پاکستان کے مشہور وکیل جناب اے۔ کے بروہی صدر ضیاء الحق کے کابینہ کے ممتاز ترین وزیر اور ان کے دست راست ہیں، ان ہی کی نگرانی میں یہ سمینار انجام پا رہا تھا، وہ انگریزی زبان اس طرح بولتے ہیں جیسے یہ اُن کی مادری زبان ہے، اس زبان میں شاید دنیا کے بہترین مقرروں میں ہیں، اسلامی علوم و فنون پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں، اسکے کسی پہلو پر بولتے ہیں تو اپنی شانِ خطابت سے خاص رنگ پیدا کر دیتے ہیں، انھوں نے دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں ۱۹۷۸ء میں بڑی مدد فرمائی تھی، ہوٹل میں ان کی نظر مجھ پر پڑی تو اپنی دل آویز مسکراہٹوں کے ساتھ میری طرف بڑھے، پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ان سے دہلی کے بین الاقوامی سمینار میں مسز اندرا گاندھی کے افتتاحی خطبہ اور اسلامی قوانین سے متعلق مسٹر کرشنا آئر کی رائے کا ذکر کیا، تو سن کر خوش ہوئے۔

یہیں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے ملاقاتیں رہیں، اس وقت اسلام آباد کی اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں دار المصنفین کے کام سلسلہ میں غیر معمولی مدد پہونچائی تھی، شرافت اخلاق و مروت کے پیکر ہیں، اپنے اوصاف کی عطر بیزیوں سے معطر ہو کر ملے، باتیں کرتے وقت گلاب کی پنکھڑیاں فضا میں بکھرتے نظر آتے ہیں، خاطر داری کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

جناب [illegible] ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible]،
[illegible] کی محرک ہے محبت اور نیت کے ساتھ جب ان کی [illegible]

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد کراچی یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں اس سیمینار کے جنرل سکریٹری تھے مجھکو دیکھتے ہی والہانہ انداز میں تجدید ملاقات کے لئے میری طرف بڑھے بڑی اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں، تقریب کو کامیاب بنانے میں چھلاوہ کی طرح ہر طرف دکھائی دیتے، اچھے مقرر بھی ہیں۔

اس ہجری نیشنل کمیٹی کے سکریٹری جناب بی۔ ایس گھانگرو تھے، جو حکومت پاکستان کے محکمۂ قانون کے ایڈیشنل سکریٹری بھی ہیں، وہ بھی تمام مہمانوں کی پذیرائی کے لیے پیش پیش رہے، ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو بڑی خندہ پیشانی سے پورا کیا، بہت ہی جامہ زیب ہیں مختلف لباسوں میں نظر آتے اور بھلے معلوم ہوتے۔

اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین ملتے ہی گلے سے لپٹ گئے، وہ میرے استاد پروفیسر محمد مسلم کے داماد ہیں، اسی تعلق سے عزیزانہ لگاؤ رکھتے ہیں، اقبال اکیڈمی کی کارکردگی کی وجہ سے مقبول ہیں، ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر ہوکر جانے والے ہیں، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان کی صلاحیت کا اس طرح اعتراف کیا گیا ہے،

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے اڈیٹر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اپنی ملاقاتوں میں وہی گرمجوشی دکھائی جس کی توقع ان سے تھی، اس انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر عبدالرحمن [illegible] اپنی محبت میں کمرہ میں آکر ملے، اسی ادارہ کے ریسرچ فیلو حافظ محمود الغازی تو سایہ کی طرح ساتھ رہ کر اسی سعادت مندی کا ثبوت دیا جو ایک قریبی عزیز دے سکتا ہے، ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد غزالی اپنی ذہانت سے متاثر کئے بغیر نہیں رہے، ان ہی کے ساتھ سعودی عرب کے اخبارات کے نامہ نگار جناب حسان کلیمی اپنے [illegible] کے ساتھ آکر ملے، اور اپنی

بعض نایاب کتب کے خوش نما اشرات پیش کرکے، میرے عزیز مصباح الدین حکومت پاکستان کی انفارمیشن کے محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں، دارالمصنفین کے کام کے سلسلہ میں ان کے یہاں مہینوں قیام کیا تھا، وہ بھی کرے پہ ملنے آئے ان کی میزبانی اور تواضع کی یاد تازہ ہوگئی۔

لندن سے ایک پندرہ روزہ اخبار امپیکٹ نکلتا ہے، جو دارالمصنفین میں پابندی سے آتا ہے، اس کی انگریزی زبان بہت معیاری ہوتی ہے، اس کے سیاسی مضامین میں اسلامی حمیت و غیرت کا رنگ بھرا ہوتا ہے، اس کے اڈیٹر جناب اے۔ ہو فان صاحب ہیں، خیال تھا کہ کوئی صاحب قسم کے اڈیٹر ہوں گے، ایک روز وہ میری شیروانی اور ٹوپی دیکھ کر یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ آپ دارالمصنفین سے تو نہیں آئے، وہ اپنے چہرے سے متین، سنجیدہ اور دیندار مسلمان نظر آتے، انھوں نے بتایا کہ ان کا آبائی وطن غازی پور ہے، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اسی دیار سے انگریزی صحافت نگاری کے ذریعہ کوئی بھی ایک اچھی خدمت ہو رہی ہے، پھر بار بار ان سے ملنے کو جی چاہا، وہ معارف کے بڑے قدرداں بھی نکلے۔

ایک روز میرے کمرے میں ایک صاحب داخل ہوتے ہوئے بولے کہ میرا نام اختر امام ہے، میں لنکا سے آیا ہوں پھر تو دیر تک ان کو سینے سے چمٹائے رکھا، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ساتھی ہیں، معارف کے ناظرین ان سے واقف ہونگے، انھوں نے بہت سے خطوط جرمنی، لنکا، بغداد اور ماسکو سے لکھے جو اس میں چھپتے رہے، بہار کے رہنے والے تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تعلیم پائی، پھر جرمنی جاکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آئے تو لنکا یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہوگئے، ترقی کرکے اس شعبہ کے صدر ہوگئے، پھر پاکستان کے سفارتی عہدوں پر فائز رہے، لنکا یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر وہیں کے باشندے ہوگئے ہیں، تقریباً ۵۰ سال کے بعد ملاقات ہوئی، پھر تو ان کے ساتھ بڑے اچھے دن گذرے، پرانی ساری باتیں دہرائی گئیں، وہ بڑی دل آویز اور دل پذیر گفتگو کرتے ہیں، وہ ایک ہی سانس میں متنبی، خطیب، ابن خلکان، طبری، اثیر، شبلی، سلیمان اور دارالمصنفین

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible] کہ [illegible]

[illegible] ملک ہجرت سے [illegible] کے بعد [illegible]

میرے کمرے کے بغل میں بنگلہ دیش کے جناب [illegible] صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے باتیں ہونے لگیں تو بتایا کہ وہ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، شیخ مجیب الرحمٰن ان کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی مکتی باہنی والوں نے ان کو ایک روز بڑی بے دردی سے مار کر کہیں پھینک دیا، مگر ابھی زندگی تھی، اس لئے کسی نے ان کو اسپتال پہونچا دیا، وہ اپنے کاری زخموں کے باوجود بچ گئے، وہ کچھ لنگڑا کر چلتے دکھائی دیتے جو اسی مار کا اثر ہے، ان کے اہل و عیال تو بنگلہ دیش میں رہتے ہیں مگر وہ خود مکہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں، وہ سیمینار میں آئے، ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔

ایک روز نائجیریا کے نمائندہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوائی خاص طور سے ملے، گجرات کے رہنے والے ہیں، مگر نائجیریا کے شہری ہوگئے ہیں، وہاں کی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، عربی اسی لب ولہجہ میں بولتے ہیں، ان کو انگریزی اور اردو بولنے میں بھی بڑی مہارت ہے، بالکل مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے، معارف برابر پڑھتے رہتے ہیں، انھوں نے بھی ایک روز سیمینار کے ایک اجلاس کی صدارت کی۔

ایک روز صبح ناشتہ کی میز پر بیٹھا تھا کہ امریکہ کے ٹی۔ بی۔ ارونگ آکر بیٹھ گئے، انھوں نے کلام پاک کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ ان کے کام کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی لیکن اس سیمینار میں ان کو بھی ایک اجلاس کی صدارت دی گئی۔

ہمدرد فاؤنڈیشن کے جناب حکیم محمد سعید سے بھی نیاز حاصل ہوا، جو حسب معمول اپنے بے داغ سفید لباس میں خوش منظر نظر آرہے تھے، ان کی ہر ادا دلکش اور ہر بات دل نواز معلوم ہوتی ہے، [illegible] احسانات بہت کچھ ہیں، اس لئے ان سے [illegible] مگر وہ خود

انکسار اور تواضع سے پیش آتے، وہ بڑے علم نواز بھی ہیں، اپنی علم نوازی میں اکبری دور کے حکیم ابو الفتح گیلانی کی یاد تازہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ جناب برکات احمد صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے ایس بھی تھے، اپنی ملازمت کے زمانہ میں ہندوستان کی طرف سے سفارت کی خدمت بھی انجام دیکے ہیں، محمد اینڈ دی جیوز کے مصنف بھی ہیں، اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید مالک ہمدرد دواخانہ دہلی، کے بھی بڑے اچھے دوست ہیں، اس زمانہ میں اسلام آباد آئے ہوئے تھے،

پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم سے بھی برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے داماد ہیں، آج کل اپنی تحقیقی تحریروں کی وجہ سے اس برصغیر کی علمی فضا پر چھائے ہوئے ہیں، ان کے ملنے جلنے کے انداز میں عزیزانہ محبت اور گرم جوشی رہی۔

اس تقریب میں جناب شریف المجاہد ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی کراچی اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر چیرمین انٹرمیجیٹ ایجوکیشن بورڈ بلوچستان سے مل کر بھی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، جناب نذیر احمد صاحب پہلے پاکستان کے محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی سکریٹری تھے، دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں بڑی مدد پہونچائی تھی، پھر وہ لندن چلے گئے تھے، وہاں سے ان ہی دنوں واپس آگئے تھے، ایک ڈنر میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی بڑی محبت سے پیش آئے، اسی ڈنر میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو محمد فاضل شمسی نے بھی ہر طرح کی خاطر تواضع کی۔

معلوم ہوا کہ اس سیمینار کے انتظام و انصرام میں تقریباً ایک کروڑ روپیے خرچ ہوئے ہیں، اسی سے اس کے کروفر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، افتتاح کی رسم جناب صدر ضیاء الحق نے پاکستان کی روایتی شان سے ادا کی، ان کا خطبہ اردو میں تھا، اس میں یہ تلقین کی گئی کہ اب تک اسلامی علوم و فنون میں جو کچھ کام ہو چکا اسی پر اکتفا کرنا مناسب نہیں، بلکہ آیندہ نئے ولولے اور نئے جوش کے ساتھ

اس سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے، نمایندوں کی بہت بڑی تعداد جلسہ میں موجود تھی تقریباً تمام اسلامی ممالک کی نمایندگی تھی، کوئی غیر مسلم نمایندہ نہ تھا، حالانکہ ایسے موقع پر ان کی دعوت سے بھی کچھ نہ کچھ فائدے سے خالی نہیں ہوتا، ہندوستان کے سمینار میں زیادہ تر غیر مسلم ہی تھے، انھوں نے اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی کلچر سے متعلق جو اپنے مفید خیالات کا اظہار کیا، اس سے سمینار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی،

افتتاح کے بعد چائے نوشی کے اجتماع میں جناب صدر ضیاء الحق خصوصی توجہ کے ساتھ اس خاکسار سے بھی ملے، میں نے ان سے عرض کیا کہ ہماری وزیر اعظم نے اسی قسم کے سمینار میں جو تقریر کی وہ آپ کی نظر سے گذری کہ نہیں، انھوں نے فرمایا کہ اخبار میں جتنی چھپی وہی پڑھی، پھر عرض کیا کہ یہ پوری تقریر پڑھنے کے لائق ہے، اس سے ہندوستان کے اندر ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے، امید ہے کہ دونوں پڑوسی ملکوں کے اچھے تعلقات میں بھی اضافہ ہو جائے گا، فرمایا کہ اس کو منگوا کر پڑھونگا، مولانا ابو الحسن علی ندوی سے متعلق بھی باتیں ہوئیں، ان باتوں میں جناب اے۔ کے بروہی صاحب بھی آکر شریک ہو گئے، وہ میری تصانیف کا ذکر جناب صدر صاحب سے کرنے لگے جنھوں نے غایت تواضع میں اپنی چائے کی پیالی میری طرف بڑھا کر نوازا۔

اس موقع پر بڑا اہم منظر وہ تھا جب صدر صاحب سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی ملے، وہ صدر صاحب کے استاد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں رہ چکے تھے، صدر صاحب نے اپنے استاد کے احترام میں ان سے معانقہ کیا، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر اپنے یہاں خصوصی مہمان کی حیثیت سے قیام کرنے کے لیے مدعو کیا، جس کو مولانا نے شکریہ کے ساتھ منظور کیا۔

سمینار کے دو حصے کر دیے گئے تھے، بکثرت مقالات آئے تھے، جن کو چھاپ کر سات جلدوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے، سمینار کے منتظمین اپنی اس کارکردگی اور مستعدی کے لیے مبارکباد کے

مستحق ہیں، مگر ان میں مقالہ نگاروں کا تعارف نہیں، جس سے ایک بڑی کمی محسوس ہوئی ایک سیکشن کے ایک اجلاس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی کی جن کی صدارتی تقریر پسند کی گئی، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے لیے بھی ایک اجلاس کی صدارت کا اعلان تھا، مگر وہ تشریف نہیں لا سکے تھے۔

عرب مندوبین کے مقالات عربی میں تھے، عربی سے اردو اور انگریزی، اسی طرح اردو اور انگریزی کے عربی ترجمے کا انتظام خاطر خواہ تھا، آلۂ سماعت کے ذریعہ سے سنے جا سکتے تھے، عرب مندوبین مباحثے میں زیادہ حصے لیتے رہے، مگر جب ہندوستانی مندوبین میں سے پروفیسر لالی والا کی انگریزی تقریر بینک کے غیر سودی نظام پر ہوئی تو مجمع سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں کہ ایک غیر اسلامی ملک کا نمایندہ ایسی تقریر پیش کر رہا ہے، ان سے ٹیلی ویژن پر بھی اس قسم کی تقریر کرائی گئی،

راقم کا مقالہ انگریزی میں "اسلام میں تصور ریاست نظری اور عملی حیثیت سے" کے عنوان سے تھا، اس موضوع پر ہندوستان میں بارہا اپنے خیالات کا اظہار کر چکا تھا، اس بین الاسلامی مجمع میں اس مقالہ کو پیش کرنے کا مقصد صرف اس کے ردعمل سے واقف ہونا تھا، کلام پاک اور احادیث کے حوالے پر مشتمل یہ اچھا خاصہ طویل تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے،

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے، مگر طرز حکومت اور اس کی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، حکومت جغرافیائی حالات، ماحول اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے، اس لئے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب تھا، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ہر زمانہ ہر ملک اور ہر ماحول کے لیے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے، جس سے ایک قابل فخر ویلفیر اسٹیٹ بن سکتی ہے اگر ان بنیادی باتوں پر عمل کر کے کوئی حکومت

قائم کی جاتی ہے، تو اس کی نوعیت خواہ بادشاہت یا جمہوریت یا عوامی جمہوریت یا آمریت ہی کی کیوں نہ ہو، وہ اسلامی حکومت کہی جا سکتی ہے، ہمارے سامنے خلافت راشدہ کا نمونہ ہے، لیکن اسکی حکومت کی نوعیت کا متعین کرنا آسان نہیں، کوئی اسکو اوتاری، کوئی مذہبی، کوئی زعیمی، کوئی دستوری کوئی جمہوری، کوئی اوتاری اور جمہوری، کوئی بادشاہی اور جمہوری حکومت کی ملی جلی شکل بتاتا ہے، یہ سب کچھ تھی، مگر ان سب کی برائیوں سے پاک اور ان کی تمام خوبیوں کی حامل تھی، اسلئے یہ بہترین حکومت تھی، خلفائے راشدین کا انتخاب ضرور ہوتا رہا، مگر ان کے طرز انتخاب سے خاص ضابطے متعین نہیں کئے جا سکتے، کلام پاک میں شوریٰ کی اہمیت ضرور ہے، لیکن جمہوریت کا ذکر نہیں، اسلام حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کے طریقے، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب اور اظہار رائے کے طریقے وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں دیتا اس کے نزدیک اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے،

اگر کوئی سربراہ حکومت خواہ وہ بادشاہ یا آمر ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالےٰ کے حکم اور منشاء حکومت کا نفاذ کر کے اسلامی شعار، اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی نگہبانی اور پشتیبانی کر کے اسلام کی شان اور آن بان میں اضافہ کرنے کا کوشاں رہا ہو یا ہو، تو کیا وہ جمہوری حکومتوں کے ان سربراہوں سے فروتر سمجھے جائیں گے، جو ظالم، فاسق اور فاجر ہوں، لیکن ان کی حکومت کا حق صرف اس لئے ہو کہ وہ عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آئے ہیں، یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد خاندانی حکومتیں ضرور قائم ہوتی رہیں لیکن ان کے سربراہوں نے اسلام کے قوانین کی بالادستی کو اپنی حکومت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر برقرار رکھا تو کیا ان کی حکومتیں خارج از اسلام محض اس لئے سمجھی جائیں گی کہ وہ خلافت راشدہ کے طرز پر نہ تھیں، تو پھر اسلام کی سیاسی تاریخ ہمارے پاس کیا رہ جاتی ہے حالانکہ

ہم کو ان کے بہت سے کارناموں پر فخر ہے،

اس مقالہ کو پڑھتے وقت سامعین کی طرف برابر نظر اٹھتی رہی، اندازہ ہوا کہ ان کے جذبات میں کچھ ہلچل پیدا ہو رہی ہے، اپنی جگہ پر آکر بیٹھا تو ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے تو مجمع کو لوٹ لیا، سنگاپور کے ایک نمایندہ نے کہا کہ It is a wonderful paper پھر اس پر بحث بھی شروع ہو گئی میں جواب دیتا رہا، کچھ معترضین تو مطمئن ہوئے، اور کچھ غیر مطمئن رہے، اجلاس ختم ہوا تو جناب حکیم سعید صاحب نے از راہ نوازش میرے پاس آنے کی زحمت گوارا کی فرمایا آپ یہ مقالہ مجھکو دیدیں، عرض کیا وہ کیا کریں گے، فرمایا پھر بتاؤنگا، دوسرے دن ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ یہ مقالہ صدر صاحب کے ہاتھ میں خود دے کر آیا ہوں، عرض کیا یہ اتنا اہم تو نہ تھا، فرمایا اس کی اہمیت کا اندازہ دوسروں کو ہے،

ایک شام صدر صاحب نے اپنے یہاں تمام مندوبین کو بھی مدعو کیا، ہندوستانی وفدان سے ملا تو مجھ سے مصافحہ کرنے میں فرمایا آپ کا مقالہ میرے پاس پہونچ گیا ہے، میں نے اس کو غور سے پڑھا، میں نے شکریہ ادا کیا، اسی ملاقات میں جناب سید اوصاف علی نے ان کو یہ کہہ کر دعوت دی کہ جب کبھی وہ دہلی تشریف لائیں تو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں بھی تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں، میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ اکبر نے تو فتح پور سیکری کو اپنے شاہانہ خزانہ کی مدد سے آباد کیا تھا، لیکن حکیم عبد الحمید نے محض اپنی شاہانہ ہمت سے تغلق آباد کے ویرانے کو علم و فن کا ایک چمنستان بنا دیا ہے، انھوں نے دعوت قبول کر لی رخصت ہوتے وقت عرض کیا کہ آپ کے جسم پر تو آپ کی شروانی بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، مگر یہ شیروانی پاکستان میں بہت ہی کم نظر آتی ہے، فرمایا میں نے تو اس کو قومی لباس بنا دیا ہے رفتہ رفتہ یہ عام ہو جائے گی۔

سیمینار کے ساتھ ایک نمائش بھی رکھی گئی تھی، اس میں پاکستان کے اندر ہر زمانہ میں صنعت حرفت، پارچہ بافی، آرٹ، کلچر، فن تعمیرات اور موسیقی وغیرہ کو فروغ دینے کی جو کوششیں ہوئیں ان کو بہت سلیقہ سے دکھایا گیا تھا،

نیشنل بک فونڈیشن اسلام آباد نے دارالمصنفین کی ۱۱۵ مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت باضابطہ خرید لیا ہے، اس کا بھی ایک نمائشی اسٹال سیمینار کے ہال کے پاس تھا، اس کی طرف سے دارالمصنفین کی اب تک ۴۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں، اس کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب رضی الرحمن صاحب سے بقیہ مطبوعات کی طباعت اور اشاعت سے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

سیمینار کے آخری اجلاس میں جناب اے۔ کے۔ بروہی کے ہاتھوں سے غیر ملکی مندوبین کو تاج کمپنی کا بہترین چھپا ہوا کلام پاک کا ایک ایک نسخہ ملا جو بہت ہی بابرکت اور کارآمد تحفہ تھا' تقریب کی یادگار میں کانسے کا ایک ایک تمغہ بھی دیا گیا، اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایسا تمغہ سونے کا تھا، معلوم نہیں اس مرتبہ وہ فیاضی کیوں نہیں دکھائی گئی۔

سیمینار دائرۂ ادب، اسلامیہ یونیورسٹی، محکمۂ امور خارجہ اور ایوان صدر کی دعوتوں اور مختلف تجویزوں کے ہجوم میں ختم ہوا، تو مقالہ نگاروں کے مقالات کی سات جلدوں کے علاوہ حسب ذیل علمی تحفے بھی مہمانوں کے ساتھ کئے گئے،

(۱) سمپوزیم اون اسلام اینڈ سائنس (۲) انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس (۳) ماسٹر پلان اوف اسلامک ریسرچ (۴) ورلڈ اوف اسلام ٹوڈے (۵) پاکستان پنورما (۶) اسٹیٹس آف دی مین ان اسلام (۷) برادر ہڈ ان اسلام (۸) ملیگرزان اسلام (۹) ڈائی منسنز آف اسلام (۱۰) جسٹس ان اسلام (۱۱) اسلامک لاز ان پاکستان، ۱۲۔ ہجرا سینٹنری سیمے پریشن کانفرنس آف مسلم ورلڈ، (۱۳) نگلیکٹڈ جینس آف دی ایسٹ وغیرہ۔

جناب عبد الواحد ہالی پوتہ صاحب ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ایک مخصوص تقریب میں مدعو کرکے اپنے یہاں کی تازہ مطبوعات پیش کیں، وہاں کے لائق لائبریرین ڈاکٹر احمد حسن نے از راہ کرم یہ کتابیں دارالمصنفین ڈاک کے ذریعہ سے بھیج دینے کی زحمت گوارا کی، جو اب یہاں پہونچ گئی ہیں، ان کے کچھ نام یہ ہیں، مجموعہ قوانین اسلام جلد دوم، سوم، پنجم، مرتبہ ڈاکٹر تنزیل الرحمن الکندی مرتبہ ڈاکٹر عبد الرحمن شاہ ولی مقصود المومنین لبایزید الانصاری، ڈیولپمنٹ آف جامع ان اسلام از احمد حسن، الکزنڈر اگینسٹ گیلین اینڈ موشن، اسلام اینڈ سیکولرزم ان پوسٹ کمالسٹ ٹرکی از محمد رشید فیروز لینڈلارڈ اینڈ پیزنٹ ان ارلی اسلام" از ضیاء الحق، اسلامک لیگل فلاسفی، از محمد خالد مسعود ارلی ڈیولپمنٹ آف اسلامک جورس پروڈنس از احمد حسن

جناب اے۔ کے بروہی کے الطاف و اکرام کی بدولت یہ تواضع کی گئی کہ مندوبین پاکستان کے جس حصہ میں جانا چاہیں، سرکاری اخراجات پر جا سکتے ہیں، اس کے بعد میں کراچی پہونچ گیا، وہاں کے ارباب علم سے مل کر اپنی زندگی میں اور بھی تازگی پائی، پاکستان کے پرنس اسکالر جناب پیر حسام الدین راشدی صاحب سے دو برس کے بعد بغل گیر ہوا تو معلوم ہوتا تھا، کہ علم و محبت کی بہت بڑی دولت آغوش میں سمیٹ رہا ہوں، ان ہی کے یہاں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اسلام آباد سے آکر ٹھہرے، پھر تو بڑی اچھی صحبت رہی، پیر صاحب نے اپنے غیر معمولی جذبۂ میزبانی اور علم دوستی میں ایک رات کراچی کے کچھ ممتاز ارباب علم کو اپنے یہاں مدعو کیا تو ان کا گھر ایک علمی میکدہ بن گیا جہاں کی شبستان عیش میں ایسا معلوم ہوا کہ پیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، بلا رہے ہیں، قدم قدم پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں،

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب اب تک اتنی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہو چکے ہیں کہ شاید اب سب کے نام بھی ان کو یاد نہ ہوں کوئی اور ان کا شمار کرنا چاہے تو قلم دوات کے سہارے ہی کر سکتا ہے، ان کو

تذکروں سے لگاؤ نہیں‘ شاید عشق ہے‘ مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی‘ تکملہ مقالات الشعراء از خلیل ٹھٹھوی‘ تذکرہ حدیقۃ الاولیاء از عبدالقادر ٹھٹھوی‘ تذکرہ شعرائے کشمیر از میرزا محمد اصلح‘ تذکرہ روضۃ السلاطین اور تذکرہ جواہر العجائب از فخری ہروی وغیرہ ایڈٹ کرکے اس فن کا معیار بہت اونچا کر دیا ہے‘ ان کو ایڈٹ کرنے میں انھوں نے جو محنت‘ مشقت اور ریاضت کی ہے‘ اس سے تذکرہ نگار تو دب کر رہ جاتے ہیں‘ مگر وہ خود اپنے مقدمے‘ تعلیقات‘ پھر شعراء کے حالات و آثار کے اضافے سے ایسے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں کہ قارئین کے ذہن و دماغ پر تذکرہ نگار کے بجائے وہی چھائے ہوئے رہتے ہیں‘ میرا خیال ہے کہ تذکرہ شعرائے کشمیر ان کی علمی سرگرمیوں کا شاہکار ہے‘ اس میں تقریباً ۳۰۵ فارسی کے شعراء کا ذکر ہے‘ اس کی مختلف جلدوں میں ان شعراء کے متعلق اتنے مواد جمع کر دیے گئے ہیں کہ پھر کسی اور تذکرہ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی‘ ان کی اور تصانیف ہیں‘ ان کی میرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب بھی مجھ کو بہت پسند ہے‘ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کے مزار کے پاس دارالمصنفین میں بیٹھ کر لکھ رہے ہیں‘ تحریر کا اسلوب اور تحقیق کا انداز وہی ہے جو بستان شبلی کا ہے‘ غازی خاں ترخان جہانگیر کی طرف سے سندھ سے لیکر قندھار تک کا حکمراں بنا رہا‘ ۲۵ سال کی عمر میں وفات پا گیا‘ مگر اپنی علم دوستی‘ سخن پروری‘ زرپاشی کا ایک افسانہ چھوڑ گیا ہے‘ جو فسانۂ عجائب سے کم نہیں‘ وہ اپنے دور کا عبدالرحیم خانخاناں تھا‘ اگر وہ زندہ رہتا تو عبدالرحیم خانخاناں کی معارف پروری کی داستان کے سامنے ماند پڑجاتی‘ جو خدمت ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی لکھ کر انجام دی وہی راشدی صاحب نے اپنی یہ کتاب قلمبند کرکے دی ہے‘ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ملا عبدالباقی نہاوندی کی تحریروں میں درباری رنگ ہے لیکن راشدی صاحب کے قلم میں بیسویں صدی کا تصنیفی شعور و سلیقہ نمایاں ہے‘ اس کا مطالعہ کرتے وقت کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی عجیب افسانہ پڑھ رہے ہیں‘ اس کا انداز بیان ہی کچھ ایسا ہے‘ راقم نے بزم تیموریہ کی دوسری جلد میں اس سے ہر طرح استفادہ کیا ہے۔

راشدی صاحب کی دعوت میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام سے ملاقات ہوئی‘ جو بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں‘ ابھی حال ہی میں انھوں نے دو کتابیں ایڈٹ کی ہیں‘ ایک تو محمود بن امیر ولی کے سفرنامہ

ہند و پاکستان بحرالاسرار فی مناقب الاخیار اور ایک اے کنڈ ڈ آف ڈ وکو منٹر اون انڈو پرشین پینٹنگز ہے، یہیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے ادارہ ترقی اردو بورڈ میں مدعو کیا، یہیں پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری ملے، جو فارسی سے اردو میں ترجمے کرنے میں بڑے ماہر ہیں، تاریخ ہند کی بہت سی کتابیں مثلاً مآثر الامرا، اور طبقات اکبری وغیرہ کے اردو ترجمے کر چکے ہیں، ان کے بھائی ابومعاویہ کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، انھوں نے اس کے کتب خانہ کے لئے پاکستان کی بے شمار مطبوعات فراہم کیں، وہ دارالمصنفین بھی آئے، اور اس کے لائف ممبر بھی بن گئے، اور جب یہ سطریں قلمبند ہو رہی تھیں تو پروفیسر ایوب قادری نے اطلاع دی کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے، یہ معلوم کرکے بڑا دکھ اور رنج ہوا کہ دارالمصنفین کا ایک بڑا ہمدرد جنت کو سدھارا، دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کریں، آمین

ایک روز پیر حسام الدین راشدی صاحب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اور پاکستان کے آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ جناب خورشید حسن کے ساتھ ٹھٹھہ لے گئے، جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب اور جہاں کسی زمانہ میں چار سو درسگاہیں تھیں، اگر اب وہاں لوگ زیادہ تر مکلی کے گورستان شاہی کے کھنڈرات کی زیارت کو جاتے ہیں، جو چھ میل میں پھیلے ہوئے ہیں، چند گھنٹوں میں ایک سرسری نظر ہی میں سندھ کے حکمرانوں، شہزادوں، گورنروں، وزیروں، روحانی پیشواؤں اور شاعروں کے مزارات دیکھے، یہاں دفن ہونا بھی بڑا امتیاز تھا، اب یہ ساری عمارتیں عبرت کی جگہیں بنی ہوئی ہیں، ان میں تین دور کی عمارتیں ہیں، سمہ عہد کے مقبروں میں جام نظام الدین، مبارک خان ملک راج پال کے مزارات ہیں، ترخانی اور ارغونی دور کے ممتاز لوگوں میں عیسیٰ خان ترخان، باقی بیگ ترخان اور سلطان ابراہیم وغیرہ کے مقبرے ہیں، مغلوں کے زمانہ کے لوگوں میں جانی بیگ ترخان، غازی بیگ ترخان، باقی بیگ ازبک، طغرل بیگ، عیسیٰ خان ترخان ثانی، جان بابا اور دیوان شرفا کے مقبرے ہیں، ان میں

[illegible]

[illegible]

تحت کی ... کے [illegible] ہیں ... ہیں پر [illegible] وسط ایشیا

کے فن تعمیرات کے اثرات زیادہ ہیں مگر ڈاکٹر [illegible] نے [illegible] کے اثرات زیادہ ہیں،

اس کی تائید جناب پیر حسام الدین راشدی نے بھی کی، اس کی بعض [illegible] قرآنی آیتیں بڑی ماہرانہ خوبصورتی

سے کندہ [illegible] پر یقیناً وسط ایشیا کے اثرات تھے، پتھروں کی صناعی اور بعض ستونوں اور کھمبوں [illegible]

کے محلات کے اثرات تھے، سورج مکھی کے پھول، سواستیکا اور سکھر وغیرہ ہندوؤں کے اثرات کی غمازی کرتے

تھے' ان مقابر پر جناب پیر حسام الدین راشدی کی ایک کتاب سندھی زبان میں مکلی نامہ کے نام سے شائع

ہوگئی ہے جس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے' میری یہ تحریر تو محض ایک طائرانہ نگاہ تھی' میرے لیے زیادہ

جاذب نظر اور دیدہ زیب شاہجہانی مسجد تھی' جو مکلی ٹیلے سے الگ ٹھٹھہ شہر میں واقع ہے' شاہجہاں کی بنوائی

ہوئی تمام مسجدوں سے اس کی شان بہت مختلف تھی، مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک پردہ نشین حسین اور حیادار خاتون

نظروں کے سامنے ہے' اس کے اوپر ترانوے (۹۳) چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں جن سے پوری مسجد [illegible] گونجتی رہتی ہے

اس میں سفید ٹائل موزیک، کاشی کاری اور منبت کاری کی بہاریں پورے حسن کے ساتھ دیکھنے میں آئیں،

اس کی تعمیر نواب عبدالبقا خان کی نگرانی میں ۱۶۴۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۴۷ء تک اس میں کام ہوتا رہا۔

ٹھٹھہ سے واپسی میں ہم لوگ ایک ایسی جگہ رکے جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ دیبل ہے اور یہیں محمد بن قاسم

لنگر انداز ہوا، یہ اس وقت ایک بلند ٹیلہ پر واقع ہے وہاں ابھی زمانہ کے آثار کا ایک میوزیم بھی ہے' اس میں ایک

کتاب وادی سندھ کی تہذیب دیکھی' خورشید حسن صاحب نے اس کا نسخہ بھیج کر ممنون کیا، بعد میں جناب پیر حسام الدین

راشدی پورے یقین کے ساتھ بولے کہ یہ دیبل ہرگز نہیں ہے' دیبل کی جائے وقوع کہیں اور ہے۔

ایک رات دیر تک پیر صاحب کے کمرے میں بیٹھے رہے گذشتہ [illegible] میں ان کے ساتھ [illegible] سے ہم کنار رہ کر

علمی [illegible] کی کیفیت [illegible] کی، انھوں نے ایک کتاب تذکرہ [illegible] عطا کی [illegible]

عنایت کی، جس کو ڈاکٹر [illegible] نے مرتب و شائع کیا ہے، میں نے عرض کیا کہ بزم تیموریہ میں اضافہ کرکے اس کو اب تین جلدوں میں شائع کیا ہے مگر جتنا اضافہ کرتا ہوں نئے تذکرے سامنے آجاتے ہیں تو وہ پہلے کی طرح ناقص ہی معلوم ہوتی ہے۔

ایک روز ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ترقی اردو بورڈ کے دفتر میں مدعو کیا، ان کا سن جتنا بڑھتا جاتا ہے جوان ہوتے جاتے ہیں، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں مگر مجھ کو ان کی اقبال اور تصوف زیادہ پسند ہے جس میں وہ اہل نظر ہونے کے ساتھ اہل دل کی حیثیت سے بھی سامنے آئے، وہ کراچی یونیورسٹی میں لسانیات اردو کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کراچی کے بھی ڈائرکٹر ہیں "اردو لغت تاریخی اصول پر" کا کام ان ہی کی نگرانی میں ہو رہا ہے، اس کی دو جلدیں تو مکمل ہو چکی ہیں، تیسری جلد کی بھی تکمیل ہو چکی ہے، پہلی جلد پہلے عنایت کر چکے تھے، دوسری اس مرتبہ نذر کی، اگر اس کی ساری جلدیں مکمل ہو کر شائع ہو گئیں تو لغت نگاری میں اردو زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دوش بدوش ہو جائے گی، امید کہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی جواں ہمتی اور اولو العزمی سے یہ کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا، اس کے دفتر میں پروفیسر ابو الخیر کشفی، جناب راز مرادآبادی اور جناب لطف اللہ خاں صاحب بھی پہونچ گئے تھے، پھر تو ایک اچھی ادبی مجلس ہو گئی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے نستعلیق اردو کا ایک ٹائپ بھی تیار کرایا ہے جو بہت جلد پاکستان میں رائج ہو جائے گا اور اس کی قیمت چھ سو روپیے سے زیادہ نہ رکھی جائے گی، از راہ نوازش دار المصنفین کو بھی یہ ٹائپ نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

پروفیسر ابو الخیر کشفی نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں اور میری ناچیز تصنیف غالب مدح و قدح کی روشنی میں کے مکمل اشاریے تیار کیے گئے ہیں، اس کو سن کر میرا جی چاہا کہ ان کو گلے لگا لوں، جو کام ہم لوگ خود نہ کر سکے وہ کراچی یونیورسٹی میں انجام پا گیا، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ایک رات اپنے یہاں ڈنر دیا تو ان اشاریوں کی جلدیں جناب پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی (کراچی یونیورسٹی) نے پیش کیں، جنھوں نے اپنی نگرانی میں وہاں کے ایم۔ اے اردو کے طلبہ اور طالبات سے یہ تیار کرائی ہیں،

ان جلدوں کو میں اپنے سینے سے لگا کر نظم گنگناتا رہا۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے نوائے وقت کے دفتر میں بھی ایک نشست کرائی جہاں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

پاکستان کے مشہور اور محبوب ادیب اور اردو زبان کے ہمہ کمال جناب مشفق خواجہ صاحب سے ملنے میں ایک ولولۂ وفا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اردو ادب کی دلنوازی اور دلربائی سے کسی کو اس کا مطالعہ کیے بغیر لطف اندوز ہونا ہو تو وہ خواجہ صاحب سے ملے، وہ اپنے ذاتی کتب خانہ میں بیٹھ جاتے ہیں تو ان کی خاموشی ان کی گفتگو اور ان کی بے زبانی ان کی زبان ہو جاتی ہے، مگر جب بولتے ہیں تو رس گھولتے ہیں، انھوں نے ازراہ نوازش ایک پرتکلف ڈنر پر خاکسار کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور جناب نثار احمد فاروقی کے ساتھ مدعو کیا جس میں کراچی کے علمی منطقۃ البروج کے اہم سیاروں کو جمع کیا، بڑی پرکیف مجلس رہی، میری گذارش پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے خواجہ صاحب کا شکریہ اپنی پوری شیریں بیانی کے ساتھ ادا کیا، پھر مجھ کو دارالمصنفین کے طریقۂ کار اور آئندہ کے لائحۂ عمل پر بولنے کو کہا گیا جس پر کچھ دیر تک بولتا رہا، خواجہ صاحب کی اس ضیافت کے قمقمے ذہن میں برابر جگمگاتے رہیں گے۔

مولانا ناظم ندوی اور ان کے بچے تو قریبی عزیزوں کی طرح ملتے ہیں، ان کی زندگی کا پرتکلف معیار روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ان ہی کے ساتھ ایک رات جناب ظفر احمد انصاری کے یہاں مدعو تھا، جن کے صاحبزادے اور مولانا ناظم ندوی کے داماد نے گلشن اقبال میں ایک بہت ہی عمدہ مکان ابھی حال ہی میں تعمیر کرایا ہے، مولانا ظفر احمد انصاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے بے داغ کردار کی وجہ سے ہر حکومت کے زمانہ میں مقبول رہتے ہیں، آج کل اسلامک آئیڈیالوجی کے اہم رکن اور صدر ضیاء الحق کے معتمد علیہ بھی ہیں۔

مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی تو علم و فن کے بلبل ہزار داستان ہیں، مذہبی، فقہی، تاریخی، علمی اور ادبی موضوعات پر ان سے زیادہ بہتر فاضلانہ اور پُرمغز گفتگو کرنے والا میں نے کسی کو اور کہیں نہیں پایا، وہ رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے بین الاقوامی المجمع الفقہی کے رکن بھی ہیں، اپنے یہاں ایک نشست میں بینک کے

انٹرسٹ پر گفتگو کرنے لگے تو بہت دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ بینکوں کی طرف سے جو انٹرسٹ ملتا ہے اس سے ایک مسلمان کو حتی الامکان پرہیز کرنا واجب ہے، اور یہ بات تو فرض ہے کہ جہاں اور جس ملک میں اتنی طاقت رکھتے ہوں کہ ملک کے معاشی اور اقتصادی نظام کو ربوی آلودگیوں سے پاک رکھ سکیں، وہاں اس کی اصلاح کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں، اور اگر نہیں کریں گے تو سب کے سب گنہگار ہوں گے، اور قیامت کے دن قابل مواخذہ قرار پائیں گے، لیکن مسلمان جہاں عددی قلت کی وجہ سے بے اختیار ہوں وہ مسلمان مسلمان یا ہندو سے سودی لین دین نہیں کر سکتے، یہ بہر صورت حرام ہے لیکن اگر بینکوں سے ان کو انٹرسٹ ملے تو وہ اس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کر سکتے ہیں، یہ مرتبہ رخصت اور جواز ہے، عزیمت یہ ہے کہ ایسی رقموں کو رفاہی کاموں اور محتاجوں پر صرف کریں، البتہ رفاہی اداروں یا قومی وجماعتی نفع یا غیر نفع اداروں کو جمع شدہ رقوم پر جو سرکاری خزانوں یا حکومتی بینکوں سے اضافے بنام انٹرسٹ، ڈیوی ڈنڈ یا کسی اور نام سے ملتے ہیں، ضروری ہے کہ یہ رقمیں ان اداروں کے لیے حاصل کر کے ان کے مقررہ اخراجات میں صرف کی جائیں اس عمل میں نہ کوئی کراہت ہے اور نہ گناہ، بلکہ اس کے برخلاف ان کے چھوڑ دینے میں تنگی اور قباحت ہے، فقہائے اسلام کا بھی یہی فیصلہ ہے، اس کے لیے انھوں نے بہت سے دلائل دیے۔

میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ یہ فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے، لیکن اس فیصلہ کا اعلان باضابطہ طور پر کہیں نہیں ہوا، کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر سے نہیں گذرا، آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کی ذاتی رائے سمجھی جائے گی، اگر یہ ساری باتیں اجماع سے طے ہوں اور فقہائے اسلام یا بین الاقوامی المجمع الفقہی کی طرف سے ان باتوں کا اعلان ہو تو قابل قبول ہو سکتی ہیں، ورنہ ہندوستانی مسلمان اپنی ذہنی کشمکش میں اسی طرح مبتلا رہیں گے جس طرح سے ہیں، کہنے لگے بین الاقوامی المجمع الفقہی کے سامنے یہ مسائل ہیں، میں نے پھر عرض کیا کہ اس پر شاید متفقہ فیصلہ نہ ہو سکے۔

ایک روز جناب جمیل جالبی سابق انکم ٹیکس کمشنر کے دولت کدہ پر بھی ان سے ملاقات رہی، ان کی کتاب

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] نے [illegible] میرے [illegible] ڈاکٹر [illegible] کے علاوہ جناب [illegible] کے
[illegible] اور [illegible] میرے عزیز [illegible] جناب [illegible] الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی [illegible])
سوسائٹی کے سابق صاحبزادے جناب افضال حسین بہت ہی معاون رہے۔

اس مرتبہ کراچی میں دو نئی یافت ہوئی ایک تو جناب نوی والا صاحب اور دوسرے جناب لطف اللہ خاں صاحب کی تھی، جناب نوی والا صاحب آدم جی ل ہیں ایک بڑے معزز عہدہ پر ہیں مذہبی ہونے کے ساتھ علمی ذوق بھی رکھتے ہیں معارف کے بڑے قدردان ہیں اس کے شذرات سے متاثر ہوتے ہیں ان کو کراچی میں میری آمد کی خبر ملی تو مسلسل ٹیلیفون کرتے رہے، پھر ایک روز تحفے تحائف کے ساتھ میری قیام گاہ پر تشریف لائے، ان کے چہرے کو منور پایا، بڑی محبت سے ملے، پھر اپنے گھر پر مدعو کیا، ان کی شاندار کوٹھی میں کتابوں کی کئی الماریاں تھیں جن میں تفسیروں کی تعداد زیادہ تھی، اسلامی حمیت اور غیرت پر کہیں آنچ آجاتی ہے تو اخباروں میں انگریزی مضمون لکھ کر اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں معارف کا ری پرنٹ کراچی میں بھی چاہتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لیں تو دارالمصنفین کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف اور ان کی خوبیوں کے بڑے مداح ہیں، ان ہی کے دولت کدہ پر جناب مولانا محمد حسین صاحب دیوبندی اور حاجی ولی محمد احمد صاحب سے بھی ملاقاتیں رہیں جو بہت لطف وکرم سے پیش آئے۔

جناب لطف اللہ خاں صاحب مدراس کے رہنے والے تھے لیکن رہنے سہنے، بول چال، ملنے جلنے میں شمالی ہند کی تہذیبی روایت کی یاد کو تازہ کرتے ہیں ان کے فلیٹ میں داخل ہونے پر ان کی ہر چیز میں خوش سلیقگی دکھائی دی، ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کیے ہوئے ہیں لیکن ان کا اصلی مشغلہ تمام مشاہیر کی آوازوں کو ریکارڈ کرکے ان کے کیسٹ تیار کرنا ہے، آپ جس کی بھی آواز، تقریر، وعظ، گفتگو سننے کے خواہشمند ہوں

ان کے بیان سن سکتے ہیں، انھوں نے ایسے کیسٹ کے کیٹلاگ تیرہ ۱۳ جلدوں میں تیار کیے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں کتنے بے شمار کیسٹ ہوں گے، وہ ان کو فروخت نہیں کرتے بلکہ تیار کر کے ان شیلفوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اگر فروخت کریں تو لاکھوں پائیں، ازراہ نوازش میری ایک گفتگو بھی ریکارڈ کی جو دارالمصنفین کی تاریخ پر تھی۔

دارالمصنفین کے بہت بڑے کرم فرما ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کے دولت کدہ پر عزیزی سہیل سلطان اور فضال حسین کے ساتھ ملا، وہ کویت میں بڑی مدت تک طبی ڈاکٹر رہنے کے بعد کراچی آگئے ہیں، بقیہ زندگی اللہ کی یاد میں گذار رہے ہیں، اپنی گفتگو میں کہا کہ معارف کے شذرات میں غداروں کا جو ذکر کیا گیا ہے ضرورت اس کی ہے کہ اس موضوع پر پوری ایک کتاب لکھی جائے، یہی بات ان کے صاحبزادے نے بھی کہی، میں ہنس کر خاموش رہا۔

کراچی کے علمی حلقوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یکایک اعظم گڈھ سے تار پہونچا کہ مجھ کو ۲۶ مارچ کو دہلی پہونچنا ہے، میری لڑکی اپنی لڑکی نازش مصطفےٰ اسلمہا کی بسم اللہ میری موجودگی میں کرنا چاہتی تھی، اب اس کو یہ تقریب عجلت میں کرنی پڑی، اس میں مذکورۂ بالا تمام کرم فرماؤں کو مدعو کیا، اس موقع پر جناب راز مراد آبادی نے اپنے کلام کو ترنم سے پڑھ کر حاضرین کو بہت محظوظ کیا، پھر مولانا عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر ابوالخیر کشفی اور جناب مشفق خواجہ نے بھی اپنا اپنا کلام سنایا جس سے ایک ادبی مجلس کا لطف آگیا۔

میں ۲۵ مارچ کو دہلی پہونچا، ۱۵ اگست ۱۹۸۰ء میں حکومت ہند کی طرف سے اس خاکسار کو جو اعزاز ملا ہے اس کی باضابطہ سند اور خلعت سے راشٹرپتی نے ۲۶ مارچ کو اپنے یہاں کے ایک دربار میں نوازا۔

اس کے بعد ۳۱ مارچ کو اعظم گڈھ پہونچا تو معلوم ہوا کہ ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی سمینار ۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل کو ہو رہا ہے، گویا اس سال کا تیسرا بین الاقوامی سمینار تھا، اس میں بیرونی ممالک کے بجائے

آنکھوں کے لیے بڑا فرحت بخش ہوتا تھا۔

یہ ۲۰؍ اپریل کو شروع ہوا، اس کے لیے ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی نئی عمارت کے ہال کو جس طرح سجایا گیا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے نئی دہلی کے سیمینار کا وگیان بھون اور اسلام آباد کی فیصل مسجد دونوں کے ہال کی یاد ماند پڑ گئی، ان دونوں ہال کے لیے تو حکومت کے خزانے کھول دیے گئے تھے، مگر ندوہ کے سیمینار کے لیے اخلاص، ولولے، لگن، خدمت، ذوق اور شوق کے بے تھاہ خزینے کھلے ہوئے تھے، وہاں کے اساتذہ کی خوش سلیقگی، طلبہ کی مستعدی اور دوسرے کارکنوں کی عملی سعی سے پنڈال داماں باغباں اور کف گل فروش نظر آ رہا تھا۔

دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں عرب ممالک کا کوئی نمائندہ نہیں پہونچ سکا تھا، اسلام آباد کے سیمینار میں عرب نمائندے ضرور آئے، مگر ان کی اتنی بڑی تعداد وہاں نظر نہیں آئی جتنی کہ ندوہ کے سیمینار میں تھی، ۱۶؍ اپریل سے خبر ملنے لگی کہ حکومت قطر کے جید عالم شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری تشریف لے آئے، جن کا دینی، ادبی اور علمی پایہ پورے اسلامی ملک میں مشہور ہے، پھر سننے میں آیا کہ عالی مرتبت سید عبدالعزیز رفاعی سابق سکریٹری مجلس الوزراء مملکت سعودیہ بھی پہونچ گئے، انھوں نے صحابۂ کرامؓ کو ان شخصیتوں کے ادبی پہلو پر ایک سلسلہ تیار کیا ہے جو صرف دینی شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں، پھر معلوم ہوا کہ استاذ عبدالرحمن رافت الباشا بھی آگئے ہیں جنھوں نے الشعر الاسلامی، النثر الاسلامی اور ادب الدعوۃ کے موضوع پر ایک مستقل کتب خانہ تیار کر دیا ہے، اسی طرح یہ اطلاع ملی کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعۃ الملک عبدالعزیز (جدہ و مکہ)، جامعۃ الامام محمد ابن سعود، جامعۃ العین (امارات عربیہ)، جامعہ قطر، جامعہ عمان (شرق اردن) کے عربی شعبوں کے اساتذہ اور صدر بھی پہونچ گئے ہیں، مصر کے وفد میں وہاں کے وزیر اوقاف ڈاکٹر زکریا اور نائب وزیر ڈاکٹر عبداللہ عبدالشکور تھے، دبئی کے فضلاء و ادباء کا بھی ایک وفد تھا، جامعۃ الملک عبدالعزیز کی طرف سے شام کے مشہور فاضل اور کثیر التصانیف عالم استاد حسن عبدالرحمن بھی شریک ہوئے سلطنت عمان کی

مفتی محمد خلیل بھی تشریف لائے، ابو ظہبی کی نمائندگی الدکتور تقی الدین الندوی مستشار علمی شیخ زید حفظہ اللہ شرعی و استاذ حدیث عین یونیورسٹی نے کی، پاکستان سے مولانا ناظم ندوی آئے جو دار العلوم ندوہ کے طالب علم اور یہاں کے مقبول استاذ بھی رہ چکے ہیں، عربی زبان میں ان کی قدرت اور مہارت کی شہرت عرب ممالک میں بھی ہے، عرب ممالک کے بیالیس (۴۲) فضلاء تھے جو سب اپنے خرچ سے آئے، یہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کے اخلاص، دینی خدمت اور عالمگیر شہرت کی کرامت تھی کہ ان کی آواز پر تمام عرب ممالک لبیک کہنے کے لیے امنڈ پڑے، ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف گوشوں کے نمائندے بھی پہونچے، عربی کے ساتھ اردو کا بھی مذاکرہ رکھا گیا تھا جس میں دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ علی گڑھ، دہلی، کلکتہ، لکھنؤ اور بنارس یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک ہوئے، مذاکرہ کا عنوان یہ تھا: ادبیات کا اسلامی تصور۔

خطبۂ استقبالیہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنی فصیح اور بلیغ عربی میں بہت ہی موثر انداز میں یہ کہا کہ قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ عربی زبان زندہ ہے، اور اپنے مرکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر آج اس کے ادب پر مباحثہ ہو رہا ہے، پھر تفصیل سے بتایا کہ اس ملک میں ادب، فلسفہ، تفسیر اور حدیث میں ایسا کام ہوا جس کی مثال دوسرے ملکوں میں مشکل سے ملے گی، فخر کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہاں کے علماء نے ملک کے زبان و ادب کی ترقی میں قائدانہ حصہ لیا اور وہ یہاں کی علمی و ادبی زندگی میں اس طرح گھل مل گئے کہ اس کا اعتراف ہر جگہ کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں دار المصنفین، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور اس کے دوسرے خدمت گذاروں کے نام خاص طور پر لیے، مولانا نے اس پہلو کی بھی وضاحت کی کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے نامور فضلاء نے ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنے کی سب سے پہلے دعوت دی جس میں دین اور ادب ایک دوسرے کے معاون ہوں۔

اس خطبہ کے بعد کچھ افتتاحی تقریریں بھی ہوئیں، مقرروں میں سب سے نمایاں ڈاکٹر فتحی عثمان رہے، جو امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کی عربی فیکلٹی کے ڈین ہیں، انھوں نے بڑی فراخدلی سے ہندوستان کے ان

علماء کی تعریف کی جنھوں نے اسلامی علوم و فنون کی خدمت کی ہے، ان میں علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کے نام خاص طور پر لیے، ان کی تقریر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں کے علماء کی علمی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کی تقریر ختم ہوئی تو مولانا ناظم ندوی نے اٹھ کر ان کو گلے سے لگا لیا۔

دوسرے دن اسی پنڈال میں سمینار شروع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ آنکھوں کے سامنے سینما کے سیمیں پردے پر یکایک سین بدل گیا ہے، جگہ وہی تھی لیکن اس کی ترتیب ایسی بدل دی گئی تھی کہ عرب نمایندے ایک طویل مستطیل پنڈال کے تین طرف ایسے بیٹھے نظر آنے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم عباسیہ دور کے بغداد کے بیت الحکمت اور قرطبہ کی مسجدوں کی علمی مجلسوں کے کسی اہم اجتماع کو دیکھ رہے ہیں، ہر طرف علم کی چاندنی اور مہتابی چھٹکی ہوئی ہے یہ دین، علم اور فضل کے نمایندے نہیں بلکہ فرشتے ہیں جن کے انوار سے پوری فضا منور ہو رہی ہے، راقم کو بہت سے بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، مگر یہ اثر آفرینی اور دل کشی کہیں دیکھنے میں نہیں آئی، اس میں علمی اخلاص، علمی متانت، علمی وقار اور علمی وزن کی بڑی جلوہ سامانیاں تھیں۔

سمینار کے آغاز میں شیخ محمد المجذوب استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ نے یہ تجویز پیش کی کہ میزبان ادارہ کے سربراہ ہی کو سمینار کے ہر اجلاس کا صدر ہونا چاہیے تاکہ مہمانوں میں سے کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ ان کو کسی اجلاس کا صدر نہیں بنایا گیا، اس طرح بالاتفاق مولانا ابو الحسن علی ندوی اس اہم بین الاقوامی اجتماع کے صدر ہوئے، وہ اپنی شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس تھے، البتہ سر پر ایک سفید عربی رومال ڈال رکھا تھا، صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر ان کی نظر اس اہم اجتماع کی طرف اٹھی ہوگی تو ان کو غیر شعوری یا شعوری طور پر محسوس ہوا ہوگا کہ انھوں نے ندوہ کے ایک گوشہ میں رہ کر اپنی تمناؤں کے مرغزار، اپنی آرزوؤں کے گلزار اور اپنی خواہشوں کے سمن زار کا

جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ندوہ کے اس پُرکیف اور دل نواز اجتماع میں پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے، فرما نشا ما میں اُن کے دل کی گہرائیوں میں ان کی شادمانیوں اور کامرانیوں کا ایک چمنستان آباد ہو گیا ہوگا، ان کا ہر بن مو شاداں اور فرحاں ہو رہا ہوگا کہ اس وقت اسلامی علم و ادب کی عطر آگینی اور نکہت بیزی سے ندوہ کی فضا معطر ہو رہی ہے۔

کارروائی کو کنڈکٹ کرنے کی خدمت علامۂ ادب استاد راحت پاشا نے انجام دی جو جامعہ محمد بن سعود میں عربی ادب کے استاد ہیں، تمام عرب نمایندے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی علمی سطوت اور دینی سطوت سے متاثر نظر آ رہے تھے، ان کی زبان ان کو الشیخ الکبیر اور بقیۃ السلف الصالحین کہتے کہتے خشک ہو رہی تھی، اس مذاکرہ کا عنوان "ادبیات کا اسلامی تصور" تھا' کل اڑتالیس مقالات پڑھے گئے، دس قصیدے بھی سنائے گئے، عربوں نے بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا کہ ندوہ نے عربی نثر اور مقالہ نگاری کا ایک ایسا اسلوب پیش کیا ہے جو عربی زبان و ادب کی حلاوت، فصاحت اور دعوت کی روح اور طاقت دونوں کے عمدہ نمونے ہیں۔

اس اجتماع کے آخر میں متفقہ طور پر یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ادبیات کے اندر اسلامی تصورات کی تلاش اور ادبی کاموں میں اخلاقی اور تہذیبی عناصر کو روشن اور واضح کرنے کے لیے ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے، جس کا صدر مقام ندوۃ العلماء ہو، عرب ممالک کے فضلاء نے اس تجویز کو منظور کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مقبولیت اور شہرت کے گلے میں ایک مرصع کار اور زرنگار ہار پہنا دیا ہے، اس طرح اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے، اب اس کو اور بھی عظیم تر سفر پر اٹھ کھڑا ہونا ہے، دعا ہے کہ اس کی کٹھن منزلوں کو طے کرنے میں اس کو وہی کامیابی ہو جو اس سیمینار کو انجام تک پہونچانے میں ہوئی۔

اردو سیکشن کا سینار بھی ہوا، مگر یہی کی آنکھیں عربی سینار کی تابناکیوں سے زیادہ چکا چوند رہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی عربی سینار کی صدارت کو چھوڑ کر اپنی مقناطیسی شخصیت کے ساتھ جب کبھی اردو سینار میں تشریف لے آتے تو اس میں بھی روح اور زندگی پیدا ہو جاتی، انھوں نے اس کو بھی اپنی سحر پرداز تقریروں سے مسحور کیا، اور بار بار یہ بات دہرائی کہ مولانا شبلیؒ نے جو اسلوب عطا کیا ہے اس سے بہتر اسلوب کسی اور کے یہاں نہیں ملا۔ اس کے تین ۳ اجلاس ہوئے، پہلے کی صدارت خاکسار نے جناب ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ کے تعاون سے کی، اس موقع پر خاکسار کو اس کی وضاحت کرنے کا موقع ملا کہ علامہ شبلیؒ نے کس طرح ادب کو اسلامی علوم و فنون سے سنوارا، اور پھر اسلامی علوم و فنون ان کے ادب و انشار کی وجہ سے کس طرح نکھر کر سامنے آئے، دوسرے اجلاس کی صدارت پاکستان کے مولانا ناظم ندوی نے کی، تیسرے کے صدر ڈاکٹر عطا کریم برق ہوئے جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی، فارسی اور اردو کے صدر ہیں، کل چوبیس ۲۴ مقالے پڑھے گئے، کارروائی کو ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلاتے رہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی موجودگی میں مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین) نے "قرآن مجید کے بعض اسالیب" اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ نے "اقبال فلک مشتری پر" کے عنوانات سے اپنے مقالات پڑھے، یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو خاص طور سے پسند آئے، جو ان مقالہ نگاروں کی محنت کا اصلی صلہ تھا۔

مطبوعاتِ جدیدہ

خلافت و ملوکیت تاریخی و شرعی حیثیت
مرتبہ جناب صلاح الدین یوسف صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۰۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد پندرہ روپے، غیر مجلد دس روپے پچاس پیسے، پتہ: المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور ۲

"خلافت و ملوکیت" مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ بانی جماعت اسلامی کی مشہور متنازعہ کتاب ہے، اس کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اس کے شروع میں اسلامی معاشرہ کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرکے اس غلطی کی نشاندہی کی ہے جو مولانا مودودی اور بعض دوسرے اشخاص نے خلفائے راشدینؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد کے جائزہ میں کی ہے، مصنف نے خلافت و ملوکیت کے ماخذوں سے استفادہ کرنے میں مولانا مودودی کی بے احتیاطی دکھائی ہے اور اسلام کے نظریۂ سیاست اور نظام حکمرانی پر بحث کے ضمن میں لکھا ہے کہ خلافت و ملوکیت فی نفسہٖ بھلی یا بری نہیں ہیں، بلکہ ان کی خوبی اور خرابی میں اصلی دخل خود خلیفہ یا بادشاہ کی سیرت، کردار اور عمل کا ہوتا ہے، اسی لیے ان کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے بعد کے دور کا نظام حکومت بھی اسلامی ہی تھا، وہ مولانا مودودی کی یہ رائے تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت امیر معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے زمانہ میں جب کہ متعدد ممتاز صحابہؓ بھی موجود تھے اسلامی حکومت کی تمام خصوصیات ختم ہوگئی تھیں، اور اس نے خالص دنیوی حکومت کا ڈھانچہ اختیار کر لیا تھا، اسی سلسلہ میں عدالت صحابہؓ کے متعلق مولانا کی رائے پر تبصرہ بھی کیا ہے، وہ مولانا کی ان تاریخی کتابوں کو تمامتر صحیح باور کر لینے پر سخت حیرت ظاہر کرتے ہیں جن کی روایتوں کی نہ چھان بین کی گئی ہے اور نہ ان کے

بارہ میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ وضاعین اور اہلِ تشیع کی روایتوں سے یکسر پاک ہیں، اس ضمن میں ابن سعد، ابن جریر، ابن عبدالبر، ابن اثیر اور ابن کثیر کی کتابوں اور تاریخوں کی اصل حقیقت اور نوعیت بھی واضح کی ہے، وہ مولانا کی اس رائے پر بھی سخت بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں کہ تاریخی روایتوں کو جانچنے کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں جو احادیث کے لیے اختیار کیے گئے ہیں، کیونکہ اس سے تاریخ اسلام خصوصاً قرن اول کا بڑا حصہ غیر معتبر قرار پائے گا، اس کی تردید کے لیے مصنف نے حافظ ابن کثیر اور دوسرے علمائے اسلام کی کتابوں سے مثالیں نقل کرکے دکھایا ہے کہ ان حضرات نے بھی تاریخی روایات کے رد و قبول میں محدثین کے اصولِ نقد و جرح کو سامنے رکھا ہے، ایک باب میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے انتخاب کی نوعیت بیان کرکے ثابت کیا ہے کہ اس وقت ولیعہدی اور نامزدگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نامزدگی کی مخالفت دوسری وجہوں سے کی تھی، اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کی نامزدگی کی تجویز کو غلط نہیں کہا تھا، وہ مولانا مودودی کی یہ رائے درست نہیں مانتے کہ خلفائے راشدین کے نزدیک خلیفہ کو عام مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رائے سے منتخب کیا جانا چاہیے، کیونکہ یہ طریقہ کسی خلیفہ کے انتخاب میں اختیار نہیں کیا گیا تھا، مولانا نے خلافت کی جو چھ خصوصیات بتائی ہیں مصنف نے ان کو ذکر کرکے دکھایا ہے کہ وہ سب کم و بیش حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھیں، چوتھے باب میں پہلے حضرت عثمانؓ پر ان کے جن اقدامات کی وجہ سے اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے، پھر حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق مولانا کے بیانات کا تضاد دکھایا ہے اور آخر میں جمل اور صفین کی جنگوں اور معاہدہ تحکیم وغیرہ کی مصنف نے جس انداز سے تصویر کشی کی ہے اس پر نقد کرکے اس کی خامیاں واضح کی ہیں، آخری باب میں ملوکیت کو اسلامی معاشرہ کے بگاڑ کا سبب قرار دینے کی تردید کی ہے اور حضرت امیر معاویہؓ پر اعتراضات کا جواب دیا ہے، مولانا مودودی نے متعدد صحابہؓ خصوصاً حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ کے بارے میں جو نا روا طرز و لہجہ اختیار کیا ہے مصنف نے اس پر جا بجا ناگواری ظاہر کی ہے، ان کو مولانا سے ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ وغیرہ کے بارے میں متداول تاریخوں کی ہر رطب و یابس روایت کو صحیح قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں، اور ایسے موقع پر صحابہؓ کی عظمت و عدالت کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن دوسری طرف حضرت علیؓ کے متعلق اسی قسم کی روایتوں کی چھان بین کی تلقین کرتے ہیں اور انھیں صحابہؓ کی عظمت و عدالت کا سہارا لینا مستوجب بھی نظر آتا ہے، اس کتاب کے بعض مندرجات پر قیل و قال کی گنجائش ضرور ہے، کہیں کہیں بیجا تاویل اور خوردہ گیری سے بھی کام لیا ہے، بعض مباحث میں تکرار اور غیر ضروری طوالت بھی ہے، تاہم مولانا مودودی نے حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ کی شخصیت کو مجروح

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلۂ تاریخ ہند دس کتابوں پر مشتمل ہے اسی کے تحت عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے، حصۂ اول میں عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی ماخذوں کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً مغل فرمانرواؤں جن کا عہدِ حکومت سب سے طویل رہا ہے، اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور مردم نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت۔ - ۷ روپے (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن)

تبع تابعین حصۂ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور اُن کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے اور حصہ دوم میں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مسعودی اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے ۳۰ صاحبِ تصنیف اور صاحبِ شہرت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،

مرتبہ محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین

قیمت :- ۲۰

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو اور فارسی کے ایک صاحبِ کمال صوفی شاعر ہیں اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

(مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی)

قیمت :- ۰ - ۱۲

سلسلۂ تذکرۂ محدثین

حقیقت یہ ہے کہ بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی کی تحصیل و روایت صحابہ کا ہی یا احادیث صرف حجاز ہی میں نہیں پھیلی تھیں بلکہ عالم اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں اور نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و چھان بین کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا ان کے مجموعے مرتب کئے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مقدس سلسلہ کی تکمیل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاری پر ایک مضمون اور صاحب موطا امام مالکؒ کی سوانح عمری وہ خود بھی لکھ چکے تھے، یہ کام ان کی وفات کے بعد یہاں کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیر ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالکؒ اور ائمہ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام عبد الرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات سوانح اور فن حدیث سے متعلق ان کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات سوانح اور ان کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بقیہ اور اس کے بعد کے تمام قابل ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ:- مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول:- ۔/۱۷ قیمت: حصہ دوم:- ۔/۱۹

منیجر

[illegible] جون سنہ ۱۹۸۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۳۔ ڈاکٹر [illegible]

۲۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمن [illegible]

[illegible]

دارالمصنفین کی نئی کتاب

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی [illegible] غالب کی مدح و قدح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا [illegible] جائزہ لیا گیا ہے [illegible] کیا گیا ہے اس کے دو حصے ہیں۔

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے [illegible] تک ان کی حمایت و [illegible] میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

حصہ دوم

اس میں [illegible] غالب کی [illegible] ۱۹۶ [illegible] تک [illegible] تبصرہ [illegible]

قیمت [illegible]

جلد ۱۲۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۱ء عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

معارف کے شذرات میں گذشتہ چودہ سو سال ہجری کے اندر اپنے مسلمان حکمرانوں میں بنو امیہ کے بعد کچھ عباسی، سلجوقی، زنگی اور ایوبی فرمانرواؤں کا ذکر آیا تھا، اندلس میں مسلمانوں کی بڑی شاندار حکومت رہی، اس پر بھی ایک نظر پڑ جائے تو اچھا ہے۔

یہاں مسلمانوں کا داخل ہونا اور وہاں سے ان کا خارج ہونا، دونوں کی تاریخ ولولہ انگیز ہونے کے ساتھ عبرتناک بھی ہے، اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں طارق بن زیاد جبرالٹر میں اترا تو اس نے اپنی واپسی کے تخیل کو مٹانے کے لیے اپنے تمام جہازوں کو جلا دیا جس کے بعد ان کے لیے یا تو موت تھی یا وہ زمین جہاں وہ اترے تھے، ان کی اولوالعزمی کو دیکھ کر ان کے دشمن یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں، اسپین کے بھاری عیسائی لشکر کے مقابلہ میں مسلمان فوجیوں کی تعداد بہت کم تھی، طارق نے ان میں جوش، ولولہ، عزم اور استقامت کی روح پھونکنے کے لیے اس وقت جو بڑی لمبی تقریر کی وہ آج بھی اس قابل ہے کہ مسلمان ملکوں کا ہر فوجی سپہ سالار اس کو حرز جان بنائے رکھے۔

اس لمبی تقریر کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں: مسلمانو! سمجھ لو، میدان جنگ سے مفر کی اب کوئی صورت نہیں، سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہیں، خدا کی قسم پامردی اور استقلال ہی میں تمہاری نجات ہے، یہی فتح مند فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں، تعداد کی قلت سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، فوج کی کثرت ہو لیکن اس میں بزدلی، سستی، نامردی اور اختلاف ہو تو اس کی کثرت اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، تمہاری تلواروں کے علاوہ تمہارے پاس کوئی سامان اور مدد نہیں ہے، تم کو اپنے دشمنوں سے سب کچھ چھین کر

کرتا ہے، اگر تم نے کوتاہی کی اور کچھ حاصل نہ کیا تو تمھارے دشمنوں کے دلوں میں تمھارا رعب پیدا ہونے کے بجائے
تم سے مقابلہ کی ہمت پیدا ہو جائے گی، تم اپنی جان پر کھیل جاؤ تو کامیابی تمھارے قدم چومنے کے لیے فرش راہ
ہے، میں حملہ کروں تو تم بھی حملہ آور ہو، اگر میں رک جاؤں تو تم بھی رک جاؤ، جنگ کے وقت سب مل کر ایک
جسم بن جاؤ، اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو تم غم نہ کرنا، میرے بعد آپس میں جھگڑا نہ کر بیٹھنا، خبردار ذلت
پر راضی نہ ہونا، اپنے کو دشمن کے حوالے کسی حال میں نہ کرنا، خدا نے تمھاری مشقت اور جفاکشی کے ذریعہ دنیا
میں تمھارے لیے جو عزو شرف اور راحت اور آخرت میں جو ثواب مقدر کر رکھا ہے اس کی طرف بڑھو،
اور اگر تم نے یہ کر لیا تو اللہ کے سارے فضل و احسان تمھارے ساتھ ہیں، وہ تمھیں آیندہ ہونے والے
بڑے گھاٹے اور کل مسلمانوں کے درمیان برے لفظوں سے یاد کیے جانے سے بچائے گا۔

اس تقریر کے بعد فوج ایسے عزم، ہمت اور جوش سے لڑی کہ اس کو زبردست فتح حاصل ہوئی، پھر دو برس کے اندر بحر شام سے لیکر کوہ پائرینز تک مسلمانوں کا تسلط ہو گیا، اس. پی. اسکاٹ کا بیان ہے کہ جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے اندلس پر کامل قبضہ کیا اور صدیوں اپنے ہاتھ میں رکھا تاریخ عالم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، یہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ ملک پچاس برس کے اندر تہذیب کے اس نقطہ پر پہونچ گیا جہاں تک پوپ کی حکومت کے ماتحت اٹلی کو پہونچنے میں ایک ہزار برس لگے تھے۔

اس کا پہلا باضابطہ حکمراں عبد الرحمٰن الداخل تھا، دمشق میں بنو امیہ کو عباسیوں نے ختم کیا تو وہ وہاں سے فرار ہو کر اسپین پہونچا، جب وہ اس کے ساحل پر پہلی دفعہ اترا تو اس کے سامنے شراب پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کی طرف سے منھ موڑ لیا کہ اس کو تو ایسی چیز کی ضرورت ہے جو اس کی عقل کو بڑھائے نہ کہ اس کو کم کرے، اسی طرح ایک موقع پر اس کو بہت ہی حسین و جمیل کنیز پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ اگر وہ اس کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بنانے لگا تو اپنے اصلی مطلوب کو چھوڑ دیگا اور اگر اپنے اصلی مطلوب کی فکر میں برابر لگا رہا تو اس کنیز پر صریحًا ظلم ہوگا، ان ہی اوصاف کے ساتھ اس نے

ایک ایسی خاندانی حکومت کی ابتدا رکھی جس کی مثال اس وقت تک [illegible] یورپ میں نہیں ہو سکی تھی۔

عبدالرحمن الداخل کے عزم، تدبر، دانائی اور اعلیٰ جذبات کی بڑی شہرت ہے، وہ ہمیشہ [illegible] کا قصر کھلا رکھتا، وہ ملک بھر میں باہر دورے کرتا، حکام کے اعمال پر کڑی نظر رکھتا، رعایا کی [illegible] با خبر رہتا، صنعت و حرفت کی ترقی کی ترغیب دیتا، اس کی سرپرستی میں علوم و فنون کو بھی فروغ [illegible] میں اس کی حیثیت وہی تھی جو بنو عباس میں منصور کی تھی، اس نے قرطبہ کو [illegible] اور [illegible] سے اس طرح سجا دیا تھا کہ خود وہ اس پر ناز کرنے لگا، اس نے مسجد قرطبہ کی بنیاد یہ کہہ کر ڈالی کہ اس کی شان و شوکت بہت جلد ایک خلیفہ مانگے گی، اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

عبدالرحمن الداخل کے بیٹے ہشام اول نے صرف ساڑھے سات سال تک حکومت کی، مگر اپنے تقویٰ ذکر و للہ اور رموز حکمرانی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یاد تازہ کر دی، اس کے زمانہ میں قرطبہ علماء، فضلاء اور صلحا کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا، اپنی وفات سے پہلے اپنے جانشین حکم کو نصیحتیں کیں کہ عدل و انصاف میں امیر و غریب کا امتیاز نہ کرنا، جو لوگ تمہارے دست نگر ہیں ان سے لطف و کرم سے پیش آنا، یہ سب لوگ خداوند تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں، صوبوں اور شہروں کی حفاظت نیک عمال اور تجربہ کار لوگوں پر چھوڑنا، رعایا کو تنگ کرنے والے حکام کو بے رحم ہو کر سزا دینا، اپنے سپاہیوں سے اعتدال سے پیش آنا اور یہ خیال رکھنا کہ ان کو اسلحہ ملک کی حفاظت کے لیے [illegible] دیے جاتے ہیں، ہمیشہ اس کی کوشش کرنا کہ تمہاری رعایا تم سے ڈرنے اور نفرت کرنے کے بجائے تم سے محبت کرے، اگر لوگ تم سے ڈرنے لگے تو [illegible] ہو جائیں گے، اور نفرت کرتے رہے تو تم کو برباد کرنے کی کوشش کریں گے، کاشتکاروں کی ہمیشہ حفاظت کرنا کہ وہ روٹی مہیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، جانشینی کے [illegible]

[illegible]

بھی بڑا علم دوست رہا، مگر اس کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا، ایک مرتبہ رمضان میں اس کا ایک روزہ قضا ہو گیا تو ساٹھ دن کے روزے کفارہ میں رکھے، اس کی دینداری کی وجہ سے عوام بھی دیندار ہو گئے تھے، لوگ اس کی زندگی کی رنگینی کو اس کی طبیعت کی کمزوری اور اس کی دینداری کو اس کی زندگی کا جوہر سمجھتے، اس لیے اس کی کمزوری سے چشم پوشی کرتے، وہ سائنس، صنعت اور حرفت کا بڑا مربی تھا، یونانی فلسفہ سے اس کو بڑی دلچسپی رہی، قرطبہ کو عالی شان عمارتوں، حماموں، سیرگاہوں اور فواروں سے سجا کر بغداد ثانی بنا دیا تھا، اس کے عہد میں تہذیب و تمدن کو ایسا فروغ ہوا کہ یورپ کے فرمانروا اس کی نقل کرنا فخر سمجھتے تھے۔

عبدالرحمٰن ثانی کا جانشین امیر محمد تھا، جس کا دورِ حکومت بڑا پرآشوب رہا، لیکن علماء اس کی دینداری کی وجہ سے اس کے گرویدہ رہے، وہ بہت بڑا شاعر، خطیب اور خطاط بھی تھا، اس کا جانشین المنذر تھا، جس کی حکومت دو سال تک رہی، مگر اس نے اپنے حزم، تیز فہمی اور شجاعت سے عیسائیوں پر فتوحات حاصل کیں، اس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

اس خاندان کا لائق ترین فرمانروا عبدالرحمٰن ثالث تھا، اس کے انتقال کے بعد اس کے کاغذوں میں ایک بیاض نکلی جس میں اس نے خود لکھا تھا کہ "میں نے نہایت امن اور کامیابی کے ساتھ پچاس برس حکمرانی کی، میری رعایا مجھ پر فدا تھی، میرے دشمن مجھ سے لرزاں تھے، میرے حلیف اور دوست مجھ سے خوش تھے، دنیا بھر کے بادشاہ میری دوستی کے طلبگار تھے، کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس کی خواہش انسان کے دل میں ہوا کرتی ہے وہ مجھ کو میسر نہ ہوئی ہو، شہرت، قوت اور عیش سب کچھ مجھے حاصل تھا، میں نے اس طویل زندگی میں ان دنوں کو گنا ہے جن میں بے فکر رہا ہوں اور مجھے حقیقی خوشی نصیب ہوئی، وہ شمار میں صرف چودہ تھے، کیا دنیا کا کوئی حکمراں اپنی حکمرانی میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے"، اس نے الناصر لدین اللہ کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا، اس کے بعد اس کے جانشین بھی ایسے القاب اختیار کرتے رہے

عبد الرحمٰن ثالث کے لڑکے حکم ثانی کے زمانہ میں حکومت سنبھلی رہی، جس میں علم و فنون کو بڑا فروغ ہوا، اس کے بعد ہشام ثانی، المظفر اور مہدی وغیرہ تخت پر بیٹھے، مگر پھر طوائف الملوکی ایسی بڑھی کہ چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی، مسلمان قرطبہ کو کھو کر غرناطہ میں سمٹ آئے، مگر یہاں بھی وہ متحد نہیں رہے، عیسائیوں نے ان کے نفاق و افتراق سے پورا فائدہ اٹھایا، وہ آٹھ سو برس کے بعد اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرنے میں کامیاب ہوگئے، اسٹینلی لین پول اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حکومتیں دنیا میں عروج حاصل کرکے ختم بھی ہو جاتی ہیں، یونان، روم اور دنیا کی بہت سی قدیم سلطنتیں جاتی رہیں، اسی طرح اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا، مگر اس کو دکھ ہے کہ اندلس سے مسلمانوں کو خالی کرکے عیسائی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، انھوں نے یورپ کے ایک زریں راج ہنس کو ہلاک کر دیا، اسپین مسلمانوں کی وجہ سے صدیوں تک تمدن، آرٹ، سائنس، علوم اور ہر قسم کی روشن خیالی کا مرکز بنا رہا، یورپ کا کوئی ملک اس معیار کو نہیں پہونچ سکا، مگر اس ملک میں ان کے بعد جو گہن لگا اس کی تاریکی آج تک دور نہیں ہو سکی ہے، لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے رومن امپائر کو ختم کیا تو عیسائیوں نے اس کا بدلہ اسپین میں لیا۔

ایس۔ پی اسکاٹ نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کو اس ملک کو از سر نو فتح کرنے میں آٹھ سو برس متواتر جد و جہد کرنی اور پانچ ہزار لڑائیاں لڑنی پڑیں، ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت تک وہی قوم دوسرے ملک میں جا کر حکومت کر سکتی ہے جس کے فرمانروا زیادہ تر اچھے رہے ہوں، اندلس میں ایسے اچھے حکمرانوں کی تعداد زیادہ رہی، اسی لیے ط اب تک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی

ایس۔ پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ عبد الرحمٰن ثالث نے [illegible] کے کام [illegible] انجام دیے، اور اپنے عہد میں بڑی شان و شوکت پیدا کی، [illegible] لکھتا ہے کہ المستنصر [illegible] تمام عیسائی دنیا [illegible]

بہتر معلوم ہوتا تھا، یورپ کے فرمانروا اس سے سفارتی تعلقات رکھنے میں فخر کرتے، اس کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو مشورے کے لیے بلاتا، وہ اپنے دور وسطیٰ کے بجائے موجودہ دور کا فرماں روا ہونے کے لائق تھا، اڈربوکریچ لون بیمط ازہے کہ حکم کے زمانہ میں عبدالرحمٰن سوم زیادہ حکومت کی شان و شوکت بڑھ گئی تھی خصوصاً جب اس نے پرتگال کے علاقہ پر قبضہ کر لیا، غرناطہ کے حکمراں محمد بن احمر کے بارہ میں اس پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ وہ نہایت قابل بادشاہوں میں سے تھا، اس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سخت پرآشوب زمانہ میں مسلمانوں کے دین کی عزت اور ان کی تلوار کی عظمت کو قائم رکھا

واشینگٹن لین پول اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پر عام تبصرہ یہ لکھ کر کرتا ہے کہ عرب فاتحوں نے جس نرمی، عدل پروری اور دانشمندی سے اندلس پر حکومت کی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی، یہاں کے باشندے اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے زمانے سے زیادہ خوش تھے، ان کو اپنے قوانین اور ججوں کو رکھنے کی اجازت تھی، ضلعوں میں ان ہی کے ہم مذہب حکام ہوتے، وہی ان سے ٹیکس وصول کرتے، وہی ان کے باہمی جھگڑے چکاتے، عیسائی حکومت کے زمانہ میں زبردستی مذہب کی تبدیلی کے لیے مجبور کیے جاتے، مسلمانوں نے ان پر کبھی ایسا دباؤ نہیں ڈالا، خود عیسائی علانیہ اعتراف کرتے کہ فرینکوں اور گوتھوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حکومت کہیں بہتر ہے۔

اس، پی، اسکاٹ کا بیان ہے کہ تمام سائنٹفک کاموں اور زندگی کے عملی امور میں اندلس کے مسلمان تنہا علم و ہنر کے ساتھ اپنا کمال اور جوہر دکھاتے رہے، صنعت کا کوئی میدان ان کے لیے تنگ نہ تھا، جزئیات و کلیات کی تحقیق کے لیے ان کا میدان وسیع تھا، انھوں نے اپنی قوت عقلیہ اور مہارت تامہ سے ان چیزوں سے مفید کام لیا جو دوسری قوموں کے لوگ نہایت حقارت سے رد کرتے رہے ہیں، وہ یورپ پر تہذیب و تمدن کا مستقل نقش چھوڑ گئے ہیں، قرون وسطیٰ کے یورپ کے سیاہ نقشے پر اگر کوئی سفید اور روشن جزو نظر آتی تھی

تو وہ اس زمانہ کا اندلس تھا۔ یورپ کی ضروریات اور ایشیا کے تعیشات کے لیے مسلمان اہل اندلس کی ذہانت، کاوش اور صنعت و حرفت سے مہیا ہونے والا سامان پہنچتا رہا۔

قرطبہ، مدینۃ الزہرا، غرناطہ اور الحمراء وغیرہ کو ان مسلمانوں نے جس طرح سنوارا، اس سے یورپ والوں کی آنکھیں خیرہ رہیں۔ خود یورپی مصنفین لکھتے ہیں کہ قرطبہ اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے صحیح معنوں میں ملک کا حسن، صراط الورد، اور جان العروس کہلانے کے لائق تھا۔ یہ دولت کا خزینہ، تجارت کا مرجع انام اور تمام یورپ کی سیاست کا عنوان سمجھا جاتا تھا۔ صنعت و حرفت، سائنسی کمالات اور تہذیب و تمدن کے عروج میں فرانسیسی مورخ موسیو لیبان کے قول کے مطابق کوئی اور دار السلطنت مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں اٹھارہ سو [۱۸۰۰] مسجدیں، ساٹھ ہزار [۶۰۰۰۰] محلات اور دلکش عمارتیں، دو لاکھ [۲۰۰۰۰۰] مکانات اور سات سو [۷۰۰] حمام تھے۔

اس۔ پی اسکاٹ کے خیال میں مدینۃ الزہرا اپنی جائے وقوع اور تعمیری خوبصورتی کے اعتبار سے اتنا دلکش تھا کہ دور گیتی نے کوئی اور جگہ اس کے مقابل میں نہ دیکھی تھی اور نہ دیکھے گی۔

غرناطہ میں کھجور اور انار کے پہلو بہ پہلو آلو بالو اور لیموں بکثرت پیدا ہوتے، زیتون کے باغات اتنے تھے کہ سیاح انکو شاہ بلوط کے جنگل سے تشبیہ دیتے تھے، ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے شہتوت کے درخت ہوتے، ساحل کے نزدیک روئی اور کتان کی کاشت ہوتی، دواؤں کے پودوں کی کاشت بڑے سلیقہ سے کی جاتی، زمانۂ حال کے اطبا ان ہی پودوں کی بنائی ہوئی دواؤں سے یورپ میں علاج کر رہے ہیں، یہ ساری چیزیں عربوں کی وجہ سے وہاں رائج ہوئیں، پھر شہر اپنی عمارتوں کی رنگا رنگی کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا کہ شعراء اپنی زبان میں کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمرد کے ساغر میں موتی جڑے ہوئے ہیں، یہاں کے محلات کا سرتاج الحمراء تھا، جس میں اندلس کے مسلمانوں کے صدیوں کا تمدن سمٹا ہوا نظر آتا تھا، اس کی حیرت انگیز رنگ آمیزیوں اور گل کاریوں کو دیکھ کر ایک فرانسیسی شاعر نے کہا تھا کہ اس قصر شاہی کو جنات نے آراستہ کیا اور اس کو ہر رنگ کی نغمہ سرائی کا گہوارہ بنایا، اور یہ ایک طلسماتی خواب دکھائی دیتا۔

اندلس میں علوم و فنون کے جو یگانۂ روزگار پیدا ہوئے ان کی داستان الگ ہے۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

سیر الصحابہ جلد ششم میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے حالات

امیر معاویہؓ کے بعد کربلا کا جو خونیں واقعہ پیش آیا تو اُس وقت حضرت عبداللہؓ بن زبیر مکہ میں حرم کی پناہ میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے اہل تہامہ اور اہل حجاز کو اپنی بیعت کی دعوت دی، چند لوگوں کے علاوہ سبھوں نے بیعت کرلی، اس کے بعد یزید کے عمال کو مدینہ سے نکال دیا، یزید نے ان کے مقابلہ میں ایک فوج بھیجی جس نے خانۂ کعبہ پر بھی آتش باری کی، اور اس کی عمارت کو نقصان پہونچایا، مگر یزید کی یکایک وفات سے یہ فوج واپس ہوگئی، یزید کے بعد مروان اس کا جانشین ہوا، جس نے شام اور مصر سے ابن زبیرؓ کے حامیوں کو نکال دیا، مگر وہ بھی جلد مرگیا تو اس کے لڑکے عبدالملک کی تخت نشینی ہوئی، اسی انتشار کے زمانہ میں ثقیف کا ایک عالی دماغ شخص مختار ثقفی ابھرا، جس نے پہلے حضرت ابن زبیرؓ کے مزاج میں رسوخ پیدا کیا، پھر ان سے کٹ کر حضرت امام حسینؓ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ کا سرپرست بن گیا اور قاتلین حسینؓ سے بدلہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا جس سے اس کی مقبولیت بڑھی، وہ عراق پر قابض ہوگیا اور حضرت حسینؓ کے قاتلوں شمر ذی الجوشن سنوی، ابجی اور عمر بن سعد کو قتل کرکے ان کے سر محمد بن حنفیہ کے پاس بھجوا دیے، مگر کچھ دنوں بعد کوفی عربوں نے مختار ثقفی کی مخالفت شروع کردی، ان کو یقین ہوگیا کہ وہ بنی ہاشم کے پردہ میں اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے،

بالآخر وہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ محمد بن حنفیہ کا کوئی پشت پناہ باقی نہ رہا، حضرت ابن زبیرؓ نے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا، لیکن انھوں نے بیعت سے انکار کیا اور وہ طائف جاکر پناہ گزین ہوئے، مختار کے قتل کے بعد حضرت ابن زبیرؓ کی قوت بڑھ گئی اور ان کا قبضہ مختار کے مقبوضہ علاقوں پر بھی ہو گیا، مگر ان کا مقابلہ عبدالملک سے ہوا تو عبدالملک نے حجاج کی نگرانی میں فوج بھیج کر حرم کا محاصرہ کر لیا، ابن زبیرؓ نہایت دلیری اور پامردی کے ساتھ مدافعت کرتے رہے، مگر جب رسد کی کمی ہوگئی اور ان کے ساتھیوں نے بے وفائی کرنی شروع کی تو وہ اپنی والدہ کے پاس پہونچے اور ان سے مشورہ طلب کیے، ماں بیٹے کی جو گفتگو ہوئی وہ اسلام کی تاریخ کا زندۂ جاوید ولولہ انگیز واقعہ ہے، اس کو شاہ صاحبؒ نے جس موثر طریقہ سے بیان کیا ہے، وہ ان ہی کی تحریر کے ذریعہ سننے کے لائق ہے:

"ابن زبیرؓ نے اپنی بے بسی کا عالم دیکھا تو مایوس ہوکر ایک دن اپنی ماں حضرت اسماءؓ کی خدمت میں عرض کیا: اماں! میرے تمام ساتھیوں نے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے، حتیٰ کہ میرے لڑکے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اب صرف چند فدائی باقی رہ گئے ہیں، لیکن ان میں بھی مقابلہ کی تاب نہیں، اور ہمارا دشمن ہمارے منشا کے مطابق مطالبات پورا کرنے پر آمادہ ہے، ایسی حالت میں آپ کیا فرماتی ہیں؟"

اس وقت ان کی ماں حضرت اسماءؓ کی عمر سو برس سے متجاوز ہو چکی تھی، کئی جوان بیٹوں اور پوتوں کے داغ اٹھا چکی تھیں، دل و جگر فگار تھے، نامور بیٹوں میں صرف عبداللہؓ باقی تھے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اس پیرانہ سالی اور ایسی خستہ دلی کے ہوتے ہوئے بھی صدیق اکبرؓ کی اولوالعزم اور بہادر بیٹی نے آمادۂ قتل بیٹے کو جو شریفانہ جواب دیا اس پر عورتوں کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، فرمایا: بیٹا! تم کو خود اپنی حالت کا صحیح اندازہ ہوگا، اگر تم کو اس کا یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور حق کی دعوت دیتے ہو، تو جاؤ اس کے لیے لڑو کہ تمھارے بہت سے ساتھیوں نے بھی جان دی ہے، لیکن اگر تمھارا مقصد

دنیا طلب ہو تو تم سے بڑھ کر برا کون خدا کا بندہ ہوگا کہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ہلاک کیا، اگر یہ عذر ہے کہ تم حق پر ہو لیکن اپنے اعوان و انصار کی کمزوری سے لاچار ہوگئے ہو تو یاد رکھو شریفوں اور دین داروں کا یہ شیوہ نہیں ہے، تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے، جاؤ، حق پر جان دے دینا زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

ماں کی زبان سے یہ بہادرانہ جواب سن کر حضرت عبداللہؓ بن زبیر نے کہا: اماں! مجھے صرف اس کا خوف ہے کہ اگر بنوامیہ میرے قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو میری لاش کو مثلہ کر کے سولی پر لٹکائیں گے، اور اس کی بے حرمتی کریں گے، بہادر ماں نے جواب دیا:

"بیٹا! ذبح ہونے کے بعد بکری کو کھال کھینچنے سے تکلیف نہیں ہوتی، جاؤ خدا سے مدد مانگ کر اپنا کام پورا کرو۔"

یہ حوصلہ افزا باتیں سن کر حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ڈھارس بندھی، ماں کے سر کا بوسہ دے کر بولے،

"میں نے یہ صفائی اپنے نفس کی کمزوریوں سے بہلانے کے لیے نہیں پیش کی، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو یہ تسکین رہے کہ آپ کے لڑکے نے ناحق بات کے لیے جان نہیں دی۔"

ماں نے جواب دیا:

"مجھے امید ہے کہ میں ہر حالت میں صبر و شکر سے کام لوں گی، اگر تم مجھ سے پہلے دنیا سے چل بسے تو صبر کروں گی، اور اگر کامیاب ہوئے تو تمہاری کامیابی پر خوش ہوں گی، اچھا جاؤ! دیکھوں خدا کیا انجام دکھاتا ہے۔"

اس کے بعد ماں نے ان کے حق میں دعا کر کے انہیں خدا کے سپرد کیا، پھر اپنے لیے صبر و شکر کی دعا مانگی، دعا مانگ کر بیٹے کو گلے لگا کر بوسہ دیا، اور جب یہ کہہ رہی تھیں کہ جاؤ اپنا کام پورا کرو تو گلے لگانے میں ان کی زرہ پر ہاتھ پڑ گیا، پوچھا:

دیا کہ کیا ابھی اس [illegible] نہیں ہے؟

ماں کے اس فرمان پر وہ تاریخی معرکہ میں لڑتے ہوئے مقتل میں پہنچے، قریش کا یہ یگانہ بہادر، حواریٔ رسولؐ کا لخت جگر اور ذات النطاقین کا نور نظر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ حجاج نے قتل کے مقام میں ان کی لاش کو قریش کی عبرت کے لیے بیرون شہر ایک بلند مقام پر سولی پر لٹکوا دیا، کچھ دنوں کے بعد سولی سے اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھنکوا دیا، پھر وہ ان کی ماں کو طرح طرح کی دھمکیاں دے کر ان کے پاس پہونچا اور بولا: سچ کہنا خدا نے اپنے دشمن کو کیا انجام دکھایا' دلیر خاتون نے جواب میں جہاں اس سے اور باتیں کہیں وہاں یہ بھی کہا کہ تو نے ان کی دنیا خراب کی لیکن انھوں نے تیری آخرت برباد کی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بنی ثقیف میں کذاب اور مبیر ہوں گے، کذاب تو ہم لوگوں نے دیکھ لیا تھا مبیر باقی رہ گیا تھا، وہ تو ہے!

یہ داستان اس صحابی کی ہے جس کے متعلق شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عثمان بن طلحہ کہتے تھے کہ تین چیزوں میں ابن زبیرؓ کا کوئی حریف نہیں، عبادت، بلاغت اور شجاعت، شاہ صاحبؒ نے ان کے ان تمام اوصاف کی بڑی حقیقی اور جاگتی تصویر اپنی اس کتاب میں کھینچی ہے جس سے اس زمانہ کی پوری تاریخ بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے، اس کو پڑھتے وقت یہ خیال غالب رہتا ہے کہ اس دور کی خونریزی کے بجائے مسلمان مسلمان بن کر ایک دوسرے کے لیے صلح و آشتی اور محبت و یگانگت کے پیامبر بنے رہتے تو آج ان کی تاریخ کیا سے کیا ہوتی، خود شاہ صاحبؒ کو بھی اس کا بڑا دکھ رہا، بڑے درد کے ساتھ لکھتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور تک مسلمانوں کا شیرازہ بندھا ہوا تھا، ان کی تمام قوتیں غیر مسلموں کے مقابلہ میں صرف ہوتی تھیں، اس لیے جدھر رخ کرتے تھے، فتح و نصرت قدم چوم لیتی تھی، لیکن چند ہی برسوں میں دفعۃً حالات بدل گئے، اور مسلمانوں میں ایسا تفرقہ پیدا ہوگیا کہ پھر ان کی شیرازہ بندی نہ ہوسکی" (ص ۲۵۶)

حضرت عبداللہ بن زبیر کے حالات میں اس تفرقہ کی پوری تفصیل شاہ صاحبؒ نے عبرت انگیز اور سبق آموز انداز میں پیش کردی ہے، جس میں ان کے قلم نے ان کی بڑی مدد کی۔

سیر الصحابہ جلد ہفتم | سیر الصحابہ جلد ششم کی اشاعت کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۲۶ء میں شاہ صاحبؒ کی سیر الصحابہ جلد ہفتم شایع ہوئی، جس میں ایک سو پچاس صحابہؓ کے حالات ہیں مگر وہ مختصر ہیں، اسی لیے ان کے حالات کے قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ کے قلم کا وہ زور نہیں دکھائی دیتا ہے جو ان کی گذشتہ جلد میں دکھائی دیتا ہے، اس کی وجہ خود انھوں نے یہ بتائی ہے کہ ان کے حالات، حدیث اور طبقات کی کتابوں میں محض برائے نام ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحابہؓ ایسے وقت کے مسلمان یا پیدا شدہ ہیں، جبکہ عہد رسالت اور تبلیغ اسلام کا نازک اور ابتدائی دور، جو آزمایش وامتحان کا حقیقی دور تھا، گذر چکا تھا، اس لیے انھیں صحابہؓ کی صف اول میں جگہ نہ مل سکی، اس کے علاوہ تاخیر اسلام اور صغر سنی کی وجہ سے انھیں فیضان نبوت سے استفادہ کا بھی پورا موقع نہ مل سکا، اسی لیے ان میں وہ روح نہ پیدا ہوسکی، جو مہاجرین وانصار کا طغرائے امتیاز ہے، لیکن ان کے حالات کا لکھنا اس لیے ضروری تھا کہ سلسلۂ سیر الصحابہ میں اخلاقی درس کے ساتھ عصر صحابہؓ کی پوری تاریخ بھی مسلمانوں کے سامنے آجائے۔ ان کے حالات مختصر ضرور ہیں لیکن بقول شاہ صاحبؒ نکہت بیزی کے لیے مشک خالص کا ایک ذرہ بھی کافی ہوتا ہے، اور متلاشیان راہ حقیقت کے لیے تاروں کی روشنی بھی شمع ہدایت کا کام دیتی ہے (دیباچہ ص ۸)

شاہ صاحبؒ اس کتاب کے لکھنے میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ حضرت سید صاحبؒ نے حسن خاتمہ کے عنوان سے اس کے آغاز میں یہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج سے پندرہ سال پیشتر سیر الصحابہ کے نام سے جس سلسلہ کا آغاز کیا گیا تھا اس جلد پر آج بحمد اللہ اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں دس جلدیں دارالمصنفین سے شایع ہوئیں، جن میں سے تین جلدوں کے لکھنے کی سعادت شاہ صاحبؒ کو حاصل ہوئی، اور انہی کی آخری جلد پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔

شاہ صاحب کے ایک مضمون کا اچھا اثر

پہلے ذکر آچکا ہے کہ [illegible] میں حضرت ابوہریرہؓ پر جو گستاخانہ مضمون شائع ہوا تھا شاہ صاحبؒ نے اس کا مدلل جواب [illegible] کے معارف میں دیا، اس گستاخانہ مضمون کے لکھنے والے سید مقبول احمد تھے، جو اس زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کو اسی قسم کے مضامین لکھنے میں لذت محسوس ہوتی تھی، شاہ صاحبؒ کے مضمون کی اشاعت کے بعد ان پر یورش ہوئی تو انھوں نے اپنی ایک تحریر میں باضابطہ اعلان کیا کہ میرا تعلق نگار اور اس کے الحادی مضامین سے ہرگز نہیں، ہاں حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق میری تنقید و جرح میں مجھے ایک سخت غلطی کا اشتباہ ہوا، اور میرا یہ اسلامی فرض ہے کہ بہت جلد اپنی رائے کا اظہار کر کے اس سے قطعی رجعت کروں، اور میں اس کو کسی دنیاوی خوف سے نہیں لکھ رہا ہوں، حضرت ابوہریرہؓ کے خلاف امام رازی، شعرانی، ازرقی اور صحابہؓ میں ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی نسبت سکوت کرتا ہوں، اس پر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا ہے کہ ایسے عالم نما جہلاء کے شوق نمائش کے فرو کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ فریب نفس کے جس طلسم میں وہ اب تک مبتلا تھے وہ کہاں تک اصلیت رکھتا تھا، مگر حضرت سید صاحب نے اس کی ذمہ داری علماء پر بھی رکھی جن کے بارہ میں تحریر فرمایا کہ وہ اپنے وعظ و پند کے لیے مشککین کی اس جماعت کو چھوڑ کر صرف عوام کو منتخب کر لیا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان مشککین کی بیماری ناقابل علاج ہے، وہ نہ کبھی ان کے خیالات کو سنتے اور نہ ان کے شکوک کو دور کرتے ہیں، اور کبھی وہ ان کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو ایسی زبان اور طریقۂ ادا اور اسلوب بیان میں اپنا مدعا ظاہر کرتے ہیں کہ متکلم و مخاطب دونوں کو ایک دوسرے سے گھبراہٹ ہوتی ہے (شذرات معارف نمبر ۵ جلد ۲۸) سید صاحبؒ نے اسی بات کو سامنے رکھ کر شاہ صاحبؒ کو ان مشککین کے خلاف میدان میں اتارا، جس میں اتر کر انھوں نے مردانہ وار جنگ کی، اور وہ زبان، طریقۂ ادا اور اسلوب بیان اختیار کیا جو سید صاحب چاہتے تھے، اسی لیے ڈپٹی مقبول احمد نے سپر ڈال دی۔

اوقات نماز پر ایک اہم مضمون

ڈپٹی مقبول احمد نے معافی تو ضرور مانگ لی، مگر اس سے پہلے نگار میں جس کو شاہ صاحبؒ نے

فتنہ ہندنا اوسلم و مذہب کا مشہور آرگن قرار دیا، ان کا ایک اور مضمون "نقاب پوش حق گو" کے نام سے چھپ چکا تھا، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ قرآن پاک میں ظہر اور مغرب کا کوئی ذکر نہیں، درحقیقت ظہر اور مغرب کا کوئی وقت بھی نہیں، بلکہ یہ دونوں اوقات عصر و عشاء کی تقدیم و تاخیر سے پیدا ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی عشاء کی نماز جلدی پڑھ لی اور کبھی دیر کرکے، اسی طرح عصر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اول وقت پڑھ لی، کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت، دیکھنے والے یہ سمجھے کہ آپ نے علیحدہ علیحدہ دو اوقات کی تعداد کی، آپ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے باجماعت پڑھتے تھے، لوگوں نے انکو بھی مستقل فرض نماز شمار کر لیا، صحابہؓ کے عہد میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے اوقات ایک دوسرے کے معنیٰ میں سمجھے جاتے تھے، ابن عباسؓ کی روایت جمع بین الصلاتین سے اس کی تائید ہوتی ہے، حدیث سے ظہر و مغرب کی نمازوں کا ثبوت نہیں ملتا، خارجی جو صحیح مسلمان تھے وہ تین ہی وقت کی نماز پڑھتے تھے، پانچ وقت کی نماز مجوسیوں کی نقل ہے۔

اس قسم کے مذہبی ہفوات کی تائید نگار کے مدیر نے اپنے ملاحظات میں یہ لکھ کر کی کہ ہمارے مولوی بالکل ٹھوس اور جامد ہیں، علمائے مغرب کی طرح اپنے دماغ سے کوئی اختراع نہیں کرتے، اور اگر کوئی روشن دماغ اور روشن ضمیر موجد و مخترع ذہن و دماغ کی تربیت کے لیے کوئی جدید تحقیقات اور نئی ایجاد پیش کرتا ہے تو مولوی کفر کا فتویٰ دے کر سوسائٹی سے خارج کر دیتے ہیں، تنقید حدیث، اوقات صلوٰۃ، ایام صیام، اور قتل مرتد کی نئی تفسیروں میں علمائے جدید کی ہم نوائی نہیں کرتے۔

اس تکلیف دہ مضمون کو ایک دیوانے کی بکواس سمجھ کر نظر انداز کرنے کی ضرورت تھی، لیکن استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی ایمانی حرارت بروئے کار آئی اور انھوں نے اپنے لائق شاگرد جناب شاہ صاحبؒ سے اس کا جواب پھر لکھوایا جو حضرت سید صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف کے اٹھاون صفحے اس کے لیے مخصوص کیے اور اس میں کوئی اور مضمون شائع نہیں کیا۔

شاہ صاحب نے علوم پاک حدیث، آثار تدوین حدیث، صحابہ کرامؓ کے اقوال اور مجتہدین سلف کے با اختلافات مل سے بھی منصفانہ انداز میں اس پورے مضمون کو شروع سے آخر تک کذب و دروغ اور تحریف و تلبیس کا ایک دفتر قرار دیا، اس کے لکھنے میں ان کا انداز جہاں محققانہ اور عالمانہ تھا وہیں ان کے ناقدانہ اسلوب میں زہریلا رنگ بھی پیدا ہو گیا، حضرت سید صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب کوئی اللہ اس کے رسولؐ، کلام پاک اور احادیث پر حملہ آور ہوتا ہے تو پھر اس کے جواب میں ان کی تحریر اس قدر تلخ ہو جاتی کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کی زہرناکی کو نہیں دھو سکتا ہے۔ مذکورہ بالا مضمون میں دین اسلام کے ختم نبوت شعائر نے اس کی جس طرح بیخ کنی کی کوشش کی، اس سے اپنے محترم استاذ کی طرح شاہ صاحبؒ کا تلملا کر [illegible] ضروری تھا، انھوں نے اس کے جواب میں نگار کے مدیر اور اس کے مضمون نگار کی خبر جس طرح لی؟ اس میں ناگزیر زہرناکی بھی ہے، مدیر نگار نے مولویوں کو جامد اور اپنے مضمون نگار کی بعض تحقیقات کو انقلاب قرار دیا تھا، اس پر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ! کتنی صحیح منطق ہے، کیا اختراع و ایجاد کے لیے صرف مذہب ہی کا میدان رہ گیا؟ اور مذہب کی نئی تفسیروں ہی کا نام اختراع ہے اور ان ہی اختراعات کو قبول نہ کرنے سے مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے، کیا صرف تیس ہی دن کے روزوں اور پانچ وقت کی نمازوں میں ان کی بربادی و تباہی منحصر ہے؟ کیا مسلمان اس لیے پستی میں ہیں کہ وہ پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے اور مہینہ بھر کے روزے رکھتے ہیں، اور اگر اس کے بجائے دس دن کے روزے رکھنے لگیں اور تین وقت کی نمازیں پڑھنے لگیں تو ترقی کے اوج کمال پر پہنچ جائیں گے، تنزل اور ترقی کی یہ نئی تعبیر ایسی عجیب و غریب اختراع ہے کہ [illegible] علمائے مغرب بھی حیران رہ جائیں گے [illegible] ان اختراعات [illegible]
[illegible]

کھتی، پھر دیکھئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے یا ان کے کمال کی داد دی جاتی ہے، اس میدان میں تو پستہ قدی کا مذہب ہے، او مذہب کی تحقیق کے لیے ہر لنگڑا باد صبا کے دوش مرکب پر سوار نظر آتا ہے، جو موٹی موٹی کتابوں کے لکھنے کا ہم پہ طعنہ کیا جاتا ہے آج انہی کی بدولت یہ علم کی فراوانی ان کے کاشانہ میں نظر آتی ہے، اور اسی کے دستر خوان سے آج وہ علم سے بہرہ مند ہونے کے مدعی ہیں، جو اس سے بالکل تہی دامن ہیں، ہدیۂ سعیدیہ اور شرح چغمینی کا نام لینا آسان ہے مگر ان کا ایک صفحہ دیکھنا بھی کبھی نصیب نہ ہوا ہو، اور سمجھنا تو بڑی بات ہے۔"

مدیر نگار کی مسروقہ تحریروں سے جو ناظرین واقف ہوں گے، وہ شاہ صاحبؒ کے اس طنز سے لطف لیں گے:

"بہرحال مذہب کی ان نئی تفسیروں کا جہاں تک تعلق ہے واقف کار کی نظر میں وہ بھی ان مصلحین امت کے فضل و کمال کی ممنون نہیں، بلکہ تمام تر یورو بین مصنفین کی صدائے بازگشت ہے، البتہ ہمارا مجدد از قسم ادب لطیف یعنی شبابیات و عریانیات وغیرہ اپنے اختراعات میں پیش کر سکتا ہے، لیکن اس کے متعلق بھی عرض ہے کہ ؎

حسن نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست"

پھر مدیر نگار ہی کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"اس دور حریت میں زبان و قلم پر کوئی احتساب نہیں، جو جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج۔"

شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید اور احادیث سے تمام دلائل پیش کرتے ہوئے مضمون نگار کے مبلغ علم کو ظاہر کرنے کے لیے اس کو محقق فہیم، مفسر اعظم، فاضل محقق، منطقی، ناقد، فاضل مجتہد، نامور مورخ اور حریت نواز وغیرہ لکھ کر طنز کیا اور پھر جابجا اپنی زہریلی تحریروں سے اس کو مجروح کیا، مثلاً:

"ہمارا فاضل محقق جب تک تیاس کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور دوسرے کے مال کو اپنا کہہ کر پیش کرتا ہے [illegible] حقیقت کا وہ ڈھنڈورا پیٹتا ہے، اگر قرآن و حدیث کے متعلق،

واقعہ کو نہیں سمجھتا اور اس کی غلط تفسیر کرتا ہے تو بھی چنداں قابل الزام نہیں کیونکہ علوم اسلامیہ میں مہارت کی ضرورت ہے اور محض عربی کی استعداد سے قرآن و حدیث کا فہم قدرے مشکل ہے، لیکن جب وہ قیاس کی ہوائی فضا سے آگے بڑھ کر تاریخ کے معمولی واقعات کی دنیا میں آ جاتے ہیں تو اس کے فضل و کمال کا پردہ پورا فاش ہو جاتا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"تاریخ اسلام کا یہ نامور مورخ لکھتا ہے کہ وان کریمر کا خیال ہے کہ ابن عباسؓ نے امام حسنؓ اور ابن زبیرؓ کے خلاف بنی امیہ کے ساتھ مل کر سازش کی تھی، یہ لکھ کر نہایت عالمانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے کہ میں اس قیاس کو صحیح نہیں سمجھتا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تاریخ اسلام کے بارہ میں بالخصوص ایک بہت بڑے صحابی کے مقابلہ میں ایک متعصب یوروپین کی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لیے کہ بنی امیہ کے دربار میں ابن عباسؓ کی رسائی کبھی نہیں ہوئی، اس سے پوچھا جائے کہ جب اس بیہودہ قیاس کو غلط سمجھتا تھا تو اس نے اپنے قلم کو کیوں اس سے آلودہ کیا؟ لیکن وہ اپنی فطرت شتم صحابہ سے مجبور ہے۔"

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "فاضل علامہ کی تاریخ دانی کا یہ حال ہے کہ انھیں ابن عباسؓ اور بنی عباس کا فرق نہیں معلوم، بنی عباس کنھیں کہا جاتا ہے اور ابن عباسؓ سے کون مراد ہوتا ہے، تاریخ اسلام میں دولت عباسیہ کے لیے ابن عباسؓ نہیں بلکہ بنی عباس استعمال کیا جاتا ہے، ابن عباسؓ سے مراد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ذات ہے، اور معلوم نہیں یہ کس فاضل محقق کی تحقیق ہے کہ بنی عباس کے زمانہ میں حدیث گوئی کے فن نے ترقی کی، ناقد کو معلوم ہونا چاہیے کہ اشاعت حدیث کا اصل زمانہ خلفائے راشدین اور بنی امیہ کا تھا کہ تمام بڑے بڑے حفاظ حدیث صحابہؓ ان ہی دونوں زمانہ میں تھے۔"

اور آخر میں شاہ صاحبؒ کا لب و لہجہ اور بھی تیز ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

شی تک اسلام قرآن، احادیث، اسوۂ رسولؐ اور عمل صحابہؓ کی تکذیب و تردید یورپین مستشرقین کے گمراہ کن بیانات سے کرتا ہے، تاریخی حیثیت سے بھی ان خرافات کی کوئی حیثیت نہیں، وہ ان بیانات کے ثبوت میں اسلامی تاریخ سے کوئی ضعیف سے ضعیف سند بھی پیش کرسکتا ہے یا محض مستشرقین یورپ کی متعصبانہ تحریروں سے نماز کی فرضیت اور عدم فرضیت کا فیصلہ ہوجائیگا اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حرف بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں، وہ بتائے کہ عہد نبوت یا عہد خلافت میں کب تک تین وقتوں کی نمازیں اور جاتیں تھیں، اور کب زرادتہ اور مانویہ کے اثر سے پانچ وقت کی ہوئیں، کیا اس عظیم الشان تغیر کی کوئی تاریخ دنیا میں موجود نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس بے بنیاد دعویٰ کے لیے کیا ثبوت اس کے پاس ہے۔"

شاہ صاحبؒ کے اس مدلل مضمون کے بعد نگار کے مضمون کی حیثیت بے سروپا خرافات کی بھی گئی اور نہ صرف مضمون نگار بلکہ نگار کے مدیر مسلمانوں کی نظر میں مطعون رہے۔

جگر مرادآبادی کی شاعری پر ایک اہم مضمون

شاہ صاحبؒ نے نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف میں جگر مرادآبادی کے مجموعۂ کلام شعلۂ طور پر ایک بہت ہی عمدہ مضمون لکھ کر اپنے قلم کی ادبی گل کاری کا نمونہ دکھایا۔

اعظم گڈھ سے جگر مرادآبادی کا تعلق بڑا گہرا رہا، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اعظم گڈھ ہی کے افق سے ایک بہت ہی دل آویز غزل گو کی حیثیت سے ابھرے، بلکہ بقول شاہ صاحبؒ ان کی شہرت نے یہیں پر پرواز لگائے، وہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ یہاں بی۔ ان۔ بنجل کی عینکوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے آتے تھے، ایک محلہ کے لوگوں کو اپنی غزلیں تفریحاً سنائیں تو اس زمانہ میں یہاں کے مشہور وکیل جناب مرزا احسان احمد کی نظریں ان کی طرف اٹھیں، وہ وکالت ضرور کرتے تھے مگر طبعاً ایک اچھے شاعر، ایک اچھے ادیب اور ایک اچھے نقاد تھے، جگر کی شاعری سے متاثر ہوئے تو جنوری ۱۹۲۰ء کے

رسالۂ مخزن لاہور میں ان پر ایک مضمون لکھا، اور ان کی شاعری کو بہاریان لکھنؤ اور دہلی کے [illegible] کہا، پھر ان کو جگر کے دیوان کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، اگرچہ ان کی لاپروائی سے ان کی غزلیات کا ایک معتدبہ ذخیرہ تلف ہو چکا تھا، تاہم جو کچھ سرمایہ حاصل ہو سکا اس کا ایک گلدستہ بنا کر مرزا احسان احمد صاحب نے 'داغ جگر' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا، اس میں ان کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں جگر صاحب کے حالات کے ساتھ ان کی شاعری کے جوش بیان، وسعت تخیل، جذبات نگاری، نکتہ آفرینی، سوز و اثر اور جدت ادا وغیرہ پر بڑا پُر مغز تبصرہ ہے، مرزا احسان احمد نے اس وقت لکھا کہ جگر نے اپنی قوت تخیل کو ایک پیکر اعجاز بنا دیا ہے، ان کا ایک ایک حرف جوش محبت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے، بلکہ ان کا ایک ایک شعر اسرار فطرت کا ایک متقفل خزانہ ہے، اس کی ایک ایک ادا عشق کی مستانہ کیفیتوں سے لبریز ہے، پھر تعجب کا اظہار کیا کہ ادبی دنیا اب تک ان کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا ہے۔

جب مرزا احسان احمد کی تحریروں سے ادبی دنیا جگر کی شاعرانہ عظمت سے آشنا ہوئی تو وہ مرزا احسان احمد کے بار احسان سے جھکے رہتے، وہ جب اعظم گڈھ آتے تو ان سے بڑی مخلصانہ محبت کے ساتھ ملتے، ان سے جگر کی عقیدت کا اظہار اس شعر سے بھی ہوگا ؎

میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر
دل ہر اک حال میں ہے حضرت احساں کے قریب

مرزا احسان احمد ہی کے حسن وساطت سے وہ جناب اقبال سہیل سے بھی ملنے گئے، شعر و ادب میں ان کی استادانہ مہارت اور امعان نظر کے قائل ہوتے گئے، مرزا احسان احمد ہی ان کو دارالمصنفین لائے، خود حضرت سید صاحب ان کے کلام سے متاثر ہوئے، ان کی غزلوں کو معارف میں چھاپنے لگے، اور ان کی سرخی خون جگر رکھتے، اس طرح انھوں نے بھی ان کو اچھالنے کی کوشش کی، جس کے بعد وہ مشہور عام ہو گئے، اور جب جگر نے اپنا کلام 'شعلۂ طور' کے نام سے مرتب کیا تو سید صاحب سے اس کا

تنقید لکھنے کی درخواست کی جناب مرزا احسان احمد نے اس کی تائید کی، سید صاحبؒ نے اس پر لکھنا شروع کیا تو پھر ان کے قلم سے ادب کے آبدار موتی جھڑ کر جھلملانے لگے، اور یہ تحریر ان کے ادب و انشاء کی رعنائی اور دلآویزی کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کے پڑھنے سے قارئین کو نثر منظوم کا لطف آئے گا، رقمطراز ہیں:

"جگر کی شاعری میں زلف و شانہ ہے نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شہدا کے دل و جگر کی گل کاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے باربار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھائی دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے، مگر وہ تصویر نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے۔"

آگے چل کر سے خوار اور جام و مینا میں سرشار جگر کے متعلق لکھتے ہیں:

"جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے، اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو، اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود و فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پُرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں یہ اثر نہ ہو۔"

سید صاحبؒ نے اپنی مذکورۂ بالا تحریر کے دوسرے ٹکڑے میں رند اور سرمست جگر سے متعلق جو رائے ظاہر کی اس پر بعض حلقوں میں چہ می گوئیاں اور نکتہ چینیاں بھی ہوتی رہیں، لیکن انھوں نے اپنی اس رائے میں

کہ تفہیم نہیں کی، سید صاحب نے اپنی کتاب نقوشِ سلیمانی میں اسی طرح شائع کیا، جگر کی آخری زندگی میں جو انقلاب آیا، انھوں نے جس عارفانہ انداز میں حج کیا، اور مدینہ منورہ میں حاضری دی، پھر جو نعتیں کہیں اور اپنے مرشد شاہ عبدالغنی منگلوری کی تعلیمات پر جس طرح عمل کیا اور ان کا جو خاتمہ بالخیر ہوا اس کے لحاظ سے سید صاحبؒ کا یہ لکھنا غلط نہ تھا کہ وہ خمخانہ کے بادۂ کیف سے بے خود ہوکر بزمِ ساقیٔ کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، مرزا احسان احمد صاحب نے جگر کی سرمستی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا، پھر بھی انھوں نے اسی زمانہ میں لکھا کہ حضرت جگر ان مخصوص شعراء میں ہیں جن کو قدرت نے صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ محسوسات کی بے رحم حکومت سے آزاد ہوکر صرف عالمِ روحانی کے اسرار و معارف کی پردہ کشائی کریں (مقدمہ داغِ جگر بحوالہ مقالاتِ احسان ص ۳۵۵)

اعظم گڈھ سے جگر کے اس تعلقِ خاطر کو سامنے رکھ کر شاہ صاحبؒ نے شعلۂ طور پر تبصرہ لکھا، ان کے استاذِ محترم حضرت سید صاحبؒ اور ان کے دیرینہ ملنے والے جناب مرزا احسان احمد جگر کے جس طرح معترف تھے، ان سب کا احساس ان کو تھا، پھر ان کا قلم ادبی تحریروں کے لیے بہت موزوں ہوچکا تھا، اس لیے جب جگر کے کلام پر تبصرہ کرنے لگے تو ان کے ادبی ذوق نے ادبی انداز کی تحریر لکھنے میں بڑی مدد کی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے:

"گو ان کا (یعنی جگر کا) گلستانِ شاعری آغاز ہی سے اپنے پربہار مستقبل کا پتہ دیتا تھا، تاہم آج سے دس برس پہلے اور اب کے کلام میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے، پہلے ایک کلی تھی، اب گلِ خنداں ہے، پہلے ایک جوئے مستانہ خرام تھا، اب پرشور طوفان ہے، پہلے بے خودی میں احساس بھی شامل تھا، اب ہمہ تن بے خودی اور بے خبری ہے، غرض یہ شراب پرانی ہوکر خالص جوہر بن گئی ہے جس کا ایک ایک قطرہ دوسرے لذت آشناؤں کو بھی سرشار بنا دیتا ہے۔"

اصول بھی مرتب کرتے جاتے ہیں جن کو یہاں پر درج کرنا اس لیے مناسب ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوجائیگا کہ ان کی نظر و فکر میں اچھی شاعری کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔

ان کے نزدیک شعر کی تاثیر کے لیے سب سے مقدم شرط الفاظ کا مناسب انتخاب اور ان کا صحیح استعمال ہے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ سامعہ کا سب سے پہلا اثر الفاظ کی شیرینی اور اس کے ترنم کا پڑتا ہے معنی پر بعد میں نظر جاتی ہے، معنوی حیثیت سے شعر کا مفہوم کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن اگر الفاظ شیریں اور ترکیب مترنم نہیں تو شعر بالکل پست ہوجائے گا اور سننے والے پر اس کا کوئی خاص اثر نہ پڑے گا، اس کے برعکس سادہ سے سادہ تخیل کو الفاظ کی سحرکاری کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔

وہ اپنے ذوق سلیم کے مطابق نظم کی ایک ممتاز خوبی یہ قرار دیتے ہیں کہ خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دقتوں کے باوجود سلاست و روانی میں کوئی فرق نہ آنے پائے، اور کسی جگہ زبان کو ٹھوکر نہ لگے، وہ نظم کی سلاست و روانی کا انتہائی کمال یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو نثر کرنے کے بعد بھی اس کی ترکیب میں فرق نہ آئے، یعنی اگر اسے نثر بنا دیا جائے تو کسی لفظ اور کسی جملہ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

اپنے دور کے بعض لوگوں کے مذاق سخن کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ انقلاب زمانہ کے باوجود یہ اب تک خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی اور اسلوب بیان کی ندرت کے مقابلہ میں زبان کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں، اور جو شعر اس ٹکسال کا ڈھلا نہیں ہوتا وہ خواہ کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو کھوٹا شمار کیا جاتا ہے اس پر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں شبہہ نہیں کہ ہر کلام کی خوبی کے لیے خواہ وہ نظم ہو یا نثر، زبان کی صحت اور سلاست نہایت ضروری شرط ہے، لیکن زبان کی صحت اور سلاست الگ شے ہے، اور لطف زبان اور شے ہے، لطف زبان سے مراد وہ مخصوص اور ٹکسالی محاورے ہیں جو اردو کے مخصوص کی جگہوں میں بولے جاتے ہیں، مگر میرے نزدیک زبان کی خوبی کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ اس میں کوئی صرفی اور نحوی خامی نہ ہو، محاورے کے خلاف نہ ہو، انداز بیان میں فصاحت اور دلکشی ہو، اگر کلام

اور جیسا کہ تب تو بھروں کا خیال ہے اور کسی عنصر کی ضرورت نہیں۔

ان کی یہ رائے بھی ہے کہ اردو شعر کا لطف فارسی کے شیریں الفاظ اور دلنشین ترکیبوں سے دوبالا ہو جاتا ہے، اور یہ وہ صناعی ہے جس سے زیور شاعری جگمگا اٹھتا ہے، فارسی کے شیریں الفاظ اور دلنشین ترکیبیں سلیقہ سے کھپائی جائیں تو اردو نثر و نظم کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہیں، اس سلسلہ میں صاف تیز لہجہ میں کہتے ہیں کہ زبان کی سادگی اور فارسی الفاظ و ترکیبوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، تضاد تو ان بد مذاقوں نے پیدا کر دیا ہے جنھیں اردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے کھپانے کا سلیقہ نہیں ہے، اور وہ فارسی کے ہر قسم کے الفاظ خواہ وہ اردو کے آہنگ سے جوڑ کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں، عبارت میں ٹھونس دیتے ہیں۔

شاعری کا اولین موضوع حسن و عشق ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حسن و عشق کی بنیاد تمام تر دل پر ہے، خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی، عشق کی آگ اسی چقماق سے پیدا ہوتی ہے، دونوں میں فرق اسی قدر ہے کہ عشق حقیقی میں دل کی کیفیتیں زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہو جاتی ہیں اور ہوا و ہوس کے تمام خس و خاشاک جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں، لیکن دل کا تعلق بہرحال قائم رہتا ہے۔

وہ سوز و گداز کو تغزل کی روح سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اسی سے تغزل کے جسم میں جان پڑتی ہے، گداز عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے، اس لیے کہ تغزل نام ہے حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا، اور سوز و گداز ہی عشق میں جلا دیتا ہے، اور اسی برق خرمن سوز سے مکمل شاعری پیدا ہوتی ہے۔

(۵) رنگینی خیال اور رنگینی ادا کو بھی شاعری کا نہایت ضروری عنصر بلکہ رخسار شاعری کا گلگونہ تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک شاعری میں اسی کی بہار اور دل کا تعلق کے ساتھ [illegible] تبسم

اور چہرہ کی شگفتگی کا سامان بھی ضروری ہے، ورنہ بقول ان کے شاعری محض محفل وجد کے لیے رہ جائیگی، مگر اسی کے ساتھ وہ اس میں اعتدال اور سلامت مذاق قائم رکھنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

رندوں اور واعظوں میں پرانی نوک جھونک چلی آتی ہے، شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ جب تک ان دونوں کا وجود دنیا میں باقی رہے گا دونوں کی چپقلش چلی جائے گی، اس لیے کہ اس کے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی چھوٹے گی اور نہ حضرت واعظ اپنے مذہبی فریضہ سے چوکیں گے۔

شاعری کے متعلق شاہ صاحبؒ کے یہ خیالات اس کے صحیفہ میں درج کرنے کے قابل ہیں، اس میں دبستان شبلیؒ کی بھی نمایندگی ہے، ممکن ہے کہ بعض ناقدوں کا خیال ہو کہ ان میں کوئی نئی اور اچھوتی بات نہیں کہی گئی، لیکن جس خوبصورت انداز میں پورے وثوق کے ساتھ یہ باتیں کہی گئی ہیں ان سے شاہ صاحبؒ کے ذوق سلیم کا اندازہ ہونے کے علاوہ تازگی اور نیاپن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ان ہی تمام اصولوں کو اساس بناکر شاہ صاحبؒ نے جگرؔ کی شاعری پر ایک جامع تبصرہ میں جگر کی شاعری کی ظاہری اور معنوی دونوں خوبیاں دکھائی ہیں، شاہ صاحبؒ نے شاعری میں الفاظ کے مناسب انتخاب، ان کے صحیح استعمال، ان کی شیرینی اور ترنم، ان کی سحرکاری اور ان کی سلاست و روانی پر زور دیا ہے، پھر اسی کو سامنے رکھ کر جگرؔ کی شاعری کا مطالعہ کرکے اپنی اس رائے کا اظہار بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے کہ جگرؔ اپنے شیریں اور سادہ الفاظ اور سہل و آسان ترکیبوں سے باغ کی بہار، جوئبار کی مستانہ خرامی، نسیم سحر کی اٹھکھیلیاں اور تبسم موج کی بھی مصوری کرتے ہیں اور ان ہی سے بادل کی گرج، طوفان کے شور اور آندھی کے زور کے ہولناک مناظر بھی دکھاتے ہیں، ان کو الفاظ کے مناسب انتخاب اور ان کی نشست کا خاص سلیقہ ہے، وہ اگرچہ الفاظ نہایت سادہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی شیرینی اور ترکیب کی خوبی شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کو جگرؔ کی چھوٹی بحر کی غزلیں زیادہ پسند تھیں، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سلاست بیان

کے نہایت اعلیٰ نمونے ہیں، ایسی غزلیں شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اترتی چلی جاتی ہیں، ان کے یہاں زبان کی چاشنی ڈھونڈنے والوں کے لیے بھی پورا سامان موجود ہے۔

ان کے کلام کی فارسی ترکیبوں سے متعلق شاہ صاحبؒ کی رائے ہے کہ انھوں نے حتی الامکان فارسی ترکیبوں سے احتراز کیا ہے، لیکن ان کا کلام اس کی لطیف آمیزش سے خالی بھی نہیں ہے، جن موقعوں پر انھوں نے فارسی سے کام لیا ہے، اپنی خوش مذاقی سے عجب خوش منظر گنگا جمنی پیدا کر دی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ جگر کی شاعری کی معنوی خوبیاں دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں خیالات کی وحدت کے ساتھ انداز بیان کا تنوع اور طریق ادا کی نیرنگی ہے، حافظؔ شیرازی کی طرح ان کے خیالات محدود اور بندھے ہوئے ہیں، لیکن انھیں وہ مختلف پیرایوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ بیان کی نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے، ساز ایک ہی ہے لیکن اس کا ہر نغمہ اپنے تاثر اور ترنم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف سنائی دیتا ہے، اسی کے ساتھ ان کے یہاں جذبات کی لطافت اور خیالات کی فلک پیما بلندی ہے، غزل کے مضامین محدود ہوتے ہیں، اس میں مشکل سے کوئی اچھوتا مضمون نکل سکتا ہے، لیکن جگر پامال زمین میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلاتے ہیں اور پرانے پھولوں کو اس طرح سجاتے ہیں کہ ہر گلدستہ اپنے رنگ و بو کے اعتبار سے نیا نظر آتا ہے، اور پھر ان تمام چیزوں کو ایسی بے خودی کے عالم میں کہتے ہیں کہ خود اس میں گم ہو جاتے نظر آتے ہیں اور سننے والوں کو بھی مست و بے خود بنا دیتے ہیں

شاہ صاحبؒ نے جگر کے مادی اور روحانی خیالات کا علحدہ علحدہ تجزیہ بھی کیا ہے، کہتے ہیں کہ وہ جب تک انسانی پیکر میں عالم آب و گل کی باتیں کرتے ہیں تو کسی نہ کسی حد تک عام شعراء کا ساتھ دیتے ہیں، لیکن جہاں سے روحانی سرحد شروع ہوتی ہے، وہاں سے وہ عالم ناسوت چھوڑ کر عالم لاہوت میں پرواز کر جاتے ہیں، اور روح القدس سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے جگر کی شاعری میں ان کے حسن و عشق کے تخیل کا بھی تجزیہ گہرائی کے ساتھ کیا ہے،

لکھتے ہیں کہ جگر کا عشق بلند اور پاکیزہ ہے، ان کا مطلوب عالم مادی سے اورا اور مجسم لطافت ہے، ان کے یہاں دل کا مادی واسطہ بھی درمیان میں باقی نہیں رہتا جس میں وہ اپنی ہستی کا پردہ بھی گوارا نہیں کرتے، ان کے ہجر و وصل کی صورت عالم مادی کے وصل و ہجر سے بالکل مختلف ہے، وہ وصال دوست کو عشق کا نقص سمجھتے ہیں، وہ نگاہ کے تحیر اور رگ جاں کے تواجد سے مشاہدۂ جمال کی محرومی کے قائل ہیں، گو تحیر کو عین آرزو قرار دیتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ مشاہدۂ جمال میں دیکھنے والا سراپا نظر بن کر جلووں میں گم ہو جائے، راہ حقیقت کی آخری منزل اس راہ میں گم ہو جانا ہی ہے، پھر اس کو حال وقال اور مقام و قیام کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں حسن حقیقت تو مستور رہتا ہے لیکن عشق حقیقی کی تسلی جاری رہتی ہے جس کے بعد بے خودی آگے بڑھ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتی ہے، جہاں جبین و آستانہ میں امتیاز باقی نہیں رہتا، اور عالم وارفتگی میں طالب و مطلوب کی زبان بن جاتا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جگر نے اپنے ان خیالات کی بلندی کا اظہار مجاز کے پردے میں قصداً کیا ہے، اور وہ اس حجاب کو اٹھانا نہیں چاہتے، کیونکہ یہ حسن حقیقت کے احترام کے منافی ہے، اور پھر شاہ صاحبؒ نے جگر کے شعر ہی سے یہ بھی دکھایا ہے کہ عالم مادی میں نظارہ مشاہدۂ جمال کا وسیلہ ہے لیکن جمال حقیقت کے مشاہدہ کے لیے یہی وسیلۂ حجاب بن جاتا ہے، پھر جگر ہی کے شعر سے یہ بھی ثابت کیا ہے، کہ پردۂ مجاز کے بغیر مجرد جمال حقیقت کا مشاہدہ ان مادی آنکھوں سے ناممکن ہے، اس لیے حسن حقیقت ہمیشہ پردۂ مجاز میں نظر آتا ہے، مگر اس تشابہ کی بنا پر سالک کو ہر ہر قدم پر دھوکا ہوتا ہے اور وہ مجاز کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے، دل کی آنکھ یا چشم بصیرت تو انوار جمال کے گنجینہ کو سمیٹ لیتی ہے، لیکن مادی آنکھوں کی محدود نظر اس کے احاطہ سے قاصر رہتی ہے، اس لیے طالب دیدار کا طالب ہو جاتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ حسن حقیقت کے قید تعین میں آنے کے بعد نظر تعینات و تشخصات میں الجھ کر رہ جاتی ہے، اس لیے طالب اس پردۂ تعین کو ہٹانا چاہتا ہے لیکن پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ حسن حقیقت جیسی شے

تعینات و تشخصات کی قید میں آ ہی نہیں سکتی تو سمندر کوزہ میں نہیں سما سکتا، اس لیے وہ تعینات کی قید کو صرف اوہام کا فریب سمجھنے لگتا ہے، پھر اس کے تصور میں یہ بات آتی ہے کہ وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت یا وحدت الوجود یعنی تمام کائنات عالم ایک ہی اصل کی فرع اور ایک ہی آفتاب کا پرتو اور ایک ہی تصویر کا مرقع ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی دیدہ وری اور نکتہ آفرینی سے جگر کی بظاہر غنائیہ اور غزلیہ شاعری میں کیسا فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ پیدا کر دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ کو جگر کی شاعری میں یہ رنگ پیدا کرنے میں ان کو اپنی خاندانی روایات سے بھی مدد ملی ہے، صابر یہ چشتیہ کی تعلیمات کا غلغلہ ان کے گھر کے علاوہ ردولی کی خانقاہ کی مجلسوں اور وہاں کے عرس کے موقع پر سماع کی محفلوں میں بلند ہوتا رہا۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جگر کے اس مخصوص رنگ کے علاوہ ان کا ایک عام رنگ بھی ہے، یعنی جب وہ پامال شاہراہ پر چلتے ہیں تو اس میں بھی اپنا راستہ الگ نکالتے ہیں، مثلاً محبوب کا عتاب عاشق کے لیے ایک جانگسل مصیبت ہے، لیکن جگر کی نگاہ دل اس میں بھی کرم کا سامان تلاش کر لیتی ہے، جگر کا حرمان نصیب دل سکون سے ہمیشہ محروم رہتا ہے، اس لیے کہ سکون ملنے میں بھی اضطراب دل بن جاتا ہے جو اضطراب کا اصل سبب ہے، گویا اضطراب ہی شکل بدلتا رہتا ہے، اسی طرح جگر اپنی عالی ظرفی میں ستم یا کسی شکایت سے زبان آلودہ نہیں کرتے بلکہ ستم خاص کی تمنا کرتے ہیں، وہ تو زبان پر مطلوب کا ذکر بھی لانا احترام حسن کے منافی سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے جگر کے اشعار میں گداز عشق کی اچھوتی شکلوں کی بھی تلاش کی ہے، کہتے ہیں جگر نے ایک درد آشنا دل پایا ہے، کبھی کبھی اس کے ٹوٹتے ہوئے دل سے بھی آہ سوزاں نکل جاتی ہے، مگر وہ عاشقی کو مصیبت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا درد پسند دل اس سے لذت یاب ہوتا اور کمال لذت کے لیے سراپا درد بن جاتا ہے، عام شعراء کے خلاف ان کے یہاں غم ہجر جانگسل ہونے کے بجائے جاں نواز ہے۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جگر نے یہ سب کچھ رنگینی کی لطیف آمیزش سے کیا ہے، ان کے یہاں جوانی، نگاہِ مست، نگاہ گستاخ، نگاہ کی مے بادہ وغیرہ کی بڑی رنگین مرقع آرائی ہے، ان کی بعض غزلیں تو پوری کی پوری خیالات اور بیان کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

جگر کے یہاں خمریات بھی بہت ہیں، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ کی رائے ہے کہ ان کے خمخانہ میں ہر رنگ و بو، ہر مزہ اور ہر درجہ کی شراب ہے اور اس کے اثرات بھی مختلف ہیں، کسی میں سرخوشی کی حد تک نشہ، کسی میں مستی اور کسی میں بدمستی تک لیکن اس عالمِ مستی میں جگر کے حواس قائم رہتے ہیں، وہ ان مہذب رندوں میں ہیں جو واعظوں پر نہایت لطیف اور ظریفانہ پھبتیاں کستے ہیں لیکن تہذیب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔

شاہ صاحبؒ جگر کو اخلاق کا علمبردار یا پیامبر نہیں سمجھتے اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں اخلاق کا عنصر تو ہے لیکن بہت کم ہے۔

شعلۂ طور میں جگر کا کچھ فارسی کلام بھی ہے لیکن شاہ صاحبؒ اس پر صرف اتنا تبصرہ کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظ شیرازی کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کا میدان نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ مضمون تقریباً پچاس برس پہلے لکھا تھا، اس میں جگر کی شاعری کا جس طرح تجزیہ کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری پر لکھنے والوں کے لیے آج بھی مشعلِ ہدایت ہے، ان کی شاعری کا کون سا پہلو ایسا ہے جس پر اس میں بحث نہیں کی گئی ہے، علامہ شبلیؒ نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کی پانچوں جلدوں میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ اگر وہ کسی شاعر کے محاسن کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے ثبوت میں بکثرت اشعار پیش کرتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشعار کا مطالعہ پوری دیدہ دری سے کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب شعر الہند میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے، حضرت سید صاحبؒ بھی جب شعر و ادب پر کچھ لکھتے تو یہی رنگ اپناتے، شاہ صاحبؒ نے اپنے اس مضمون میں

جگہ گوناگوں خوبیاں دکھانے میں ان کے اشعار بکثرت نقل کیے ہیں، یہ انداز ان نقادوں کے لیے شکل اور صبر آزما معلوم ہوگا جو ایک دعویٰ تو کر بیٹھتے ہیں لیکن اس کے ثبوت میں اشعار نقل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اس میں ان کی سہل انگاری کو بھی بڑا دخل ہے، دبستان شبلی میں ایسی سہل انگاری پسند نہیں کی جاتی، پھر مضمون وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جو خود بولے کہ یہ سلیقہ، محنت اور ریاضت سے لکھا گیا ہے، شاہ صاحبؒ کا یہ مضمون بھی سب کچھ بولتا ہے، اس کو پڑھ کر ناظرین کو اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ کو اگر ادبی تحریر لکھنے میں پوری قدرت حاصل ہوگئی تھی تو اس کو قلمبند کرتے وقت وہ نہ صرف فن شاعری کے رموز سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ حسن و عشق، حال و قال، مشاہدۂ جمال، راہِ سلوک کے احوال، وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت وغیرہ کے اسرار سے بھی واقف تھے، پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن مجید اور حدیث جیسے موضوعات پر لکھنے والے عموماً شعر و ادب پر اچھی تحریریں نہیں لکھ پاتے، مگر یہ دبستان شبلیؒ اور حضرت سید صاحبؒ کی تربیت کا فیض تھا کہ شاہ صاحبؒ قرآن اور حدیث پر جس جوش و خروش سے مضامین لکھتے، اس سے زیادہ زور اور طاقت سے شعر و ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنی تحریر کی خوش سلیقگی کا اظہار کرتے۔ (باقی)

حیات سلیمان

یہ سید صاحب علیہ الرحمہ کی محض سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ سید صاحبؒ کے پورے دور کی تمام ملی وقتی، سیاسی وملی اور ادبی ولسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی پوری تاریخ ہے، اس میں دارالمصنفین کی سال بسال ترقی کی روداد، ترک قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، پھر قیام پاکستان، اور انھوں نے پاکستان میں جو علمی و ملی خدمات انجام دیں، ان کی بھی تفصیل آگئی ہے۔ از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۳۲ روپے

سیرتِ نبویؐ کے قدیم واولین مآخذ

اور

ان کا تنقیدی جائزہ[1]

از

ڈاکٹر تقی الدین ندوی مستشار علمی دائرۃ القضاء الشرعی، استاذ حدیث عین یونیورسٹی۔ ابوظبی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر عہد میں سیرت نبویؐ کے ساتھ جس غایت درجہ کا اہتمام واعتناء کیا گیا ہے، علوم انسانی کی تاریخ میں اس کی نظیر مفقود ہے۔ "بلاشبہہ مسلمانوں کے اس فخر و امتیاز کا تا قیامت کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبرؐ کے سوانح اور وقائع کا ایک ایک حرف اس استقصار، صحت اور استناد کے ساتھ محفوظ رکھا کہ دنیا میں کسی شخص کے حالات و واقعات آج تک اس احتیاط و جامعیت کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے۔" دوسرے مذاہب کے داعیان اور رسولوں کے سوانح اور کارناموں کی تصویر ہمیں تاریخ میں بہت ناتمام ملتی ہے، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس وسعت و تفصیل کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے کہ آپؐ کے اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، اکل و شرب، نشست و برخاست اور سونے جاگنے کی ایک ایک ادا محفوظ ہو گئی ہے، اور اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

---

[1] یہ مقالہ دوحہ (قطر) کی تیسری عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ ۲۴ تا ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

دیگر مذاہب کے اصول و تعلیمات وقتی تھے، ابدی نہ تھے" اور یہی ہمہ گیری و ابدیت اسلام اور داعی اسلام کا خصوصی طغرائے امتیاز ہے۔ پیشِ نظر مقالہ میں راقم سطور نے مذکورۂ بالا حقیقت کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے سیرت نبوی کے قدیم اور اولین ماخذوں کا ایک جامع جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس موضوع پر آئندہ تفصیلی مطالعہ یا تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے دلیل راہ ثابت ہو سکے۔

سیرت نبوی کا سب سے اہم اور مستند ترین ماخذ قرآن پاک ہے، اس کے مطالعہ سے کہیں تو اجمالاً اور کہیں تفصیلی طور پر سیرت نبوی کے بکثرت گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ بعثت نبوی سے قبل اور بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن مراحل و کیفیات سے دوچار ہوئے، مثلاً آپ کی یتیمی، غار حرا میں خلوت نشینی، نزول وحی، اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس راہ میں صعوبات و مصائب کا تحمل، ہجرت اور غزوات وغیرہ سب کی تفصیل قرآن میں محفوظ ملتی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کے پایۂ صحت و اعتبار میں کسی طرح کا شک کفر ہے۔

قرآن کے بعد سیرت نبوی کا دوسرا اہم ترین ماخذ حدیث کا قیمتی ذخیرہ ہے، اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شب و روز کی زندگی، اخلاق و عادات اور رجحانات و میلانات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر رواۃ حدیث نے حجۃ الوداع کے تاریخی سفر اور عہد آفریں واقعہ کے ہر ہر جزئیہ کو نہایت صحت و گیرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، خواہ تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہ ہو۔ چنانچہ بکثرت علماء نے صرف ذخیرۂ حدیث کی بنیاد پر سیرت نبوی پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں، دنیا میں کسی بھی داعی مذہب کے اقوال و افعال کی حفاظت کے ساتھ اس کے متبعین نے وہ اعتنا نہیں کیا ہے جو صحابۂ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور محدثین نے احادیث نبوی کے ساتھ کیا ہے، یہاں تک کہ احادیث کی تحقیق کی غرض سے ہزاروں، لاکھوں راویوں کے نام و حالات قلمبند کیے گئے اور اس طرح اسماء الرجال کا عظیم فن وجود میں آیا۔ کتب حدیث میں باعتبار صحت صحاح ستہ اور ان میں بھی

بخاری و مسلم کو فوقیت حاصل ہے اس کے بعد کتبِ مسانید کا درجہ ہے، جن میں امام احمدؒ بن حنبل (المتوفی ۲۴۱ھ) کی شہرۂ آفاق مسند مختلف حیثیتوں سے سب سے ممتاز و فائق ہے۔

تیسرا ماخذ: کتبِ دلائل نبوت علماء و محدثین نے دلائل نبوت پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے، چنانچہ کتبِ صحاح میں ایسے مستقل ابواب ملتے ہیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور ان کے دلائل نبوت کو جمع کر دیا گیا ہے، مثلاً امام بخاریؒ و مسلمؒ نے صحیحین میں اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں علاماتِ نبوت اور معجزاتِ رسولؐ کے علٰحدہ ابواب قائم کیے ہیں، علاوہ ازیں متعدد علماء نے دلائل نبوت کے موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں جن میں سے حسب ذیل لائق ذکر ہیں:

(۱) دلائل النبوۃ مؤلفہ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی (المتوفی ۴۳۰ھ) اس میں حافظ ابونعیم نے حیاتِ نبویؐ پر روشنی ڈالنے کے بعد معجزاتِ رسولؐ اور ان کی حقانیت کو ثابت کیا ہے، محدثین کے عام طریقۂ کار کے مطابق اس کتاب میں بھی صحیح و ضعیف روایات باہم خلط ملط ہو گئی ہیں، اس کا خلاصہ حیدرآباد سے ۱۳۲۰ھ میں طبع ہو چکا ہے، امام ابونعیم ایک بلند پایہ مورخ اور ثقہ حافظ حدیث تھے، انھوں نے دلائل نبوت کے علاوہ دس ضخیم جلدوں میں حلیۃ الاولیاء اور معرفۃ الصحابہ وغیرہ کتابیں تالیف کی ہیں[1]۔

(۲) دلائل النبوۃ مؤلفہ حافظ ابوالعباس جعفر بن محمد المعتز المستغفری (المتوفی ۴۳۲ھ) امام مستغفری اپنے عہد کے ممتاز حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں، ابن ناصر الدین کا قول ہے کہ وہ ثقہ حافظ حدیث تھے، مگر کبھی وہ بغیر وضاحت و تحقیق کے موضوعات بھی روایت کرتے تھے[2]، ابن مندہ کا بیان ہے کہ:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے، وفیات الاعیان ج ۱، ص ۲۶۔ میزان الاعتدال ج ۱، ص ۵۲۔ لسان المیزان ج ۱، ص ۲۰۱، طبقات الشافعیہ ج ۳، ص ۷۔ الاعلام زرکلی ج ۱، ص ۱۰۵ [2] شذرات الذہب ج ۳، ص ۲۴۹۔

اذا وجدت فی اسنادہ زاھدًا	جب تم ان کی سند میں کسی زاہد کو پاؤ تو
فاغسل یدک من ذالک الحدیث[1]	اس کو چھوڑ دو۔

(۳) دلائل النبوۃ: مولفہ ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن واقد الفریابی (المتوفی ۲۱۲ھ) امام فریابیؒ نے مشہور تبع تابعین امام اوزاعیؒ اور سفیان ثوریؒ سے خصوصی استفادہ کیا تھا، اور امام بخاریؒ ان کے تلامذہ میں شامل تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمدؒ بھی ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے، مگر راستہ ہی میں ان کی وفات کی خبر ملی، حافظ ذہبی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے[2]۔

(۴) دلائل النبوۃ: مولفہ امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی (المتوفی ۴۵۸ھ) اس کے آغاز میں امام بیہقیؒ نے سیرت نبویؐ قلمبند کرنے کے بعد معجزات حسیہ پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے مگر اس میں بہت سی ضعیف روایات راہ پاگئی ہیں، یہ کتاب متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہے آخری بار استاذ سید صقر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ سے شایع ہوئی، حافظ بیہقی حفظ و اتقان اور ثقاہت و عدالت میں بقول ابن ناصر الدین یکتائے عہد شمار ہوتے تھے، کثرت تصانیف میں ان کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مختلف علوم و فنون میں ایک ہزار کتابیں تالیف کی ہیں، نیشاپور اور خراسان میں مذہب شافعیت کے فروغ و شیوع میں ان کی تصانیف کا بڑا حصہ ہے، ابن خلکان رقمطراز ہیں:

ھو اول من جمع نصوص الشافعی	انھوں نے سب سے پہلے امام شافعیؒ کے
فی عشر مجلدات وکان اکثر	نصوص کو دس جلدوں میں جمع کیا، اور
الناس لنصر المذھب الشافعی[3]	مذہب شافعیت کو سب سے زیادہ ان ہی سے
	مدد پہونچی۔

---

[1] طبقات السیوطی ص ۴۲۵۔ کشف الظنون ج ۳، ص ۲۳۸۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۳۷۶، شذرات الذہب ج ۳، ص ۱۰۲۔ الاعلام ج ۷، ص ۹۸۔ [3] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۲۰۴۔

امام ذکرنگ کا بیان ہے کہ:

مامن شافعی الا وللشافعی علیہ	ہر شافعی المسلک امام شافعیؒ کا منت کش ہے
منۃ الا البیھقی فان لہ علی الشافعی	مگر علامہ بیہقیؒ کا خود امام شافعیؒ پر یہ احسان ہے
منہ لتصانیفہ فی نصرۃ مذھبہ[1]	کہ ان کی تصانیف کے ذریعہ مذہب شافعیت کے فروغ میں بہت مدد ملی۔

دلائل النبوۃ کے علاوہ امام بیہقیؒ کی چند لائق ذکر تالیفات یہ ہیں: السنن الکبری، کتاب الزھد، کتاب الاسماء والصفات، کتاب الخلاف، مناقب الامام الشافعیؒ[2]۔

(۵) دلائل النبوۃ مولفہٗ ابو القاسم اسماعیل بن محمد الاصفہانی (المتوفی ۵۳۵ھ) اس کتاب کے مؤلف تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب میں منتخب عصر شمار ہوتے تھے، ابن مندہ کا قول ہے کہ لیس فی وقتنا مثلہ یعنی ہمارے عہد میں وہ عدیم النظیر ہیں، حافظ ابن عمادؒ حنبلی نے ان کے بارے میں ائمہ بغداد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

ماد خل الی بغداد بعد احمد بن حنبل	امام احمدؒ بن حنبل کے بعد سرزمین بغداد پر
افضل ولا احفظ منہ[3]	ان سے بڑا اہل علم اور حافظ حدیث نہیں آیا۔

(۶) الخصائص الکبریٰ مولفہ امام جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر السیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) یہ کتاب سیرت و شمائل نبویؐ اور دلائل نبوت پر مشتمل ہے، حافظ سیوطی کی جلیل القدر شخصیت بہت معروف ہے، انھوں نے مختلف علوم و فنون میں چھ سو کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں اس کتاب کے علاوہ الاتقان فی علوم القرآن، الاشباہ والنظائر، بغیۃ الوعاۃ، حسن المحاضرۃ، الدر المنثور فی التفسیر الماثور، تاریخ الخلفاء اور الالفیۃ فی مصطلح الحدیث کے نام خصوصیت سے

---

[1] شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵۔ [2] الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۱۰۲ [3] شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶۔

لائقِ ذکر ہیں[1]

چوتھا طبقہ: کتبِ شمائل | اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات، فضائل و شیم اور شب و روز کے معمولات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، علماء و مصنفین نے ابتدائی زمانہ ہی سے اس موضوع کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور اس میں بکثرت کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں سے کچھ لائقِ ذکر حسبِ ذیل ہیں:

(۱) الشمائل النبویہ والخصائل المصطفویہ: مؤلفہ ابو عیسیٰ محمد بن سورۃ الترمذی (المتوفی سنہ ۲۷۹ھ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و عادات اور اخلاق و شمائل پر اب تک جتنی کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اُن میں یہ کتاب اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں تمام روایتوں کے معتبر اور صحیح ہونے کا خصوصی التزام کیا گیا ہے، اس کی افادیت کے باعث متعدد علماء نے اس کے شروح و حواشی لکھے ہیں، یہ کتاب دارالطباعۃ العامرۃ دمشق سے ایک جلد میں شائع ہو چکی ہے، استاذ محمود سامی نے "المختصر فی الشمائل النبویہ و شرحہا" کے نام سے اس کی تلخیص و شرح لکھی ہے، جو سنہ ۱۹۵۹ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔

(۲) اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم و آدابہ: مؤلفہ حافظ عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حیان الاصفہانی (المتوفی سنہ ۳۶۹ھ) اس میں مؤلف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات و اخلاق اور عادات و اطوار کو جمع کر دیا ہے، یہ کتاب عبد اللہ محمد الصدیق الغماری کی تحقیق کے ساتھ سنہ ۱۹۵۹ء میں قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے۔

(۳) کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ: مؤلفہ قاضی ابو الفضل بن عیاض اندلسی (المتوفی سنہ ۵۴۴ھ)

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الکواکب السائرۃ ج ۲ ص ۲۲۶، شذرات الذہب ج ۸، ص ۵۱۔

آداب اللغۃ ج ۳، ص ۲۲۸، الضوء اللامع ج ۴ ص ۶۵۔ حسن المحاضرۃ ج ۱، ص ۱۸۸۔

دو جلدوں پر مشتمل یہ اپنے موضوع پر ایک عدیم النظیر کتاب ہے، اور افادیت کے پیش نظر متعدد بار طبع ہو چکی ہے، آخری بار ۱۳۹۱ھ میں دمشق سے شیخ ابو الفتاح ابو غدہ کی تعلیق کے ساتھ نہایت دیدہ زیب طباعت میں منظر عام پر آئی، قاضی عیاض چھٹی صدی ہجری میں اندلس کے ایک نامور عالم اور امام حدیث کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے، حدیث کے علاوہ لغت، ادب، نحو، تاریخ اور انساب میں یگانۂ عہد شمار ہوتے ہیں، ملا علی قاری اپنی شرح شفا کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں،

كان وحيد زمانه وفريد اوانه	وہ وحید زمانہ اور یکتائے عصر تھے،
متقنا لعلوم الحديث واللغة	علم حدیث، لغت، نحو، ادب، تاریخ عرب اور
والنحو والآداب عالماً بايام العرب	انساب کے متبحر عالم تھے۔
والانساب۔[1]	

کتاب الشفاء کے علاوہ مختلف علوم میں ان کی تیس۳۰ مؤلفات یادگار ہیں، جن میں الاکمال شرح صحیح مسلم، مشارق الانوار، کتاب المدارک وتقریب المسالک اور شرح حدیث ام زرع وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔

کتاب الشفاء، قاضی عیاض کی مقبولیت اور افادیت کے باعث علمائے متاخرین نے اس کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا، اور اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں، جن میں درج ذیل دو سب سے زیادہ مشہور ہیں:

(۱) نسیم الریاض فی شرح الشفا للقاضی عیاض مؤلفہ امام احمد بن محمد الخفاجی (المتوفی ۱۰۶۹ھ) یہ مبسوط شرح چار ضخیم جلدوں میں دمشق سے ۱۲۶۷ھ میں شائع ہوئی (۲) شرح الشفا فی شمائل صاحب الاصطفٰی مؤلفہ ملا علی قاری (المتوفی ۱۰۱۴ھ) یہ بھی چار ضخیم مجلدات میں حسین محمد مخلوف کی تحقیق کے ساتھ ۱۳۹۰ھ میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔

---

[1] شرح الشفا فی شمائل صاحب الاصطفٰی، ج ۱، ص ۵۔

امام نورالدین علی بن محمد المعروف بہ ملا علی القاری جید متاخر کے علمائے کبار میں شمار ہوتے ہیں، ان کا معمول تھا کہ ہر سال اپنے قلم سے ایک قرآن پاک لکھتے اور اس کو فروخت کرکے پورے سال کا رزق کفاف فراہم کرتے تھے، وہ شرح شفا کے دیباچہ میں اس کے سبب تالیف کے سلسلہ میں خود رقمطراز ہیں:

لما رأیت کتاب الشفا فی شمائل	جب میں نے قاضی عیاض کی تصنیف کتاب الشفاء
الاصطفا اجمع ما صنف فی بابه	فی شمائل الاصطفا کو دیکھا تو اسے
جملا من الاستیفاء قصدت ان	اس موضوع پر لکھی گئی تمام مختصر کتابوں کی جامع
اخدمه لشرح یشرح بعض ما	پایا میں نے اس کی شرح لکھنے کا عزم کیا۔
یتعلق به من تحقیق الاعراب والبناء	تاکہ آخرت کے روز علماء کے ساتھ محشور ہونا
رجاء ان اسلك فی سلك مسالك	نصیب ہو۔

العلماء یوم الجزاء[1]

مذکورۃ الصدر کتب شمائل کے علاوہ اس موضوع پر بعض دوسرے علماء نے بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں کچھ یہ ہیں: (۱) شمائل النبیؐ مؤلفہ ابو العباس المستغفری (المتوفی ۴۳۲ھ) (۲) النور الساطع مؤلفہ ابن المقری (المتوفی ۵۵۲ھ) (۳) سفر السعادۃ مؤلفہ امام مجد الدین الفیروز آبادی (المتوفی ۸۱۲ھ) (۴) شمائل الرسول مؤلفہ حافظ ابن کثیر (المتوفی ۷۷۴ھ)

پانچواں ماخذ: کتب مغازی | عقلی و قیاسی حیثیت سے فن سیرت میں سب سے پہلے مغازی کی روایتوں کو فروغ حاصل ہونا چاہیے تھا، کیونکہ عرب میں مختلف وجوہ سے جنگوں اور معرکوں کے واقعات محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، لیکن عہد بنی امیہ کے وسط تک فن مغازی و سیر کے ساتھ کسی اعتناء کا ثبوت نہیں ملتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (المتوفی ۱۲۰ھ)

---

[1] شرح الشفاء فی شمائل صاحب الاصطفا ج ۱ ص ۵۔

کو جو فن مغازی میں خاص کمال رکھتے تھے، حکم دیا کہ جامع دمشق میں حلقۂ درس قائم کرکے لوگوں کو مغازی اور مناقبِ صحابہؓ کا درس دیں۔[1]

اس کے بعد رفتہ رفتہ مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہوگیا، اور پہلی صدی ہجری میں متعدد اکابر علماء نے اس فن میں مستقل کتابیں تالیف کیں جن میں سے اکثر اگرچہ آج ناپید ہیں، مگر متاخرین کی تصنیفات میں ان کا بڑا حصہ شامل ہوگیا ہے، ذیل میں ہم ان اکابرینِ امت کے نام اور ان کی تصنیفات کی ایک جامع فہرست درج کرتے ہیں جو فن مغازی و سیر کے ارکان و اساطین شمار ہوتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ سیرت نبویؐ کے دیگر مستند ماخذوں میں کتب مغازی کا مقام کتنا اہم ہے۔

(۱) عروہ ابن زبیرؓ بن العوام (المتوفی ۹۴ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار کیے جاتے ہیں، سیر و مغازی میں ان کی روایتیں بہت کثرت سے ملتی ہیں، ابن سعد نے انھیں ثقہ، کثیر الحدیث، فقیہ اور عدول و ثبت قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ کان عالمًا بالسیرۃ[2]۔ حاجی خلیفہ نے بعض علماء کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

هو اول من صنف بالمغازی[3] — ان ہی نے فن مغازی میں سب سے پہلی کتاب تصنیف کی۔

(۲) وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) جلیل القدر تابعین کرام میں تھے، علمائے جرح و تعدیل ان کی توثیق پر متفق ہیں، سیرت نبویؐ کے بارے میں کتب عہد قدیم کی بشارتوں اور پیش گوئیوں کے علم میں شہرت عام رکھتے ہیں۔[4]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸، ص ۲۴۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱، ص ۶۲ [3] کشف الظنون ج ۲، ص ۲۰۷۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۸۰۔ حلیۃ الاولیاء ج ۲، ص ۱۷۶۔ الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۱۷۔ [4] وہب بن منبہ کے حالات و کمالات کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۱۴۹، تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۶۶۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵۔ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۸۰؛ شذرات الذہب ج ۱، ص ۱۵۰۔

(۳) محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۳ھ) امام زہری زمرۂ تابعین کے گل سرسبد تھے،
، وحدیث کی معرفت و تبحر میں نادرۂ عصر تھے، حدیث و روایت کی تحصیل انھوں نے جس غیر معمولی
کا ہمک کے ساتھ کی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں گھر گھر جاتے اور بڑھا
لا د ھیڑ جو بھی ملتا یہاں تک کہ پردہ نشین خواتین سے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال
الات پوچھتے اور قلمبند کرتے تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز رضؓ کے عہد میں ان کی ہدایت کے مطابق
ازی پر ایک مستقل کتاب لکھی جسے سہیلی نے روض الانف میں اس فن کی پہلی کتاب قرار دیا ہے، امام
ی کے حلقۂ درس سے جو اصحاب کمال پیدا ہوئے اُن میں موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق فن مغازی میں
از خاص رکھتے ہیں۔

(۴) امام ابو عمرو عامر بن شراحیل الشعبی (المتوفی ۱۰۳ھ) انھیں پانچ سو صحابۂ کرام رضؓ کے دیدار کی
ادت حاصل ہوئی تھی، فقہ و حدیث اور مغازی و سیر میں درجۂ کمال رکھتے تھے، ایک بار وہ اپنے
ذہ کو مغازی کا درس دے رہے تھے کہ اسی اثناء میں عبد اللہ بن عمرؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو فرمایا،
یہ ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان غزوات کو جانتے ہیں[1]۔
یب بغدادی نے ان کی تصنیفات میں "کتاب المغازی" کا ذکر کیا ہے[2]۔

(۵) عاصم بن عمر بن قتادۃ الانصاری (المتوفی ۱۲۰ھ) مغازی و سیر میں نہایت وسیع المعلومات
، جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، حضرت عمر بن عبد العزیز رحؒ کے حکم سے جامع دمشق میں بیٹھ کر تشنگانِ علم کو
زی اور مناقب صحابہ رضؓ کا درس دیا کرتے تھے، ابن سعد نے انھیں ثقہ اور کثیر الحدیث قرار دیا ہے،
ابن حبان نے کتاب الثقات میں بصراحت ان کی توثیق کی ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱، ص ۸۰۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲، ص ۲۳۰، طبقات السیوطی، ص ۳۲۔

[3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۲۲۔

(۶) ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی (المتوفی سنہ ۱۲۷ھ) نہایت جلیل المرتبت تابعی ہیں، انھیں اڑتیس صحابۂ کرام کے دیدار اور سماعِ حدیث کی سعادت نصیب ہوئی تھی، خانوادۂ سبیعی علماء و فضلاء کا مخزن تھا اور اس کا ہر فرد آسمانِ علم و فن کا اختر تاباں تھا، ابو اسحاق سبیعی اس خاندانِ فضل و کمال کے ابو الآباء تھے، وہ فقہ و حدیث اور مغازی میں کامل تبحر کے ساتھ زہد و اتقاء، عبادت و ریاضت اور ورع و تقویٰ میں بھی اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ مغازی و سیر کی معرفت میں شہرۂ آفاق تھے[۱]۔

(۷) یعقوب بن عتبہ بن المغیرۃ المدنی (المتوفی سنہ ۱۲۸ھ) امام زہریؒ کے معاصر اور نہایت ثقہ عالم تھے، اُن کا شمار مدینہ کے چند منتخب فقہاء میں ہوتا ہے، سیرت نبویؐ کے بہت اعلیٰ پایے کے عالم تھے۔

(۸) یزید بن رومان الاسدی (المتوفی سنہ ۱۳۰ھ) جلیل المرتبت محدث اور حضرت عروہؓ و امام زہریؒ کے شاگرد تھے، مغازی میں انھوں نے بھی ایک کتاب تالیف کی ہے۔

(۹) ابو المعتمر سلیمان بن طرخان (المتوفی سنہ ۱۴۳ھ) حضرت انس بن مالکؓ اور امام حسن بصریؒ کے اجل تلامذہ میں تھے، روایات کی باریک بینی اور دقیقہ رسی میں قابل تحسین قرار دیے جاتے ہیں، ان کے علمی کارناموں میں کتاب المغازی کا سراغ ملتا ہے۔

(۱۰) موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش الاسدی (المتوفی سنہ ۱۴۱ھ) یہ آل زبیر کے غلام تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا تھا، ان کے اساتذہ میں امام زہریؒ اور تلامذہ میں امام مالکؒ شہرۂ آفاق ہوئے، انھوں نے فن مغازی میں ایک کتاب تالیف کی تھی جو اپنے موضوع پر اہم ترین مراجع میں شمار ہوتی ہے، امام مالکؒ سے جب کبھی مغازی کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے:

علیکم بمغازی الرجل الصالح — مغازی کا علم حاصل کرنا ہو تو موسیٰ بن عقبہ

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۷۰۔

موسیٰ بن عقبة فانها اصح المغازی | سیکھو، کیونکہ ان کے مغازی سب سے زیادہ صحیح ہیں۔

امام موسیٰ بن عقبہ کے مغازی کی نمایاں ترین خصوصیت روایات میں احتیاط اور صحت کا غایت درجہ التزام ہے، آج موسیٰ کی اصل کتاب ناپید ہے، لیکن سیرت کی تمام قدیم و جدید کتابوں میں اس کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔

(۱۱) محمد بن اسحاق بن یسار المدنی (المتوفی سنہ ۱۵۱ھ) انھوں نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ زبان خلق نے "امام فن مغازی" کا لقب عطا کیا، ابن شہاب زہریؒ کا قول ہے کہ

من اراد المغازی فعلیه بمحمد بن اسحاق[1] | جو شخص مغازی کی واقفیت حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحاق سے استفادہ کرے۔

امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ

من اراد ان یتبحر فی المغازی فهو عیال علی محمد بن اسحٰق[2] | جو فن مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحاق کا محتاج ہے۔

حدیث میں بھی باکمال تھے، مگر ان کی ثقاہت کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل اختلاف رائے رکھتے ہیں، امام مالکؒ کی ان کے بارے میں سخت رائے تھی، مگر پھر اس سے رجوع کر لیا تھا[3]، تاہم اکثر اکابر محدثین کی رائے ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایات قابل استناد ہیں، امام بخاریؒ نے گو جامع صحیح میں ان کی روایات کی تخریج نہیں کی، مگر جزء القراءۃ میں ان سے روایت لی ہے، اور تاریخ میں تو بکثرت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۲۔ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۰۵۔ [3] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۱۰۵۔ [4] الاعلام زرکلی ج ۵، ص ۱۰۶۔

روایات ان سے لی ہیں۔

محمد بن اسحاق کی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب المغازی" کے منصۂ شہود پر آ جانے کے بعد یہ فن اس قدر ترقی یافتہ اور دلچسپ بن گیا کہ اہل علم میں عام طور پر اس کا مذاق پیدا ہونے لگا۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ فن مغازی میں کوئی تصنیف محمد بن اسحاق کی کتاب کے رتبہ کو نہیں پہونچتی، یہ کتاب کثرت سے پھیلی اور اکابر محدثین نے اس کے نسخے مرتب کیے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیاد البکائی سے سند اجازت حاصل کرنے کے بعد مزید تنقیح و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا جو آج سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے۔

(۱۲) معمر بن راشد الازدی (المتوفی سنہ ۱۵۳ھ) یہ امام زہری اور حضرت قتادہؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، علم حدیث کے اساطین میں شمار کیے جاتے ہیں، علماء جرح و تعدیل ان کی ثقاہت و عدالت پر متفق ہیں، بالخصوص امام زہریؒ سے ان کی مرویات کا پایہ نہایت بلند ہے[۱]۔ ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں "احد الاعلام الثقات الاماما حجۃ[۲]"۔ مغازی میں ان کی ایک تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے "کتاب المغازی" لکھا ہے[۳]۔

(۱۳) محمد بن صالح بن دینار (المتوفی سنہ ۱۶۸ھ) امام زہریؒ کے تلامذہ اور واقدی کے اساتذہ میں بلند مقام رکھتے ہیں، ابن سعد نے لکھا ہے کہ

انہ کان عالماً بالسیرۃ والمغازی[۴]	بلاشبہ وہ سیرت و مغازی کے بڑے عالم تھے

ابو الزنادؒ جیسے اعلیٰ پایہ امام حدیث کا بیان ہے کہ

من اراد ان یتعلم المغازی فعلیہ محمد بن صالح[۵]	جو شخص مغازی کا علم حاصل کرنا چاہے اسے لازماً محمد بن صالح سے استفادہ کرنا چاہیے

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۱۷۱، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۸۸ ۲ شذرات الذہب ج ۱، ص ۲۳۵ ۳ الفہرست لابن ندیم ص ۲۰۰۔ ۴ طبقات ابن سعد ج ۹، ص ۸۰۔ ۵ ایضاً۔

(۱۴) ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمٰن المخرمی (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) فن حدیث میں بلند مرتبت کے ساتھ سیرت نبویؐ کے اکابر علماء میں تھے، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ فن مغازی کے امام و سرخیل تھے، امام ترمذی کا قول ہے کہ وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں[۱]۔

(۱۵) ابو محمد عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الحنیفی (المتوفی سنہ ۱۶۲ھ) یہ امام زہریؒ اور عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے تلمیذ رشید اور واقدی و سعید بن مریم کے استاذ تھے، اپنے زمانہ میں فن سیرت کے شہرۂ آفاق عالم شمار ہوتے تھے، علمائے جرح و تعدیل نے ان کی تضعیف کی ہے، سیرت نبویؐ میں ان کی تالیف واقدی کا بنیادی ماخذ رہی ہے۔

(۱۶) ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) انھوں نے مدت تک غلامی کی زندگی گذارنے کے باوجود علم و فضل میں نہایت بلند مقام حاصل کیا اور انھیں مشہور تابعی ابو امامہ ابن سہل کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی تھی، علم حدیث، فقہ اور مغازی ان کے صحیفۂ کمال کے روشن ابواب ہیں، بالخصوص فن مغازی میں ان کا پایہ درجۂ امامت تک پہونچا ہوا ہے، خطیب کا قول ہے کہ وہ فن مغازی کے سب سے زیادہ واقف کار تھے[۲]، اس لیے کتب سیرت میں ان کا نام بہت کثرت سے آتا ہے، ان کے اساتذہ میں نافع، موسیٰ بن عمر، محمد بن کعب، ہشام بن عروہ اور تلامذہ میں سفیان ثوری، ابو نعیم، وکیع بن الجراح، لیث ابن سعد اور یزید بن ہارون جیسے جلیل القدر ائمہ شامل ہیں[۳]، سیر و مغازی میں غیر معمولی انہماک کے باعث بعض محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمدؒ انھیں پسند کرتے تھے، اور فن مغازی میں ان کی بصیرت کے قائل تھے، جرح و تعدیل کے مشہور امام عبدالرحمٰن بن مہدی ابو معشر سے روایت کرتے ہیں[۴]، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔

---

[۱] شذرات الذہب ج ۲، ص ۳۰۰ [۲] تاریخ بغداد ج ۳، ص ۴۲۷ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۲۱۲ [۴] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۱۔

(۱۷) ابو محمد زیاد بن عبد اللہ بن الطفیل البکائی (المتوفی ۱۸۳ھ): انھیں مغازی کے نامور علمار محمد بن اسحاق اور ابن ہشام سے بالترتیب تلمذ و استاذی کا شرف حاصل تھا بلکہ یہی درحقیقت دونوں کے درمیان واسطہ العقد کی حیثیت رکھتے ہیں، اکثر محدثین کی رائے ہے کہ ثقاہت و اتقان میں ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے، لیکن بایں ہمہ ابن اسحاق کی کتاب السیرۃ کے سب سے زیادہ قابل اعتبار راوی یہی خیال کیے جاتے ہیں[۱]، صالح بن محمد کا بیان ہے کہ زیاد البکائی بذات خود ضعیف ہیں مگر کتاب المغازی کی مرویات میں ان سے زیادہ ثبت کوئی نہیں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سیرت کے عشق میں گھر بار فروخت کر کے اپنے استاذ ابن اسحاق کے ساتھ نکل پڑے تھے، اور زمانۂ دراز تک سفر و حضر میں ساتھ رہ کر کتاب المغازی کی سماعت حاصل کی[۲]۔

(۱۸) سلمہ بن الفضل الابرش (المتوفی ۱۹۱ھ): یہ بھی محمد بن اسحاق کے تلمیذ خاص اور ان کی کتاب السیرۃ کے مستند راوی ہیں، علمائے حدیث نے ان کی تضعیف کی ہے، لیکن یحییٰ بن معین انھیں مغازی کے باب میں ثقہ اور ان کی کتاب کو سیرت نبوی کے ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دیتے ہیں، امام طبری نے ان سے بکثرت روایتیں نقل کی ہیں۔

(۱۹) یحییٰ بن سعید بن ابان الکوفی (المتوفی ۱۹۴ھ): یہ بھی محمد بن اسحاق اور ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ اگرچہ قلیل الروایۃ ہیں تاہم ثقہ ہیں[۳]، حاجی خلیفہ نے انھیں فن مغازی کے مصنفین میں شمار کیا ہے[۴]، ان کی کتاب کے بکثرت اقتباسات صحیح بخاری کے باب المغازی میں منقول ملتے ہیں، اسی طرح طبری اور ابن حجر نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۲۰) ابو العباس ولید بن مسلم الاموی (المتوفی ۱۹۵ھ) یہ اپنے عہد میں شام کے سب سے

---

[۱] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۱۹۵ [۲] الاعلام زرکلی ج ۳، ص ۹۲ [۳] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۸۰۔

[۴] کشف الظنون ج ۲، ص ۲۴۱۔

بڑے عالم، محدث اور مورخ تھے، امام اوزاعیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مغازی ان کا خاص فن تھا۔ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ ولید مغازی میں وکیع بن الجراح سے بڑے عالم تھے[1]۔ طویل اور آثار قیامت کے سلسلہ کی احادیث کے خاص طور پر حافظ تھے[2]۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ علمائے جرح و تعدیل ولید بن مسلم کی ثقاہت اور صحیح الحدیث ہونے پر متفق ہیں[3]۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر ان کی تصنیفات کی تعداد ستر بیان کرتے ہیں[4]، تاہم ان کی تصنیفات کی مزید کوئی تصریح و تفصیل نہیں ملتی ہے۔ ابن ندیم نے صرف دو کتابوں کا ذکر کیا ہے، کتاب السنن فی الفقہ اور کتاب المغازی[5]۔

(۲۱) ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی (المتوفی ۲۰۷ھ) ان کا شمار اسلام کے قدیم ترین مورخین میں ہوتا ہے، الطبقات الکبریٰ کے مشہور مصنف محمد بن سعد ان کے تلمیذ رشید تھے، واقدی بہت کثیر التصانیف تھے، سیرت نبویؐ کے موضوع پر ان کی دو کتابیں ملتی ہیں: کتاب السیرۃ اور التاریخ الکبیر والمبعث والمغازی، علمائے حدیث نے ان کو شدید ترین نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے، حتیٰ کہ عہد آخر میں واقدی کا نام کذب و افتراء کا مرادف خیال کیا جانے لگا، امام شافعیؒ ان کی تصانیف کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے، علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام اور اس کی کتب سیرت بے بنیاد روایات کا سرچشمہ ہیں، ہم آئندہ صفحات میں سیرت نبویؐ کے ماخذ کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے اس موضوع پر وضاحت سے روشنی ڈالیں گے۔

(۲۲) عبدالرزاق ابن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ: یہ چمنستان اتباع تابعین کے گل تازہ تھے، حدیث میں ان کی شہرۂ آفاق مصنف اپنی قدامت و اولیت کے لحاظ سے مصنف ابن ابی شیبہ سے بھی

---

[1] شذرات الذہب ج ۱، ص ۳۴۴۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۴۔ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲، ص ۱۴۶۔ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۶ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲۔ [5] الفہرست لابن ندیم ص ۱۳۱

بلند پایہ ہے، تبحر علمی، قوت حافظہ اور تثبت و اتقان فی الحدیث میں وہ نادرۂ عصر تھے، انھیں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، سفیان بن عیینہؒ، ابن جریجؒ اور معمر بن راشد جیسے یکتایان عہد محدثین سے شرف تلمذ حاصل تھا، خود ان کے چشمۂ فیضان سے تشنگی علم فرو کرنے والوں میں امام احمدؒ، علی بن المدینیؒ، یحییٰ بن معینؒ اسحاق بن راہویہ اور حماد بن سلمہ کے نام ملتے ہیں، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ماہرین فن ان کی ثقاہت و عدالت پر بیک زبان متفق ہیں[1]، چنانچہ امام احمد، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، یعقوب بن شیبہ اور ابو داؤد والفریابی وغیرہ جیسے اکابر علماء جرح نے بصراحت ان کی توثیق کی ہے۔ بعض علماء نے ان میں رفض و تشیع کے میلان کا بھی اظہار کیا ہے، لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد صرف اہلبیت کرامؓ سے انکی محبت ہے، آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے، اس لیے امام احمد کا قول ہے:

اتینا عبد الرزاق قبل المأتین و ھو	۲۰۰ھ سے قبل عبد الرزاق کے پاس
صحیح البصر و من سمع منہ بعد ما	آئے تو ان کی بصارت قائم تھی لیکن
ذھب بصرہ فھو ضعیف السماع[2]	جس نے ان کی بینائی زائل ہونے کے بعد
	ان سے حدیثیں سنی ہیں اس کا سماع ضعیف ہے

ابن ہمام نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، لیکن اکثر معدوم ہیں، خیرالدین زرکلی اور ابن ندیم نے ان کی جن کتابوں کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں: سنن عبد الرزاق، کتاب فی التفسیر، کتاب السنن فی الفقہ، مصنف عبد الرزاق[3]، علاوہ ازیں فن مغازی میں بھی ان کی ایک تالیف کا ذکر ملتا ہے۔

(۲۳) یونس بن بکیر الشیبانی (المتوفی ۱۹۹ھ): روایت حدیث میں ان کا پایہ گو زیادہ بلند نہیں، مگر اکثر محدثین ان کی ثقاہت کے حق میں ہیں، ہشام بن عروہ اور محمد بن اسحاق کے سامنے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۳۳۴ [2] میزان الاعتدال ج ۲، ص ۱۲۶ [3] الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۱۰۰ والفہرست ص ۲۲۶۔

زمانے تک زندگی اور مغازی و سیرت میں خصوصی کمال پیدا کیا، چنانچہ علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے "صاحب المغازی" کے الفاظ سے ملقب کیا ہے، انھوں نے مغازی کی بعد اسحاق کا ذیل لکھا ہے۔

(۲۴) ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری (المتوفی ۲۱۳ھ) یہ ایک ثقہ محدث، نامور مورخ و نحوی اور ماہر انساب کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے، زیاد البکائی کے اشد تلامذہ میں تھے، اور ان ہی کی روایت سے مغازی ابن اسحاق کی سماعت و تحصیل کی تھی، بقول سہیلی اکابر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، سیرت نبوی میں ان کی تالیف کو قدامت و جامعیت کے اعتبار سے امتیاز خاص حاصل ہے، اس میں انھوں نے صرف سیرت ابن اسحاق کی تلخیص و تہذیب کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے مشکل مطالب والفاظ کی تشریح و توضیح بھی کی ہے، سیرت ابن ہشام چار ضخیم جلدوں میں متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے، اس کا ایک اڈیشن ۱۹۳۷ء میں استاذ محمد محی الدین عبد الحمید کی تحقیق کے ساتھ مصر سے شائع ہوا، اسی طرح مصطفی السقا اور عبد السلام ہارون کی تحقیق و تہذیب کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں اس کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن طبع ہوا، امام محمد بن عبد الوہاب نے سیرت ابن ہشام کی تلخیص کی ہے، جو متعدد بار چھپ چکی ہے۔

(۲۵) حافظ محمد بن سعد کاتب الواقدی (المتوفی ۲۳۰ھ): یہ امام ابو داؤد طیالسی اور محمد بن عمر الواقدی کے اجل تلامذہ میں ہیں، محدثین نے لکھا ہے کہ ان کے استاذ واقدی جتنے زیادہ ناقابل اعتبار ہیں، وہ اتنے ہی زیادہ معتبر اور قابل سند ہیں، خطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

کان من اھل العلم والفضل	وہ اکابر اہل علم و فضل میں تھے، انھوں نے
وصنف کتابا کبیرا فی طبقات	صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے وقت تک کے
الصحابۃ والتابعین ومن	علما کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی، جو

بعدھا فی نقتہ فاجاد و احسن[1] نہایت عمدہ اور بہترین تصنیف ہے۔

بارہ مبسوط جلدوں پر مشتمل اس شہرۂ آفاق تصنیف کا نام الطبقات الکبریٰ ہے جو عام طور پر طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے، اس کی پہلی جلد اور دوسری جلد کا معتدبہ حصہ خاص سیرت نبویؐ کے موضوع پر ہے، باقی جلدوں میں صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے حالات و تراجم ہیں، اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن تمام روایتوں کے باسند ہونے کے باعث واقدی کی مرویات کو بآسانی الگ کیا جا سکتا ہے، اس کتاب کا اولین اڈیشن لیڈن سے شایع ہوا، اس کے بعد قاہرہ و بیروت سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔

(۲۶) ابو عبداللہ محمد بن عائذ دمشقی (المتوفی سنہ ۲۳۳ھ): مغازی میں غیر معمولی شغف و مہارت کے باعث "صاحب المغازی" ان کا لقب پڑ گیا تھا، یحییٰ بن معین اور دوسرے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ان کی کتاب المغازی کا پایۂ اعتبار بہت بلند ہے، ابن سید الناس کی مشہور تصنیف عیون الاثر کے بنیادی ماخذوں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔

(۲۷) ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ البغدادی (المتوفی سنہ ۲۹۹ھ): یہ تاریخ، سیرت اور ادب کے جلیل المرتبت عالم تھے، حدیث میں ان کو امام احمدؒ بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان کی مشہور تصنیف التاریخ الکبیر کا ایک معتدبہ حصہ سیرت نبویؐ پر مشتمل ہے۔

(۲۸) امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی سنہ ۳۱۶ھ): امام طبری بڑی جامع الکمالات اور متنوع الصفات شخصیت کے مالک تھے، خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ:

جمع من العلوم مالم یشارکہ فیہ احد من اھل عصرہ[2] — علوم و فنون کی جامعیت میں کوئی ہم عصر ان کا شریک نہیں۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰، ص ۲۷۳۔ [2] تاریخ التراث العربی ج ۲، ص ۳۶۱۔

چنانچہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ سب میں یکساں مہارت و بصیرت رکھتے تھے، ابن خزیمہ کا قول ہے کہ میں دنیا میں ان سے بڑا عالم کسی کو نہیں جانتا، ابن جریر طبری کی تفسیر کو احسن التفاسیر قرار دیا جاتا ہے، فن تاریخ میں ان کی ۱۳ ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب تاریخ کبیر ہے، اس کی دوسری جلد خاص سیرت نبوی سے متعلق ہے، اور اپنے موضوع پر مستند ترین خیال کی جاتی ہے، کیونکہ اس سے امام طبری کی وسعت علمی، کمال وثوق اور تحقیق و نکتہ آفرینی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، بعد کی تمام مستند تاریخیں مثلاً تاریخ ابن اثیر، ابن خلدون، اور تاریخ ابو الفداء وغیرہ سب ابن جریر طبری کی مذکورہ کتاب سے ماخوذ بلکہ اسی کے مختصرات ہیں، استاذ جواد علی نے تاریخ کبیر کے ماخذ کا تحقیقی تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ طبری نے اپنے عہد تک کے تمام مدون تاریخی سرمایہ سے پورا استفادہ کیا ہے[1]۔

سیرت نبوی پر متاخرین کی تصنیفات | گذشتہ صفحات میں سیرت نبوی کے قدیم اور اساسی ماخذ کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے، اب ذیل میں ہم علمائے متاخرین کی چند اہم تالیفات سیرت کا ذکر کرتے ہیں، جو قدماء کی مذکورۂ بالا تصنیفات کو اپنے اوراق میں محفوظ کیے ہوئے ہیں، یا ان کی شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں۔

(۱) روض الانف مؤلفہ امام عبد الرحمٰن السہیلی (المتوفی ۵۸۱ھ): یہ محمد بن اسحاق کی مذکورۂ صدر کتاب السیرۃ کی شرح ہے، علامہ سہیلی کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، عہد مابعد کے تمام مؤلفین سیرت نبوی کی تحقیقات میں ان کے خوشہ چیں ہیں، مصنف اس کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

تحصل فی ھذا الکتاب من فوائد	اس کتاب میں ہم کو بکثرت علمی و ادبی فوائد
العلوم والآداب واسماء	اسماء الرجال و انساب کا علم اور فقہی و نحوی
الرجال والانساب ومن الفقہ	معلومات اور اعراب کی تفصیلات ملیں گی،
... من ... تعلیل النحو وصنعۃ الاعراب	جو ایک سو بیس (۱۲۰) کتابوں سے ماخوذ ہیں،

[1] تاریخ التراث العربی ج ۲، ص ۴۶۱

ماھو مستخرج من ما نیف علی — اس کے علاوہ خود میری ذاتی تحقیق بھی

مائۃ وعشرین دیوانا سوی ما — اس میں موجود ہے۔

انتجہ صدری[1]

یہ کتاب قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے۔

(۲) المختصر فی سیرۃ خیر البشر: مؤلفہ حافظ ابو محمد عبد المومن الدمیاطی (المتوفی سنہ ۷۰۵ھ) اس کتاب کی ضخامت اگرچہ صرف ۳۰ صفحے ہے، تاہم یہ سیرت نبوی کے موضوع پر بیحد اہم تصنیف شمار ہوتی ہے، چنانچہ اکثر مؤلفینِ سیرت کی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، حافظ دمیاطی حدیث، فقہ اور تاریخ میں یکساں مہارت رکھتے اور اپنے عہد کے چند اساطین اہل علم میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی اس تصنیف کا ایک خطی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے، قاہرہ سے طبع بھی ہو چکی ہے۔

(۳) السیرۃ النبویۃ: مولفہ امام اسماعیل بن عمر بن کثیر (المتوفی سنہ ۷۷۴ھ) چار جلدوں پر مشتمل یہ اہم کتاب سنہ ۱۹۶۵ء میں قاہرہ سے شایع ہوئی، حافظ ابن کثیر نے علم و فن کی تاریخ میں ایک مفسر، محدث، مورخ اور فقیہ کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت پائی، انھوں نے تصنیفات کا بہت عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، جن میں البدایۃ والنہایۃ (۱۴ جلد) تفسیر ابن کثیر (۱۰ جلد) جامع المسانید (۸ جلد) خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں[2]

(۴) جوامع السیرۃ: مؤلفہ امام ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی (المتوفی سنہ ۴۵۶ھ) اس میں ابن حزم نے حیات نبوی کو بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ قلمبند کیا ہے، ڈاکٹر احسان عباس اور

[1] روض الانف ج ۱، ص ۱۳۵۔ [2] ابن کثیر کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الدرر الکامنۃ ج ۱، ص ۳۷۳، البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۳، شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱، آداب اللغۃ ج ۳ ص ۱۹۳، الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۳۱۸

ڈاکٹر مصر السید الاسلامی کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں بعض دیگر رسائل بھی شامل کر کے دار المعارف مصر سے طبع ہوئی۔

(۵) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مولفہ حافظ ابن قیم الجوزی (المتوفی سنہ ۷۵۱ھ) یہ شہرۂ آفاق اور عام طور پر متداول کتاب فقہ السیرۃ کے موضوع پر اولین کتاب شمار ہوتی ہے، اس میں مؤلف نے صرف سیرت نبویؐ اور وقایع حیات نبویؐ کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے احکام بھی مستنبط کیے ہیں اور بکثرت فقہی مسائل میں علماء کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، نیز بعض احکام کو جدید تحقیقات سے ثابت کیا ہے، غرض ابن قیمؒ نے اپنی اس کتاب کو علمی فوائد، تحقیقی نوادر اور نکتہ آفرینی ہر حیثیت سے مکمل کر کے نہایت علمی اور اہم بنا دیا ہے، مصنف نے اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے سفر حج کے دوران میں محض قوت حافظہ سے تالیف کی ہے، یہ ہندوستان و قاہرہ سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

(۶) شرح مواہب لدنیہ، مولفہ امام محمد بن عبد الباقی الزرقانی (المتوفی سنہ ۱۱۲۲ھ) یہ امام قسطلانی کی مشہور تصنیف مواہب لدنیہ کی شرح ہے، کہا جاتا ہے کہ سہیلی کی روض الانف کے بعد اس موضوع پر کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے۔ شرح مواہب آٹھ ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔

(۷) السیرۃ الحلبیہ، مولفہ علی بن ابراہیم الحلبی (المتوفی سنہ ۱۰۴۴ھ) اس کتاب کا پورا نام "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" ہے، اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں صرف راوی کے نام پر اکتفا کر کے سیرت نبویؐ قلمبند کی ہے، اسانید روایت سے تعرض نہیں کیا ہے، علاوہ ازیں تشریح طلب امور کی وضاحت اور بعض حوادث پر نہایت لطیف پیرایے میں تعلیق لکھی ہے، اس تصنیف نے قبول عام کے دربار میں بہت بلند مقام حاصل کیا، وہ ضخیم جلدوں میں

مصر سے ۱۳۲۶ھ میں طبع ہوئی.

سیرت نبویؐ کے مآخذ کا تنقیدی تجزیہ

آج احادیث نبویہؐ کے بکثرت مجموعے متداول اور مقبول عام ہیں، لیکن ان میں وثوق و اعتماد اور اعتبار و استناد صرف صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور مسند امام احمد کو حاصل ہے، محدثین نے روایات کی صحت و سقم اور راجح و مرجوح کو جانچنے پرکھنے کے بہت سخت اصول وضع کیے ہیں، یہاں تک کہ رواۃ کی جرح و تعدیل کا ایک مستقل فن اسماء الرّجال کے نام سے وجود میں آگیا، جس کے مطابق کسی بھی روایت کے پایۂ اعتبار کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بلاشبہ محدثین کا یہ ایک عظیم علمی کارنامہ ہے.

لیکن اس کے برخلاف سیر و مغازی کی کتابیں مجموعی حیثیت سے کتبِ حدیث کی ہم پلہ نہیں نہیں ہیں، کیونکہ ان میں تحقیق و تنقید اور اصول نقد و جرح کے اس بلند معیار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، جو مثلاً احادیث احکام کا خصوصی امتیاز ہے، دراصل مرورِ وقت کے ساتھ علماء میں یہ ایک عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مناقب اور فضائل اعمال کے باب میں روایتوں کی تحقیق و تنقید میں زیادہ تشدد و احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صحیح و ضعیف ہر طرح کی روایات کا درج کرنا جائز ہے جیسا کہ حافظ زین الدین العراقی (المتوفی سنہ ۸۰۶ھ) اپنی منظوم سیرت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا	طالب علم کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں
تجمع ما صحّ وما قد انکرا	صحیح اور غلط ہر طرح کی روایتیں ہوتی ہیں

چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ محدثین کے اصول جرح و تعدیل کے مطابق تمام کتبِ سیرت کی تنقیح و تحقیق ہونی چاہیے، تاکہ ضعیف و بے اصل روایات کی معرفت آسان ہو سکے.

جیسا کہ صفحات بالا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبویؐ پر متقدمین اور متاخرین علماء نے بہت وسیع اور قیمتی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ تمام کتابیں صرف چار مراجع کے محور پر

گردش کرتی ہیں، سیرۃ ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد اور طبری، ان میں محمد بن اسحاق کو امام احمد اور بعض دوسرے محدثین نے حسن الحدیث اور ثقہ قرار دیا ہے، اس لیے ان کی روایات بالعموم قابل اعتبار ہیں۔

لیکن واقدی کو محدثین نے شدید نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے، امام نسائی کا قول ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، امام شافعیؒ انھیں کذاب قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ "مغلطائی نے واقدی کے بارے میں تعصب سے کام لیتے ہوئے صرف اس کی توثیق کرنے والوں کے اقوال نقل کیے ہیں اور جن لوگوں نے اس کی تکذیب و تضعیف کی ہے، ان سے صرف نظر کیا ہے، درانحالیکہ موخر الذکر طبقہ تعداد اور علم و معرفت دونوں میں پہلے طبقہ سے زیادہ اہم ہے"۔ علامہ عثمانیؒ[1] نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مغلطائی نے تعصب نہیں بلکہ حق و انصاف سے کام لیا ہے، اس لیے کہ واقدی کے بارے میں جادۂ حق و صواب اس کی توثیق کرنا ہی ہے، امام تقی الدین ابن دقیق العید کا بیان ہے کہ

جمع شیخنا ابو الفتح الحافظ فی اول کتابہ "المغازی والسیرۃ" اقوال من ضعفہ ومن وثقہ ورجح توثیقہ وذکر الاجوبۃ عما قیل[2]

ہمارے شیخ ابو الفتح حافظ نے اپنی کتاب "المغازی والسیرۃ" کے شروع میں وہ تمام اقوال جمع کر دیے ہیں جو واقدی کی تضعیف و توثیق کے متعلق منقول ہیں اور خود انھوں نے ان کی توثیق کو مرجح قرار دیا ہے اور ان پر اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ واقدی کی ثقاہت اور ضعف کے بارے میں محدثین میں اتفاق نہیں، بلکہ

---

[1] معارف۔ یہ علامہ عثمانی کون ہیں اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔ [2] فتح الباری ج ۹، ص ۹۰۔

اختلاف رائے موجود ہے لیکن بایں ہمہ حافظ ذہبی اور امام نووی کا یہ لکھنا بہت تعجب خیز ہے کہ "واقدی کے ضعف و دہن پر علماء کا اجماع واقع ہو ... ہے" اس بات کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا کہ واقدی نے اپنی کتاب تمام ہر رطب و یابس کو جمع کر دیا ہے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) مگر اس کے باوجود حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث نے اس کی تلخیص کی ہے[1] جس کا ایک خطی نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے[2]۔

ابراہیم العربی کی رائے ہے کہ واقدی تاریخ اسلامی کے سب سے بڑے واقف کار اور عارف تھے[3] انھوں نے دور دراز مقامات پر خود جا کر واقعات کی تحقیق و تنقیح کے لیے جو غیر معمولی جانکاہی اور عرق ریزی کی ہے اس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ عہد جاہلیت کے بارے میں ان کی معلومات کم تھیں۔ حافظ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ واقدی ہمارے نزدیک حسن الحدیث ہے[4]، مزید برآں محمد بن سعد کی کتاب السیرۃ کا معتد بہ حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، اس لیے سیرت نبویؐ کے باب میں ہم واقدی کی ہر روایت کو غیر معتبر نہیں قرار دے سکتے، بلکہ محدثین کے اصول نقد و جرح کی میزان ذہن میں رکھ کر ہر روایت کے ضعف و صحت کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔

امام طبریؒ اور ابن سعد کو محدثین کی بارگاہ میں ثقاہت و ثبت کا اعزاز حاصل ہے، لیکن بایں ہمہ ان کی تصنیفات میں بہت سی غیر مستند اور ضعیف روایات بھی ملتی ہیں، علاوہ ازیں اصل سیرۃ ابن اسحٰق آج دستیاب نہیں ہے[5]۔ ابن ہشام نے اس کی تہذیب و تلخیص کر کے اس مہر بند مشک کی خوشبو کو وقف عام کیا، اور آج وہی ذوق شناسان علم کی توجہات کا مرکز ہے، لیکن ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق کو زیاد البکائی اور یونس بن بکیر سے حاصل کیا ہے، جن کے بارے میں محدثین کی رائیں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں، اگرچہ

---

[1] معارف۔ اس کے باوجود ابن حجر واقدی کے ضعف و نکارت کے قائل ہیں جیسا کہ اس مضمون میں بھی اوپر گذرا ہے[2] قواعد فی علوم الحدیث ص ۴۴۹ [3] تاریخ التراث العربی ج ۲ ص ۳۰۴ [4] ابن ہمام کی اصل حیثیت فقیہ کی ہے جو بانوہ محدثین کے مقابلہ میں ان کے قول کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے[5] معارف۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کوشش سے اس کا ایک ٹکڑا رباط سے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا گیا

ہر روایت بسند مذکور ہے اس لیے اہل نظر کے لیے اس کے راویوں اور سندوں کی معرفت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ کتب سیرت کی روایات قبول کرنے میں ہمیں جادۂ اعتدال و توازن پر قائم رہنا چاہیے، اس میں مذکور ہر روایت کو علی الاطلاق قبول کر لینا یا اس بنا پر ہر روایت کو ناقابل اعتبار قرار دینا کہ اس میں ضعیف روایتوں کا بھی دخل ہے کوئی معقول و مستحسن بات نہیں ہے، اگر کتب سیرت کے عظیم سرمایہ سے ہم نے چشم پوشی کی تو ناقابل تلافی علمی نقصان ہوگا۔

معارف:۔ مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد اول کے مقدمہ میں فن سیرت کی قدیم کتابوں پر مفصل بحث و تبصرہ کیا ہے، اس ضمن میں جابجا واقدی کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں؛

"علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کیے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں۔" (سیرۃ ج۱، ص ۱۵)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں؛

"محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی ان سے کم نہیں لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام ہے، اور اس لیے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے۔" (سیرۃ النبی جلد اول، ص ۲۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں؛

"واقدی خود تو قابل ذکر نہیں ہیں، لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابلِ اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں .... اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بسند مذکور ہیں اس لیے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں" (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲-۲۳)

آگے پھر لکھتے ہیں:

"سیرت نبویؐ کے متعلق ان (واقدی) کی دو کتابیں ہیں۔ کتاب السیرۃ، اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہیں، کتبِ سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں" (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۰)

سیرت کی امہاتِ کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔"

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین اعتبار کے قابل ہیں..... ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ" (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۴-۴۵)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف جنوری ۱۹۲۶ء اور جنوری ۱۹۲۷ء کی دو اشاعتوں میں نہایت تحقیق، جامعیت اور استقصاء کے ساتھ واقدی کا درجہ و مرتبہ اور ان کی کتاب کی حیثیت

واضح کی ہے، انھوں نے اس ضمن میں واقدی کے موافقین و مخالفین کی فہرستیں بھی دی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موافقین کی تعداد بھی کم ہے اور ان سب کا مخالفین کے مقابلہ میں حدیث و روایت میں پایہ بھی بہت کمتر ہے۔

علاوہ ازیں واقدی کو نامور محدثین اور سیرت و مغازی کے مستند ائمہ کی صف میں جگہ دینے کی کوشش دراصل مستشرقین کی ایک سازش ہے جو نہایت مضحکہ خیز ہے، حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس[1] کا حوالہ دیں"

جو لوگ واقدی کی روایتوں کو مستند سمجھتے ہیں ان کا شمار بلند پایہ محدثین میں نہیں ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے اس کے موافق بھی شہادت دی ہے مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقف کاروں کا بڑا حصہ جس میں امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ داخل ہیں اس کو بے اعتبار، جھوٹا اور دروغ گو کہتا ہے اور اسی لیے اس کی روایتوں کو محدثین نے حدیث اور احکام کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے"

جو لوگ واقدی کی توثیق کے لیے یاقوت کا حوالہ دیتے ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب و جغرافیہ و تاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح و تعدیل سے کیا تعلق ہے"

اگر ناظرین زیر نظر مقالہ کے ساتھ معارف کے دو: نوں مضامین بھی ملاحظہ کریں جو مقالات سلیمان جلد دوم میں بھی شامل ہیں تو واقدی کا مسئلہ بالکل منقح ہو جائے گا اور اس کی اصل حیثیت بھی واضح ہو جائے گی۔

---

[1] رینالڈس انگریزی زبان کا مشہور ناول نگار ہے۔

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی اور انکا تذکرہ

مہر جہاں تاب

از جناب مولوی شمس تبریز خان صاحب رفیق مجلس تحقیقات و نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۲)

مولانا لکھتے ہیں کہ مولوی جمال الدین صاحب کے بعد نواب صاحب نے مولوی محمد مبین شاہجہاں پوری ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کو نیابت اور مدار المہامی پر بلایا اور کچھ عرصے بعد انھیں رخصت کر دیا، پھر عبد العلی خاں گیاوی مدار المہام ہوئے جو مجھ سے بہت شریفانہ برتاؤ کرتے تھے،.... ۱۳۰۲ھ میں گریفن ریزیڈنٹ (جو کابل میں اپنی سخت گیری کیلئے مشہور ہو چکا تھا) ریاست میں مظالم کی تحقیقات کیلئے بھیجا گیا، اس نے شیخ صلاح الدین کو توال کو سختی کے الزام میں دو تین سال کیلئے قید کر دیا، اور نواب صاحب کا منصب و خطاب ضبط کر لیا گیا، میں نے انھیں اس حال میں دیکھا کہ تاج محل کے تالاب کی جانب کمرے میں ایک بے زبان چڑیا کی طرح مقید اور فکر مند رہتے تھے، ان کی سخت جانی پر حیرت ہوتی تھی، صرف بیگم صاحبہ ساتھ تھیں اور کوئی قریب بھی نہیں جاتا تھا، ریزیڈنٹ ایک ایک کو بلا کر نواب صاحب اور والیۂ ملک کے بارے میں استفسار کرتا۔

اسی دوران میں کلکتہ کے عبد اللطیف خان مدار المہام بنائے گئے جنکا مشاہرہ دو ہزار تھا کچھ دنوں کے بعد میجر واٹ وزیر مقرر ہو گئے، میں نے ایک سال بعد محرری سے استعفا دیدیا، بھوپال سے واپس آکر ٹونک تشریف لے گئے، اور کچھ عرصے بعد وہاں سے وطن واپس ہوئے اور مستقل قیام کیا، اور تصنیف و تالیف میں عمر گزار دی، ۱۳۱۲ھ میں ندوۃ العلماء کے اجلاس بریلی میں شریک ہوئے، جہاں انکے بقول تین سو علماء شریک تھے، مولانا لطف اللہ صاحب صدر تھے، اور مولانا حکیم عبد الحی صاحب سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہاں سے علیگڈھ گئے، مسلم یونیورسٹی کے بارے میں لکھتے ہیں،

بس بہر آنجا کہ سید احمد خان چندہ — دہان کے مدرستہ العلوم پہنچا جس کے لیے سید احمد
لکوک روپیہ برائے آں جمع کردہ کانے — خان نے لاکھوں روپیے کا چندہ جمع کیا،

اگر ... دراز کر دوست ... | اور اسکے لیے کسی دوکان کے سامنے دامن
با ... ... گذشت ... | ... چھپانے سے دستِ سوال دراز کرنے
ہر گز نہی کر دہ رسیدم [1] | ہو اور چندہ میں ایک پیسہ بھی لے لینے میں
کوئی کوتاہی نہیں کی۔

آخری احساسات اور وفات مولانا سید فخر الدین صاحبؒ خاندانی تربیت اور دینی رجحان کے سبب ہمیشہ اصلاحِ نفس اور فکرِ آخرت کی طرف متوجہ رہے، مہر جہاں تاب۔ میں جابجا اپنی دنیوی ور ملازمت کی مشغولیتوں پر افسوس کرتے ہیں، اور دینی و اخروی مشاغل میں وقت بسر کرنے کی تمنا کرتے ہیں، اخیر عمر میں یہ احساسات اور بڑھ گئے تھے، اپنی کتاب سیرۃ السادات میں لکھتے ہیں:

"عمر کا آفتاب چھپاسٹھویں منزل پر پہنچا بظاہر اس کے غروب کا وقت قریب ہے بیعتِ طریقت مقتدائے زمانہ حضرت مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی کے دستِ حق پرست پر ہوئی لیکن اس سلسلہ کی نسبت ...لی آپ سے کرتے ہوئے ایسی شرم آتی ہے جیسا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاندان ...ب کی نسبت کرتے ہوئے اپنی ناخلفی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، کیونکہ ساری عمر بے عملی ...رنا اہلی میں گذاری اور اب جبکہ زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے اب بھی نافرمانیوں اور گناہوں ...ے رہائی نہیں ہوئی، ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا کہ دل گناہوں کے خیال سے خالی ہو، اگر ...عات میں سے کسی خیر کی توفیق بھی ہوئی تو کردہ ناکردہ برابر ہے اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے ...نہ پر نہ مار دیجائے، اس پاس میں اگر کچھ آس بندھتی ہے تو محض اس سے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ الخ [2]

وفات کا حال: ... ... کی مقبولیت و حسنِ خاتمہ کا اندازہ ہوتا ہے، انکے فرزند مولانا عبد الحئی صاحب

---

[1] مہر جہاں تاب ص ۵۷۶۔ [2] حیات عبد الحئی بحوالہ سیرۃ السادات ص ۲۳

لکھتے ہیں:-

"...... یہاں تک کہ مغرب کے بعد نبض ساقط ہوگئی اور سوائے سانس کی آمد و شد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی اور دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے اور قلب جاری ہوگیا، اور اس میں اتنی شدت وحدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلے سے لفظ مبارک "اللہ" سنا جا سکتا تھا، قلب مبارک میں ایسی جنبش تھی گویا ایک ایک بالشت اچھلتا تھا، یہ حال رات کے ایک بجے تک رہا اس کے بعد اضمحلال پیدا ہوگیا، اسوقت اس فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہوگیا، دوبار پڑھنے کی نوبت آئی پھر حاضرین نے تلقین شروع کی حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا لبوں اور زبان کی حرکت دیکھنے سے اور آواز قریب جانے سے سمجھ میں آتی تھی، لفظ مبارک اللہ کو پوری تجوید کے ساتھ ادا فرما رہے تھے جیسا کہ زندگی میں عادت مبارک تھی، آخر حالت تک ذاکر رہے، دم واپسیں کے وقت فکِ اسفل (نیچے کا جبڑا) اوپر ہوگیا، اور زبان اسم ذات ادا کرنے کے لیے متحرک ہوئی مگر پورے طور پر وہ ادا نہیں ہو سکا تھا کہ جان جان آفریں کے سپرد کردی، وہ رات ہم لوگوں کے لیے شب قدر تھی، محسوس ہوتا تھا کہ ملائکہ رحمت ہر طرف سے ہجوم کیے ہوئے ہیں، تنہائی سے کوئی وحشت اور ایسے شفیق باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کوئی صدمہ نہ تھا، قلب میں صاف بسط و انشراح محسوس ہوتا تھا بیساختہ الحمد للہ الحمد للہ زبان پر جاری تھا، احباب تسبیح و تہلیل میں مصروف تھے اور نماز تہجد پڑھ رہے تھے، ایک ایسی حالت تھی کہ تحریر میں اسکو لانا مشکل ہے، فقیر نے ایسی کیفیات تمام عمر مشاہدہ نہیں کیں، یہ چہارشنبہ کی شب ۱۰ رمضان مبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے، اسوقت والد مرحوم کی عمر ۷۱ سال تھی۔"[1]

مرحوم نے اپنے پسماندگان میں پہلی بیوی سے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اور ایک صاجزادی (جنھوں نے نوجوانی میں انتقال کیا) اور دوسری بیوی سے دو صاجزادیاں شمس النساء زوجہ سید ظہور صاحب حسنی ٹونکی اور فاطمہ بی بی زوجہ سید محمد یوسف مرحوم اور ایک صاجزادہ حافظ سید محمد صابر کو چھوڑا جنھوں نے دار العلوم دیوبند میں حفظ کیا اور جن پر حضرت شیخ الہند محمود حسن صاحبؒ بڑی شفقت فرماتے تھے، وہ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال کر گئے۔[1]

تصنیفات پر طائرانہ نگاہ مولانا فخر الدین صاحب خیالی نے نثر میں اظہار خیال کا ذریعہ بیشتر فارسی اور کمتر اردو کو بنایا جب کہ نظم کی ہر صنف میں زیادہ تر اردو ہی میں اظہار خیال کیا ہے۔ فارسی کے مقابلہ میں ان کی اردو غزلیں، مثنویاں اور مسدس زیادہ دلکش اور پُر اثر ہیں، البتہ ان کی فارسی نثر میں ادب و انشاء کی چاشنی، رنگینی، روانی و پختگی، سلاست و شگفتگی موجود ہے، جو انھیں اس عہد کے مستند فارسی نویسوں کی صف میں جگہ دیتی ہے، اسی طرح وہ اردو شاعری میں منشی امیر اللہ تسلیم کے تلامذہ میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، جس پر مستقل تبصرے کی ضرورت ہے جو ان شاء اللہ کبھی کیا جائے گا۔

انکی گم شدہ کتابوں میں مولانا عبدالحیؒ صاحب نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے، تاریخ تکمیل لکھنؤ (اردو) چمنستان اردو، جوش دل (اردو کا پہلا دیوان)، پریم راگ (بھاشا کا دیوان) دیوان فارسی اور رقعات فخریہ مثنوی بہار تسلیم وجہان فخر، اور موجود کتابوں میں دیوان فخر (اردو)، مثنوی، او طرفیہ ونگارخانہ چین (موخرالذکر کو غلام احمد فروغی نے چھپوایا تھا) مسدس خیالی مستطعالی کے جواب میں مولوی عبدالعلی آسی مدراسی نے لکھوائی اور چھپوائی تھی، نثر خیالی ایک مختصر کتابچہ ہے جسے فروغی نے ۱۳۰۸ھ میں شائع کیا تھا، تجلیات خیالی (۵۶ صفحات کا نعتیہ غزلوں اور نظموں کا مختصر مجموعہ ہے، جسے حکیم عبدالحی صاحب نے شائع کیا تھا) واردات خیالی غیر مطبوعہ، عربی میں دعاؤں کا مجموعہ سبیل النجات مرتب کر کے اس کا اردو ترجمہ

---

[1] حیات عبدالحیؒ ص ۱۲۶

بھی کر دیا تھا، اسی طرح کی کتاب اردو میں مجربات خیالی کے نام سے مرتب کی تھی، فخر المطالب کے نام سے سیوطی کے کسی رسالے کا ترجمہ کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی "الانصاف" کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا اور اس پر فوائد لکھے تھے، ان کی کتابوں میں . . . . . . ایک کتاب آئینۂ خیال ہے جو ۲۲۲ اوراق پر مشتمل ہے، جو اردو لغات و محاورات کا فارسی ترجمہ ہے، اور بڑے کام کی ہے، مہر جہاں تاب کے بعد ان کی دوسری بڑی کتاب ھدیۃ السادات ہے، جو ۴۵۵ صفحات کی کتاب ہے، اس کے باب اول میں حسنی سادات کی مختلف شاخوں کا تذکرہ اور نسب نامہ ہے، حسینی سادات پر دوسرا باب نامکمل رہا، یہ کتاب اصلاً شجروں اور نسب ناموں پر مشتمل ہے، جو سادات کے سیرت نگاروں کے لیے خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

تیسری مفصل کتاب اعلام الہدیٰ ہے، جو ۵۰۰ صفحات پر ہے، جو اصلاً حضرت سید احمد شہیدؒ کے چچا مولانا سید محمد نعمانؒ نے حضرت شاہ علم اللہؒ اور ان کی اولاد و احفاد کے تذکرے میں لکھی تھی جسے مولانا خیالی نے ۱۳۱۰ھ میں سیرۃ علمیہ کے نام سے مرتب کیا تھا، پھر مولانا عبد الحئی صاحب نے تذکرۃ الابرار کے نام سے مرتب کیا۔ مہر جہاں تاب کا اردو حصہ ۹۰۰ صفحات تک لکھے گئے تھے، اور اس میں تاریخ ایران اور تاریخ اسلام کے عباسی دور کا تذکرہ چل رہا تھا۔

ان کی اردو نعتوں کا ایک مجموعہ منجیات خیالی کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کے علاوہ کئی مجموعے غیر مطبوعہ ہیں، اور بامقصد اور صحیح نعت گوئی کی ایک روایت قائم کرتی ہیں، انھوں نے مجمع البحرین کے نام سے ۴۵۰ صفحات کی کتاب میں ملا علی قاریؒ کی الحزب الاعظم کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا، جو ان کی قادر الکلامی کا اچھا نمونہ ہے، اردو مثنوی پر انھیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی جو نسیم دہلوی اور تسلیم کا فیض کہی جا سکتی ہے، ان کی مثنوی ماہ و خورشید، اور بہار تسلیم بہت کامیاب مثنویاں ہیں، طلسم خیالی کے نام سے انھوں نے دوسرے ترکیب بندوں کے علاوہ ایک طویل

ترکیب بند لکھا تھا،

اردو غزل میں مومن کی معاملہ بندی و ترفہ گوئی، رنگینی، دلنشینی اور سوز و گداز کی روایات نسیم اور تسلیم سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچی ہے، اور وہ اپنے استاد کی طرح دبستان دہلی، اور مومن اسکول کے نمایندہ شاعر ہیں، جن کے یہاں سید احمد شہیدؒ کے جذبۂ اصلاح و جہاد اور دینی رجحانات اور تعمیری خیالات کا وفور ہے، اسی جذبے کے تحت انھوں نے مسدس حالی کا جواب مسدس خیالی کے نام سے لکھا، اور حالی کی تجدد پسندی کے مقابلے میں راسخ العقیدہ مسلم عوام و خواص کے جذبات کی ترجمانی کی، اور انھیں مغرب کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے کتاب و سنت کی بصیرت اور اسلامی کردار کی قوت اپنانے پر مائل کیا، یہ اور بات ہے کہ اس کا فنی مرتبہ مسدس حالی سے فروتر ہے، جس کے سبب یہ مسدس عام نہیں ہو سکا۔

مہر جہاں تاب پر ایک نظر مولانا خیالی کا یہ عظیم و ضخیم تذکرہ بڑے سائز کے ۱۲۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اپنے عہد کے اردو فارسی تذکروں سے کئی لحاظ سے ممتاز ہے، سب سے پہلی چیز مصنف کے ذوق کی پاکیزگی، لطافتِ طبع، اور نقطۂ نظر کی صحت و صداقت ہے، جس کی روح پورے تذکرے میں کارفرما ہے، اسلامیت اور سلامت روی توازن و اعتدال، اور خوش مذاقی و شائستگی اول سے آخر تک موجود ہے جس سے ذوق کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، بیشتر تذکرے غیر جانبداری دوری و سیع النظری اور کشادہ نظری کے معیار کے حامل ہیں اور ان میں مورخانہ نقطۂ نظر اپنایا گیا ہے، اور حالات و واقعات مستند کتابوں سے لیے گئے ہیں، اشعار کے انتخاب میں بھی بلند ذوقی اور حسن طبیعت کا ثبوت دیا گیا ہے،

اس تذکرے کی دوسری خصوصیت اس کے دائرے کی وسعت اور اس کے مشمولات کا تنوع اور احاطہ ہے، جو اسے ایک دلچسپ اور ہمہ گیر تذکرہ بنا دیتا ہے، جسے ہم مختصر اسلامی انسائیکلو پیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب کے نامور فرزند اور ملک کے ممتاز مورخ و تذکرہ نگار

مولانا حکیم عبدالحئی صاحب کو اپنی کتابیں نزہۃ الخواطر اور الہند فی العہد الاسلامی لکھنے کا خیال اسی تذکرے سے پیدا ہوا ہوگا، انھوں نے ان کتابوں میں اس تذکرے سے بہت استفادہ کیا ہے اور اس کے جابجا حوالے بھی دیے ہیں، انھوں نے گل رعنا میں بھی اس کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں، مصنف موصوف کی کوشش یہ ہے کہ حتی الامکان اسلامی تاریخ و ثقافت اور مشاہیر اسلام سے عام قاری کو واقف کردیا جائے، اور اس کے لیے ایک ایسا دائرۃ المعارف تیار کردیا جائے، جس سے اس کی عام معلومات ہی میں اضافہ نہ ہو، بلکہ اس کے ذوق کی مناسب تربیت اور اس کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل بھی ہو اور اس کے اندر اسلامی ثقافت کے چیدہ و برگزیدہ نمونوں کی پیروی کا جذبہ و داعیہ بھی پیدا ہو،

اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مصنف کی پوری عمر کی کمائی ہے اور تقریباً تیس سال (١٢٨٨ ــــــ ١٣١٨ھ) کے عرصے میں تیار ہوا ہے، جس میں خود مصنف کی ذاتی ڈائری بھی شامل ہے، جو سادگی و بے تکلفی، ایمانداری اور بے نفسی، عالی ہمتی و بلند مشربی کا ایک نمونہ اور آئینہ ہے، اور جس میں ایک بہترین خود نوشت سوانح عمری کی بیشتر خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں، اس میں مصنف کے سفر ملی اور جنوبی ہند کا سفرنامہ بھی درج کیا ہے، جس میں بہت سے معروف اور غیر معروف مقامات کی جغرافی و تمدنی معلومات سامنے آتی ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعمیری و تمدنی کارناموں کا تعارف ہوتا ہے، بہت سی تاریخی عمارتوں اور مسجدوں کے فنی حسن اور تکنیکی مہارت کی تفصیل پیش کی گئی ہے، ان کی پیمائش اور ان کا نقشہ بتایا گیا ہے، بھوپال اور حیدرآباد کے معاشرتی و تاریخی حالات اور بہت سی شخصیات کے متعلق چشم دید اور مستند بیانات دیئے گئے ہیں، جو ان ریاستوں کے مورخین کی توجہ کے مستحق ہیں،

بہت سے مشاہیر علماء، شعراء اور معاصر شخصیتوں کے بارے میں ذاتی تاثرات و واقعا

بیان کیے گئے ہیں، جو شاید کسی اور تذکرے میں نہ ملیں، اس لیے ہماری ثقافتی علمی و ادبی تاریخ میں اس تذکرے سے استفادہ ناگزیر ہو جاتا ہے، خصوصاً حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کی بہت سی شخصیات و واقعات کے لیے یہ تذکرہ ایک اہم اور معتبر ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے،

مشاہیر کے تراجم میں کہیں تفصیل اور کہیں اجمال سے کام لیا گیا ہے، مگر اس طرح کہ شخصیت کی تصویر قاری کے ذہن میں آجاتی ہے اور وہ اس سے بڑی حد تک متعارف ہو جاتا ہے، تذکرے کی زبان ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہے، مگر قافیہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، اور تذکرہ و تراجم کے مناسب زبان استعمال کی گئی ہے، جس میں روانی بھی ہے اور برجستگی بھی، مولانا خیالی کے نامور فرزند مولانا عبدالحئی صاحب اس کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

"والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ عجیب کتاب مہر جہاں تاب ہے، فارسی زبان میں ایک جلد اس کی فلسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی ...... دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا۔ یہ جلد آدھی ہو چکی تھی کہ انکو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانے نے ورق الٹ دیا ہے، اور چند دنوں میں کوئی اسکا سمجھنے والا بھی باقی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہو گئی، چند دنوں کے لیے قلم رکھدیا، پھر اپنی گذشتہ محنت پر تاسف ہوا اور اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا دس بارہ جز لکھ چکے تھے، کہ داعی حق کو لبیک کہہ کر خلد بریں کو سدھارے"[1]

تذکرے کے شروع میں مصنف نے تین دیباچے لکھے ہیں، جو فارسی انشا پردازی کے اچھے نمونے

---

[1] گل رعنا ص ۲۳۳

لکھے جا سکتے ہیں، ان میں انھوں نے ہر دفتر کے تبدل نشیں پہلو نکالے ہیں، اس کے بعد دفتر اول میں ۳۰ علوم کے تعارف میں کہیں تفصیل اور کہیں اجمال سے کام لیا ہے، وہ علوم یہ ہیں "اصول دین" تفسیر، حدیث، اصول فقہ، صرف و نحو، معانی و بیان اور بدیع، خط، قرأت، تصوف، فرائض، منطق، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، تشریح، عروض و قوافی، انفاس و معرفت دم، تعبیر رویا، موسیقی، فراست، تکسیر، جفر و نجوم، احکام، آثار علویہ و سفلیہ، احاجی، احتساب، اوائل۔

روات حدیث:

علم بدیع کے تحت عربی، فارسی، اور اردو شعراء اور اپنے کلام سے محاسن کلام کے نمونے پیش کیے ہیں ـــــ پھر دفتر ثانی کے ذکر اول میں قصص الانبیاء مستند حوالوں کے ساتھ لکھی ہے، (ص ۱۵۰ ـ ۲۵۰) پھر خلفائے راشدین، ائمہ اثنا عشر اور عشرۂ مبشرہ کا ذکر ہے، پھر بہ ترتیب حروف صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کا صدہا تذکرہ لکھا گیا ہے۔ ذکر ہفتم میں مجتہدین اربعہ کے حالات لکھے ہیں، ائمہ ثلاثہ کے بالمقابل امام اعظمؒ کے حالات میں تفصیل کی یہ توجیہ کی ہے کہ غیر مقلدین اور اہل حدیث کے ایک گروہ نے امام صاحبؒ پر اعتراضات کیے ہیں، اس لیے محدثین کی شہادتوں سے ان کا ازالہ ضروری تھا، امام صاحب کے تفقہ سے زیادہ بحث نہیں کہ یہ تو متفق علیہ ہے، اس لیے حدیث و رجال سے بحث کی ہے، اور حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے امام صاحبؒ کی تابعیت ثابت کی ہے، اور حدیث میں امام صاحبؒ کے مقام تحقیق سے انکار کو کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

(صفحہ ۳۹۲ ـــــ ۳۹۸)

ذکر ہشتم میں قراء سبعہؒ اور ذکر نہم میں محدثین و اکابر نقشبندیہ اور ذکر دہم اور یازدہم میں گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی ہجری تک کے علمائے ہند کا تذکرہ لکھا ہے، جس میں بعض عرب علماء کے بھی حالات ہیں، ہم یہاں کچھ تراجم کے نمونے پیش کرتے ہیں، تاکہ مصنف کی تذکرہ نگاری اور طرز تحریر سامنے آجائے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے تذکرے میں انگریزوں کی وہابیت کے متعلق پھیلائی ہوئی افواہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وآنچہ در عوام بغلط شہرت دارد کہ وی وہابیت داشت، محض افتراست، ای مولوی محمد اسماعیل و جملہ ہمراہیانش ہمہ موحدین متبعین بالسنۃ در اصول حنفیت بودند الا بسبب ردِ شرک و بدعت، قدمیکہ آلودہ و ملوث بدعات و شرک بود نعوذ باللہ منہا، ترک عادت قدیمہ مشکل دانستہ ایشان را بوہابیت مشہور کردتا بعدم اتباع این قوم مر ایشان را اولیائی کافی و عوام از دشان وحشت گیرند۔" (ص ۱۰۲)

مولانا عبد الحیٔ بڈھانویؒ | مولانا عبد الحیٔ بڈھانویؒ دہلوی داماد شاہ عبد العزیز محدثؒ و شاگرد رشید وی بادامادش بود و از محمد بن علی الشوکانی نیز اجازت حدیث دارد، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، فقیہ، اصولی، مفسر و محدث، واعظ سحر بیان، زاہد متورع، محی السنۃ، ماحی شرک و بدعت، عارف خدا آگاہ، غازی فی سبیل اللہ بود، مرید و تربیت یافتہ بزرگ خلیفہ حضرت قدوۃ العارفین امیر المجاہدین الشہید فی سبیل اللہ الاحد السید احمد البریلوی قدس سرہ است

و سالہا در تکیہ شاہ علم اللہؒ در وطن حضرت موصوف بودہ در سفر بادی ہمراہ بودہ در سفر جہاد ولایت سکھاں رفیق ماندہ، محن و ریاضات کہ در تحصیل کمالات معنوی بخدمت مرشد کشیدہ بیانش طوالت میخواہد بالجملہ آیتی از آیات اللہ و خاتمہ ربانین معرفت آگاہ بود وفاتش ہشتم ماہ شعبان روز یکشنبہ سنہ ۱۲۴۳ھ بودہ" (۳۲)

مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ | حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں انھوں نے نواب صدیق حسن خاںؒ کی کتاب سے تلخیص کرتے ہوئے لکھا ہے،

لہ مہر جہانتاب ص ۱۰۹۴

"محمد اسماعیل بن شیخ عبدالغنی یا عبدالغنی العمری بن مسند الوقت شاہ ولی اللہ المحدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ یکی از ائمہ دین و فقہاء متقین و نبلاء محدثین بود پدرش بعمر بست و ہشت سالگی دنیای فانی را پدرود کرد . . . . وے را بعد وفات پدر بزرگوار در کنار عم نامدار شاہ عبدالقادر دہلویؒ مولف موضح القرآن تربیت ظاہری و باطنی یافت و بجای فرزند او بود و ہم زانوی ادب در تحصیل کمالات علمیہ و عملیہ و فضائل خاندان خود بخدمت اعمام کرام خویش تہ نمودہ بذروۂ اعلیٰ از علم و فضل رسید جوہر ذکاء او بنہایت عالی افتادہ بود، مقدمات غویصہ و مشکلات علوم را زود تر ادراک می کرد و بمغز سخن می رسید ولادت او تقریباً در سنہ ۱۱۹۳ھ واقع شدہ، بیعت جہاد با سید احمد رائے بریلوی خلیفہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ بجا آوردہ سر خیل قافلۂ مجاہدین و مجاہدین وی بود این ہمہ ترویج شریعت از شرق تا غرب در دفع بدع و محدثات کہ می بینی و این ہمہ مذاکرۂ علوم و کثرت صوم و صلاۃ و زکاۃ و آبادی مساجد کہ در مردم ہندوستان می بینی بدولت جہد و اجتہاد او و مولوی عبدالحیؒ مرحوم است گوئی در سرزمین ہند مثل این دو نفر بزرگوار کہ بجای دو فرزند شیخ خود بودند دریں دوازدہ صد سال کسے نہ برخاستہ۔

تخم اتباع سنت کہ جد وی شاہ ولی اللہ محدث رضی اللہ عنہ دریں دیار کاشتہ بود در عہد وی بزرگ و بار آورد و در ہدایت ارازوی نہایت پذیرفت در معقول و منقول یاد پیشینیاں از خاطرہا برد و در فروع و اصول ائمہ ازاد و در تری نشاند، در ہر علم کہ با او سخن رانی دانی کردی امام این فن است مولفاتش در فقہ و حدیث و اصول و جز آں بعض رسائل موجود است انجملہ رد الاشراک و تقویۃ الایمان و تنویر العینین در اصول فقہ، و صراط مستقیم، و رسالہ امامت و ایضاح الحق و مثنوی سلک نور و تنقید الجواب۔"

صراط مستقیم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نانا کے بھائی مولوی سید سعید الدین صاحب نے

انھیں بتایا کہ جو مولانا اسماعیل شہید کے ساتھ تکیہ میں رہ چکے تھے، جہاں یہ کتاب لکھی جا رہی تھی، کہ اس کے مضامین سید صاحبؒ کے ملفوظات پر مبنی ہوتے تھے، جنھیں حضرت مولانا شہید بعد میں لکھتے تھے، اور حضرت سید صاحبؒ کو سناتے تو وہ ترمیم کرتے اور حضرت مولانا اسے قلم زد کرکے دوبارہ تحریر فرماتے تھے۔[1]

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ | مولانا محمد قاسم نانوتوی بن شیخ اسد علی در سنہ ۱۲۴۸ھ متولد شد نام تاریخی او خورشید حسن است، علامۂ عصر، نابغۂ دہر، متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذکی، ماہر در معقولات، از عہد طفلی طباع، بلند ہمت، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری بود، و در کتب پیوستہ از ہم سبقان اول می بود، قرآن شریف بہ وقت یسیرہ ختم کردہ، شوق نظم در ایں فن حوصلہ بلند داشت، در طفلی حکایات لہو و لعب بیشتر نظم فرمود، در ۱۲۶۰ھ دہلی رفتہ نزد حضرت مولوی مملوک العلی آغاز تعلیم کرد، و حدیث بحضور شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی خواند، و در ۱۲۷۷ھ بحج بیت اللہ مشرف شد، و بعد واپسی در مدرسۂ دیوبند متولی تدریس گردید، باز بعدہ در ۱۲۸۵ھ، دیگر بارہ حج کردہ بعد واپسی در دہلی بمسند افادہ نشست، اکثر از پادریان و پنڈتان مباحثہ مذہبی می کرد غالب می آمد، از تصانیفش حجۃ الاسلام و قبلہ نما مشہور اند، بعد از اں بار سیوم بحج بیت اللہ مشرف شد و بعد واپسی بہ تپ مبتلا شد چندی علیل ماند تا روز پنجشنبہ وقت ظہر چہارم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ بعارضۂ ذات الجنب وفات فرمود، مزارش در دیوبند است، مولوی محمود حسن و مولوی فخر الحسن گنگوہی و مولوی احمد حسن امروہی از تلامذۂ وے اند، کذا فی الکتاب العاشر عن الفاضل رحیم بخش لاہوری۔[2]

مولانا محمد علی کانپوری و مونگیری | ناظم ندوۃ العلماء، فاضل درویش سیرت متدین بافتا

---

[1] مرحبا کتاب ص ۵۰۲، ۵۰۳ [2] ایضاً ص ۵۱۰

از سادات بارہہ است و از شاگردان مولانا سلطف اللہ علی گڑھی در کانپور توطن گزید و بانی مبانی مجلس ندوہ کہ برائے جمہور اہل اسلام نافع دین و دنیا ست ، ہو شد مدنی نزد منفقہ این بار گراں بر سر گرفتہ سعیش مشکور باد۔[1]

ہم ان اقتباسات کا خاتمہ اس دلچسپ تحریر پر کرنا چاہتے ہیں، جو مولانا نے اپنے لائق فرزند مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب کے بارے میں لکھی ہے اس سے ناظرین انکی اس غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو انھوں نے تذکرہ نگاری میں ملحوظ رکھی ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ | سید عبدالملقب بسید احمد خلف اکبر کاتب بحروف ست در سنہ ۱۲۸۶ بوجود آمدہ ، کتب درسیہ ابتدائیہ از صرف و نحو و فقہ و اصول و تفسیر معقولات ابتدائی پیش افاضل لکھنؤ و قدوۃ الافاضل شمس العلماء مولانا محمد نعیم و مولانا فضل اللہ فرنگی محلی و بحضور افاضل بھوپال چوں جناب مولانا مفتی عبدالحق ولایتی و مولانا شیخ محمد بن حسین بن محسن عرب و مولانا سید احمد دیوبندی کرد و صحاح ستہ بحضور جناب مولانا شیخ حسین بن محسن یمنی محدث معروف بہ عرب صاحب در بھوپال قرارت کرد ، شیخ صاحب موصوف و حق او مثیل افاضل بھوپال و رحمی از اساتذہ فاتحہ فراغ خواندہ و دعای برکت فرمود و اجازت جمیع علوم داد مکرر با تقریبا داسی فراغ در ۱۳۱۲ دست دادہ۔

و در ہمیں سال سفری طویل گوارا کردہ بخدمت جناب مولانا رشید احمد گنگوہی اقامہ اللہ علی سر ایں فائدہ و جناب قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی و جناب مولانا نذیر حسین محدث دہلوی و دیگر محدثین و علمائی دیوبند و سہارنپور و نواح پنجاب و دہلی و پیران کلیر حاضر شد و اجازت و سند حدیث تحریری و تقریری حاصل نمود ، و ہمہ این بزرگان بنظر محبت دینی بچشم عزت نگریستند و توجہ خاص مبذول [فرمودند]

[1] مہر جہانتاب ص ۱۱۰۵

وہم اجازت و سند حدیث از جناب مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ یافتند و سعت بیعت بدست مبترکہ او شان داده و طب بعضی از ابتدا ابیات چوں موجز سدیدی وغیرہ از حقیر راقم خوانده و شرح اسباب و علامات از حکیم حافظ محمد عبد العلی لکھنوی نبیرہ جناب مولانا استاذ الحکما حکیم محمد یعقوب طاب ثراہ و طرفی در کلیات قانون الشیخ پیش حکیم عبد العزیز نبیرۂ ثانی مولانا موصوف و مطب از حافظ عبد العلی و فرزند شان کرده لیاقتی نامه و استعدادی کامله بہم رسانیده در ہر علمی را بتدبر و تفکر تمام حاصل نموده و از شوال ۱۳۱۳ھ تا آخر حسب استدعا ناظم صاحب ندوة العلماء در ندوه کارش به مزد کرده و از محرم ۱۳۱۶ھ بشاہرہ سی روپیہ بعہدۂ مددگاری و نیابت ناظم ماموره و تحریر و تقریر و مواعظ و اجوبۂ فتاویٰ بطا و بہتر سرگرم و بفضل الٰہی سعادت و عمل نیک و توجہ بہ علوم دینی روزی رسیت و ندوه مجلسی است که بمشورۂ علماء برائے اصلاح اہل اسلام در کانپور قائم شده و تا حال بکرم تعالیٰ بکارش بدرود نقش روز افزون ست فللہ الحمد علی ان من علینا بتوفیق طلبه لعلوم الدین و لاکرم بالسعادة و عمل الخیر اللهم وفقنی و ایاه لسعادة الاعمال و حسن خاتمتنا باحسن الاقوال و ہذا الاربعة عشرة بعد الالف من سنین الہجرة سنة ۱۳۱۴ھ[1]

---

[1] دربار ثاب ص ۱۹۴

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

اسلامی علوم و فنون پر ہندوستان کے علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی فہرست اب تک مکمل نہیں ہو سکی تھی، مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند لکھ کر اس کمی کو دور کر دیا ہے، یہ اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کی فہرست کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی فکری تاریخ بھی قلمبند ہو گئی ہے، قیمت دس روپیہ "منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی صاحب، رام پور

معتبر ہو مستقل ہو ان کی چشمِ التفات
سایۂ ابر گریزاں کب ہے غم خوارِ حیات

اک طرف ہے روزِ روشن اک طرف تاریک رات
دیدنی ہے آج کل آئینۂ ذات و صفات

ناامیدی کفر ہے تو سوچنے کی بات ہے
زہر کو انسان کیوں کہنے لگا آبِ حیات

دیکھیے اک پتلۂ خاکی کا منصب دیکھیے
نائبِ یزداں پھر اس پر سربراہِ کائنات

ہر نفس ہر زندگی میں کشمکش سی کشمکش
انقلابی کیفیات و حادثاتی کیفیات

سعدؓ و طلحہؓ بوعبیدہؓ، عبدؓ رحمٰنؓ و زبیرؓ
فیضِ صحبت سے بنی ہیں کیسی کیسی شخصیات

حال کی ظلمت میں مستقبل کا سورج دیکھنا
تجھ سے اتنا ربط ہے اے زندگیِ بے ثبات

میں بغیر اذنِ ساقی شغل کر سکتا نہیں
یوں تو کہنے کے لیے ہوں شاملِ بزمِ حیات

آپ کی نوخیز نظریں کس قدر محتاط ہیں
ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا نشانِ التفات

بے یقینی وقت کی نیرنگیوں سے پوچھ لے
ہر قدم، ہر موڑ پر ہوتے ہیں تازہ تجربات

بے اجازت کیسے کہہ دوں اپنی بیخوابی کا راز
لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں میرے غم کی واردات

میرے ہاتھوں میں ابھی امید کی پتوار ہے
سیلِ غم سے کھیلتی رہتی ہے کشتیِ حیات

ظاہر و باطن میں اتنا فرق ــ کیا کہیے عروج
لب پہ ہے تقدیسِ کعبہ، اور دل میں سومنات

غزل

(از جناب محمد حسین فطرت بھٹکلی)

دامانِ اہلِ ہوس میں وفا کا ثمر نہ جائے
گلشن میں رائیگاں مرا خونِ جگر نہ جائے

فسق و فجور و ظلم کا پیمانہ بھر نہ جائے
تحت الثریٰ میں آج کا انساں اتر نہ جائے

تشہیر مجھ پہ شاق ہے اپنے خلوص کی
داغِ جگر پہ میرے کسی کی نظر نہ جائے

یوں ہی جمال پاش رہے غازۂ الم
جب تک عروسِ زیست کا چہرہ نکھر نہ جائے

فردوسِ عافیت کا تصور فضول ہے
جب تک جدید دور کا انساں سنور نہ جائے

دل میرا ہے ازل سے حریفِ تجلیات
آئے کبھی نہ شام، جمالِ سحر نہ جائے

توحید تو یہی ہے اسی کا رہے خیال
ادنیٰ گماں بھی غیر کا دل میں گزر نہ جائے

ہو خواہ کتنا سلسلۂ شامِ غم دراز
سینے سے میرے خواہشِ نورِ سحر نہ جائے

فطرتؔ مرا کلام مہکنے لگا ہے آج
غزلوں سے بوئے گلشنِ داغِ جگر نہ جائے

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب چمپارن

کلام ہو جس قدر بھی مہمل، مگر ہے دعویٰ سخنوری کا
جدید فکر و نظر کا داعی فریب خوردہ ہے شاعری کا

چراغِ عقل و خرد بھی روشن ہے اور انجم بھی جگمگا گئے ہیں
مگر یہ کیا ہے کہ دور تک بھی پتہ نہیں کوئی روشنی کا

جو علم سے آشنا نہیں، وہ بشر نہیں نخلِ بے ثمر ہے
کہ علم ہی سے جہاں میں انساں کو شرف حاصل ہے برتری کا

اجڑ چکیں بستیاں وفا کی، رہا نہ اخلاص کا زمانہ
بدل دیا ہے مزاج "اہلِ ہوس" نے دنیائے عاشقی کا

یہ کیسا وقت آ گیا چمن پر؟ یہ کون سی ہے بہار ہمدم
کہ چہرہ اترا ہوا ہے پھولوں کا رنگ فق ہے کلی کلی کا

چلو کہ اب چل کے چاند تاروں پہ امن کی بستیاں بسائیں
سنا ہے جنگل کے سب درندوں نے بھیس بدلا ہے آدمی کا

تجھے نہ میں بے وفا کہوں گا، کبھی نہ ذکرِ جفا کروں گا
رہا ہے دستور تیرے مستوں میں عمر بھر ضبط و خامشی کا

نہ ہے یہ جور و جفائے پیہم، خوشا یہ ناکامیٔ محبت
یہ ہے مری زندگی کا حاصل، وہ ہے صلہ میری دوستی کا

مرے نبیؐ رحمتِ جہاں ہیں، مرے نبیؐ محسنِ زماں ہیں
ہوا نہ ہوگا کبھی جہاں میں کوئی بھی ہمسر مرے نبیؐ کا

یہ شہر ہے دشمنوں کا وارثؔ یہاں سبھی لوگ اجنبی ہیں
یہاں تو تنہا زندگی ہے جہاں نہیں ہے کوئی کسی کا

مطبوعات جدیدہ

نظرات :۔ از جناب وقار احمد رضوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۳۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے، ناشر: ملک نورانی، مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲، عبداللہ ہارون روڈ کراچی

گو موجودہ دور کے ناقدوں نے اردو خواں طبقہ کو مغربی افکار سے روشناس کرایا، تاہم اصول نقد کو اردو زبان کے مزاج کے مطابق نہ ڈھالنے اور مغربی تنقید کی نقالی کی وجہ سے انھوں نے اصولی و معروضی تنقید کی طرف کم توجہ کی اور ان کی تنقیدیں تمامتر جمالیاتی، مارکسی اور تاثراتی نوعیت کی ہوگئیں جو عربی و فارسی کے ناقدوں اور مفکروں کے خیالات اور اصول نقد پر بحث و گفتگو سے خالی تھیں، زیر نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اور اس میں نقد و انتقاد کے اصول بھی زیر بحث لائے گئے ہیں، اس کے مصنف پاکستان کے ایک اچھے نئے اہل قلم ہیں اور وہ انگریزی کی طرح عربی زبان سے بھی واقف ہیں، اس لیے انھوں نے عربی زبان کے ادیبوں اور ناقدوں کے افکار و خیالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور اس کتاب کے چوتھے باب میں عربی میں معروضی تنقید کے امام قدامہ بن جعفر کے مختصر حالات تحریر کرکے ان کی مشہور کتاب نقد الشعر کا مفصل جائزہ لیا ہے، اس باب سے تنقید، علمی تنقید اور معروضی تنقید کا مفہوم بھی پوری طرح واضح ہوگیا ہے، لائق مصنف نے اصولی و معروضی تنقید پر بحث سے پہلے ادب کی تعریف، ادبی تنقید کے مفہوم اور شاعری کے درجہ و مرتبہ کی تین علیحدہ علیحدہ ابواب میں وضاحت کی ہے اور ادب، تنقید اور شعر کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی اہمیت و حقیقت بھی بیان کی ہے، پانچویں باب میں نقد کے ان اصول و ارکان کا ذکر ہے جو ادبی سرمایے کو پرکھنے کی کسوٹی ہیں، اس

سلسلہ میں جذبہ، خیال، مواد، ہیئت اور اسلوب کی نوعیت، اہمیت، ضرورت اور اثر آفرینی دکھائی ہے، یہ اس کتاب کا سب سے اہم باب ہے، اس میں ادب و تنقید کے اصول و ضوابط کی تشریح کے ضمن میں بڑی دیدہ وری اور نکتہ آفرینی سے کام لیا گیا ہے، یہ پوری کتاب محنت و کاوش سے مرتب کی گئی ہے، اور برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہے، اس سے مصنف کی سلیقہ مندی اور ستھرے ادبی و تنقیدی ذوق کا پتہ چلتا ہے، ابتدا میں انھوں نے اردو کے تنقیدی ذخیرہ کا مختصر جائزہ لیا ہے، اس سلسلہ میں اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کی توازن پسندی اور دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبد القادرؒ کی قرآن فہمی | مرتبہ جناب محمد فاروق خاں صاحب ایم۔ اے تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۶ قیمت ۵ روپیے

پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیری حواشی موضح القرآن کو بے مثال شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، امتداد زمانہ کے باوجود ان کی سادگی، سلاست اور دلکشی میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے، چند برس قبل مولانا اخلاق حسین قاسمی نے موضح القرآن کے محاسن پر بعض رسالے شائع کیے تھے، اور اب جماعت اسلامی کے ایک اہل قلم محمد فاروق صاحب نے موضح القرآن کی مدد سے حضرت شاہ صاحبؒ کی قرآنی فہم و بصیرت پر روشنی ڈالی ہے، پہلے انھوں نے شاہ صاحبؒ کے حالات و کمالات کا مختصر خاکہ تحریر کیا ہے، پھر مختلف عنوانات کے تحت موضح القرآن کے تفسیری حواشی نقل کر کے ان کی خصوصیات اور شاہ صاحب کی قرآن فہمی دکھائی ہے، مصنف اس سے پہلے ہندی میں قرآن مجید کا ترجمہ مختصر حواشی کے ساتھ مرتب کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوا، اس کتاب سے شاہ عبد القادرؒ کی قرآن دانی کے علاوہ خود ان کی قرآن مجید کے ترجمہ و تحشیہ کے کام سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت | مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۸، قیمت نو روپے پچاس پیسے۔ شائع کردہ: اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

تصوف کے طرق و سلاسل میں سلسلہ چشتیہ ہندوستان میں زیادہ رائج اور مقبول ہوا، اس کتاب میں اس کے فیوض و برکات اور اصول و مناہج کا لب لباب پیش کر کے دکھایا ہے کہ آج بھی چشتی تعلیمات کے اندر روحانی جلا اور اخلاقی سدھار کا پورا سامان موجود ہے، یہ دراصل وہ مقالہ ہے جو سلسلۂ چشتیہ کے مرکز درگاہ اجمیر میں منعقدہ آل انڈیا سیمینار میں پڑھا گیا تھا، اس میں چشتیہ مشایخ کے نظام تعلیم و تربیت کی وضاحت ایسے دلنشین انداز میں کی گئی ہے کہ تصوف کا اصل مقصد، ارادت و بیعت کی حقیقت اور پیر و مرید کی ذمہ داری بھی واضح ہو گئی ہے اور تصوف کے بارہ میں بعض شبہات کا ازالہ بھی ہو گیا ہے، مصنف نے اس سلسلہ میں نفس کشی، ترک دنیا، روح عبادات اور خدمت خلق کی حقیقت بھی موثر اور دلآویز انداز میں بیان کی ہے، اور توبہ و استقامت، صدق و اخلاص اور اطعام و انفاق کو چشتی خانقاہوں کی تعلیم و تربیت کا حاصل بتایا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے تصور عشق اور ذکر کی حقیقت اور مراقبہ کی غایت کی وضاحت کی ہے، مقالہ نگار کا اصل مقصد اس زمانہ میں چشتی تعلیمات کی معنویت، اہمیت اور ضرورت ثابت کرنا ہے، اس کے لیے انھوں نے پہلے اُس دور کے حالات بیان کیے ہیں جس میں چشتی مشایخ نے اپنا نصاب تعلیم و تربیت جاری کیا تھا، پھر اس مشینی دور کے عقیدوں، فلسفوں اور مذہب میں رسوم و ظواہر کی دراندازی کا ذکر کیا ہے، امید ہے کہ ان کی یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی، جس کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ روحانیت و اخلاق کی نایابی کے اس دور میں چشتی تعلیمات ایمان و یقین میں پختگی و استواری اور سیرت و اخلاق کی تعمیر و تطہیر میں معاون بن سکتی ہیں۔

اقبال اور مغربی مفکرین: مرتبہ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

صفحات ۲۷۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپے، پتہ: مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ (انار کلی) لاہور

اردو کے مشہور شاعر و اہل قلم جناب جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر اقبال کے عاشق و شیدائی ہیں، یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ اس وقت اقبالیات کی معرفت و ترجمانی میں کم ہی لوگ ان کے ہمسر ہوں گے، وہ اقبال پر متعدد مفید کتابیں لکھ چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں اقبال اور مندرجۂ ذیل مغربی مفکرین کے افکار و خیالات کا تقابلی جائزہ لیا ہے، بیکن، لاک، کانٹ، فشٹے، شوپن ہار، کارل مارکس، نیٹشے، برگساں، دانتے، ملٹن اور گوئٹے، شروع میں اقبال اور فکر یونان کے زیر عنوان یونانی فلسفہ کی اہمیت اور مشہور حکمائے یونان سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے نظریات پر بھی مفید گفتگو ہے،

اقبال کے بارہ میں ایک رائے تو یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے تمام فکری دھاروں سے بے نیاز ہے، اور دوسرا خیال یہ ہے کہ اقبال کی خود اپنی کوئی فکر اور دین نہیں ہے، بلکہ ان کے اکثر خیالات مغربی مفکرین کے خیالات کی صدائے بازگشت ہیں، اس انتہا پسندی کے مقابلہ میں لائق مصنف نے یہ معتدل موقف پیش کیا ہے "اقبال نے اگر مشرقی اور مغربی مفکرین کے خیالات کو اپنایا ہے تو اسی حد تک جس حد تک وہ انھیں قابل قبول تھے، اس کے بعد انھوں نے اپنا راستہ الگ اختیار کیا، مغربی خیالات کو جانچنا، پرکھنا اور انھیں اپنانا یا رد کرنا کسی بھی فنکار کی عظمت کی دلیل ہے، اس کے علی الرغم ان سے آنکھیں بند رکھنا یقیناً چھوٹے پن کا ثبوت ہے، اقبال نے مغربی خیالات کی گہرائی میں اتر کر اور کہیں انھیں قبول کر کے اور کہیں رد کر کے اپنے اوریجنل مفکر ہونے کا ثبوت دیا ہے" لائق مصنف نے مذکورۂ بالا مغربی مصنفین اور اقبال کے مشترک موضوعات پر اظہار خیال کو موضوع بحث بنایا ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے اور اقبال کے خیالات میں کس حد تک موافقت یا اختلاف ہے، اس ضمن میں انھوں نے بڑی دقت نظر سے اقبال کے کلام کا جائزہ لیا ہے، جس سے اقبال کی وہ تحسین یا تردید بھی سامنے آگئی ہے جو انھوں نے مغربی مفکرین کے خیالات کے بارے میں کی ہے، مصنف نے "اقبال اور کارل مارکس" کے زیر عنوان مارکسزم کے متعلق

اقبال کا اصل نقطۂ نظر پیش کرکے اس دور کی کئی ممتاز سیاسی و ادبی شخصیتوں کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ وہ سوشلزم اور کمیونزم سے قریب یا اسلامی سوشلسٹ تھے، اس سلسلہ میں اقبال کی شاعری کے علاوہ ان کے خطوط اور خطبات سے بھی شواہد پیش کیے ہیں، یہ حصہ خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، مصنف اقبال کے بڑے مداح اور عقیدت مند ہیں، وہ انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو نری عقیدت یا بے جا غلو کا نتیجہ ہو، ان کا انداز تمام تر معروضی ہے اور انھوں نے اقبال کو کسی خاص عینک سے دیکھنے کے بجائے صحیح انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کتاب اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ہندوستان میں چھپا تھا، یہ دوسرا اڈیشن پاکستان سے شایع ہوا ہے، اس میں کتابت و طباعت کی کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں۔

کتابخانہ ہائے پاکستان: مرتبہ جناب محمد حسین تسبیحی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۴۰، قیمت ۵۵ روپیے۔ ناشر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان دونوں ملکوں کی تحقیقات علمی کی وزارتوں کے اشتراک سے اسلام آباد میں قائم ہوا ہے، اس کا مقصد فارسی زبان و ادب اور اس سے متعلق علوم و فنون کی ترویج و اشاعت ہے، یہ کتاب اسی مرکز سے شائع ہوئی ہے، اس میں پاکستان کے متعدد شہروں کے ڈھائی سو سے زیادہ کتب خانوں کا ذکر اور ان کے اہم مخطوطات کا تعارف درج ہے، ہر کتب خانہ کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی تعداد بھی دی گئی ہے اور بعض کتابوں کی زبانوں اور کتب خانہ کے مالکوں اور لائبریرین کا ذکر بھی ہے، بعض کتب خانوں کی عمارتوں کی موجودہ حالت اور ان کے مالک یا لائبریرین کے مختصر حالات قلمبند کیے ہیں، بعض شہروں کے متعلق مختصر معلومات بھی درج ہیں، کتابوں کے تعارف میں کاتب و مصنف کے نام و فن، زبان، تقطیع، زمانۂ تصنیف و کتابت اور کاغذ کی نوعیت وغیرہ بیان کی گئی ہے، لیکن کتابوں اور

کتب خانوں کی کثیر تفصیلات ہیں جن میں کسی کتاب کے مصنف کا ذکر ہے، بلکہ ہر کتاب کا زمانہ نہیں ... علمی
کے فن، زبان اور زمانہ تصنیف و کتابت کی صراحت کی گئی ہو، اس کا کہیں نہیں کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ مصنف نے یہ فہرست عجلت میں مرتب کی ہے، اگر ہر کتب خانہ کے ذکر میں زبانوں اور فنون کے اعتبار سے
الگ الگ عنوان قائم کیے جاتے تو اس فہرست سے استفادہ میں زیادہ سہولت ہوتی۔

غزل چہرہ: از جناب جمیل نظر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد
مع خوبصورت گرد پوش، قیمت تیس روپیے، پتہ جمیل احمد معین لمحہ مکان نمبر ۶۲ بلاک ۱۲ فیڈرل بی ایریا، السید سوسائٹی کراچی نمبر ۳۸۔

یہ جناب جمیل نظر کی غزلوں کا مجموعہ ہے، ان کی شاعری قدیم روایتوں کی پروردہ ہونے کے باوجود نئے حالات و
مسائل کا آئینہ ہے، اس لیے مجموعہ تغزل کی قدیم و جدید علامتوں کا خوشگوار امتزاج ہے، جمیل نظر صاحب کا اصلی وطن بریلی تھا مگر اب
پاکستان میں بود و باش اختیار کر لی ہے، ان کے کلام میں پاکستان کے بعض مخصوص حالات خصوصاً طبقاتی، خاندانی اور علاقائی
کشمکش کی مذمت اس انداز سے کی گئی ہے کہ غزل کی لطافت میں فرق نہیں آنے پایا ہے، انھوں نے موجودہ پست ذہنیت اور سطحی
جذبات و میلانات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے، اس سے ان کی قوت مشاہدہ کا اندازہ اور طبیعت کی دردمندی
کا پتہ چلتا ہے، غزل چہرہ جناب جمیل نظر کی غزل گوئی کا اچھا نمونہ اور حسن طباعت میں بے مثال ہے۔

دعوت اسلام: از مولانا محمد عبد الملک جامعی، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲،
بلا قیمت، پتہ مولانا افتخار زیدی، زیدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔

یہ تحریر مولانا عبد الملک جامعی مراد آبادی ثم مدنی نے جذبہ اخلاص، دردمندی، دل سوزی اور جذبہ تبلیغ
سے سرشار ہو کر لکھی ہے اور اسی جذبہ صادق سے مولانا افتخار زیدی نے اسے شائع کیا ہے، اس میں مؤثر انداز میں مسلمانوں کو
ان کا فراموش شدہ فریضۂ دعوت و تبلیغ یاد دلا کر اسلام کی عظیم نعمت کو تمام بندگان خدا تک پہنچانے کی دعوت دی گئی ہے اور خیر امت
کی حیثیت سے انھیں اس زمانہ کی پھیلی ہوئی مختلف گمراہیوں اور برائیوں کا انسداد کرکے دنیا کو ہلاکت و بربادی سے بچانے کی تلقین
کی گئی ہے، کتابچہ کی کوئی قیمت رکھنے کے بجائے صرف اس کی توسیع اشاعت کی اپیل کی ہے، اسلام کی دعوت و اشاعت مصنف و ناشر کی
کاوش ہے، اس میں اور رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہر شخص کو ان کا تعاون کرنا چاہیے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]